خواتین اور دوشیزاؤں کے لیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اپریل 2017

APRIL 2017



Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books



Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books







Fair & Lovely

ایکسپرٹ فیئرنس سلوشن

30 سال سے
قابلِ اعتماد نام



زہریلی*
کریمز سے محتاط رہیں

* فارمولا کریمز میں مرکری اور دوسرے مضرِ صحت اجزاء ہو سکتے ہیں


URDUSOFTBOOKS.COM URDUSOFTBOOKS.COM



گیسٹوفل

سیرپ اور ٹیبلٹس

گیس، سینے کی جلن اور بدہضمی کا حل



قرشی گیسٹوفل کے فوائد:

- گیس (تبخیرِ معدہ) کیلئے انتہائی مفید ہے
- سینے کی جلن میں مؤثر ہے
- معدہ کی تیزابیت اور بدہضمی میں آرام پہنچاتا ہے
- بھوک لگاتا ہے اور قبض دور کرنے میں مفید ہے

facebook.com/QarshiPakistan | www.qarshi.com

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر ——— آذر ریاض
نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی
نفسیات ——— عدنان
اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

اپریل 2017
جلد 44 شمارہ 12
قیمت 60 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 7000 روپے



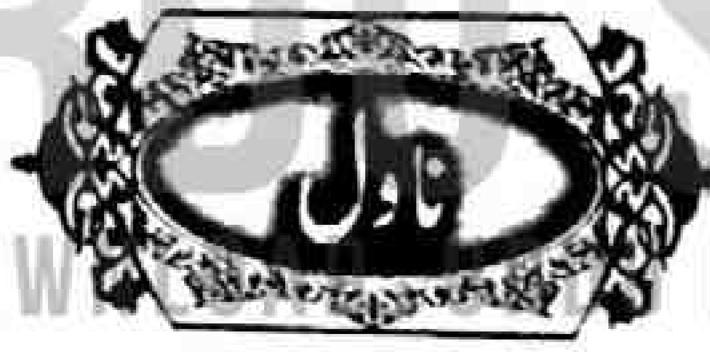

آپ سے کیا پردہ


خاتون کی ڈائری


مجھ سے ملیے


انٹرویو


سالگرہ نمبر


ناول


مکمل ناول


ناولٹ


افسانے

Watch Us On

YouTube

چہرے کے فالتو بالوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

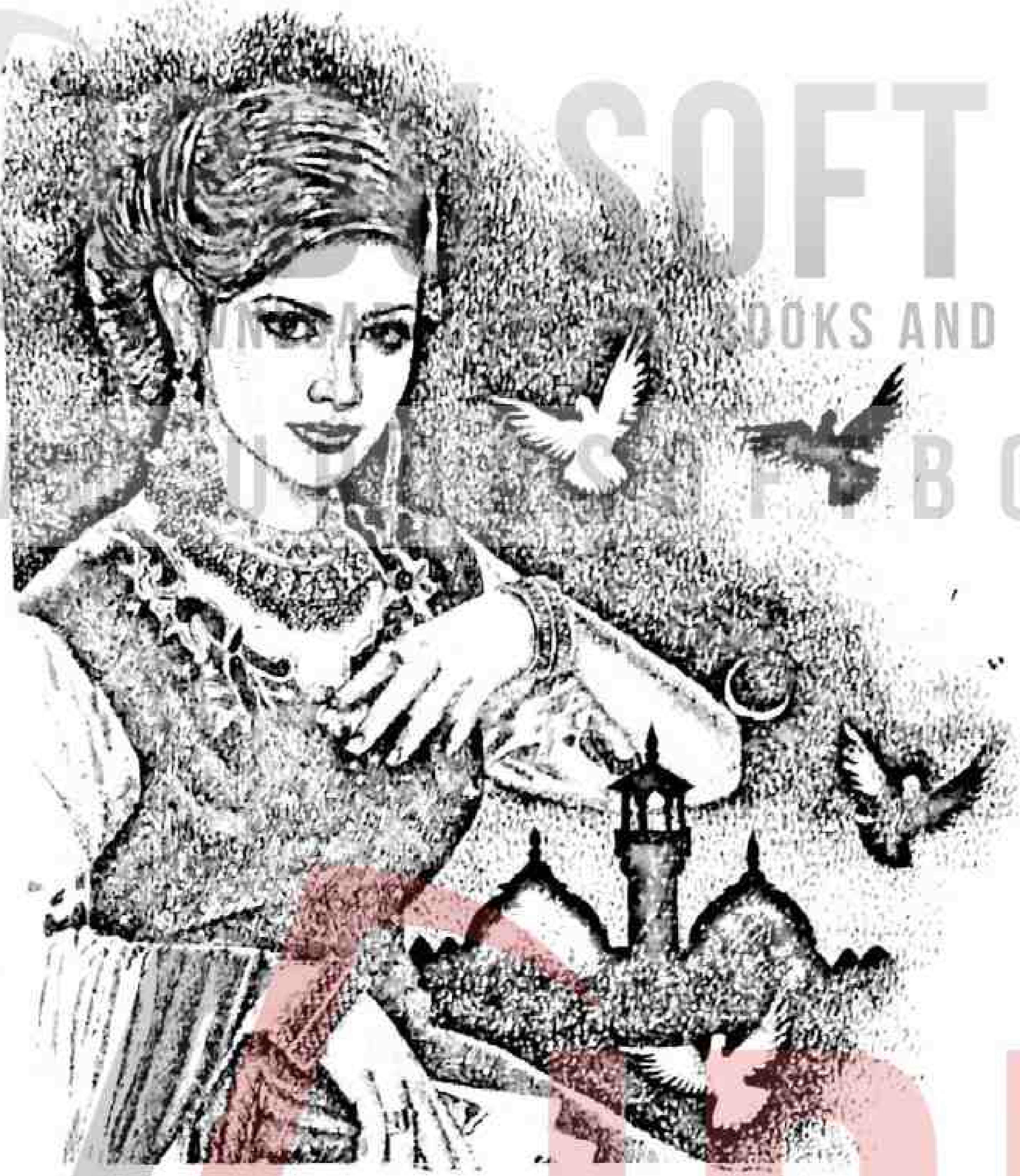
چہرے کی جھُریوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club













خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر لیے حاضر ہیں۔

45 واں سالگرہ نمبر

آپ کی محبتوں اور چاہتوں کے خوبصورت احساس کے ساتھ ایک اور سال کی مسافت تمام ہوئی۔ خوب سے خوب تر کی راہ پر گامزن خواتین ڈائجسٹ ایک قدم اور آگے بڑھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور اس کی مہربانی ہے۔ ہم اس کے حضور سربہ سجود ہیں۔

کسی بھی نئے کام کا آغاز کرنے کے لیے کڑی محنت لگن اور خلوص کے ساتھ ساتھ بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ محمود ریاض صاحب نے اس ادارے کی بنیاد رکھی تو دل میں لگن اور شوق کے ساتھ ساتھ حوصلے بھی بلند تھے۔ قدرت نے ان کے ارادوں کا ساتھ دیا۔ پہلے ہی شمارے نے قارئین کو چونکا دیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ خواتین ڈائجسٹ آگے ہی بڑھتا رہا۔ اگرچہ اس راہ میں کچھ سخت مقام بھی آئے۔ کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ خواتین بہتر سے بہترین کی طرف بڑھتا گیا اور آج جبکہ الیکٹرانک میڈیا کے بعد تفریح کے بے شمار ذرائع آگئے ہیں، وقت گزاری مسئلہ نہیں رہا۔ خواتین ڈائجسٹ کا آج بھی وہی مقام ہے۔ آج بھی اس کی قارئین کا ایک بڑا حلقہ ہے اور اس کا شمار بہنوں کے پسندیدہ ترین پرچوں میں ہوتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی کامیابی میں ہماری مصنفین کی محنتوں اور کاوشوں کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی مثبت سوچ اور فکر نے قارئین کی روشن راہوں کی طرف رہنمائی کی اور ان کی تحریروں نے خواتین ڈائجسٹ کو ایک منفرد مقام دیا۔ ہم اپنی مصنفین کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ بہت سی مصنفین ہمارے درمیان نہیں، ان کے لیے دعائے مغفرت۔

ہم اپنی قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جو کامیابی اور کامرانی کے اس سفر میں ہماری ہم قدم رہیں۔ تعریف و توصیف سے ہماری حوصلہ افزائی کی اور خامیوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کی نشان دہی کرکے ہماری اصلاح کی۔

اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ کامیابی اور کامرانی کا سفر اسی طرح جاری رہے۔ خواتین ڈائجسٹ آگے بڑھتا رہے اور ہم پر آپ کا اعتماد اسی طرح قائم رہے۔ آمین۔

نمرہ احمد کا ناول۔ حالم،

نمرہ احمد کا ارادہ تھا کہ وہ سالگرہ نمبر سے نیا ناول شروع کریں گی لیکن کچھ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ان کا ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ان شاء اللہ مئی کے شمارے میں قارئین نمرہ احمد کا ناول "حالم" پڑھ سکیں گی۔

اس شمارے میں،

- دل کی راہ گزر پر۔ نگہت عبداللہ کا مکمل ناول،
- حسن المآب۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول،
- ادا فروش۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول،
- عفت سحر طاہر اور افراح سکندر خان کے ناولٹ،
- عطیہ خالد، منشا محسن علی، قرۃ العین سکندر اور سمیرا عثمان گل کے افسانے،
- آمنہ ریاض کا ناول۔ دشت جنوں،
- پرواز آسمان۔ سالگرہ نمبر کے لیے سمیرا حمید کی تحریر،
- وقت کی رہ گزر پر۔ سائرہ رضا کا مضمون،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ، ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بندگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

وضو نصف ایمان ہے

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"پورا (اچھی طرح) وضو کرنا نصف ایمان ہے اور الحمدللہ سے (اعمال کا) ترازو بھر جاتا ہے اور تسبیح و تکبیر سے آسمان اور زمین پُر ہو جاتے ہیں، نماز نور ہے، زکوٰۃ دلیل ہے، صبر روشنی ہے، قرآن تیرے حق میں یا تیرے خلاف ایک حجت ہے، ہر شخص صبح کو اپنے آپ کو فروخت کرتا ہے، خود کو آزاد کر لیتا ہے یا تباہ کر لیتا ہے۔" (نسائی)

فوائد و مسائل :

1۔ پورا وضو سے مراد وضو کرتے وقت اعضاء کو اس طرح دھونا ہے کہ کوئی حصہ خشک نہ رہ جائے۔ اس مقصد کے لیے توجہ اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ خصوصاً" جب پانی کم ہو یا سردی کی وجہ سے ٹھنڈا پانی استعمال کرنا دشوار ہو یا انسان جلدی میں ہو تو اعضائے وضو پوری طرح نہیں دھوئے جاتے۔ ایسے مواقع پر وضو پوری طرح سنوار کر کرنا یقیناً" ایمان کی علامت ہے۔

صحیح مسلم میں یہ حدیث ان الفاظ سے مروی ہے۔ "پاکیزگی نصف ایمان ہے۔" (حدیث۔223)

اس میں وضو اور غسل کے علاوہ ظاہری نجاست سے جسم اور لباس کو پاک رکھنا بھی شامل ہے۔

2۔ "ترازو" سے مراد اعمال کا وزن کرنے والے ترازو کا نیکیوں کا پلڑا ہے۔ الحمدللہ میں اللہ کی تعریف بھی ہے کہ وہ ان تمام صفات حمیدہ سے متصف ہے، جو اس کی شان کے لائق ہیں بلکہ مخلوقات میں بھی جو قابل تعریف صفات پائی جاتی ہیں، وہ اسی کی دی ہوئی اور اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں، اس لحاظ سے بھی اور ان صفات کی وجہ سے بھی وہی قابل تعریف قرار پاتا ہے۔ چونکہ یہ کلمہ الحمدللہ، اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات کا اظہار ہے اس لیے اس کا مقام اس قدر بلند ہے کہ اگر پورے شعور و احساس کے ساتھ یہ لفظ ادا کیا جائے تو اکیلا ہی نیکیوں کا پلڑا پُر کرنے کے لیے کافی ہے۔ علاوہ ازیں الحمدللہ، اللہ کے لیے شکر کا اظہار بھی ہے۔ جس

میں یہ اقرار بھی شامل ہے کہ ہر نعمت اللہ ہی سے ملی ہے اور یہ اس کا احسان اور فضل ہی ہے لہٰذا مخلوق کو فخرو تکبر کے بجائے شکر و امتنان ہی زیبا ہے، اس لیے الحمدللہ کا لفظ اتنی عظمت کا حامل ہے کہ نیکیوں کے پلڑے کو پُر کردیتا ہے۔

3 ۔ سبحان اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام اوصاف و افعال سے پاک ہے، جو اس کی شان کے لائق نہیں۔

جس طرح الحمدللہ تمام ایجابی اور اثباتی صفات کا جامع ہے۔ ان دونوں کے اجتماع سے اللہ تعالیٰ کی ہمہ پہلو صفات کا اقرار ہوجاتا ہے۔ چنانچہ سبحان اللہ والحمدللہ اتنا عظیم الشان ذکر ہے کہ آسمان سے زمین تک سب پر محیط ہے کیونکہ تمام کائنات میں اللہ کی ان صفات مقدسہ ہی کی کارفرمائی اور ان ہی کا ظہور ہے۔

4 ۔ نماز کو نور قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہ گناہوں سے باز رکھتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے "یقیناً" نماز بے حیائی اور برُے کاموں سے روکتی ہے۔" (سورۃ عنکبوت 29/45)

جس طرح روشنی کی وجہ سے انسان اپنے فائدے اور نقصان کی چیزوں کو معلوم کرلیتا ہے، اسی طرح نماز کی وجہ سے دل میں نیکیوں سے محبت اور گناہوں سے نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔

5۔ زکوٰۃ دلیل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کے ایمان کا دعوا سچا ہے۔ اللہ کی راہ میں خلوص کے ساتھ مال خرچ کرنا تب ہی ممکن ہے اگر دل میں یہ یقین اور ایمان موجود ہو کہ آخرت میں اس کی جزا ملے گی۔ اسی طرح نفلی صدقات بھی قیامت کے دن نجات کا باعث بنیں گے۔

6۔ صبر سے مراد اللہ کی اطاعت اور نیکی پر استقامت بھی ہے اور گناہ کی طرف دعوت دینے والے اسباب اور خواہشات کا مقابلہ کرتے ہوئے تقویٰ اختیار کرنا بھی، اس کے علاوہ دنیا میں پیش آنے والے حادثات و مصائب کے موقع پر جزع و فزع سے پرہیز کرنا اور گناہ کی طرف راغب نہ ہونا بھی صبر میں شامل ہے۔ یہ وصف ایک روشنی کی طرح زندگی کے سفر میں ہر قدم پر رہنمائی کرتا ہے۔ بعض علماء نے صبر کی وضاحت روزے سے کی ہے کیونکہ روزہ بھی گناہ کے جذبات کو مغلوب کرکے دل کو روشن کردیتا ہے۔

7۔ قرآن مجید اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، چنانچہ جو شخص اس کی تلاوت کرتا اور اس پر عمل کرتا ہے، قرآن مجید قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی دے گا۔ جو شخص اس کی پروا نہیں کرے گا اور عمل نہیں کرے گا، قرآن مجید اس کے خلاف گواہی دے گا۔ قرآن مجید کی بعض سورتوں کے، مثلاً" : سورۃ بقرہ اور آل عمران کے بارے میں بھی وارد ہے کہ وہ پڑھنے والے کے حق میں گواہی دیں گی اور شفاعت کریں گی۔ (صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین باب فضل قراءۃ القرآن و سورۃ البقرۃ، حدیث : 804)

8۔ انسان کی نجات کا دارومدار اس کے اعمال پر ہے۔ اس کو حدیث میں ایک مثال کے ذریعے سے واضح کیا گیا ہے۔ ہر شخص کے سامنے صبح کے وقت دونوں راستے کھلے ہوتے ہیں، نیکی کا بھی اور برائی کا بھی اور یہ انسان کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ خود کو اس دین کے لیے اللہ کے ہاتھ فروخت کرتا ہے یا شیطان کے ہاتھ۔ جس نے اللہ کی اطاعت اختیار کرلی اور اس کی پسند کے نیک اعمال کیے، اس نے نجات حاصل کرلی اور جس نے اپنی لگام شیطان کے ہاتھ میں دے دی اور اس کی پسند کے کام کرتا رہا، اس نے خود کو تباہ کرلیا۔

وضو

حضرت عبداللہ صنابحی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص وضو کرتا ہے اور (وضو کرتے ہوئے) کلی کرتا اور ناک میں پانی ڈالتا ہے تو اس کے منہ اور ناک سے گناہ نکل جاتے ہیں، پھر جب چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے گناہ نکل جاتے ہیں حتیٰ کہ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں سے بھی نکل جاتے ہیں۔ پھر جب

اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے گناہ نکل جاتے ہیں' پھر جب سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر سے گناہ نکل جاتے ہیں حتیٰ کہ کانوں میں سے بھی نکل جاتے ہیں۔ پھر جب اپنے پاؤں دھوتا ہے تو اس کے پاؤں سے گناہ نکل جاتے ہیں حتیٰ کہ پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔ پھر اس کی نماز اور اس کا مسجد کی طرف چل کر جانا مزید (درجات میں بلندی کا باعث) ہوتا ہے۔" (نسائی)

فوائد و مسائل :

1۔ جسم سے گناہوں کے نکل جانے کا مطلب گناہوں کی معافی ہے۔

2۔ وضو سے معاف ہونے والے گناہ' صغیرہ گناہ ہیں۔ کبیرہ گناہ صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں یا پھر اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے معاف کردے۔ اس کے علاوہ اگر گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو معافی کے لیے ان حقوق کی ادائیگی ضروری ہے یا صاحب حقوق معاف کردے۔

پپوٹوں اور ناخنوں سے گناہوں کے نکل جانے کا مطلب تمام گناہوں کی معافی ہے۔ گناہوں کو ظاہری میل کچیل سے تشبیہ دی گئی ہے' جسم کے بعض حصوں سے میل کچیل دور کرنے کے لیے زیادہ توجہ کی ضرورت ہوتی ہے' جب یہ بھی صاف ہو گئے تو باقی جسم یقیناً "صاف ستھرا ہو چکا ہے۔

3۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وضو سے تمام صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں کوئی باقی نہیں رہتا۔ واللہ اعلم۔

وضو کا ثواب

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب بندہ وضو کرتا ہے اور اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے گناہ گر جاتے ہیں۔ پھر جب اپنا چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے گناہ گر جاتے ہیں۔ پھر جب اپنے بازو دھوتا ہے اور اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے بازوؤں اور سر سے گناہ گر جاتے ہیں۔ پھر جب اپنے پاؤں دھوتا ہے تو اس کے پاؤں سے گناہ گر جاتے ہیں۔" (مسند احمد)

فوائد و مسائل :

1۔ "گر جانے" سے مراد گناہوں کی معافی ہے۔ جس طرح پانی کے ساتھ ظاہری میل کچیل دور ہو جاتا ہے' اسی طرح وضو کے ساتھ باطنی میل کچیل (گناہوں) کی صفائی ہو جاتی ہے۔

2۔ ہاتھوں کے گناہوں سے مراد وہ غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں جن کا تعلق ہاتھوں سے ہے۔ اسی طرح چہرے کے گناہوں سے مراد نامناسب الفاظ کی ادائیگی' یا ایسی بات سننا جس کا سننا درست نہیں' یا ایسی چیز کی طرف دیکھنا جسے دیکھنا جائز نہیں اور اسی طرح کے دیگر اعمال ہیں۔ اگر وہ معمولی کوتاہی ہے تو صغیرہ گناہ ہے۔ جو وضو سے معاف ہو جائے گا۔ اگر جان بوجھ کر اہتمام سے کیا ہوا عمل ہے تو کبیرہ گناہ ہے۔ جس کے لیے توبہ کی ضرورت ہے۔

پہچان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا (پوچھا) گیا۔

"آپ نے اپنی امت کے جن افراد کو نہیں دیکھا' انہیں (قیامت کے دن) کس طرح پہچانیں گے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ وضو کے نشانات سے پنج کلیان' چتکبرے ہوں گے۔"

فوائد و مسائل

1۔ اس سے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف ظاہر ہوتا ہے کیونکہ وضو کے اثر سے اعضائے وضو کا نورانی ہونا اس امت کا خاص امتیاز ہے۔

2۔ اعضاء کا نورانی ہونا' وضو کا اثر فرمایا گیا ہے۔ گویا بے نماز مسلمان اس امتیازی شرف سے محروم ہوں

گے اور وہ غیر مسلموں سے ممتاز نہیں ہو سکیں گے۔ اس سے بڑھ کر بدنصیبی کیا ہو گی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' امتی ہونے کا دعوا رکھنے والے کسی شخص کو پہچاننے ہی سے انکار کر دیں؟

سنت کے مطابق

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت حمران رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

"میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مقام "مقاعد" پر بیٹھے دیکھا' (وہاں) انہوں نے پانی منگوا کر وضو کیا' پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی مقام پر بیٹھے دیکھا تھا' آپ نے بھی اسی طرح کا وضو کیا تھا جس طرح میں نے یہ وضو کیا ہے' پھر فرمایا تھا۔

"جو شخص میرے اس وضو جیسا وضو کرے گا' اس کے تمام گزشتہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔" اور (اس کے بعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: "اور مغرور نہ ہو جانا۔" (یا "تم دھوکا نہ کھانا۔")

امام ابن ماجہ رحمتہ اللہ نے ہشام بن عمار کے واسطے سے بھی مذکورہ روایت کی مثل بیان کیا۔

فوائد و مسائل:

1۔ مقاعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس یا مسجد کے پاس ایک جگہ تھی جہاں لوگ فارغ اوقات میں مل بیٹھتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو یاد رکھتے تھے۔ ان کے مطابق عمل کرتے اور دوسروں کو اسی طرح کر کے دکھاتے تھے تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آجائیں۔

2۔ تعلیم کا ایک موثر طریقہ یہ بھی ہے کہ استاد خود کام کر کے دکھائے تاکہ شاگرد اسے دیکھ کر اس کے مطابق کرنے کی کوشش کریں۔ خصوصاً" وضو' نماز' حج' عمرہ وغیرہ جیسے عملی مسائل میں یہ طریقہ بہت مفید ہے۔

3۔ "مغرور نہ ہونا" یا "دھوکا نہ کھانا" اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایک عمل کا اتنا زیادہ ثواب دیکھ کر نیکی کے دوسرے اعمال میں کوتاہی نہ کرے۔ یا یہ سوچ کر گناہوں کی جرات نہ کرے کہ کوئی بات نہیں' وضو سے معاف ہو ہی جائیں گے۔ یہ بے خوفی خود ایک گناہ اور دھوکا ہے یا کوئی شخص یہ سوچ کر غرور نہ کرے کہ میرے سب گناہ معاف ہو چکے ہیں اور میں بالکل پاک باز اور پاک دامن ہوں۔

مسواک کا بیان

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز تہجد کے لیے بیدار ہوتے تھے تو مسواک کے ساتھ اپنا منہ صاف کرتے تھے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اسلام میں طہارت اور پاکیزگی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے' اس لیے عبادت کے موقع پر ظاہری صفائی کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ وضو کے ساتھ ساتھ ظاہری صفائی کا ایک ذریعہ مسواک بھی ہے' جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تاکید فرمائی ہے۔

2۔ منہ اور زبان اللہ کے ذکر کا ذریعہ ہیں' لہٰذا اللہ کا نام لینے کے لیے ان کی صفائی کا اہتمام ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کے لیے وضو کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ جس میں منہ کی صفائی کرنے والی دو چیزیں شامل ہیں' یعنی کلی اور مسواک۔

3۔ نیند کی وجہ سے منہ میں ایک بو پیدا ہو جاتی ہے' جس کے ازالے کے لیے بیدار ہونے پر منہ کی صفائی اور مسواک کی ضرورت ہے' خواہ یہ بیداری نفل نماز (تہجد) کے لیے ہو یا فرض نماز (فجر) کے لیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں اپنی امت کو مشقت

میں ڈال دوں گا تو میں انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔"

فوائدو مسائل :

1۔ مشقت میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اس حکم پر عمل کرنا امت کے لیے دشوار ہو گا کیونکہ ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں جب مسواک موجود نہ ہو' یا آسانی سے دستیاب نہ ہو تو لوگوں کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

2۔ حکم دینے کا مطلب ہے ضروری قرار دے دینا کیونکہ استحبابی حکم تو اب بھی موجود ہے لیکن واجب نہیں کہ اس کے بغیر وضو ہی نہ ہو۔

3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے حق میں انتہائی شفیق تھے' اس لیے آپ نے حتی الامکان مشکل احکام نہیں دیے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے بھی یہی دعائیں کرتے رہے کہ مشکل احکام میں نرمی کی جائے جیسا کہ معراج کی رات اللہ تعالی کی بارگاہ میں باربار درخواست فرما کر پچاس نمازوں کے حکم میں تخفیف کروائی۔

وضو سے پہلے مسواک نہیں کی گئی لیکن نماز شروع کرتے وقت مسواک کرلی ہے تو پھر بھی درست ہے۔

اس روایت سے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔

مسواک

حضرت شریح بن ہانی رحمتہ اللہ سے روایت ہے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا۔

"مجھے یہ بتائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب (باہر سے) آپ کے پاس آتے تو سب سے پہلے کیا کرتے تھے؟"

ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں تشریف لاتے تو سب سے پہلے مسواک کرتے تھے۔" (مسلم)

فوائدو مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے اوقات کے علاوہ بھی مسواک کا اہتمام فرماتے تھے۔

2۔ بعض فقہاء نے کچھ ایسی شرطیں لگائی ہیں جو کسی دلیل سے ثابت نہیں' مثلاً": مسواک کا ایک بالشت ہونا یا پانی کے بغیر مسواک نہ کرنا' وغیرہ۔

علاماتِ قیامت کا بیان

قریب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں کو جمع فرمایا۔ (بخاری)

فوائدو مسائل :

1۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں' اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف قیامت ہی باقی ہے۔

2۔ یہ حدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے منافی نہیں کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مبعوث ہوئے تھے۔ آسمان سے ان کا نزول اگرچہ بعد میں ہو گا لیکن اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی نبوت کی بجائے نبوت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مبلغ و داعی ہوں گے اور شریعت محمدیہ ہی کو نافذ و غالب فرمائیں گے۔

3۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ روز بروز بڑھتے ہوئے فتنوں کے دور میں اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے اور جاہلیت کے عقائد و رسوم کو رائج کرنے والوں کے خلاف ہر ممکن کوشش کرے۔



کہ اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

انشاجی

کل بشیر خالد صاحب نے کہا۔ "آج شام میرے ساتھ چلو۔ ایک جگہ کھانا ہے اور گانا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "کھانے میں عُذر نہیں لیکن گانا ہمیں نہیں آتا۔"

بولے۔ "تم سے کون کہہ رہا ہے گانے کو۔ اور لوگ گائیں گے۔"

ہم نے کہا۔ "اچھا لیکن زیادہ پکا اور زیادہ کچا گانا ہم نہیں سن سکتے۔"

"فرمایا بین بین ہوگا۔ اور تہران کے بہت سے پاکستانیوں سے ملاقات بھی ہوجائے گی۔"

خدا جانے کتنی راہوں سے ہوکر ہماری ٹیکسی ایک جگہ رُکی۔ جس گھر میں ہم داخل ہوئے وہاں کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ لوگ صف بہ صف بیٹھے قرآن خوانی کررہے تھے۔ ہم بھی سر پر رومال باندھ تھوتھا منہ بنا بیٹھ گئے اور ایک پارہ پڑھنے لگے۔ اسے ختم کرکے ہم نے خالد صاحب کے کان میں کہا۔

"دیر ہورہی ہے۔ اس گانے والے گھر میں بھی جانا ہے اور یہاں کا آپ نے ہمیں بتایا ہی نہیں تھا۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں ہوں گی مرنے والے میں۔ لیکن وہ غریب الوطن تھا کون؟"

حیران ہوکر بولے "کس کو پوچھ رہے ہو؟"

ہم نے کہا۔ "جس کے ایصال ثواب کا یہ سامان کیا گیا ہے۔"

خالد صاحب نے کہا۔ "خدانخواستہ میاں! تمہارے خیال میں قرآن شریف صرف کسی کی موت پر پڑھنے کی چیز ہے؟"

ہم نے کہا۔ "ہم نے تو اکثر اپنے ہاں یہی دیکھا ہے۔"

بولے۔ "یہاں کے پاکستانی بڑے متدین ہیں۔ مذہب کے پاسدار بلکہ والا و شیدا۔ یہ صادق بٹ صاحب بجن کا یہ گھر ہے۔ مہینے میں ایک بار برکت کے لیے قرآن خوانی ضرور کراتے ہیں۔ احباب کو بلاتے ہیں' کھانا کھلاتے ہیں۔ محبت اور مودّت بڑھتی ہے۔ دل بہلا رہتا ہے اچھا' پارہ پڑھ چکے' اب نماز کے لیے کھڑے ہوجاؤ۔"

"نماز؟" ہم نے کہا۔

بولے۔ "ہاں مغرب کا وقت ہے۔"

ہم نے کہا۔ "ہاں! ہاں۔ بے شک مغرب کا وقت ہے۔ ہمیں خیال ہی نہیں تھا۔ جو نیت امام کی سو ہماری۔ منہ طرف قبلہ شریف۔ اللہ اکبر۔"

اس محفل میں ہمارا مزا تھوڑا سا کرکرا ہوا اور ہم نے بشیر خالد کا مزا کرکرا کیا۔ ایک صاحب حافظ یونس کہیں اپنا قصہ لے بیٹھے کہ اہواز میں ایک ہوٹل میں فروکش ہوئے۔ گرمی کے دن تھے۔ کمرے کو تالا لگا کر سامنے چارپائی ڈال سورہے۔ صبح اٹھے تو اندر جھاڑو پھری ہوئی تھی' تالا اسی طرح لگا ہوا تھا۔ ہوٹل والوں سے شکایت کی تو بولے۔ "نمی دانیم؟" "ہم کیا جانیں" یہ بے چارے اسی سلیپنگ سوٹ میں تہران پہنچے۔۔۔

ان کا قصہ تو تہران بعد میں پہنچا' ہم نے اس سے پہلے اپنی جیب پر ہاتھ رکھا جس میں اپنا زادِ راہ تومانوں کی صورت میں رکھتے تھے۔ کیسہ خالی تھا۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ رقم تو دوسرے کوٹ میں رکھی ہے ہم نے سوٹ بدلا' لیکن جیبوں کی موجودات نہ بدلیں بس پھر کیا تھا۔ دیوانہ راہوئے بس است۔ ہمارا آوارہ گرد ذہن بھی اہواز پہنچا۔ ہوٹل کے بل کا خیال آیا۔ یہ کون ادا کرے گا۔ بشیر خالد نے کہہ تو دیا کہ بابا میں ادا کروں گا چنتا نہ کرو۔ محفل ختم ہونے کے بعد ہوٹل میں جاکر اپنی ہمیانی ٹٹولنا۔۔۔ لیکن دے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است۔

ہم نے حاضرین سے معذرت چاہ' بشیر خالد کو

گھسیٹ، ٹیکسی لے، ہوٹل کا رخ کیا۔ اس دن ہمیں ٹیکسی لینے کا بہت تلخ تجربہ ہوا۔ پورا گھنٹہ سڑک کنارے کھڑے رہے۔ آخر ایک پرائیویٹ ٹیکسی سے استمداد کی۔ ہمارے واپس آنے تک نہ صرف کھانا ہوچکا تھا بلکہ گانا بھی شروع ہوگیا تھا۔ ہم نے میز پر بیٹھ کر کھرچن کھانی شروع کی، لیکن چونکہ اب اپنا مال عرب پیش عرب تھا لہٰذا یکسوئی اور اطمینان سے سننے لگے۔

یہ سرور سیال صاحب تھے۔ عجیب باغ و بہار آدمی ہیں۔ تہران میں شاید کوئی بزنس کرتے ہیں۔ ایک آدھ غزل بھی انہوں نے گائی، لیکن محفل کا رنگ دیگر تھا۔ حاضرین میں اکثر زندہ دلان پنجاب تھے۔ ان کی فرمائش ٹپوں اور بولیوں کے لیے تھی۔

"ہاں تو سرور صاحب! ذرا وہ ہوجائے۔ چٹا ککڑ بنیرے تے۔ نی کاسنی دوپٹے والیے، منڈا عاشق تیرے تے۔"

سچ یہ ہے کہ جس طرح ہندی اور بھاشا شاعری میں زنانہ پن غالب ہے۔ پنجابی لوک شاعری میں مردانہ پن بھرا ہے۔ ایسا کہ پھٹا پڑتا ہے۔ بہرحال اس رات تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا۔ سرور سیال کی آواز اور لوگوں کے قہقہوں اور چہچہوں نے سارے ایرانی محلے کو جگائے رکھا ہوگا۔

مینوں لے دے سلیپر کالے
دے جے توں میری ٹور دیکھنی
(مجھے کالے سلیپر لے دے اگر میری چال دیکھنی ہے)

تینوں لے دیاں سلیپر کالے
نی چاہے میری مجھ وک جائے
(تجھے کالے سلیپر ضرور لے کردوں گا۔ خواہ اس کے لیے میری بھینس کیوں نہ بک جائے)

لڈو ونڈدی کچہریوں نکلاں
جے ڈاکے وچوں یار چھٹ جائے
(میں لڈو بانٹتی ہوئی کچہری سے نکلوں اگر میرا یار ڈاکے کے الزام سے بری ہوجائے)

کتی مرجائے گوانڈنے تیری
نی بوہے کولوں یار موڑیا
(اے پڑوسن، خدا کرے تیری یہ کتیا مرجائے، جس نے دروازے پر آئے ہوئے میرے یار کو لوٹا دیا)

حضرات توجہ! پنجابی شاعر کو دیکھا کہ بھینس کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ آپ اس سے پوچھیں، عقل بڑی کہ بھینس؟ تو یقین سے کہنا مشکل ہے کہ کیا جواب دے گا۔ آپ خود ہی منصفی کرلیجیے۔ عقل والے دربدر ٹھوکر کھاتے دیکھے ہیں۔ بھینس دودھ دیتی ہے۔ جس کے سو فائدے ہیں۔ خود پیجیے، دوسروں کے ہاتھ پانی ڈال کر بیچیے۔ اس کا گوبر بھی بڑی کار آمد چیز ہے۔ بھینس کے آگے موسیقی کے بعض سازوں کی مشق بھی کی جاسکتی ہے۔ عقل کے سامنے ایسی کوئی بات آپ نہیں کرسکتے۔ پڑوسن کی کتیا یا بنیے کی کتیا پنجابی شاعروں کی دلن ہے۔ حضرت بلھے شاہ نے بھی ایک عورت کی زبانی اسے بددعا دی ہے۔ "ایہ کتی مرے کراڑدی جھوڑی چنوں چنوں نت کرے۔" یہ اس لیے کہ اہل دل کے مراد پانے کی راہ میں حارج ہوتی ہے، پڑوسنوں پر بھی پنجابی شاعر اکثر نامہربان رہتا ہے۔ حضرت بلھے شاہ کے اسی گیت میں کتیا کے ساتھ ان کا گھن بھی پس گیا ہے۔ "اور یہ پڑوسنیں بھی اللہ کرے مرجائیں۔ جو نہ مریں ان کو تپ چڑھ جائے تاکہ پابند مسکن ہوجائیں۔ گھر سے باہر نہ نکلیں۔" آخر میں سرور صاحب نے مختلف علاقوں کے لوگوں کی بولیوں کی نقل بھی اتاری۔ مسافر پشاور سے پشتو سنتا اور کانوں میں تیل ڈلواتا چلتا ہے۔ لاہوریوں کی خاص بولی بلکہ بنکار سنتا ہے۔ پھر پٹیالے کی بولی۔ دکی کی کرخنداری زبان، کلکتے کی بنگلہ اور آخر میں مدراس کی اگڑم بگڑم" ہنستے ہنستے لوگوں کی پسلیاں دکھنے لگیں۔ ہم نے گھڑی دیکھی، آدھی رات کا عمل تھا۔ ٹیکسی کی مشکل کا خیال کرکے ہم نے بشیر خالد کو دامن سے کھینچ گھسیٹا اور ہوٹل اٹلانٹک کی راہ لی۔ یہ محفل جانے کب تک جاری رہی ہوگی، بہرحال اس نے بہت سا غبار مسافر کے دل کا دھویا۔ کرم کردی عزیزم زندہ باشی۔

شوہر نے کہا "تم ہمیشہ بھائی کی شادی میں شرکت کی درخواست ہی کیوں یاد کرتی ہو۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔

ساتھ ہی میں نے ایل سی ایم نکالنا بھی سیکھ لیا ہے اور رٹا کے سوال پہاڑے تو پہلے ہی یاد ہو گئے ہیں۔ (اتنی محنت اپنی تھرڈ اور ففتھ کلاس کے لیے کرتی تو ماں باپ کا نام روشن کرتی یا) جب تک یہ خط شائع ہوگا۔ رزلٹ آچکا ہو گا اور میں پاس۔۔۔ میرا مطلب ہے بچے پاس ہو چکے ہوں گے ان شاءاللہ۔

ایسے مشکل حالات میں، جب پرچے موصول ہوں تو جیسے

ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

اپریل خواتین ڈائجسٹ کی سالگرہ کا مہینہ بھی تو ہے۔ واؤ۔۔۔

خواتین کو شائع ہوتے آج 45 برس ہو گئے۔ سوچتی ہوں اگر یہ نہ ہوتا تو ہم بھی نہ ہوتے (اتنے اچھے آپ سب ہی کہتے ہیں ناں۔۔۔ اور میں نے ہم صیغہ



وقت کی رہ گزر پر

سائرہ رضا

"محبت مارچ کا موسم" میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ اس مارچ نے تو مت مار دی ہے۔ جی محبت امتحان بن کر سر پر برس پڑی ہے۔ وہ محبت جو ہر ذی شعور ماں کو اپنے بچے سے ہے۔ اسی محبت کے باعث مجھے ناؤن (Noun) کی ساری ڈیفنیشن یاد ہو گئی ہے اور بھائی کی شادی میں شرکت کی درخواست بھی، (کہ بھائی نے کہا۔ تم اتنے شدومد سے درخواست یاد کر رہی ہو، مطلب بچی کو یاد کروا رہی ہو تو میں تیار ہوں شادی کے لیے بس اپنی بھابھی سے اجازت دلوا دو۔)

بھی اسی لیے استعمال کیا ہے کہ میں تو خیر۔۔۔ مگر دوسرے، بہت سے، بہترین لکھنے والے)

اتنے سالوں میں بڑے اتار چڑھاؤ آئے۔ مگر معیار برقرار رہا۔ (ہلکی پھلکی کمی بیشی کو گننا کم ظرفی ہو جائے گی)

سب کی محنت و دعائیں ہی وجہ رہی ہوں گی۔ مگر یہ بھی کہ اس ادارے کو نئی کھیپ ملتی رہی، لوگ جاتے رہے۔ مگر آتے بھی رہے۔ بہتر اور مزید بہتر، بہترین۔

جہاں پرانے منجھے ہوئے لکھاریوں کی تحریروں کے لیے بے تاب رہتی ہوں' وہیں نئے نام مجھے خوش کر دیتے ہیں۔ پھل اتارنے والے کے ہاتھ میں اگلی فصل کے بیج ہونا ضروری ہیں۔ (سائرہ! بہت خوب صورت جملہ۔)

میں نئے لکھنے والوں کو سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ اور ممکن ہو سکے تو رائے پہنچانے کی کوشش بھی۔۔۔ کیونکہ وہ سب حق رکھتی ہیں کہ آغاز سفر میں قاری ان کے ہم قدم ہو اور رائے دے کر منزل کے تعین میں مددگار ثابت ہو۔

مصباح علی سید کی آمد۔۔۔ مجھے یوں لگا' جیسے ایک صبح آپ اٹھیں اور آپ کے آنگن میں ایک خوشبودار بوٹی اگی ہو اور دیکھتے ہی دیکھتے دیوار پر چڑھے اور سارے گھر کو ڈھانپ لے۔ ساری فضا معطر ہو گئی۔ ایک کہانی انہوں نے کرن میں کسی انجینئر لڑکی کی لکھی تھی۔ جس نے مجھے چونکایا۔ اور پھر ایک ابھی حال ہی میں قیام پاکستان کے پس منظر میں۔۔۔ تب میں فخر سے سب کو کہتی پھری' دیکھا میں نہ کہتی تھی۔ سو ایک نئی نکور رائٹر سب کو مبارک ہو۔

مجھے منشا محسن کی تحریر بھی پسند آئی ہے۔ ایک سیدھی روایتی سی کہانی مگر پیش کرنے کا انداز خوب تھا۔ دراصل مجھے کوئی بھی ایک بات اچھی لگ جاتی ہے۔

جب ہالہ نے باپ کا ڈنڈا پکڑا اور گلی میں بجاتی پھری۔

راتوں کو جاگتے رہو' کی صدائیں آپ نے بھی سنی ہوں گی۔ مگر جس نظر سے رائٹر نے اس چیز کو دیکھا تو یہی اصل خوبی ہے۔ باپ گلی میں جاگتے رہو کی آوازیں لگا رہا ہے اور بیٹی لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھی نوٹس بنا رہی ہے۔ بہت پیارا سا تصور بندھ گیا۔

ایمل رضا نے ایسے جگہ بنائی جیسے چھوٹا بچہ بڑوں کی ٹانگوں کے بیچوں بیچ چپکے سے جگہ بناتا سب سے آگے جا کھڑا ہوتا ہے۔ پیال ساز مجھے اچھی لگی پھر انہوں نے میں' محبت اور تم لکھی۔ میں نے ایمل کو فون کر کے کہا کہ وہ پیال ساز جیسی چیزیں ضرور لکھیں۔ مگر ایسی ہلکی پھلکی تحریر لازمی لکھنی ہے۔

ایک ناول ڈارک' ایک لائٹ ۔۔۔ فلیور ملے گا ریڈرز کو۔۔۔ ان کے افسانے بھی کمال ہوتے ہیں۔ خوب صورت استعاروں و تشبیہات سے مزین۔

میں' محبت اور تم کو پڑھ کر میں اتنا ہنسی کہ آنکھوں میں پانی آگیا۔ بہت مزے دار؟

سمیرا اگرچہ نئے لکھنے والوں میں شامل نہیں لیکن پھر بھی چند سطریں ان کے لیے۔

سمیرا کا قلم میری تعریف کا محتاج نہیں رہا۔ ماشاء اللہ۔۔۔ بہت خوب۔ وہ جتنا اچھا لکھ رہی ہیں۔ میں اتنی اچھی تعریف نہیں لکھ سکتی۔ اللہ قلم کو جلا بخشے۔

فرزانہ کھرل نے چھپا کے چھپی بڑا مزے کا ناول لکھا۔ اس سے پہلے سبحان نامی ہیرو والی بہت پیاری تحریر لکھ چکی ہیں۔ ان کا نام ہو تو میں الرٹ ہو جاتی ہوں۔

نبیلہ رمضان کی مرگ وفا اچھی تحریر تھی۔ خصوصاً" جس ماحول کو انہوں نے چنا اور مصنوعی پن محسوس نہ ہونے دیا۔ یہ اچھی بات تھی۔

بنت سحر' ہاجرہ ریحان اور عطیہ خالد کا نام بھی میں اب پہچاننے لگی ہوں۔

وجیہہ احمد کی تحریر کا نام بہت پیارا لگا "کمہاری کا گھر" پھر کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ شازیہ الطاف ہاشمی کے افسانے بھی متاثر کر رہے ہیں۔

سو نئے لکھنے والے ہمیشہ سے میری توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ جیسے میں کچھ ڈسکور کر رہی ہوں اور بعد میں مجھے اپنے اندازے درست ثابت ہونے کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ "دیکھا میں نے کہا تھا ناں۔" یعنی میں بھی دیدہ بینا رکھتی ہوں۔

ڈائجسٹ کے طویل کامیاب سفر میں امثل کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہو گی۔ میں انہیں بادشاہ گر کہتی ہوں۔ آج کے تمام بڑے بڑے ناموں کی پہلی کچی پکی تحریر

انہی کی عقابی نگاہوں سے گزری اور انہوں نے ہیرے کو پہچان لیا۔ سو امتل کو ہم جوہری بھی کہہ سکتے ہیں۔

اور خبردار امتل جو آپ نے ان لائنز کو کاٹا۔۔۔

ذکر پھر اس خوب صورت شام۔۔۔ بلکہ رات کا بھی ہونا چاہیے' جب رفعت ناہید سجاد کے اعزاز میں دیے ڈنر میں شرکت کی اور بہت بڑے بڑے رائٹرز کے بیچ مجھ ناچیز کو بھی مدعو کیا گیا۔ سائرہ غلام نبی' ریحانہ علی احمد' فریدہ اشفاق۔۔۔ ڈنر شاندار تھا۔ اور میری پلیٹ میں آنے والا کوفتہ واقعی خاصا بڑا تھا۔ رفعت ناہید کے سامنے مجھے اپنا آپ ایک نالائق شاگرد سے بڑھ کر کچھ نہ لگا۔ (اس پہ مستزاد مجھے جگہ بھی ان ہی کے صوفے پر ملی)

سو میں دم سادھ کر بیٹھی رہی۔ یہ ایک خوب صورت ملاقات تھی۔

جس میں ساگ کے گھوٹنے سے بات شروع ہو کر دائیں بازو اور بائیں بازو کے نظریات تک کو چھو آئی۔

ہم سب نے یونی ورسٹی روڈ کا حال دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا ہم ایم اے کر چکے' ورنہ اس سڑک پر کون روز آتا (بھلے چین بھیج دو مگر یونی۔۔۔ توبہ توبہ)

خط کے آغاز میں' میں نے امتحانات کا ذکر کیا تھا۔ تو کیسے ہو سکتا ہے کہ میں حسن المآب کو بھول جاؤں۔

آج کل سانس لینے کے بعد بس ایک ہی کام کرتی ہوں۔ عالم یہ ہے کہ اپنی بیٹی کو پکاروں تو منہ سے حسنل نکل جاتا ہے۔

صبح حسنل شام حسنل' روشن تیرا نام حسنل۔

حسن المآب کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

مگر چند ضروری باتیں۔۔۔

سات سال قبل یونہی بیٹھے بیٹھے میں نے ماہ رو اور حسنل کا کالج والا سین لکھا تھا۔

"آج کیا تاریخ ہے' آج تیرہ تاریخ ہے اور اس جواب کو میں تمہیں اردو' انگلش اور سندھی تک میں دے سکتی ہوں۔"

بچی کی حساب کی خانوں والی کاپی کے صفحے پر آگے پیچھے لکھا یہ باب اس کہانی کا آغاز تھا۔ جبکہ کہانی کا مرکزی خیال میرے دماغ میں اس وقت آیا جب سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی اور اسلامک اسٹڈیز کی کلاس میں سورۃ البقرہ کو ترجمے اور تفسیر سے پڑھتی تھی۔

حسنل کا کردار اسی وقت سے میرے ساتھ رہنے لگا تھا۔ اور جب جب میں نے سورۃ البقرہ پڑھی۔ مجھے حسنل یاد آ گئی۔

مجھے قسط وار لکھنے کا تجربہ نہیں اور بہت گھبراہٹ ہوتی ہے کہ میں نہیں کر سکوں گی۔ مگر آپ سب کی دعاؤں سے نو اقساط لکھ چکی ہوں۔

آپ کی رائے۔۔۔ میں شدت سے اس کی منتظر رہتی ہوں۔ (تعریف ہو یا تنقید۔۔۔ مگر ہو۔۔۔) گلہ ان قارئین سے بھی ہے جو اکٹھا کر کے پڑھیں گی۔

یہ صحیح نہیں ہے دوستو۔۔۔ آپ کی رائے سے کہانی کا قبلہ درست ہوتا ہے۔ سمجھیں طاقت کا سیرپ پی لیا۔

ایک حسرت اکثر دل مسوستی ہے۔ کاش میری کہانیاں محمود ریاض پڑھتے۔ میں نہیں جانتی پرچہ نکالتے وقت انہوں نے کامیابی کی حد کہاں تک رکھی ہوگی۔ مگر یہ سب نے دیکھ لیا۔ ان کے پرچوں نے آسمان کو چھو لیا۔

اور دیگر اس معیار تک پہنچنے کا خواب دیکھتے ہیں۔

اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ہمارے لیے راستہ بنا گئے خار ہٹا دیے۔ پتھر چن دیے' بہت شکریہ' بڑی کرم نوازی۔

"ان کے جانے کے بعد آذر ریاض نے ان کے کام کو بہت خوب صورتی سے سنبھالا اور اس کے معیار میں فرق نہیں آنے دیا۔" شکریہ آذر ریاض صاحب

سائرہ رضا' کراچی

پروازِ آسمان

سمیرا حمید



سولہویں صدی کے عظیم شاعر محمد فوضولی کی چھوٹی بہن فیروزے کوہ قاف کے پہاڑوں پر اڑ کر جنت کی عملی تفسیر دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ کاروان کے ساتھ اپنی سرزمین سے نکل کر ہر سرزمین کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ وہ کئی سالوں سے چھپ چھپ کر شاعری کی زبان میں قصہ گوئی کرتی ہے۔ اپنے بھائی محمد فوضولی کی طرح کتابوں کو بغل میں دبا کر، شہر کی گلیوں سے ہو کر، وہ مدرسے میں کیمیاء اور تفسیر پڑھنا چاہتی ہے تاکہ وہ بھی عظیم شاعرہ بن سکے.... تاکہ وہ بھی "محمد فوضولی" بن سکے۔

لیکن وہ یہ سب نہیں کر سکی.... کیونکہ وہ "فیروزے" تھی محمد فوضولی نہیں۔

اہلف کی خیالی فیروزے قلم کار بننے سے پہلے ہی مرجاتی ہے۔ کیونکہ جب "قلم" عورت کے ہاتھ میں دینے کی بات ہوتی ہے تو دنیا سکڑ جاتی ہے۔ فلسفے ٹھہرا لیے جاتے ہیں.... عقل پر ماتم کیا جاتا ہے.... قلم چھین لیا جاتا ہے۔ ورنہ اس پر سوال اٹھایا جاتا ہے یا اسے "پابند" کروایا جاتا ہے۔

عورت کے قلم کار ہونے پر بڑا واویلا ہوتا رہا ہے۔

"عورت کیسے لکھ سکتی ہے؟ وہ قصہ گو کیونکر بن سکتی ہے؟ تاریخ لکھنے والے تاریخ دان گواہ ہیں، وہ سب مرد تھے کیونکہ عورت کی نہ یادداشت پر یقین رکھا گیا، نہ پرکھ پر، نہ قلم اور نہ عقل پر۔ اسے لکھ لکھ کر یا چھپانا ہے۔ یا دل میں، روح میں دفنانا ہے۔ وہ گھر میں اپنے بعد اپنی تحریر کے لیے کونے کھدرے ڈھونڈے گی یا اس سیاہی کو خون کے آنسوؤں میں بہا دے گی۔

عورت کو قلم کار کیوں کر بننا ہے؟

میرا یقین کیجیے صرف ایک صدی پہلے تک دنیا بھر کی عورتوں نے یہی کیا ہے۔ نصف صدی پہلے تک ہندوستان کی مسلمان عورتوں پر بھی یہی بیتا ہے.... چار عشرے پیشتر پاکستان کی عورت نے بھی یہی بھگتا ہے.... لیکن اب یہ قلم عیاں ہے.... ظاہر ہے.... آزاد ہے.... اپنی راہ پر ہے۔

ہر عورت قلم کار کو.... خواتین ڈائجسٹ میسر ہے۔

کارواں کے سنگ اس سرزمین سے ہر سرزمین تک جانے کی خواہش مند کو پڑھنے کے لیے یہ "ہزار داستان" میسر ہے۔

"میں شیطان ہوں.... میں اپنی ماں کی کہانیاں سن کر انسان بنا ہوں۔"

مردوں کے لکھنے کی روایت اتنی زیادہ معتبر تھی اور عورت "اتنی غیر مدبر" تھی کہ عورت کو کہانی کار مان لینا کسی لعنت سے کم نہیں لگتا تھا۔ مغرب میں کتنی ہی

عورتوں نے مردوں کے ناموں سے لکھا۔ وہاں عورت کے نام کی کتاب نہیں بکتی تھی۔ ہندوستان میں بنت فلاں' زوجہ فلاں' والدہ فلاں' کے نام سے لکھا جاتا رہا۔ باپردہ خواتین کتابوں کو حسرت سے دیکھا کرتی تھیں کجا ان کتابوں کا خالق بننا۔ کتنی ہی فیروزے مشرق و مغرب میں دم توڑ گئیں۔ کتنے ہی لفظ' کہانیاں بن کر تخلیق نہ ہو سکے۔ کتنے ہی قلم سیاہ ہو کر بھی خشک ہی رہے.....

اور کتنے ہی قلم سیاہ ہی رہتے..... اگر تاریخ' وقت' زمانوں کے اس تسلسل کو پاکستان میں "خواتین ڈائجسٹ" نے نہ توڑا ہوتا۔

عصمت چغتائی ایک جگہ لکھتی ہیں کہ فلاں محل کی ایک باپردہ عورت نے باہر سے اندر آنے والے ایک معمولی سے رقعے کو بڑے شوق سے پڑھا۔ یعنی کچھ بھی پڑھنے کی چاہ اتنی شدید تھی کہ پڑھنے کے لیے رقعہ بھی مقبول رہا۔

کہانی سننا انسان کی ضرورت ہے نہ مجبوری۔ یہ کوئی آسائش ہے نہ کوئی فرمائش۔ کہانی سانس لیتا ایک ایسا انسان ہے جس سے ہر انسان ملنا چاہتا ہے۔ تھوڑا خود کو پا کر' کچھ دوسرے کو ڈھونڈ کر..... کہانی..... یہ ایسی سرزمین ہے' جس کے ہم سب باشندے ہیں۔

پاکستان میں اس سرزمین کا نام "خواتین ڈائجسٹ" ہے۔

مرد نے معاشرے کے جنگل میں نکل کر ہر نسل کے جانور کی تشریح کی۔ عورت نے جنگل کی بستی میں' کھڑکی کے پاس بیٹھ کر' کھڑکی کے اندر کے ہر جذبے کی نمائندگی کی۔ تھوڑا آزاد ہو کر' زیادہ پابند رہ کر' کچھ شہزادے' کچھ شہزادیاں ان کے قلم کی نوک پر بھی آئے۔ کچھ راز قصوں کی زبانی' کچھ فریادیں کہانیوں کی طرح' کچھ دکھ' جھوٹ میں سچ کی طرح' کچھ سسکیاں اور آہیں' بہت سی گھٹن بیان کرنے کا موقع انہیں بھی ملا۔

ایک پرچہ..... ایک جہاں..... انہیں بھی میسر ہوا۔

نورالہدیٰ شاہ کہتی ہیں کہ

"عورت پورا سوچتی اور آدھا لکھتی ہے۔"

خواتین ڈائجسٹ کے قبیلے کی عورت نے جتنا سوچا' اس سے زیادہ ہی لکھ ڈالا۔ ایک بیٹی' ایک ماں' بیوی اور بہن کی پوری سوچ۔ کچھ محرم بن کر' کچھ نامحرم ہو کر۔ جذبات جو صرف ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے' اسے لکھنے کا موقع بھی انہیں پورا پورا ہی دیا گیا۔

میں جب جب ان وقتوں پر غور کرتی ہوں' جب خواتین ڈائجسٹ نکالنے کے بارے میں سوچا جا رہا تھا تو میں صرف ایک اس بات پر حیران ہوتی ہوں کہ جس ملک میں آٹے میں نمک کے برابر بھی خواتین قلم کار موجود نہیں تھیں۔ وہاں خالصتاً" ایک "خواتین" ڈائجسٹ نکالنے کا خیال کیسے آیا۔ جس ملک میں ادب کا حلقہ سارے کا سارا ہی مردوں کی دسترس میں تھا وہاں عورتوں کو "لکھنے" کی باگ ڈور پکڑانے کے بارے سوچ کیسے لیا گیا؟

اگر یہ خواب تھا تو بہت ہی جرأت مندانہ تھا..... اگر یہ ایک خواہش تھی تو بہت ہی انقلابی خواہش تھی.....

بل گیٹس کہتا ہے کہ

"جو لوگ بڑے رسک نہیں لیتے وہ بڑے فائدے سے بھی محروم رہتے ہیں۔"

محمود ریاض صاحب نے بلاشبہ دیوانے کے اس خواب کے ساتھ' ایک بڑا رسک لیا۔ جس کی تعبیر صرف بڑے نہیں' بہت عظیم فائدے کی صورت میں نکلی۔

نیپال کی سرحد کے قریب ایک انڈین گاؤں کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن سے کچھ تصویریں مجھے بھیجی گئیں۔ یہ تصویریں اس اسٹال پر موجود خواتین ڈائجسٹ اور شعاع ڈائجسٹ کی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ یہاں بہت مقبول ہے اور بہت زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ (انڈیا میں ان کی ہو بہو کاپی شائع کی جاتی ہے۔ اکثر تو ٹائٹل تک نہیں بدلتے)

میں یہ تو جانتی تھی کہ انڈیا میں یہ ڈائجسٹ پڑھا جاتا

ہے' مجھے یہ گمان تک نہیں تھا کہ اتنے چھوٹے سے سرحدی گاؤں میں بھی پڑھا جا رہا ہوگا۔

"خواتین ڈائجسٹ کیا ہے؟" ایک بار مجھ سے پوچھا گیا۔

"یہ پاکستان کے طول و عرض میں موجود ہر قاری کا وہ کلام ہے جو ان سے ان ہی کی زبان میں' ان ہی کے احساسات میں ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ ان کے جذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے لیے کچھ درس کا' کچھ فن کا' کچھ دریافت اور زیادہ مثبت خیالات کا موجب بنتا ہے۔"

"اس ڈائجسٹ میں آنے والی کہانیوں کو آپ کس گنتی میں شمار کرتی ہیں؟"

"گنتی میں نہ مقدار میں۔۔۔ افکار میں۔۔۔"

"اس ڈائجسٹ کا اردو ادب میں کتنا حصہ ہے؟"

"اس کا ہر قاری کی مثبت تعمیری سوچ میں پورا پورا حصہ ہے۔"

"اس کی کوئی ایک کہانی جو عالمی معیار کی ہو؟"

"عالمی کہانیوں میں وہ معیار ہے جو ایک دیہاتی' کم پڑھی لکھی' عام سمجھ بوجھ کی عورت کو اپنی بات سمجھا سکے۔ کچھ امید سے' کچھ تسلی سے' کچھ خوش آئند وقت کی نوید سے اسے ڈھارس دے سکے؟ بالشت بھر کی درز سے انہیں پورا آسمان دکھا سکے؟"

"تو آپ پاپولر فکشن کے حق میں ہیں؟"

"میں ہر اس کہانی کے حق میں ہوں جو اندھیرے میں جگنو بنے۔ جو معاشرے کو دیمک زدہ ہونے سے محفوظ رکھے۔"

خواتین ڈائجسٹ نے ہر قاری کو محظوظ بھی کیا اور محفوظ بھی رکھا۔

معاشرے میں بدلاؤ کبھی بھی ایک دم سے نہیں ہوتا۔ انقلاب بھی آتے آتے تین نسلوں کی بنیاد اور دو نسلوں کی جان لے لیتے ہیں۔ ایک پرچے سے "درزوں' کونوں کھدروں' گھٹن زدہ ماحول کو آسمان بنتے بنتے بھی وقت لگا۔ لکھنے والوں کی محنت' چھاپنے والوں کی ایمان داری' اصول پسندی نے خوب رنگ جمائے۔ آج آپ بک فیئر' بک شاپس میں جاتے ہیں تو سب سے آگے ادارہ خواتین کی رائٹرز کی کتابیں رکھی ہیں۔ آپ کوئی سا بھی ٹی وی چینل لگالیں' اس سے ادارے کی رائٹر کا ڈراما چل رہا ہوگا۔

پرچے کے صفحوں میں مقید تحریریں' ٹی وی اسکرین کے ذریعے گھر گھر دیکھی جا رہی ہیں۔ کسی بھی ادارے کی اتنی بڑی کامیابی معمولی ہرگز نہیں ہے۔

کروڑوں کی آبادی کے اس ملک میں جس میں کتب بینی نہ ہونے کے برابر ہے اسے "کہانیاں" پڑھنے پر مائل کر دینا کسی معرکے سے کم نہیں۔ جسے پڑھنے والوں کی بڑی تعداد مشکل سے چار پانچ جماعتیں بھی پاس نہیں' انہیں کمال فن سے جہان فن سے متعارف کروا دینا کسی علمی انقلاب سے کم نہیں۔ خواتین ڈائجسٹ ایک ایسا پرچا ہے' جس نے لاکھوں عورتوں کو وہ کھڑکیاں دی ہیں جو ان پر بند تھیں۔

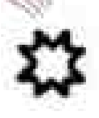
محمد فوضولی کی بہن فیروزے کے ہاتھ میں اب قلم ہے۔۔۔ کہانی ہے۔۔۔ کوہ قاف ہے۔۔۔

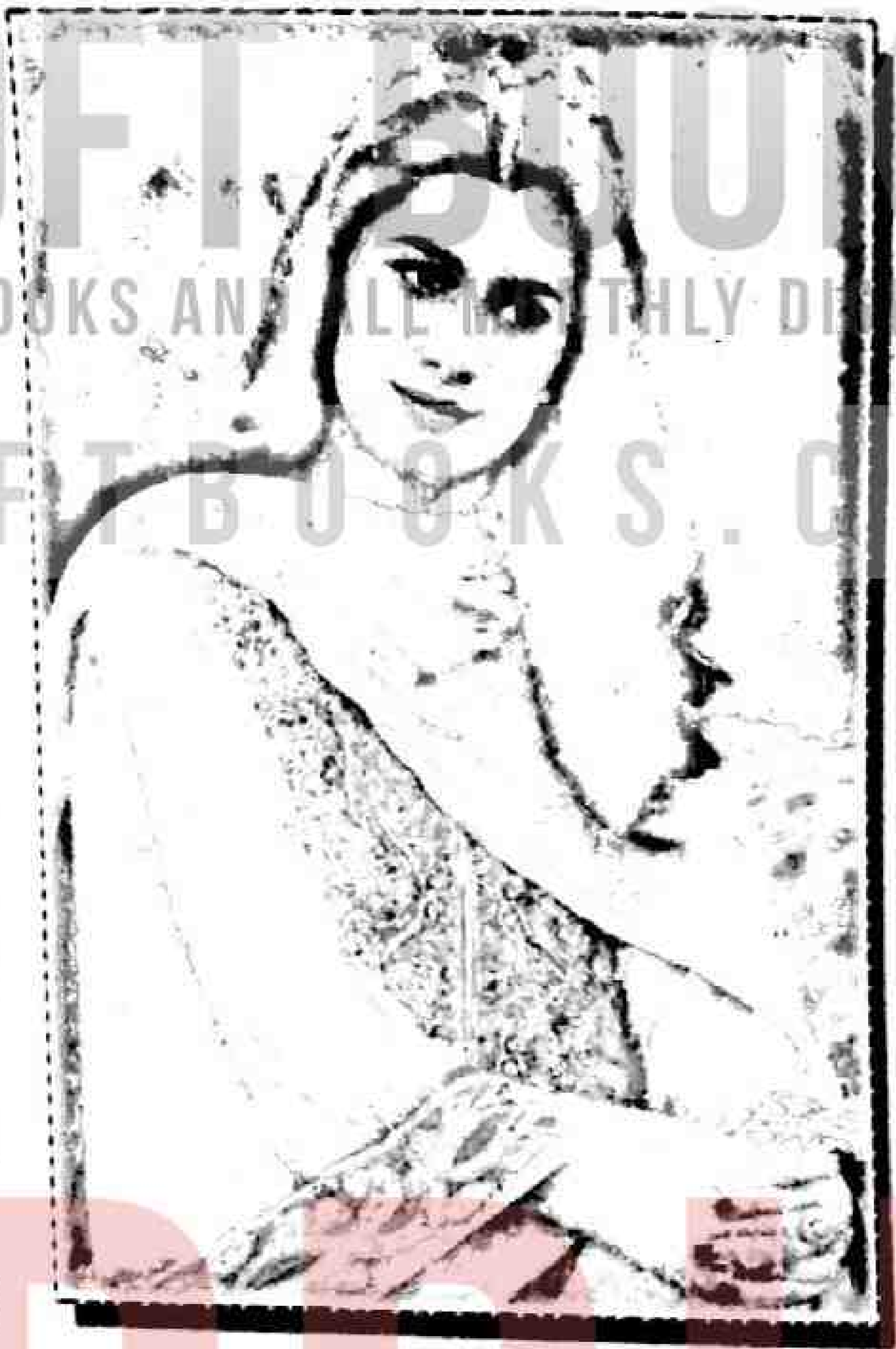
"شیکسپیئر کی ایک بہن تھی جو ایک بھی لفظ لکھے بغیر مر چکی ہے۔ وہ آپ میں اور مجھ میں زندہ ہے اور بہت سی دوسری عورتوں میں۔ جو آج یہاں موجود نہیں ہیں کیونکہ وہ گھروں میں برتن دھو رہی ہیں اور بچوں کو سلا رہی ہیں لیکن وہ زندہ ہیں کیونکہ عظیم لکھاری کبھی نہیں مرتے۔ ان کی آمد جاری ہے لیکن ضرورت ہے تو بس اس امر کی کہ انہیں لکھنے کا موقع دیا جائے۔" (ورجینا وولف)

مجھے تو اپنا نام بھی ٹھیک سے لکھنا نہیں آتا تھا اور اس ادارے نے میرے نام کو سجا سنوار کر بہت اہتمام سے لکھ دیا۔ ہر رائٹر کے نام کو' ہر کہانی کو خاص جانا۔

ہر قاری کو اہم سمجھا۔ "قابلیت" اس ادارے کی بس یہی ایک شرط ہے۔ اس شرط کے پیمانے پر پورا اترنے والوں کو ہمیشہ آگے رکھا۔

خواتین ڈائجسٹ اور امتل میرے لیے ایک ایسا آسمان ہیں جس پر ہم سب کی کہانیوں کے پرندے آزادی سے پرواز کرتے ہیں۔





سنگِ مرمر کی ہانیہ

باتیں کبریٰ فاطمہ خان سے

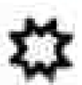
شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"کبریٰ فاطمہ خان۔"
2 "پیار کا نام؟"
"پیار کے بہت سے نام ہیں۔ لیکن زیادہ تر لوگ کبریٰ ہی کہتے ہیں۔"
3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"16 جون 1996ء / ملتان۔"
4 "بہن بھائی؟"
"میری دو بہنیں ہیں۔"
5 "مادری زبان؟"
"اردو ہی ہے۔ گھر میں اردو اور انگریزی ہی بولتے ہیں۔ ہوں لیکن پہلے سے بھی بہت کچھ آتا ہے۔
بنیادی طور پر ہم پٹھان ہیں۔"
6 "قد بغیر ہیل کے؟"
"کبھی ناپا نہیں۔"
7 "پروفیشن؟"
"فی الحال تو شوبز ہی میرا پروفیشن ہے۔"
8 "شادی؟"
"ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔"
9 "شوبز میں آمد؟"
"میں لندن میں ہی تھی جب 2013ء میں، میں نے شوبز جوائن کیا اور اپنے ٹیلنٹ سے ہی اس فیلڈ میں آئی۔ بہ حیثیت فیشن ماڈل کے اپنے کیریر کا آغاز کیا۔"
10 "پہلا ڈرامہ / شہرت؟"
"سنگ مرمر اور شہرت بھی اسی ڈرامے سے ملی۔"
11 "پہلی کمائی؟"
"یہ نہیں بتاؤں گی... لیکن پھر بھی اچھے ملے تھے۔"
12 "صبح کب بیدار ہوتی ہیں؟"
"جب کام ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں، ورنہ تھوڑی دیر میں۔"
13 "آپ کا مستقل قیام؟"
"یو کے... لندن... ریکارڈنگ کے لیے آتی ہوں پھر چلی جاتی ہوں۔"
14 "صبح کا ناشتہ؟"
"مجھے انڈا پراٹھا بہت پسند ہے اور چائے دو کپ ہونے ضروری ہیں اور ساتھ بسکٹ وغیرہ بھی۔"
15 "اپنا ناشتہ خود بناتی ہیں؟"
"جی... خود ہی بناتی ہوں۔ آج کل کوکنگ سیکھ رہی

16 "پاکستان میں کس بات نے متاثر کیا؟"
"پاکستان کی ہر چیز متاثر کرتی ہے۔ اچھا لگا یہاں آکر۔"
17 "ایک کھانا جو روزانہ کھانا پڑے تو کھا سکتی ہیں کون سا ہو گا؟"
"آلو گوشت۔"
18 "اپنے آپ میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"مجھے اللہ تعالیٰ نے بہت اچھا بنایا ہے اگر تھوڑا اور لمبا بنا دیتا تو اچھا تھا۔"
19 "بھوک کو کم کرنے کے لیے کیا کھاتی ہیں؟"
"مجھے بھوک کم لگتی ہے اور کام کے دوران تو بالکل بھی نہیں لگتی' اس لیے برابر کھانا ہی کھاتی ہوں۔"
20 "فخر کب ہوتا ہے؟"
"آج کل بہت فخر ہوتا ہے۔ جب لوگ میری تعریف کرتے ہیں۔"
21 "تھکن میں بھی چلی جاتی ہوں؟"
"پیزا کھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہوں۔"
22 "خوشی میں رد عمل؟"
"خوشی میں روتی ہوں... حالانکہ مجھے رونا نہیں آتا مگر خوشی میں آنسو نہیں رکتے۔"
23 "بچپن کی بری عادت 'جو ابھی بھی ہے؟"
"چاکلیٹ کھاتی ہوں۔ میٹھا بہت پسند ہے۔"
24 "ضدی ہیں؟"
"نہیں۔ اچھی انسان ہوں' ضد کر کے تنگ نہیں کرتی۔"
25 "سائنس کی کار آمد ایجاد؟"
"ہر طرح کی کمیونیکشن۔"
26 "سات دنوں میں پسندیدہ دن؟"
"پہلے ہفتہ اچھا لگتا تھا اب جس دن آف ہو' وہ دن اچھا لگتا ہے۔"
27 "پسندیدہ مہینہ؟"
"دسمبر۔"
28 "غصہ آتا ہے؟"
"نہیں... کبھی کبھار آتا ہے اور کم ہی آتا ہے پھر بھی"
29 "رد عمل؟"
"کوئی Extreme (انتہائی) بات ہو جائے تو پھر اندر سے پٹھان نکل آتا ہے۔"
30 "لڑکوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"جب وہ عزت دیتے ہیں... پیار دیں۔"
31 "کیا بات بری لگتی ہے؟"
"ان کا سخت مزاج ہونا یا غصہ دکھانا۔"
33 "گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟"
"کسی کا نہیں' سب نرم مزاج اور ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔"
35 "پسندیدہ ملک؟"
"یو کے... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اب گھر سے دور رہنے لگی ہوں کام کی وجہ سے اور مجھے "کوریا" بہت پسند ہے۔"
36 "انسان کا دنیا میں آنے کا مقصد؟"
"یہ کب پتا چلتا ہے۔ اگر انسان کو اپنے دنیا میں آنے کا مقصد سمجھ میں آجائے تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہو گی۔"
37 "پیسہ ہاتھ کھینچ کر خرچ کرتی ہیں؟"
"نہیں۔ پیسہ خرچ کرتے وقت زیادہ نہیں سوچتی ویسے سچ پوچھیں تو ہم اتنے مصروف رہتے ہیں کہ پیسہ خرچ کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔"
38 "شاپنگ میں پہلی ترجیح؟"
"مجھے میک اپ کرنے کا بہت شوق ہے۔ اگرچہ زیادہ میک اپ نہیں کرتی مگر پھر بھی خریدتی ہوں' کتنا ہی میک اپ خریدنے کے بعد بھی ایسے ہی پڑا ہوا ہے۔"
39 "کرائسس میں وقت گزرا؟"
"بالکل گزرا... مگر بچپن میں نہیں بلکہ بڑے ہو کر اور اچھا خاصا وقت گزارا۔"
40 "کس بات سے موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"
"ویڈیو گیم کھیل لیتی ہوں... فرینڈز سے باتیں کر کے موڈ اچھا ہو جاتا ہے اور چاکلیٹ کھا کر میرا موڈ بہت اچھا ہو جاتا ہے۔"

42 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"آرکیٹیکٹ۔۔۔Architect۔"
43 "الارم بجتے ہی اٹھ جاتی ہیں؟"
"کہیں جانا ہو تو الارم بجتے ہی اٹھ جاتی ہوں۔ ورنہ الارم بند کر دیتی ہوں۔"
44 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"
"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی خاص پیمانہ نہیں ہوتا۔"
45 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"گھر پہ۔"
46 "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"
"محبت کو آزمانا نہیں چاہیے۔"
47 "مرد حسین ہو یا ذہین؟"
"نرم دل ہونا چاہیے۔"
48 "گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"
49 "ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"
"ایک آرٹسٹ تھے جو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے ساتھ کام کرنے کی خواہش تھی۔"
50 "کیا ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"فیملی کے اور کچھ فرینڈز ہیں ان کو فوراً جواب دیتی ہوں۔"
51 "بوریت کو دور کس طرح کرتی ہیں؟"
"ویڈیو گیم کھیل کے۔"
52 "ایک رول جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟"
"معذوری کا رول۔۔۔ خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہو۔ مگر پاگل کا رول بھی کرنا چاہوں گی۔"
53 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"بہت بار۔۔۔ بہت بار۔"
54 "آپ کے بیگ کی تلاشی لیں تو؟"
"ہیڈ فون، والٹ، چاکلیٹ، تسبیح اور کچھ دیگر چیزیں آپ کو ملیں گی۔"
55 "مذہب سے لگاؤ؟"
"الحمد للہ لگاؤ ہے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتی ہوں اور اگر نہ پڑھ سکوں تو قضا پڑھ لیتی ہوں۔"
56 "اگر پاکستان میں کوئی عہدہ مل جائے؟"
"ٹین ایجز نوجوان نسل کو نہ صرف اعلا تعلیم کے لیے راستے ہموار کروں گی بلکہ کسی کام سے بھی لگاؤں گی اور روڈ پر بھیک مانگنے والے بچوں کو اسکول داخل کرواؤں گی۔"
57 "کیا کچھ جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"کچھ خاص نہیں۔"
58 "نصیحت بری لگتی ہے؟"
"بری نہیں لگتی۔ میں ہر نصیحت کو پوزیٹو انداز میں لیتی ہوں۔"
59 "روک ٹوک کیسی لگتی ہے؟"
"بری نہیں لگتی۔ کیونکہ کوئی ہماری بہتری کے لیے ہی روکتا ٹوکتا ہے۔"
60 "وقت کی پابندی کرنی چاہیے؟"
"بالکل کرنی چاہیے اور میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ وقت کی پابندی کروں۔"
61 "کن لوگوں پر بہت خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے؟"
"فیملی پر اور اپنی بھانجی پر۔"
62 "نئی ٹیکنالوجی سے لگاؤ؟"
"بہت زیادہ ہے اور عموماً جدید ایجادات سے فائدہ اٹھاتی ہوں۔ لیپ ٹاپ، نئے موبائل اور دیگر چیزیں خریدتی رہتی ہوں۔"
63 "کھانا چھری کانٹے سے کھاتی ہیں یا ہاتھ سے؟"
"منحصر ہے کہ کیا ہے کھانے میں۔۔۔ چاول تو ہاتھ سے ہی کھاتی ہوں ورنہ مزہ نہیں آتا۔"
64 "کھانا کہاں بیٹھ کر کھانے میں مزہ آتا ہے؟"
"ہے تو بہت بری بات، مگر مجھے اپنے بیڈ پر کھانا کھانا بہت پسند ہے۔"
65 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"انٹرنیٹ سے بہت ہے مگر فیس بک سے نہیں ہے۔"
66 "دیسی کھانے پسند ہیں یا؟"
"دیسی کھانے مجھے بہت پسند ہیں۔۔۔ لیکن مجھے کورین اور

لبنانی کھانے بھی بہت پسند ہیں۔"
67 "فیوچر پلاننگ؟"
"مجھے بہت کام کرنا ہے اور اتنا کام کرنا ہے کہ کبھی کسی پر انحصار نہ کرنا پڑے۔"
68 "کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟"
"بیکنگ بہت اچھی کرلیتی ہوں۔ کیک خاص طور پر بہت اچھا بنالیتی ہوں۔"
69 "دکھ کب ہوتا ہے؟"
"جب کوئی بہت ہی روکھے انداز میں بات کرتا ہے۔"
70 "ماں کی ایک نصیحت؟"
"میری ماں کہتی ہیں کہ انسان اس دنیا میں بنا کپڑوں کے آتا ہے۔ مگر عزت کے ساتھ آتا ہے اور جاتے وقت ایک عزت ہوتی ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہوتی ہے... تو ہمیشہ عزت کمائیں تاکہ لوگ آپ کو یاد رکھیں۔"
72 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"دودھ پلائی۔ جوتا چھپائی۔"
73 "آپ کو فوبیا ہے؟"
"گہرے پانی سے اور گھٹن سے۔"
74 "کتنی بار فون نمبر بدلا؟"
"نہیں۔ ایک ہی نمبر کافی عرصے سے ہے۔"
75 "کن چیزوں کو لے کر گھر سے نکلتی ہیں؟"
"فون، فون کا چارجر، والٹ۔ لازمی لے کر نکلتی ہوں۔"
77 "غلطی تسلیم کرلیتی ہیں؟"
"ہاں جی۔ ہاں جی۔ کھلے دل سے۔"
78 "دل کی مانتی ہیں یا دماغ کی؟"
"دل کی مانتی ہوں۔"
79 "بچپن کا کوئی کھلونا جو سنبھال کر رکھا ہو؟"
"ایک دو گاڑیاں ہیں جو سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔"
80 "کبھی چھپ چھپ کر باتیں سنیں؟"
"مجھے تو اس بات کی عادت نہیں اور سخت نفرت ہے اس فعل سے جو ایسا کرتے ہیں... پرائیویسی بہت ضرور ہے۔"
81 "نیند فوراً" آجاتی ہے؟"
"نہیں... آرام سے لیٹ کر ہی موبائل کو چیک کرتی ہوں۔ اور جاگنے کو دل چاہتا ہے۔"
82 "سرہانے کیا کیا چیزیں رکھ کر سوتی ہیں؟"
"فون، پانی کا مگ... لپ بام۔ اور کچھ نہیں۔"
83 "اللہ کی بہترین تخلیق؟"
"ہر چیز... بہترین ہے۔"
84 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"کافی بار ایسا ہوا کہ زندگی بری لگی... مگر پھر اللہ سے دعائیں مانگتی ہوں تو سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔"
85 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"
"ہر چیز موجود ہوتی ہے... ہر چیز لے کر کھانے بیٹھتی ہوں۔"
86 "پسندیدہ تہوار؟"
"کوئی بھی نہیں۔"
87 "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"
"دونوں سے۔"
88 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"جب کوئی مصیبت سر پر آجائے۔ کہیں مشکل میں پھنس جاؤں تو۔"
89 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"چڑچڑی ہوجاتی ہوں۔"
90 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہیں؟"
"سونے سے پہلے۔"
91 "گھر آکر کیا دل چاہتا ہے؟"
"کھانا مل جائے۔"
92 "پسندیدہ ٹی وی چینلز؟"
"ہم ٹی وی اور ڈسکوری چینل۔"
"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"تو کوئی مسئلہ نہیں کسی اور فیلڈ میں اپنے آپ کو سیٹ کرلوں گی۔"





ذیابیطس کے ماہر

ڈاکٹر شکیل احمد سے ملاقات

شاہین رشید

ڈاکٹر شکیل احمد بہت ہی عام مرض "ذیابیطس" یعنی شوگر کے ماہر ہیں۔ بے حد مصروف رہتے ہیں۔ لیکن ہماری درخواست پر اپنی بے پناہ مصروفیات سے ٹائم نکال کر انٹرویو دیا۔ ذیابیطس کے مریض اس انٹرویو کو بہت غور اور توجہ کے ساتھ پڑھیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے بہت ہی کار آمد باتیں بتائی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے میڈیسن کی تعلیم نہ صرف ملک سے باہر حاصل کی بلکہ ذیابیطس (شوگر) کے موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔۔۔ ہم شکر گزار ہیں ڈاکٹر صاحب کے کہ انہوں نے ہمارے ڈائجسٹ کے لیے انٹرویو دیا۔

"کیسے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"الحمدللہ۔۔۔ آپ کیسی ہیں؟"

"جی۔ اللہ کا کرم ہے۔۔۔ انٹرویو کے آغاز میں ہم آپ سے پوچھیں گے کہ شوگر یا ذیابیطس کیا ہے؟"

"میرے نزدیک ذیابیطس یا شوگر بیماری نہیں بلکہ ایک نقص ہے۔ جس میں خون کی بلڈ شوگر نارمل سے زیادہ رہنے لگتی ہے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف دل کی بیماریوں کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ بلکہ ذیابیطس کی پیچیدگیاں بھی سر پر منڈلانے لگتی ہیں۔۔۔ صحت مند افراد میں ناشتے سے پہلے کی بلڈ شوگر ملی گرام ڈی ایل Mgldl یا اس سے کم ہوتی ہے۔۔۔ لیکن اگر ناشتے سے پہلے کی بلڈ شوگر 100 تا 125 ملی گرام ڈی ایل اور کھانے کے دو گھنٹے کے بعد 140 تا 199 ملی گرام ڈی ایل رہنے لگے تو "پری ذیابیطس" یعنی آپ کو ذیابیطس ہونے کا خطرہ ہے۔۔۔ اس طرح اگر آپ کی شوگر ناشتے سے پہلے 126 ملی گرام ڈی ایل ہے اور کھانے کے دو گھنٹے کے بعد 200 ملی گرام ڈی ایل ہے تو آپ کو شوگر ہے۔

"ذیابیطس (شوگر) کیوں ہوتی ہے؟ اس کی کیا علامات ہوتی ہیں؟"

"میرے نزدیک کم چلنا۔۔۔ زیادہ کھانا۔۔۔ ورزش نہ کرنا، سست رہنا، فاسٹ فوڈ کھانا۔ سافٹ ڈرنکس کا استعمال اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔ وزن کا بڑھنا اس مرض کو ہوا دیتا ہے۔۔۔ آج کل ہمارے نوجوان انرجی ڈرنکس بھی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ چیز بھی شوگر کے لیے بری ہے اس سے بھی شوگر ہو جاتی ہے۔۔۔ جہاں تک علامات کی بات ہے تو۔۔۔

ابتدا میں اس کی کوئی علامت نہیں ہوتی۔۔۔ اس کی کلاسیکل علامات میں پیشاب کا بار بار آنا' بھوک کا زیادہ لگنا' اور پیاس کی کثرت شامل ہیں۔۔۔ لیکن اگر جسم میں عموماً" درد رہے۔ یا ٹانگوں میں درد کی شکایت ہو' یا آہستہ آہستہ کمزوری بڑھنے لگے یا پیشاب میں بار بار انفیکشن رہنے لگے تو "FOS" ناشتے سے پہلے شوگر "RBS" ناشتے کے بعد کی شوگر اور "HBAIC" ہیموگلوبن اے ون سی ضرور کرالیں۔۔۔ اگر ان میں سے دو ٹیسٹ میں شوگر زیادہ ہو تو سمجھ لیں کہ آپ ذیابیطس کے مریض بن چکے ہیں اگر ہاتھوں پیروں میں سوئیاں چبھیں یا زخم دیر سے مندمل ہو' دھندلا نظر آنے لگے' جلد' شانے' یا مسوڑھوں میں انفیکشن ہو یا زیادہ غصہ آتا ہو تو یہ بھی شوگر کی علامات ہیں۔"

"ذیابیطس (شوگر) کے کیا نقصانات ہیں؟"

"ذیابیطس ہونے کے بعد اس کی پیچیدگیوں کے خطرات شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کو کنٹرول میں نہ رکھا جائے تو دل کی بیماری' اچانک ہارٹ اٹیک' فالج' گردوں کی بیماری' اعصابی کمزوری' آنکھوں کی بیماری اور دیگر بیماریوں ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اور یہ تمام پیچیدگیاں شوگر ہونے کے پانچ سال بعد شروع ہوتی ہیں۔ شوگر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے کوالٹی آف لائف بہت متاثر ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے کاروبار اور نجی معاملات بھی متاثر ہوتے ہیں۔"

"کیا اس سے بچاؤ ممکن ہے؟"

"دیگر بیماریوں کے برعکس ذیابیطس میں یہ خوبی ہے کہ اس سے بچاؤ ممکن ہے۔ جسے پرائمری پری وینشن کہا جاتا ہے' اگر آپ پری ذیابیطس ہیں یا آپ کے خاندان میں شوگر ہے یا حمل کے دوران شوگر ہو گئی ہو یا آپ کا وزن زیادہ ہے یا آپ سست رہتے ہیں تو پھر پرائمری پری وینشن یہ عمل کرتے ہوئے آپ شوگر سے بچ سکتے ہیں۔"

"شوگر "ہائی یا "لو" ہونے کا کیسے پتا چلتا ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ہماری شوگر "لو" ہو رہی ہے۔ بغیر ٹیسٹ کے کیسے اندازہ ہو جاتا ہے؟"

"ذیابیطس میں شوگر گرنے کو ہائپو Hypo کہتے ہیں۔ شوگر میں ہائپو ہمیشہ اچانک ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ بھوک لگتی ہے۔ ہاتھوں پیروں میں لرزہ آنے لگتا ہے۔ غصہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ مگر پیشاب کی زیادتی نہیں ہوتی' تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ کی شوگر گر رہی ہے۔ اگر مشین کی سہولت میسر ہو تو ضرور چیک کریں' اگر شوگر 70 ملی گرام یا اس سے کم ہو تو فوری طور پر 2 چمچ چینی ایک گلاس پانی میں لے لیں یا کوئی ٹافی کھالیں۔ لیکن اگر 70 ملی گرام سے زیادہ ہے تو کوئی میٹھا پھل کھالیں۔۔۔ میں نے دیکھا ہے کہ اکثر شوگر کے مریض' ایک گلاب جامن' ایک گلاس جوس اور تھوڑی میٹھی چیزیں لیتے رہیں جس کی وجہ سے شوگر بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔۔۔ شوگر کا بار بار گرنا یادداشت میں کمی کے علاوہ دیگر مسائل بھی پیدا کرتا ہے اگر شوگر زیادہ لو ہو جائے تو فالج یا ہارٹ اٹیک کا باعث بن سکتی ہے اس لیے شوگر گرنے یا لو ہونے کا تدارک فوری طور پر بہت ضروری ہے۔"

"شوگر کے بارے میں آپ مزید کیا معلومات دے سکتے ہیں؟"

"ذیابیطس (شوگر) کے مریض ان باتوں کو ضرور ذہن نشین کریں کہ

(1) شوگر ایک نہ ختم ہونے والا مرض ہے جس کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

(2) ذیابیطس کی ابتدا میں گولیاں اور بعد میں انسولین لیتے ہیں۔۔۔ لیکن ابتدا میں بھی انسولین لی جاسکتی ہے۔ انسولین آخری نہیں بلکہ پہلا اور محفوظ علاج ہے۔۔۔

3۔ شوگر کے علاج کے لیے اشتہاری دواؤں اور علاج سے گریز کریں۔

4۔ شوگر کا پوری دنیا میں کوئی ایسا علاج نہیں ہے کہ

جس سے یہ ختم ہو جائے۔ اسے کنٹرول تو کیا جا سکتا ہے مگر اس کا خاتمہ تاحال ممکن نہیں ہے۔

5۔ کم کھائیے، زیادہ چلیے، شوگر کی ادویات پابندی سے وقت پر لیجیے۔

6۔ دوا ہمیشہ اپنے ڈاکٹر کے مشورے سے لیجیے۔ ایسا ہرگز نہ کریں کہ ہزاروں روپے دے کر ڈاکٹر کو دکھائیں مگر مشورہ میڈیکل اسٹور والے سے کریں۔ مجھے ان لوگوں سے سخت اختلاف ہے جو سمجھتے ہیں، میڈیکل اسٹور والے بھی آدھے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔

7۔ شوگر کو کنٹرول کرنے میں، ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کا بلڈ پریشر، آپ کا کولیسٹرول، وزن اور شوگر ایک حد میں رہیں۔

8۔ اپنے چہرے سے زیادہ اپنے پیروں کی حفاظت کریں۔ اگر خدانخواستہ کوئی چوٹ لگ جائے تو فوراً ڈاکٹر سے رابطہ کریں۔ گھریلو سرجری اور جراحوں سے احتیاط لازمی ہے۔

9۔ وقتاً" فوقتاً" ذیابیطس سے متعلق ٹیسٹ ضرور کراتے رہیں۔

10۔ شوگر سے متعلق صرف اور صرف ڈاکٹر کے مشوروں پر چلیں، دوستوں اور رشتے داروں کے کہنے پر ادویات ہرگز مت لیں، کیونکہ آپ کے بارے میں آپ کا ڈاکٹر ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سی دوا آپ کے لیے مناسب رہے گی۔

11۔ باقاعدگی سے واک کیجیے۔

12۔ کھانے میں پھلوں، سبزیوں اور مچھلی کا استعمال ضرور کیجیے۔۔۔ بڑا گوشت، گھی، مٹھائیاں اور بیکری کی چیزوں کا استعمال کم کریں۔ اور گھر کا کھانا کھائیں۔ باہر کے کھانوں سے پرہیز کریں تو بہتر ہے۔"

"ہمارے ملک میں غربت بہت ہے اور شوگر کے مریضوں کی تعداد بھی بہت ہے۔ کیا آپ ان کے ساتھ رعایت کرتے ہیں؟"

"جب میں نے ذیابیطس میں پوسٹ گریجویشن کی تو میرے محترم استاد پروفیسر ڈاکٹر عبدالباسط نے مجھے "BIDE" میں جاب آفر کی، جو کہ ایشیا کا بہترین ادارہ ہے ذیابیطس کے لیے۔ میں نے آفر قبول کی اور کئی سال تک وہاں جاب کی۔ مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ میں کراچی اور اندرون سندھ کے دور دراز علاقوں کے لیے ایسی پالیسی بناؤں، جس کے تحت معیاری علاج ہو سکے۔ ڈاکٹر عبدالباسط کی ہدایت پر میں "کھارو بقائی خوشحال نگر" "خدا کی بستی" بقائی اسپتال اور "ہیلتھ ایجوکیشن سینٹر" میں کم سے کم وسائل میں معیاری ذیابیطس کے لیے کام کرتا تھا، یہ ادارہ آج بھی شوگر سے متاثرہ افراد کو بین الاقوامی ادارۂ صحت کے اصولوں پر بہت ہی معمولی فیس میں بہترین علاج کی سہولیات فراہم کر رہا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ "BIDE" ڈاکٹر عبدالباسط، ڈاکٹر ایف یو بقائی، ڈاکٹر یعقوب احمد الی، ڈاکٹر زاہد میاں اور ان کی ٹیم کو جاتا ہے۔"

"پوری دنیا میں اور پاکستان میں ذیابیطس کی کیا صورت حال ہے۔ مطلب ترقی یافتہ ممالک بھی اس کی لپیٹ میں ہیں؟"

"بالکل جی۔۔۔ پوری دنیا اس کی لپیٹ میں ہے۔ شوگر کے مریضوں میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے اور یہی صورت حال پاکستان میں بھی ہے۔ یہاں تو بے شمار افراد ایسے ہیں جنھیں شوگر ہونے کا خطرہ ہے۔۔۔ ہمارے یہاں صحت کے اداروں کا یہ حال ہے کہ جب ہمارے حکمران اور ان کے وزراء بیمار ہوتے ہیں تو وہ ملک سے باہر جا کر اپنا علاج کرواتے ہیں حالانکہ سہولیات بھی ہیں یہاں اور بہترین علاج بھی۔ غریب عوام کے لیے سرکاری اسپتال ہیں جن کی حالت بہت خراب ہے، یہاں غریب دھکے کھا کھا کر اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تعلیم اور صحت کے میدان میں اچھا کام کیا جائے تو عوام کے لیے بہتر ہو گا۔ اسپتالوں اور تعلیمی اداروں کی بہتری کی جانب توجہ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے مگر یہ دونوں

بقیہ صفحہ نمبر 279

آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی۔ ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔

معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ، وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے، آئے کت اور وسامہ، معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے، اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے، رامین، کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہوچکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منسا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہوچکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش



Watch Us On YouTube

چہرے کے فالتو بالوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

چہرے کی جھریوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club



نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے' مگر وہ انکار کر کے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آجاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی' ماموں' معاویہ کے والد سب اس رشتے سے ناخوش ہیں' مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کر لیتا ہے۔ کچھ ردوکد کے بعد آئے کت بھی راضی ہو جاتی ہے۔

شاہ میر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے' مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والد مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں' مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

چودہویں قسط

بشام میں بہار کا آغاز ہوا تو ہر طرف ہریالی چھا گئی اور زرد پھول ہر طرف دکھائی دینے لگے۔

لمبی۔ اور قوس قزح کے رنگوں سے بجی دموں والے پرندے جب اپنی سریلی آوازوں میں گنگناتے تو ساری وادی میں خوشی کے رنگ پھیل جاتے تھے۔ ایسی ہی ایک سہ پہر صاعقہ بیگم' خاتون بی بی اور پاشا کے ہمراہ وادی کے بازار میں گھومنے پھرنے کی غرض سے فلک بوس سے نکل آئیں۔ دونوں خواتین آپس میں باتیں کرتی رہیں اور پاشا وادی کی خوب صورتی کو آنکھوں میں جذب کرتا رہا۔ جب سے وہ پڑھائی کی غرض سے شہر گیا تھا' اس کی بصارت ان خوب صورت جلووں سے محروم ہو گئی تھی اور اس بات کا خاصا قلق تھا اسے۔

پھر وہ گھوما گھماتا انہیں دریا کے کنارے لے آیا۔ اس بات سے بے خبر کہ کچھ مقامی عورتیں دریا کے کنارے جمع ہو کر فلک بوس میں عنقریب منعقد ہونے والی شادی کی تقریب کی باتیں کر رہی ہیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' یہ شادی ہو جائے گی؟"

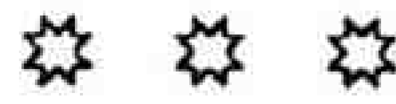
"اگر اردشیر ازی کے بیٹے نے ارادہ کیا ہے تو وہ شادی ضرور کرے گا... ویسے بھی بیوہ بھابھی کو سہارا دینا اس کا فرض بنتا ہے۔" دوسری نے کہا تو صاعقہ بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگیں۔

"فرائض کو چھوڑو... سنا ہے وہ تو محبت کرتا ہے اس سے۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو... وہ بہت خوب صورت بھی ہے۔ کوئی بھی مرد اس کی محبت میں مبتلا ہو سکتا ہے۔" ایک اور نے کہا۔

"لیکن مجھے نہیں لگتا یہ شادی ہو سکے گی۔"

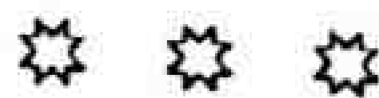
"کیوں۔۔۔؟" ایک اچنبھے سے بولی۔ "ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟"
"فلک بوس میں آج تک کوئی خوش رہا ہے؟ نہیں ناں تو اب تاریخ کو کون بدل سکے گا؟ تم دیکھ لینا، فلک بوس کا آسیب، وہ بدروح یہ شادی بھی نہیں ہونے دے گی۔"
"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔۔۔ فلک بوس میں آج تک کوئی بھی خوش نہیں رہ سکا۔"
ایسی منحوس بات سن کر صاعقہ بیگم کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ پریشانی ان کے چہرے سے جھلکنے لگی تو پاشا نے ناگواری سے سر جھٹک کر کہا۔
"ان سب کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔۔۔ توہم پرستی کی ماری ہوئی جاہل، کمزور عقیدہ عورتیں ہیں۔۔۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔"
"آمین۔" صاعقہ بیگم نے صدق دل سے کہا۔



اور جس جس نے سنا ہکا بکا ہی رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خوش نصیب خود کشی کرنے کا سوچنے لگے۔
"اس میں ناممکن کیا ہے؟" صیام نے ناک چڑھا کر پوچھا۔
"کیا پتا خوش نصیب کو تھوڑی عقل آگئی ہو اور اس نے ہم سب کی زندگیوں کو پرسکون بنانے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا ہو۔" انداز سنجیدہ تھا جو چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ وہ مذاق ہی اڑا رہی ہے۔
"نہ بھئی نا۔۔۔ میں نہیں مانتی۔" فضیلہ چچی ساری بات سن کر بولیں۔
"اماں! اس میں نہ ماننے والی کون سی بات ہے۔" طوطا بھائی برا ہی مان گئے۔
"میں بتا تو رہا ہوں، خود اپنی ان گنہگار آنکھوں سے خوش نصیب کو دیوار پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا میں نے۔ اگر جو میں نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر نہ کھینچا ہوتا تو اس وقت ہم سب اس کے ایصال

ثواب کے لیے قرآن خوانی کررہے ہوتے۔"
"بیڑہ غرق ہو آپ کا مٹھو بھائی! کیا ضرورت تھی اس حاضر دماغی کے مظاہرے کی۔۔۔ چھلانگ لگا رہی تھی تو لگانے دی ہوتی بدبخت کو۔۔۔ ہم سب کی جان چھوٹ جاتی اس مصیبت سے۔" صیام بگڑ کر بولی۔
"تمہارے جیسا پتھر کا دل تو ہے نہیں میرا۔ کہ کوئی انسان میری آنکھوں کے سامنے مرنے کا ارادہ کررہا ہو اور میں اسے روکوں بھی نہیں۔" طوطا بھائی مزید بگڑ کر بولے۔
"آئے ہائے۔۔۔ یہ دل خوش نصیب کے لیے آج کل کچھ زیادہ ہی نرم نہیں پڑ رہا۔" وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔
"ذرا اپنے بڑے بیٹے پر دھیان دے لیں امی! ایسا نہ ہو کہ جس کی طرف آپ کا دیکھنے کا بھی دل نہیں چاہتا' اسی کو آپ کے سر پر بہو بنا کر بٹھا دے۔"
مٹھو بھائی نے اس بات پر اس بری طرح صیام کو گھورا کہ صیام ان کی سگی بہن نہ ہوتی اور ان کی ہر بات کو چٹکیوں میں اڑانے کی عادی نہ ہوتی تو ان نظروں کی تاب نہ لا کر اب تک مر ہی گئی ہوتی۔
"اے تیرے منہ میں خاک صیام! مجال ہے جو کبھی کوئی اچھی بات کرلے' بے غیرت۔" فضیلہ چچی نے خوب ہی اس کے لتے لیے تو صیام منہ بنا کر ٹی وی دیکھنے لگی۔
"شاہجہان! میرے لال! تو مجھے شروع سے بتا۔ اصل میں رات ہوا کیا تھا؟" انہوں نے بہلا کر پچکار کر طوطے بھائی کو دوبارہ ٹریک پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"اوہو اماں! ایک ہی بات کو اور کتنی دفعہ سنو گی۔" وہ چڑ کر بولے۔
"اے تو میں کون سا خود سننا چاہ رہی ہوں یہ تو منہا ابھی آکر بیٹھی ہے' خوش نصیب کی سب سے بڑی حامی' اسے بھی تو پتا چلے' خوش نصیب بیگم رات ورات کیا گل کھلانے چلی تھیں۔"
منہا ابھی سو کر اٹھی تھی اور آتے ساتھ ہی سوئے سوئے سے انداز میں صوفے پر گر سی گئی تھی۔
"نہیں پلیز۔۔۔ مجھے کسی کے گل بوٹوں کے بارے میں نہیں سننا۔" اس نے فوراً" ہاتھ اٹھا کر کہا "پہلے ہی پوری رات میں نے ٹیسٹ کی تیاری میں گزار دی ہے۔۔۔ اب تھوڑا آرام کرنے دیں مجھے۔"
"ارے خاندان بھر کی زبان پر خوش نصیب کے کارنامے ہیں اور تجھے اپنی نیند کی پڑی ہوئی ہے۔" وہ ڈپٹ کر بولیں۔
"تو آپ کیا چاہتی ہیں' میں اور صیام بھی کوئی ایسا ہی کارنامہ انجام دیں کہ سب کی زبانوں پر ہمارا ہی نام ہو؟"
"ارے فٹے منہ۔۔۔ کبھی کوئی ڈھنگ کی بات نہ کرنا' ہر بات کا آگے سے الٹا جواب دو گی۔ یہ سارا اس خوش نصیب کی صحبت کا اثر ہے۔ وہ خود تو ایسی تھی ہی' میری معصوم بچیوں کو بھی اپنے جیسا منہ پھٹ بنا دیا ہے۔"
"پلیز' پلیز امی!۔۔۔ یہ صیام کا مجھے پتا نہیں لیکن میرا یہ بالکل ذاتی ٹیلنٹ ہے۔۔۔ پلیز آپ اسے خوش نصیب کے کھاتے میں مت ڈالیں۔" منہا نے تنک کر کہا' ساتھ ہی کچھ فاصلے پر بیٹھی صیام کو آنکھ بھی ماری لیکن صیام نے فوراً" ہی برا سا منہ بنا کر چہرہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ وہ مذاق میں بھی خوش نصیب کا حوالہ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔
فضیلہ چچی ہکا بکا بیٹی کو دیکھ کر رہ گئیں۔ اس سے پہلے کہ یہاں گھمسان کا رن پڑتا۔ طوطا بھائی نے معاملے کی نزاکت کو بھانپ لیا اور فضیلہ چچی کی فرمائش کے عین مطابق سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے منقطع کیا تھا۔ کیونکہ "اصل بات" کو فرمائش کے مطابق از سر نو دہرانا بھی ضروری تھا کہ اماں کو ناراض نہیں کیا جاسکتا تھا وہ اس گھر میں ان کی سب سے بڑی حمایتی جو تھیں۔
"اچھا تو ہوا کچھ یوں کہ جب میں ٹارچ پکڑ کر چھت پر پہنچا تو اسی وقت بادل زور سے گرجے اور بجلی اتنی کڑا کے

دار آواز کے ساتھ چمکی کہ میرا ننھا سا دل اچھل کر حلق میں ہی آگیا۔"
بات یوں بھی کچھ کم پُراسرار نہ تھی لیکن طوطا بھائی نے اپنے زور بیان سے اسے کچھ زیادہ ہی پُراسرار بنانے کی ٹھان لی تھی لیکن ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ منہا نے جملہ اُچک لیا۔
"یعنی دل نہ ہوا کھجور کی گٹھلی ہوگئی۔ اچھلی اور حلق میں آگئی۔" منہا اپنے موبائل سے کھیلتے ہوئے گویا ہوئی۔
طوطا بھائی بالکل ہی برا مان گئے۔ "تم بول لو میں پوری بات پھر کبھی بتا دوں گا۔"
"آپ نہ ہی بولیں تو اچھا رہے گا۔" منہا تنک کر بولی۔ "اور امی! آپ بھی بس کریں۔ بات کا بتنگڑ ہی بنا دیا ہے آپ لوگوں نے۔"
"اے ہم نے کون سا بتنگڑ بنایا ہے۔" فضیلہ بیگم کی نازک مزاجی تو یوں بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی سو وہ بھی تنک کر بولیں۔ "پوچھو ذرا شاہجہان سے کیا اس نے خوش نصیب کو آدھی رات کے وقت دیوار سے چھلانگ لگاتے نہیں دیکھا۔"
"ہو سکتا ہے طوطا بھائی کو غلط فہمی ہو گئی ہو۔" وہ بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔
"غلط فہمی کاہے کی؟"
"چھوڑیں بھی امی! آپ کس کے ساتھ سر کھپا رہی ہیں۔ یہ ہم سے زیادہ خوش نصیب کی پکی سہیلی ہے۔ ہماری باتوں پر کہاں یقین آئے گا اسے۔" صیام نے منہ بنا کر کہا تو منہا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔
"اچھا۔۔۔" اس نے سیز فائر کرنے والے انداز میں کہا۔ "اچھا۔۔۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے خوش نصیب نیند میں چل رہی ہو۔۔۔ ذرا خود سوچیں وہ خودکشی کیوں کرے گی؟ خوش نصیب تو ایسی لڑکی ہے، جو دوسروں کو خودکشی کرنے پر مجبور کر سکتی ہے البتہ خود کبھی ایسی حماقت نہیں کرے گی۔" اس کی بات میں وزن تھا۔ فضیلہ بیگم کے سارے مفروضے دم توڑ گئے۔
"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔"
"میں تو ہمیشہ ہی ٹھیک کہتی ہوں بشرطیکہ آپ کبھی میری پوری بات سن لیں۔۔۔ اور اپنے ان دونوں ہونہار سپوتوں کی باتوں میں نہ آئیں۔" اس نے طوطے اور صیام کو طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
صیام دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ طوطا بھائی نے ہونہہ کہہ کر منہ پھیر لیا جبکہ فضیلہ بیگم منہا کی پوری بات سے متفق ہو کر اب کسی اور ہی رخ سے اس سارے واقعے کو دیکھ رہی تھیں۔



دور سے دیکھو تو فلک بوس زندگی سے بھرپور، سجی سجائی عالیشان عمارت کی طرح دکھائی دیتا تھا۔
اردشیر ازی نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی کے لیے فلک بوس کا کونا کونا سجا دیا تھا اور اس مقصد کے لیے ملک کے بہترین اور نامور ایونٹ آرگنائزرز کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ فلک بوس یوں بھی فن تعمیر کا شاہکار تھا۔ اگر اسرار اس کے کونوں کھدروں میں جنم نہ لیتا اور آسیب کی من گھڑت کہانیاں اس کی خوب صورتی کو گہن نہ لگاتیں تو فلک بوس ایک بہترین مقام تھا۔ لیکن اب معاویہ کی شادی کی خبر نے فلک بوس کی راہداریوں میں زندگی سی دوڑا دی تھی۔ ایونٹ آرگنائزرز نے اسے اتنا سجایا کہ دیواروں کے اصل رنگ تو کہیں کھو ہی گئے۔
فلک بوس پر جو آرائشی لائٹیں لگائی گئی تھیں وہ سرِشام ہی جلا دی جاتیں اور فلک بوس شام کے سینے پر جگر جگر کرتا

ملک کی نامور شخصیات، سیاستدان، دور و قریب کے سب ہی رشتہ دار اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے کئی دن پہلے ہی فلک بوس پہنچ چکے تھے۔ ملک کی کریم تھی جو اردشیرازی جیسے بزنس ٹائیکون کے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے یہاں جمع ہوئی تھی۔ اب اتنی نامور شخصیات یہاں موجود تھیں تو اسی حساب سے سیکیورٹی کا بھی بڑا بہترین انتظام کیا گیا تھا۔ اردشیرازی کی دوسری بیوی اور تینوں بچے بھی آئے تھے۔ معاویہ کی ان تینوں کے ساتھ اچھی سلام دعا تھی اور اس نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ مہندی، بارات اور ولیمے کے دن پوری وادی کے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی گئی تھی۔ اردشیرازی نے کہہ دیا تھا اس روز وادی کے کسی گھر میں چولہا نہیں جلے گا۔

معاویہ کو خوشی ہوئی۔ اس کے بابا نے اپنی ناراضی ختم کرکے اس کی شادی میں شرکت کا ارادہ کرلیا تھا۔

"تم میرے بڑے بیٹے ہو۔۔۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ہی تمہاری شادی میں شریک نہ ہوتا۔" انہوں نے شاید پہلی بار اس کا گال پیار سے تھپتھپا کر کہا تھا۔ معاویہ جذباتی ہو کر ان سے لپٹ گیا تو وہ اس کے بچکانہ پن پر ہنسنے لگے۔

"ایک بیوہ کو سہارا دینے کی غلطی سے نکاح کرنا ایک اچھا فیصلہ ہے میں دعا کروں گا اللہ تمہیں تمہاری نیک نیتی کا صلہ دے اور کبھی تمہیں مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔" وہ سنجیدہ ہو کر کہہ رہے تھے۔

"آپ کے دل سے آئے ٹکت کے لیے ابھی تک بدگمانی نہیں گئی ناں؟" اس نے مسکراہٹ لبوں سے جدا کیے بنا پوچھا۔

"اگر تم اس کے ساتھ خوش رہے تو شاید یہ بدگمانی بھی دور ہو جائے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" اس نے مسکرا کر پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"آپ باقی گیسٹس کو کمپنی دیں۔۔۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو جوائن کرتا ہوں۔" وہ مسکرا کر کہتا ہوا چلا گیا تو اردشیرازی اپنے حلقہ احباب کی طرف آگئے۔

"میری مانیے تو اپنے اس فلک بوس کو ہوٹل میں بدل دیں۔۔۔ بشام اتنی خوب صورت جگہ ہے اگر مناسب طریقے سے کام کیا جائے اور ٹھیک ٹھاک تشہیر ہو تو ٹورسٹس کے لیے بڑی اٹریکشن ہے یہاں۔" اردشیرازی کے ایک ایم این اے دوست نے فلک بوس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

اس کی دیکھا دیکھی دوسرا بھی بولا۔ "بالکل بالکل۔۔۔ میں حیران ہوں ابھی تک حکومت کو خیال کیوں نہیں آیا اس طرف دھیان دینے کا۔"

"آپ کے ایک چھوٹے سے عمل سے ملک میں ٹورازم کو بھی فروغ ملے گا اور آپ کی جیب بھی بھرتی رہے گی۔" اس بات پر ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا پھر اردشیرازی نے کہا۔

"میرا بھی کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔۔۔ دیکھیے کب پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔" انہوں نے قریب سے گزرتے ویٹر کے ہاتھ سے مشروب کا گلاس لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہیں کچھ فاصلے پر طالب حسن اپنے کچھ جاننے والوں کے ساتھ خوش گپیوں میں معروف تھے۔ اسی اثناء میں صاعقہ بیگم وہاں آگئیں اور مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے طالب حسن کو بات کرنے کی غرض سے ایک طرف لے گئیں۔

"ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے سب کے درمیان سے مجھے اٹھانا ضروری تھا۔" وہ خفا ہوئے۔ "فردوسی صاحب اسٹیبلشمنٹ میں ہیں۔۔۔ میرے بزنس کو کتنا فائدہ مل سکتا ہے۔"

"سگا بیٹا اس دنیا میں رہا نہیں۔۔۔ اب اس کاروبار کو بڑھا کر کیا کرنا ہے آپ نے۔" وہ دراچھ کرولیں۔ "میرا دل اتنا پریشان ہو رہا ہے اور آپ کو اپنے بزنس کی پڑی ہوئی ہے۔"

اب گرمی بھی ہوگئی ٹھنڈی...

تبت

پریکلی ہیٹ

پاؤڈر



تبت پریکلی ہیٹ پاؤڈر گرمی دانوں سے نجات اور ٹھنڈک کا خوشگوار احساس

TPHP/06/2K15

"کیا ہوا؟ کیسی پریشانی؟"

"آج وادی میں عورتیں کہہ رہی تھیں کہ فلک بوس کا آسیب یہ شادی نہیں ہونے دے گا۔" صاعقہ بیگم فکر مندی سے بولیں تو طالب حسن نے سر پیٹ لیا۔

"آخر تم کب اس آسیب کے وہم سے نکلو گی؟"

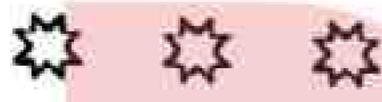
"کچھ نہ کچھ تو ہے طالب! تب ہی تو لوگ بات کرتے ہیں۔" ان کا لہجہ سرسرا رہا تھا۔

"ایک طرف نماز قرآن کی پابندی بھی کرتی ہو' دوسری طرف کمزور عقیدہ لوگوں کی طرح وہم بھی پال رکھے ہیں۔ او خدا کی بندی! آسیب جیسی کوئی چیز نہیں ہے یہاں۔۔۔ کتنی بار سمجھاؤں لیکن تم بھی بشام کی جاہل عورتوں سے کم تھوڑا ہی ہو۔"

"آہستہ تو بولیں۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ ایک بات کہہ دی۔۔۔ آپ تو پیچھے ہی پڑ گئے۔" وہ ناراضی سے بولیں۔

"تمہیں زیادہ وہم ستا رہے ہیں تو نظر کی دعائیں اور چاروں قل پڑھ کر معاویہ اور آئے کت کے گرد حصار بناتی رہو اور تھوڑا بھروسا اللہ پر بھی رکھو۔ وہ سب بہتر کرے گا۔"

"ہاں' ان شاء اللہ۔" وہ گہری سانس بھر کر بولی تھیں۔



"نہ میں پوچھتی ہوں ایسی کون سی افتاد آگئی خوش نصیب پر کہ خودکشی کرنے چھت کی دیوار پر ہی چڑھ گئی۔ کھاتی ہے' پہنتی ہے۔۔۔ کیا کمی ہے اس کی زندگی میں۔۔۔ اور تو اور سارے گھر والوں کی زندگیوں کا سکون بھی رج کے ہی برباد کیے رکھتی ہے۔۔۔ پھر بھی ایسا کیا ہوا کہ خودکشی کرنے کی سوجھی۔۔۔ تم مانوں نہ مانو بھابھی! معاملہ کچھ اور ہے۔"

دوپہر تک جب اس قصے کو خوب خوب دہرا لیا گیا اور کسی کے بھی ہاتھ کوئی چٹپٹی بات نہ لگ سکی تو فضیلہ بیگم اپنی اون سلائیاں اٹھا کر کیف کی امی کے پاس پہنچ گئیں۔ جب انہیں لمبی لمبی چغلیاں کرنی ہوتی تھیں تو اون سلائیاں وہ ساتھ ہی لاتی تھیں کہ ہاتھ بھی نہ رکیں اور زبانیں بھی چلتی رہیں۔

صباحت بیگم سبزی کی ٹوکری آگے رکھے 'فنافٹ کریلے چھیلنے میں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ کچھ فضیلہ بیگم کی بات سے قائل ہو ہی گئیں۔

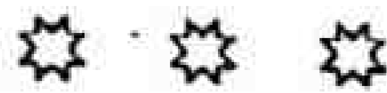
"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔۔۔ لیکن یہ الگ معاملہ کیا ہو سکتا ہے؟" انہوں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "فہمینہ تو کہہ رہی تھی ایسا سب انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی خواب میں انسان چلنے لگتا ہے تو یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔" وہ سادگی سے بولیں۔ وہ ویسے بھی سادہ مزاج خاتون ہی تھیں۔ اور اسی لیے فضیلہ بیگم کی چالبازیوں میں بھی آجاتی تھیں۔

"تو نیند میں چلنا کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔۔۔ یہ تو ذہنی عارضہ ہوتا ہے۔ اگر خوش نصیب بیمار ہے تو کسی ذہنی امراض کے ڈاکٹر کو دکھا لینا چاہیے۔ لو اب یہ نیا خرچا تیار۔" وہ ٹھونک بجا کر بولتے بولتے اپنا سر ہی پیٹ گئیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہو فضیلہ! اللہ نہ کرے کہ اسے کوئی عارضہ لاحق ہو۔" صباحت بیگم تھوڑا جھنجلا کر بولیں۔ فضیلہ بیگم کی ان ہی عادتوں سے انہیں چڑ تھی۔ کم سے کم کسی کی بیٹیوں کے لیے بات کرتے ہوئے تھوڑا بہت سوچ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

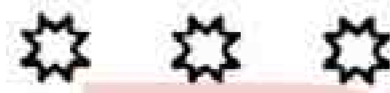
"جیسی ہماری بیٹیاں ہیں ویسی ہی خوش نصیب ہے۔ ہاں' میں مانتی ہوں اس میں کچھ بری عادتیں ہیں لیکن اس

طرح ایک دم سے اسے ذہنی مریض ثابت کردینا کہاں کا انصاف ہے۔" وہ خود بھی فضیلہ بیگم کی زبان کے چرکوں سے تنگ رہتی تھیں تب ہی احتیاطاً "نپے تلے لفظوں کا انتخاب کیا تھا۔
"اے رہنے دو بھابھی! اللہ ہماری معصوم بچیوں کو خوش نصیب کے شر سے بچا کر رکھے۔۔۔ اور آپ بھی کمال کرتی ہیں ' کیسے منہ بھر کر کہہ دیا کہ ہماری بیٹیوں جیسی ہے خوش نصیب! توبہ توبہ ' اللہ معاف کرے۔ اس کی تو زبان ہی گز بھر کی ہے۔"
"تم سمجھیں نہیں فضیلہ! میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ سٹپٹا کر بولیں۔
"آپ کے کہنے کا جو بھی مطلب تھا ' میں صاف بتائے دے رہی ہوں ' یہ جو خوش نصیب خود کشی کی کوشش کرتے ہوئے پکڑی گئی ہے ' یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یا تو یہ کوئی ذہنی عارضہ ہے یا پھر کسی لڑکے کا معاملہ ہے۔" وہ ٹھونک بجا کر بولی تھیں۔
صباحت بیگم ' خوش نصیب کا آدھی رات کے وقت منڈیر پر چڑھنے کا سن کر اتنا حیران نہیں ہوئی تھیں جتنا اس بات پر ہوئیں لیکن اس حیرانی میں ناگواری کا عنصر زیادہ تھا۔ انہوں نے خاموشی سے سر جھٹکا اور اپنی سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کھڑی ہو گئیں۔
"کیف کے ابو آتے ہوں گے۔۔۔ میں ذرا یہ سبزی روشن کو دے دوں۔" وہ کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئیں۔
فضیلہ بیگم نے ناگواری سے ناک چڑھالی۔ اسی وقت وہیں کہیں سے خوش نصیب گزر رہی تھی۔ فضیلہ بیگم اسے دیکھتے ہی جلدی سے بولیں۔
"اے لڑکی! ادھر آؤ ذرا۔"
خوش نصیب رک گئی پھر ان کے پاس بھی آگئی۔ لیکن یہ انداز تخاطب اسے سخت زہر لگتا تھا۔ سو برا سا منہ بنا لیا۔
"نہ یہ آدھی رات کو تم منڈیر پر چڑھی کیا کر رہی تھیں؟"
"طوطا بھائی نے بتایا نہیں آپ کو؟ خود کشی کرنے چڑھی تھی۔" وہ بھی کاٹ کھانے کو دوڑی۔
فضیلہ چچی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ گویا طوطے کی کہی ہوئی بات ہی درست تھی۔
"ہونہہ۔۔۔ صبح سے دماغ کھالیا ہے سب نے۔۔۔ پتنگیں لوٹنے گئی تھی میں منڈیر پر۔۔۔ کسی کو فکر ہے نہیں میری۔ خالی خولی زبان کے چسکے پورے ہو رہے ہیں۔۔۔ ظالم لوگ۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ مڑ کر ایک بھی بار فضیلہ چچی کو نہیں دیکھا۔



"آپ کیسے ہیں بابا کبیر!"
"میں ٹھیک ہوں چھوٹے صاحب! آپ کیسے ہیں؟"
"میں جب سے آیا ہوں ' دیکھ رہا ہوں مگر آپ کے چہرے پر خوشی نظر نہیں آرہی مجھے۔" سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے معاویہ نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔ "کیا میں یہ سمجھوں ' میری شادی کی خبر نے خوش نہیں کیا آپ کو؟"
"ایسی کوئی بات نہیں ہے چھوٹے صاحب!" بابا کبیر نے ہڑبڑا کر کہا۔ "مجھے بہت خوشی ہوئی ہے یہ سن کر کہ آپ آئے کت بی بی سے شادی کر رہے ہیں۔۔۔ اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر ضرور دے گا۔ وادی میں سب کہہ رہے ہیں آپ بھائی کی بیوہ سے شادی کر کے بہت بڑی نیکی کما رہے ہیں۔"

"اپنی نیک دلی کی دھاک جمانے کے لیے میں یہ شادی نہیں کر رہا۔" وہ قدرے چڑ کر بولا تھا پھر جھنجلا کر بات ہی پلٹ دی۔
"اچھا۔۔۔ چھوڑیں اس بات کو۔۔۔ مجھے پتا چلا ہے کہ پاشا بھی آیا ہوا ہے؟ کہاں ہے' دکھائی نہیں دیا اب تک۔" اس نے بابا کبیر کے بیٹے کے متعلق پوچھا تو بابا قدرے چڑچڑے لہجے میں بولے۔
"یہیں کہیں ہو گا یا نیچے وادی میں چلا گیا ہو گا۔ پڑھائی چھوڑ کر بشام آگیا ہے' کہتا ہے شادی کرو میری ورنہ واپس نہیں جاؤں گا۔"
معاویہ نے اس بات پر محظوظ ہوتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا تھا۔
"تو کروادیں اس کی شادی۔ اس میں کون سی بڑی بات ہے۔"
"نیچے وادی میں جو موہن داس ہے' اسی کی بیٹی سے محبت ہو گئی ہے اسے۔۔۔ آپ خود سوچیں صاحب! ہندو لڑکی سے کیسے شادی کروا سکتا ہوں اس کی۔"
اس سے پہلے کہ معاویہ کوئی جواب دیتا اسے دور کسی راہداری میں مڑتی آئے کت دکھائی دے گئی۔
"بابا! میں آپ سے تھوڑی دیر میں بات کرتا ہوں۔" وہ کہہ کر تیز تیز چلتا آئے کت کے پیچھے چلا گیا۔



"یہ فضیلہ بھی بعض دفعہ حد کر دیتی ہے۔" صباحت بیگم جس وقت اندر آئیں' فہمینہ بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر ماں کو دیکھا۔
"اب کیا کہہ دیا فضیلہ چچی نے؟" وہ اسٹڈی ٹیبل پر جھکی کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔
"وہ کہتی کب ہے' شوشے چھوڑتی ہے۔" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں کہتی فہمینہ کے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی تھیں۔
فہمینہ کو ہنسی آگئی۔ "اچھا تو کون سا شوشا چھوڑ دیا چچی نے۔"
"فرماتی ہیں۔۔۔ خوش نصیب کی خودکشی کی کوشش کے پیچھے کسی لڑکے کا معاملہ ہے۔" بلی تھیلے سے پھدک کر باہر نکلی۔
"کیا؟" فہمینہ کو بے یقینی کا زبردست جھٹکا لگا پھر اس کے منہ سے قہقہہ ابل پڑا۔ یہاں تک کہ صباحت تائی جان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔
"ذرا سوچیں امی! کوئی لڑکا اگر ہماری خوش نصیب میں دلچسپی لینے کی کوشش کرے گا تو خوش نصیب اس کا کیا حال کرے گی۔" فہمینہ بولتے ہوئے مزہ لے رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔
"اور نہیں تو کیا۔۔۔ خوش نصیب کی تو شادی ہی ہو جائے خیر خیریت سے تو بڑی بات ہو گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔
"مجھے تو فکر ہے' جس گھر میں یہ دلہن بن کر جائے گی وہاں رہنے والوں کا کیا حشر کرے گی۔ ہر روز لڑائیاں ہوا کریں گی۔" وہ مستقبل کا سوچ سوچ کر ہنس رہی تھیں۔
فہمینہ کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ اور اگر جو امی کو پتا چل جائے کہ کیف خوش نصیب کو ان ہی کی بہو بنانے کا ارادہ کیے بیٹھا ہے تو بھلا کیا ہو گا۔" اس نے چپکے سے سوچا اور تصور کی آنکھ سے امی اور خوش نصیب کو ساس بہو کے روپ میں لڑتے ہوئے دیکھ بھی لیا ساتھ ہی اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے منہ بھی جھکا لیا۔

"میں نے تو صاف کہہ دیا فصیلہ سے۔ خوش نصیب میں سو برائیاں سہی لیکن یہ لڑکوں وڑکوں کے معاملات میں پڑنے والی لڑکی نہیں خوش نصیب۔ اور کوئی اچھائی میں مانوں یا نہ مانوں لیکن اس معاملے میں، میں روشن کی تربیت کو ضرور مانتی ہوں۔ جب سے تمہارے چچا کا انتقال ہوا ہے نہ اس عورت نے خود نظر اٹھا کر کسی مرد کی طرف دیکھا نہ اپنی بیٹیوں کو ایسے سبق پڑھائے۔ حالانکہ بھرپور جوانی میں بیوہ ہوئی تھی۔ مشکل سے تین دن کی ہو گی ابھی خوش نصیب۔ جب وہ حادثہ تمہارے چچا کی جان لے گیا۔۔۔ یہ بھی کوئی عمر ہوتی ہے عورت کی کہ سفید چادر اوڑھ کر بیٹھ رہے۔" وہ تاسف سے اس وقت کو یاد کر رہی تھیں جب چھوٹے دیور کی میت فضل منزل کے صحن میں رکھی گئی اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اس جوان موت پر اشکبار نہ ہوئی ہو۔

"ویسے امی! اتنی کم عمر تھیں روشن چچی۔ آپ سب نے مل کر چچی کی شادی کا کیوں نہ سوچا۔" فہمینہ نے کب سے ذہن میں اٹھنے والا سوال پوچھ ڈالا۔

"ارے ہم نے تو بہتیرا سمجھایا تھا روشن کو۔ لیکن وہ اپنی ضد کی ایسی پکی نکلیں کہ مان کر نہ دیں۔" صباحت بیگم آج پرانے قصے دہرانے کے موڈ میں تھیں سو بولتی چلی گئیں۔

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو بیوگی کا بھی ایسا روپ چڑھا تھا روشن پر کہ نظر ہٹتی نہ تھی۔ ایک تو کم عمری پھر حسن بھی ایسا کہ کہیں ہزاروں میں ایک لڑکی ایسی نظر آجائے تو بڑی بات ہے۔ شکل و صورت میں ماہ نور بالکل روشن کا پرتو ہے۔ تم خود ہی اندازہ لگالو، جوانی میں کتنی خوب صورت رہی ہوں گی۔ دور پار کے رشتے داروں نے سہارا دینے کی غرض سے نکاح کا پیغام بھی دیا تھا۔۔۔ اور تو اور تمہارے عرفات ماموں بھی بہت پیچھے پڑے لیکن روشن نے ایک نہ سنی کہتی تھیں، میرے آگے دو بیٹیاں ہیں۔ آج دوسرا نکاح کروں گی تو کل انہیں کیا جواب دوں گی۔۔۔ بس پھر آہستہ آہستہ سب نے کہنا ہی چھوڑ دیا۔"

"اچھا۔۔۔ تو عرفات ماموں نے جو شادی نہیں کی، اس کے پیچھے بھی یہی وجہ ہے۔" وہ اپنی طرف سے جیسے دور کی کوڑی لائی تھی۔

"تمہارے ماموں کے دماغ میں تو بچپن سے فتور تھا لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ جوڑیاں تو آسمانوں پر ہی بنتی ہیں۔ تو جب روشن کا جوڑ ان کے ساتھ تھا ہی نہیں تو کیسے شادی ہو جاتی۔۔۔ کم عقل لڑکا، اسی روشن کے لیے بن باس لے کر بیٹھ گیا جو اس کی طرف دیکھ کر راضی نہ ہوتی تھی۔ شکل میں اگر ماہ نور ماں کے جیسی ہے تو عادت خوش نصیب نے ماں والی لی ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہیں امی! کہاں خوش نصیب کی تنک مزاجی اور کہاں روشن چچی کی سلجھی ہوئی طبیعت۔" وہ ماننے سے انکاری ہو گئی۔

"روشن چچی تو بولتی ہی اتنے دھیمے سروں میں تھیں کہ لگتا جلترنگ بج اٹھے ہیں۔ جبکہ خوش نصیب۔۔۔ وہ تو مانوں پھٹا ہوا ڈھول تھی۔"

"ارے بیٹا! وقت ہر مزاج کو نرم کر دیتا ہے۔۔۔ بیچاری کو قسمت کی مار بھی تو ایسی پڑی تھی کہ سارا تنتنا نکل گیا۔ جوانی میں تو روشن بالکل خوش نصیب کی طرح باتیں کرتی تھیں۔ ویسے ہی تنک تنک کر جواب دینا، سب کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھنا، خود کو عقل کل سمجھنا۔۔۔ لیکن بیوگی کی چادر اوڑھتے ہی ان کا مزاج بدل گیا۔ اس کے بعد کم سے کم میں نے تو روشن کو کسی کے سامنے نظر اٹھا کر بات کرتے نہیں دیکھا۔ ہاں ضد ہے اس میں۔۔۔ جو جوں کی توں قائم ہے۔ تم نے دیکھا نہیں خوش نصیب کو کیسے سمجھاتی ہے۔۔۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنا حال دیکھ چکی ہے اور نہیں چاہتی کہ خدانخواستہ کل کلاں کو خوش نصیب کا تنتنا بھی ایسے ہی ختم ہو جیسے خود اس کا ہوا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ چھوڑیں اس بات کو۔"

"ہاں۔۔۔ ان باتوں کو دہرا کر ہم نے کیا کرنا ہے۔۔۔ میں تو تمہیں بتا رہی تھی کہ فضیلہ نے اب نیا شوشہ چھوڑ دیا ہے۔"

"خدا ہی سمجھے فضیلہ چچی کو بھی۔ نیند میں چلنا کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں ہے کہ اتنا تماشا کھڑا کر لیا جائے۔۔۔ اور پھر کیا خوش نصیب سے کسی نے پوچھا کہ وہ اتنی رات گئے دیوار پر چڑھی کیا کر رہی تھی۔"

"نہیں۔۔۔ میرا نہیں خیال۔" وہ پرسوچ انداز میں بولیں۔

"بس پھر پہلے تو خوش نصیب سے ہی پوچھیں۔ طوطا بھائی تو ویسے بھی ماں بہنوں کے ساتھ رہتے رہتے آدھی لڑکی ہی بن چکے ہیں۔۔۔ فساد ڈلوانے میں بھی خاصے ماہر ہیں۔"

"ارے یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔۔۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "طوطے کی بات پر یقین کر کے بیٹھ گئے سب کہ خوش نصیب خودکشی کرنے ہی منڈیر پر چڑھی ہوئی تھی۔۔۔ کیا پتا اس وقت طوطا خود بھی نیند میں تھا یا پورے ہوش میں تھا۔"

"اور نہیں تو کیا۔۔۔ پر کا کوا بنا دیتے ہیں طوطا بھائی اور فضیلہ چچی ایمان لے آتی ہیں ان کی باتوں پر۔"

"خدا ہی سمجھے ان سب کو۔" وہ دل کی بھڑاس نکال کر اٹھ گئیں لیکن فہمینہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے موبائل اٹھایا اور کیف کا نمبر ملانے لگی۔



برآمدہ نما راہداری جس کے داہنے ہاتھ پر کمروں کی عقبی دیواریں تھیں اور دوسری طرف بشام کی وادی کا حسن ایک ڈھلوانی چٹان کی طرح دکھائی دیتا تھا تو اسی لمبی راہداری میں آئے کت اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی۔ اس نے لمبی زرد قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ پہنا تھا اور زرد ہی دوپٹے کے پلو اس کے گھٹنوں کو چھوتے تھے۔ سرخ بالوں کی ریشمی سیدھی چوٹی اس کے داہنے کندھے پر آگے کی طرف پڑی تھی۔ کلائیوں میں کہنیوں تک سفید اور زرد چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔ کانوں میں آویزے تھے جن کے کناروں سے موتی لٹک رہے تھے۔ وہ قدم آگے رکھتی تو آویزے آگے پیچھے جھولتے اور اس کے گالوں کو چھونے لگتے۔ پیروں میں نازک زرد پٹی والی چپل تھی۔

وہ تیز تیز لیکن بنا آواز کے چل رہی تھی۔ یہاں تک معاویہ نے دبے قدموں اسے جا لیا۔ پہلے داہنے کندھے کو پیچھے سے چھوا۔ وہ پلٹی تو معاویہ ذرا سا اوٹ میں ہو گیا پھر داہنے کندھے کو چھوا۔ آئے کت پوری کی پوری گھوم گئی تو معاویہ نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

"تم ہمیشہ مجھے پہچان لیتی ہو۔"

آئے کت مسکرائی۔ "ابھی بھی نہیں پہچانوں گی تو کب پہچانوں گی۔ ویسے تم سے پہلے تمہارے پرفیوم کی خوشبو مجھ تک پہنچ جاتی ہے۔"

"پرفیوم چینج کر لوں گا اور پھر تمہاری محبت کا امتحان لوں گا۔" وہ چڑانے لگا۔

آئے کت نے مسکراہٹ لبوں کے کناروں میں دبا کر اسے دیکھا۔ "لیکن میں نے یہ کب کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے؟"

"تم نہ کہو۔۔۔ بے شک نہ کہو۔۔۔ لیکن میں ساری دنیا کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔ نہیں محبت نہیں عشق ہے۔" وہ بازو پھیلا کر چہرہ اوپر اٹھا کر آہستہ آہستہ ایسے گول گول گھومنے لگا جیسے کوئی مجذوب ہو۔ عشق میں دیوانہ۔

"نہیں، یہ عشق بھی نہیں ہے۔۔۔ یہ کچھ اور ہے۔۔۔ عشق سے آگے اگر کوئی اور منزل ہے تو میں اس منزل تک پہنچ گیا ہوں۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو مجھے تمہارا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔۔۔ میں آنکھیں کھولتا ہوں تو میرا ذہن تمہارے خیالات سے نکل نہیں پاتا۔۔۔ ان چند مہینوں میں، میں نے تمہیں اتنا سوچا ہے آئے کت!۔۔۔ کہ 'میں' میں نہیں رہا۔۔۔ شاید تم ہو گیا ہوں۔"

بازو پھیلائے گول گول حرکت کرتا وہ اتنے جذب سے بول رہا تھا کہ آئے کت ہکا بکا رہ گئی۔ اتنی محبت اتنی چاہت؟؟

"لیکن معاویہ!۔۔۔" وہ سہم کر بولی۔ محبت کی اس شدت نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔ جنہیں محبت دیر سے ملتی ہے وہ وہمی بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ "میں نے واقعی کبھی نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ رکا اور ایک دم سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "تمہاری آنکھوں سے جھلکتی ہے میری محبت۔۔۔ تمہارے چہرے پر لکھا ہے کہ میرے عشق نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔۔۔ تمہاری پیشانی پر بس ایک ہی تحریر ہے کہ معاویہ شیرازی میرے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور ایسے مان و یقین بھرے لہجے میں بولتا وہ کوئی دیوانہ سا محسوس ہوتا تھا۔

آئے کت کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ محبت نے اسے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا تھا۔

"کچھ زیادہ ہی شاعرانہ موڈ نہیں ہو رہا جناب کا؟" اپنی لرزتی پلکوں سے جھلکتے اعتراف کا راز چھپانے کے لیے اس نے چہرہ ہی دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ایسے ہی ہنستا ہوا وہ برآمدے کی گرل پر کہنیاں ٹکا کر نیچے وادی میں جھانکنے لگا۔

"میں سوچ رہا تھا اچھی شادی ہو رہی ہے ہماری۔ میں تو تمہاری شکل دیکھنے کو ہی ترس گیا ہوں۔"

"شادی ہو جانے دو۔۔۔ بس پھر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتے ہی وقت گزرا کرے گا۔" وہ شرارت سے گویا ہوئی اور جا کر اس کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

"سوچتا ہوں تم میری دلہن بن کر کیسی لگو گی؟"

"ویسی ہی جیسی سب دلہنیں لگتی ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ تم عام دلہن نہیں ہو تم بہت خاص ہو۔ تمہیں اس کرہ ارض پر سب سے حسین نظر آنا ہے۔"

"معا" آئے کت چونک کر ایک طرف دیکھنے لگی۔ اس کا دل سہم گیا اور ہراس اس کی آنکھوں میں دکھائی دینے لگا۔

"کیا ہوا؟" معاویہ نے اس کی آنکھوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے لگا۔۔۔ میں نے وہاں کسی کو دیکھا ہے؟" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"لیکن وہاں پر تو کوئی بھی نہیں ہے آئے کت!"

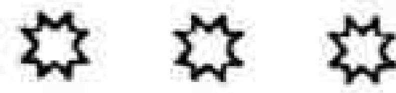
"نہیں معاویہ! مجھے دھوکا نہیں ہو سکتا۔۔۔ وہاں پر ابھی کوئی تھا اور چھپ کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔" اس کے لہجے میں خوف تھا۔

"ہو سکتا ہے آیوشمتی ہماری شادی میں شرکت کرنے پہنچ گئی ہو۔" معاویہ نے بظاہر سنجیدگی سے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

"پلیز معاویہ بی سیریس۔" وہ چڑ کر بولی۔ معاویہ ہنسنے لگا۔

"تمہارا وہم ہو گا یار! لیکن تمہیں یقین نہیں ہے تو چلو۔۔۔ ہم خود جا کر دیکھ لیتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس

طرف چلنے لگا جس طرف آئے کت کو کسی کی موجودگی کا گمان ہوا تھا۔
"نہیں۔۔۔ نہیں رہنے دو۔" آئے کت نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "میرا وہم ہی ہوگا۔" اس کی آواز اور لہجہ گو اس کی بات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اسے یقین تھا اس نے وہاں کسی کو دیکھا ہے۔
معاویہ نے اس کی بات کا اعتبار کر لیا۔ جن سے محبت کی جاتی ہے ان کی باتوں کا اعتبار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ جس محبت میں اعتبار نہ ہو وہ محبت نہیں غلط فہمی ہوتی ہے۔
"میرا برائیڈل ڈریس آگیا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔"
وہ معاویہ کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف چلنے لگی لیکن مڑ مڑ کر راہداری کے کونے کی طرف دیکھتی رہی۔ جہاں ابھی بھی ایک ہیولہ اسے حرکت کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور آئے کت کی الجھن بڑھا رہا تھا۔



مونٹوک کے ساحل پر ایک خوب صورت رات دھیمے سروں سے بہتی تھی۔ ستارے اس رات اتنے چمکدار اور بڑے دکھائی دے رہے تھے کہ ان کا عکس پانی میں دکھائی دیتا تھا۔ منفرا کاٹیج کے ٹیرس پر گرل پر کہنیاں ٹکائے کھڑی تھی اور بڑے دن بعد فرصت سے اس منظر کا نظارہ کر رہی تھی۔ اسی اثناء میں آدم ٹیرس پر آیا اور منفرا کو دیکھ کر شرارت سے مسکرانے لگا۔ منفرا نے بھی دروازہ کھلنے کی آواز پر گردن موڑ کر دیکھا تھا اور پھر اس نے ہی گردن واپس موڑلی تھی۔
"میری بہن اتنے دن کے بعد آئی ہے اور آتے ہی ناراض ہوگئی ہے۔۔۔ بھئی یہ تو کوئی اچھی بات نہ ہوئی۔" وہ شرارت سے کہتا ہوا اس کے ساتھ آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کے دو گلاس تھے۔ ایک اس نے منفرا کی طرف دوستانہ انداز میں بڑھا دیا تھا۔
"میری اتنی مجال کہاں؟ ویسے بھی تمہارے اور ڈیڈ کے اختلافات ختم ہوں تو کسی دوسرے کے ناراض ہونے کی باری آئے۔" روٹھے انداز میں کہتے ہوئے اس نے گلاس پکڑ لیا تھا۔
"میرا ڈیڈ کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں ہے۔" وہ گرل سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "اگر وہ پاکستان نہ جانے والی میری بات مان لیں تو بلیو می۔۔۔ وہ بڑے اچھے فادر ثابت ہو سکتے ہیں۔" سنجیدگی سے اس نے کہا لیکن آنکھیں شرارت سے جگمگا رہی تھیں۔
منفرا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کو وہ کسی صورت تیار نہیں تھا۔
"تم نے انہیں ناراض کر دیا ہے۔"
"منالوں گا۔" وہ بڑا پر اعتماد دکھائی دے رہا تھا اور وہ سب ایسے ہی تھے۔ منہ در منہ اگر لڑتے بھی تھے تو دل ایک دوسرے کی محبت سے سرشار تھے۔
"خیر چھوڑو اس بات کو۔۔۔ یہ بتاؤ تمہیں کوئی اچھا لڑکا ملا۔"
"اچھا لڑکا کوئی تمہارا گمشدہ آئی پیڈ تو ہے نہیں کہ کسی روز میں الماری کھولوں اور وہاں پڑا ہوا مل جائے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ جواب میں آدم قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اس نے منفرا کی بات سے بڑا حظ اٹھایا تھا۔
"اینڈ بائے دا وے۔۔۔ یہ لڑکا ملنے والی بات مام یا ڈیڈ کے سامنے مت کر دینا۔۔۔ میں بوائے فرینڈ بناؤں یا نہ بناؤں ان دونوں کو چکر ضرور آجائیں گے۔" وہ مسکرا کر ہی کہہ رہی تھی۔
"اوہ کم آن۔۔۔ یہ ہماری زندگی ہے ہم جیسے چاہیں اسے گزاریں۔"
"یہ غلط بات ہے آدم! ہمارا مذہب اور ہمارا کلچر ہمیں ان باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"مذہب کی بات کرو۔۔۔ کلچر کی نہیں۔ ہم کوئی ڈیڈ کے ملک میں نہیں رہتے کہ وہاں کے کلچر کو فالو کریں۔" اس نے ناگواری سے کہا۔

"میں شاید تمہارے ویوز (نظریات) کبھی چینج نہیں کر پاؤں گی۔" وہ ہار مانتے ہوئے بولی۔

"لیکن ایک بات طے ہے، مام ڈیڈ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی میں کبھی بوائے فرینڈ بھی نہیں بناؤں گی۔"

"اوہ ریئلی۔" وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

"اور اس اسٹوپڈ شامیر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

منفرا نے چونک کر اسے دیکھا۔ "شامیر کے بارے میں کیا خیال ہونا ہے؟ وہ بچپن کا دوست ہے میرا اور بس۔"

"پسند کرتا ہے وہ تمہیں۔" آدم نے شرارتی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے جیسے انکشاف کیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" منفرا نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔

"شامیر باؤنڈریز میں رہنے والا انسان ہی نہیں ہے۔ وہ آزاد منش انسان ہے۔ آج یہاں تو کل وہاں۔۔۔ اب یہی دیکھ لو، تقریباً" آٹھ ماہ سے ہم دونوں کی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ شادی کر کے گھر بار سیٹ کرنے کے بارے میں وہ کیسے سوچ سکتا ہے۔ ہم دونوں کی تو مینٹل اپروچ ہی ایک جیسی نہیں ہے۔ ریلیشن شپ کیسے بنا سکتے ہیں ہم لوگ۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا ان مختصر جملوں میں اس کی زندگی کا سارا فلسفہ موجود تھا۔

"بائی دا وے۔۔۔ تمہاری ملاقات ہوئی ہے شامیر سے؟"

"نہیں۔۔۔ کافی عرصے سے نہیں ہوئی۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔

"بس میں کسی ایسی انسان سے شادی نہیں کروں گی جس کے آج اور کل کی کوئی خبر ہی نہ ہو۔۔۔ جو اتنا ان پریڈکٹیبل ہو کہ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہا ہی نہ جاسکے۔"

"لیکن شامیر ڈیڈ کو بھی پسند ہے میرا خیال ہے وہ تمہاری شادی اسی سے کرنا چاہیں گے۔"

"جب شادی کی باری آئے گی تب سوچیں گے۔" اس نے کندھے اچکا کر بات ہی ختم کر دی۔

"اچھا۔۔۔ ایک چیز تو دیکھو۔" آدم نے اپنی قمیص کی آستین کو موڑتے ہوئے جوش سے دکھایا کندھے سے ذرا نیچے عقاب کا ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ منفرا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تم نیو ہارلم گئے تھے؟" اس نے صدمے میں گھر کر پوچھا۔

آدم نے مسکراہٹ دبائے زور زور سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ابھی چند روز پہلے ہی گیا تھا۔۔۔ یہ ٹیٹو وہیں سے بنوایا ہے میں نے۔" اس کا جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

"تھوڑی عقل کرو آدم! ڈیڈ کو ایسی چیزیں پسند نہیں ہیں۔ انہیں پتا چلا کہ تم نے ٹیٹو بنوایا ہے تو بہت ناراض ہوں گے۔"

آدم نے جھنجلا کر آستین نیچے کر لی۔ "ہر وہ چیز جو مجھے اچھی لگتی ہے وہ ڈیڈ کو بری لگنے لگ جاتی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے لیکن ٹیٹوز بنوانے کو وہ مذہبی اعتبار سے غلط سمجھتے ہیں۔" اس نے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اوہ کم آن۔" وہ چڑ گیا تھا "اور ویسے بھی ڈیڈ کو کون بتائے گا۔ چلو نیچے چلتے ہیں۔۔۔ مجھے اب بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ موضوع ہی ختم کرتا نیچے چلا گیا۔ منفرا گہری سانس بھرتی اس کے پیچھے چل دی۔

☆ ☆ ☆

خوش نصیب سر پکڑے بیٹھی تھی۔ جتنی پریشان کن صورت حال وہ دیکھ رہی تھی' اس کا ذاتی خیال تھا کہ اس سے بڑی پریشانی اور کوئی انہیں ہو سکتی ہے۔ سوال پر سوال جنم لے رہے تھے کہ جواب کوئی ملتا تھا۔ رات جو کچھ بھی ہوا وہ خود اس کے لیے ایک معمہ بن کر رہ گیا تھا کیونکہ اسے خود پتا نہیں تھا وہ بستر سے نکل کر چھت کی منڈیر پر آدھی رات کو کون سی پتنگیں لوٹنے چڑھی تھی۔ وہ تو بھلا ہو طوطے بھائی کا۔ بروقت اسے کھینچ کر دیوار سے اتار لیا ورنہ ذرا سا پیر کھسکتا اور وہ فضل منزل کے صحن میں کھلے ہوئے بھیجے کے ساتھ پڑی ہوئی نظر آتی۔

''تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ ایسی کون سی قیامت ٹوٹی ہے تم پر۔ کہ خود کشی کرنے چھت پر پہنچ گئیں؟'' روشن امی نے بے حد غصے سے اس سے پوچھا۔

''لوگ اس سے بڑے بڑے مصائب دیکھتے ہیں لیکن اف تک نہیں کرتے۔ ایک تم ہو جو ذرا سی پریشانی سے گھبرا گئیں۔''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں روشن امی! خود کشی کرنے نہیں چڑھی تھی میں۔'' اس نے پریشانی سے منہ پھلا کر کہا۔

''اور جب سے آپ کو پتا چلا ہے' آپ مجھے ہی ڈانٹ رہی ہیں۔ حالانکہ اتنا تو آپ کو میرے بارے میں پتا ہونا چاہیے..... لاکھ چیخ چلا لوں۔ لاکھ اعتراض کر لوں لیکن اتنا مایوسی کو کبھی اپنے سر پر سوار نہیں ہونے دیتی میں کہ خود کشی کا ہی سوچنے لگوں۔''

وہ بولنے لگی تو روشن امی خاموش ہو گئیں۔ اس کی بات میں دم تو تھا۔

''اور یہاں ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' یہ کون سی نئی بات ہے..... یہ سب تو ہمیشہ سے ہی ہوتا رہا ہے۔ ان سب زیادتیوں کے لیے خود کشی جیسا بڑا قدم کیوں اٹھاؤں گی میں۔''

''تو پھر طوطے نے یہ کیوں کہا کہ تم خود کشی کرنے والی تھیں؟'' وہ الجھ کر پوچھ رہی تھیں۔

''کیونکہ طوطے بھائی کی عقل ان کے قد سے کہیں چھوٹی ہے۔'' وہ چڑ کر بولی۔ ''میری جان بچالی۔ احسان کیا لیکن یہ خود کشی والی بکواس کر کے دماغ خراب کر دیا ہے میرا..... اب اس احسان کی وجہ سے انہیں ایک مکا مار کر انہیں مزہ بھی نہیں چکھا سکتی۔'' سیدھے ہاتھ کو بھینچ کر بائیں ہتھیلی پر مارتے ہوئے کہنے لگی۔

''بکو مت۔'' روشن امی ڈپٹ کر بولیں۔

''پہلے تم کوئی کم بڑی مصیبت تھیں جو نیند میں بھی چلنا شروع کر دیا۔ اب رات کو میں دروازے پر تالا لگا کر سویا کروں گی۔'' بڑبڑانے کے انداز میں اسے دھمکایا۔ ''اور خبردار جو تم نے طوطے سے کچھ کہا۔ وہ بے چارہ معصوم انسان تمہاری جان بچا کر مزید مشکل میں آگیا ہے۔''

''ارے اس طوطے کی جان تو میں پچّی (گردن) دبا کر نکالوں گی۔ مفت میں بدنام کر دیا مجھے۔'' منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر خاموش ہو گئی' پھر کچھ سوچ کر پیچھے آئی تو فہمینہ فون ہاتھ میں لیے اسی کے پاس آ رہی تھی۔

''اچھا ہوا تم مجھے یہیں مل گئیں۔ یہ فون پکڑو..... کیف بات کرنا چاہتا ہے۔''

خوش نصیب نے منہ بنایا تو فہمینہ نے زبردستی اسے فون پکڑا دیا۔

''بات کر کے میرے کمرے میں فون دے جانا۔'' وہ کہہ کے چلی گئی۔

''ہیلو..... لگتا ہے تمہیں بھی اطلاع مل گئی۔'' فون کان سے لگاتے ہی اس نے بے زاری سے کہا۔

''مجھے تو رات ہی بذریعہ خواب اطلاع مل گئی تھی۔'' کیف بولا۔ ''میں نے دیکھا' تم دیوار پر چڑھی میرا نام لے لے کر پکار رہی ہو اور زور' زور سے کہہ رہی ہو۔ کیف! اگر تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے تو میں چھت سے کود کر

اپنی جان دے دوں گی۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔
"بیڑا غرق ہو طوطے بھائی کا۔۔۔ پھر تو مجھے کود ہی جانے دیا ہوتا۔" وہ غصے سے بولی۔ کیف کو ایسے ہی کسی جواب کی امید تھی، سو ذرا بھی طبیعت مکدر نہ ہوئی۔
"ہائے داوے۔۔۔ تم دیوار پر کیا کرنے کے لیے چڑھی تھیں؟"
"ستارے توڑ کر لانے تھے۔ سوچا تھا چھلانگ لگاؤں گی اور ایک جست میں مٹھی بھر کر تارے لے آؤں گی۔ میاں مٹھو نے ساری پلاننگ ہی خراب کر دی۔"
"تو تم نے مجھ سے کہا ہوتا۔۔۔ مٹھی بھر کیا میں تمہیں جھولی بھر ستارے دیتا۔" درحقیقت وہ سارا معاملہ سن کر پریشان ہو گیا تھا، اسی لیے جذب سے کہہ رہا تھا۔ لڑائی جھگڑے ایک طرف لیکن وہ بچھل پیری اسے عزیز بہت تھی۔
"جو کام تم کر نہیں سکتے۔۔۔ اس کا دعوا کیوں کرتے ہو؟" وہ تکلفاً بھی دل رکھنے کی عادی نہ تھی۔
"کیونکہ دعوا ارادے کی علامت ہے اور ارادہ کامیابی کی پہلی شرط۔" وہ فوراً بولا۔
"ایسے دعوے تم اپنی سہیلیوں سے کیا کرو کیونکہ میں ایسے دعوؤں سے متاثر ہونے والی نہیں ہوں۔" وہ قطعیت سے بولی۔
"ان ہی دعوؤں سے اپنا بناؤں گا تمہیں۔۔۔ میرا بھی یہ وعدہ ہے۔" اس کا لہجہ اتنا مستحکم تھا کہ ذرا دیر کو۔۔۔ خوش نصیب چپ سی رہ گئی۔ اگلے ہی پل کیف نے بات پلٹ دی۔
"اچھا سنو۔۔۔ اور پوری سنجیدگی سے سنو۔۔۔ میرے ساتھ آئیں بائیں شائیں مت کرو اور معاملہ کیا ہے، مجھے صرف یہ بتاؤ۔"
"کوئی معاملہ نہیں ہے۔" وہ اس بار قدرے تحمل سے بولی تھی۔ "نیند میں شاید چل رہی تھی۔ طوطا بھائی کا تو تمہیں پتا ہے۔۔۔ بات کا بتنگڑ بنا ڈالا۔"
"تمہارے حریفوں کا خیال ہے تم نیند میں نہیں چل رہی تھیں بلکہ کسی لڑکے کا معاملہ ہے۔ سچ بتاؤ۔۔۔ خوش نصیب وہ لڑکا میں ہی ہوں نا۔" وہ ذرا بھی سنجیدہ نہیں تھا لیکن اتنی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا کہ خوش نصیب کو ہنسی ہی آ گئی، پھر اس ہنسی پر ناراضی کا غبار چھایا۔
"یہ کون سے حریف ہیں۔۔۔ ان کا نام تو بتاؤ ذرا۔۔۔"
"ارے جانے دو۔۔۔ جتنے منہ اتنی باتوں والا حساب ہے۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ میں دو تین دن میں چکر لگاؤں گا، پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔" اس نے فون بند کر دیا۔ خوش نصیب وہیں سے شامیر کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔
شامیر کے کمرے کے باہر رک کر اس نے دھڑا دھڑ دروازہ بجایا۔ غصے سے اس کا برا حال تھا۔ زندگی اچھی بھلی سکون سے گزر رہی تھی کہ بیچ میں یہ شامیر ٹپک پڑا۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے وہ جن ٹپک پڑا۔ ستیاناس ہو سب کا۔
وہ بھلا مانس سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھا اور سٹپٹا کر دروازہ کھول دیا۔
"خوش نصیب تم؟" وہ حیران ہوا۔
"اپنے اس موکل سے کہو میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا تھا۔
"کیا؟" شامیر حیران پریشان۔
"ہاں۔۔۔ اور اس سے یہ بھی کہو کہ انسان کا بچہ ہے۔۔۔ نہیں میرا مطلب ہے جن کا بچہ ہے تو میرے سامنے آ کر بات کرے۔ یہ کیا کہ چھپ چھپ کر مجھے زچ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ میں نے بڑوں بڑوں کو سیدھا کر دیا ہے۔۔۔ اس جن کو بھی دیکھ لوں گی۔" اس نے غصے سے کہا اور وہیں سے واپس پلٹ گئی۔

✡ ✡ ✡

مہندی کی رات فلک بوس میں ستاروں کے جھرمٹ کی رات تھی۔
اتنے رنگ، اتنے قہقہے فلک بوس میں سمٹ آئے تھے کہ در و دیوار نے ایسی رونق شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔ موسیقی، کھٹا کھٹ تصویریں کھینچتے کیمرے، مشروبات، مہمانوں کی تواضع کا ہر انتظام موجود تھا۔ اردشیر ازی نے جیسا کہا تھا، بڑے بیٹے کی شادی کو اتنا ہی یادگار بنا رہے تھے۔
مہندی کی دلہن کو پالکی میں بٹھا کر اسٹیج تک لایا گیا۔ وہ اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ آسمان کے چاند کو بھی شاید اس سے حسد محسوس ہو رہا ہوگا۔
دولہا اتنا خوش تھا، ایسی روشنیاں پھیلی تھیں اس کے چہرے پر کہ محبت اسے دیکھ دیکھ خود پر فخر کرتی تھی۔ اس کے خیال میں روئے زمین پر اگر آج کی تاریخ میں کوئی خوش قسمت تھا تو بس وہی تھا۔ ممکن ہے آج کی رات کوئی اور بھی نوازا گیا ہو لیکن اسے تو بس خود پر ناز تھا۔
جب وہ پالکی سے اتری تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، وہ شہزادوں کی سی آن بان والا اس کے استقبال کے لیے ہاتھ باندھے، مسکراہٹ لبوں کے کناروں میں سمیٹے اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی دیوی ہو۔ خوش باش، پُرسکون اور پور پور محبت میں ڈوبا ہوا۔
وہ سہج سہج قدم دھرتی اس کے طرف بڑھی۔ جب قریب پہنچی تو وہ اردگرد کی پروا کیے بنا اس کے کان کے قریب جھک کر سرگوشی کرنے لگا۔
"مجھ سے زیادہ قسمت کا دھنی کون ہوگا آج اس زمین پر۔"
سب طرف شور مچ گیا، خوب ہوا ہوئی کہ دولہا نے دلہن کے کان میں کیا کہا ہے؟ لیکن وہ مسکراتا رہا اور غلطی سے بھی اپنے اس راز کا پتا کسی کو نہ دیا۔ دلہن نے شرما کر نظروں کو کچھ اور جھکا لیا۔ پھر رسم شروع ہوئی اور دیر تک ان پر نظریں اور روپے وارے جاتے رہے۔ انہیں مہندی اور ابٹن میں شرابور کر دیا گیا۔ اتنی خوشی اور رنگوں کے بیچ معا" دلہن کی نظریں اٹھیں اور وہ دھک سے رہ گئی۔ بہت اوپر "فلک بوس کی چھت کے کنارے مصنوعی روشنی کی کرنوں سے دور ایک تن تنہا ہیولہ نہ جانے کب سے کھڑا ان دونوں کی خوشیوں کو نگلنے کو تیار کھڑا تھا۔
"معاویہ!" اس نے بے ساختہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ معاویہ نے اسے دیکھا اور چونک سا گیا کیونکہ آئے کت کا چہرا ابٹن سے بھی زیادہ زرد دکھائی دیتا تھا۔ اس نے آئے کت کی آنکھوں کے تعاقب میں دیکھا اور ہکا بکا رہ گیا۔
ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ خوشی جو انسان کو اس کی خوش قسمتی کا پتا دے۔ وہ اسے راس بھی آئے۔

✡ ✡ ✡

شہر کے پوش علاقے میں بنگلے کے عین سامنے ایک جھٹکے سے رکشہ رکا تو خوش نصیب پریشان سی اتری۔ اتنا بڑا عالی شان بنگلہ... وہ تو ایک نظر میں ہی متاثر ہو گئی تھی۔ یہاں آ تو گئی تھی۔ لیکن اب عجیب کشمکش کا شکار تھی گو کہ جبران سے ملنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، لیکن پھر بھی دل میں کوئی پھانس سی چبھ رہی تھی اور اسے بے چین کر رہی تھی۔ ذہن پر الگ بوجھ تھا۔ روشن امی یا ماہ نور کو اس نے اس سارے معاملے کی بھنک بھی نہ پڑنے دی تھی۔ آخر کو وہ اتنی ذہین اور معاملہ فہم لڑکی تھی بہتر سمجھا اس نے کہ اس معاملے کو بھی خود ہی سنبھال لے اور روشن امی کو مزید پریشانیوں سے بچا لے۔
بس یہی سوچ کر وہ شامیر کے دیے ہوئے پتے پر مقررہ وقت میں پہنچ گئی تھی۔

"ہاں بھیا! کتنے پیسے؟" پلٹ کر اس نے رکشے والے سے پوچھا' اسے مطلوبہ رقم فراہم کی اور اندر جانے کے لیے پر تولنے لگی۔ رکشا ایک زوردار آواز سے شور مچاتا اس کے عقب سے نکل گیا تھا۔ خوش نصیب اس عالی شان بنگلے کو دیکھتی متذبذب سی کھڑی تھی۔ پھر دل کو ذرا مضبوط کر کے اس نے آگے بڑھ کر دروازے کی گھنٹی پر ہاتھ رکھا' لیکن گھنٹی بے جان سی محسوس ہو رہی تھی تب اس نے جھجکتے ہوئے گیٹ سے منسلک چھوٹے دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دروازہ اسی کے انتظار میں کھلا چھوڑ دیا گیا ہو۔

خوش نصیب جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ داہنے ہاتھ چھوٹا سا لان تھا' جس کی گھاس ترو تازہ اور بہترین محسوس ہوتی تھی۔ سامنے صاف پتھروں کی غیر پالش شدہ روش تھی جو بنگلے کے داخلی دروازے تک جاتی تھی۔ بائیں ہاتھ شامیر کی اوڈی پارک کی گئی تھی اور کار کے دوسری طرف اینٹوں کا ڈھیر اور سیمنٹ کی بوریاں نظر آرہی تھیں۔ بنگلہ ابھی تعمیر کے مراحل میں تھا اور بہت سے کام ابھی نامکمل دکھائی دے رہے تھے۔

ابھی وہ وہیں کھڑی تھی کہ معاً" اندر کا دروازہ کھلا اور شامیر باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر خوش ہوا۔

"شکر ہے تم آگئیں۔" اس نے جیسے سکون کی سانس لی تھی۔ "اتنی دیر لگا دی آنے میں... میں تو سمجھا تم نہیں آؤ گی۔"

"میں تو کب سے آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن سب گھر والے صحن میں جمع تھے۔ پتا ہے ابھی بھی میں اتنی مشکل سے نکلی ہوں۔" خوش نصیب نے کہا۔

"یہ بات میں سمجھ سکتا ہوں... تم سمجھ سکتی ہو۔ جبران تو نہیں سمجھے گا۔" شامیر نے فکر مندی سے کہا تھا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں سمجھے گا؟" خوش نصیب تنک کر بولی تھی۔

"تم بھول گئیں۔ وہ کوئی انسان نہیں ہے کہ ہمارے مسائل سمجھے۔"

"ہاں... ہاں... جانتی ہوں جن ہے وہ' یہی جن گلے پڑ گیا ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی' پھر جلدی سے بولی۔

"اچھا سنو... وہ آگیا ہے کیا؟"

"ہاں... کب کا۔"

"دیکھنے میں کیسا ہے؟ میرا مطلب... زیادہ ڈراؤنا تو نہیں ہے نا؟" اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا تھا۔

شامیر سوال سن کر ہنس پڑا۔

"اندر آکر خود دیکھ لو۔" اس نے دروازہ کھول دیا۔ خوش نصیب نے تھوک نگل کر حلق تر کیا اور اندر داخل ہو گئی۔ شامیر اسے سیدھا ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرا باقی بنگلے کی نسبت کچھ سامان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک صوفہ ایک سنگل بیڈ اور ایک سینٹرل ٹیبل اور دو کرسیاں نظر آرہی تھیں۔ فرنیچر سارا ہی نیا اور جدید اسٹائل کے مطابق تھا۔ سامنے دیوار پر ایک بڑا سا آرائشی شیشہ نصب تھا۔ خوش نصیب جا کر صوفے کے پاس کھڑی ہوئی تو اس نے دیکھا' وہ اور شامیر پورے کے پورے سامنے شیشے میں نظر آرہے تھے۔

"تم یہاں بیٹھو... میں جبران کو بلاتا ہوں۔" وہ جانے لگا تو خوش نصیب نے جلدی سے کہا۔

"سنو شامیر!" وہ رک گیا اور مڑ کر دیکھا تو وہ بولی۔ "تم بھی ساتھ آنا... اسے اکیلے مت بھیجنا۔" وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ اس کا ڈر اور گھبراہٹ چہرے پر دکھائی نہ دے۔ لیکن اتنی کوشش کے باوجود اس کی شکل دیکھتے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے دل میں کیا چل رہا ہے۔

شامیر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن خوش نصیب کی ناراضی کے ڈر سے اس نے جلدی سے مسکراہٹ چھپالی۔

"تم ڈرومت... وہ ایسا بھی کوئی بدشکل نہیں ہے۔ اچھا خاصا ہینڈسم ہے میرا دوست۔"

"تمہارے اس ہینڈسم دوست کا رشتہ نہیں لینا مجھے۔ جو یہ بتا کر امپریس کرنے کی کوشش کررہے ہو۔" حسب عادت وہ تنک کر بولی۔

"میں بلاتا ہوں جبران کو..." شامیر جلدی سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ خوش نصیب تھوڑی دیر کھڑی کمرے کا جائزہ لیتی رہی پھر صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی پورے وقت اس نے آیت الکرسی کا ورد جاری رکھا تھا اور نانی کی کالے دانوں والی تسبیح بھی وہ پرس میں رکھ کر ساتھ لائی تھی۔ کافی دیر جب اسے ایسے ہی بیٹھے گزر گئی تو دروازے پر کھٹکا سا سنائی دیا۔

خوش نصیب سیدھی ہو کر بیٹھی اور اس نے آیت الکرسی کی تسبیح مزید خشوع و خضوع سے پڑھنا شروع کردی۔

دروازہ کھلا۔ خوش نصیب بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

پہلے شامیر اندر داخل ہوا۔ خوش نصیب کی پیشانی پر ڈر اور گھبراہٹ کے مارے پسینہ چمکنے لگا۔ شامیر نے اندر آکر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر دروازہ پورا کھول دیا۔

"آؤ..." وہ ذرا سا دروازے کی طرف منہ کرکے کسی کو اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

خوش نصیب کا دل اگر اس وقت باہر نکالا جاتا تو وہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ چکا ہوتا۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا اور پیشانی پر اتنا پسینہ تو دکھائی دے ہی رہا تھا کہ ایسا لگتا تھا کہ ابھی چہرا دھو کر آئی ہے۔ دروازے کے باہر ذرا سی حرکت دکھائی دی اور جبران مضبوط قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ خوش نصیب کا دل جیسے ایک پل کے لیے بند ہو کر دوبارہ رواں ہوا تھا اور ڈر کے مارے جو چیخ اس کے ہونٹوں سے نکلنے کا ارادہ رکھتی تھی، وہیں پر دم توڑ گئی۔ بلکہ اس کی جگہ آنکھوں میں ایسا تعجب چمکا کہ آنکھیں جگر جگر کرنے لگیں۔

وہ ایک خوف ناک چہرے اور عجیب الخلقت مخلوق کی توقع کررہی تھی لیکن اس کے سامنے جو کھڑا تھا، وہ اتنے خوب صورت چہرے کا مالک تھا کہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا مشکل لگتا تھا۔ ہاں آنکھیں اور دیکھنے کا انداز کچھ پُراسرار سا معلوم ہوتا تھا لیکن چہرہ ایسا ہرگز نہ تھا جیسا وہ اب تک سوچ چکی تھی۔ کہانیوں، فلموں اور ڈراموں نے جن بھوتوں سے متعلق ایک جو واضح شکل ہمیں فراہم کی ہے، وہ سوفیصدی ڈر اور خوف کے عنصر پر ہی مبنی ہوتی ہے سو خوش نصیب بھی ایک خوف ناک چہرے کی منتظر تھی، لیکن اندر آنے والا نہ صرف وجیہہ تھا بلکہ اس کی وجاہت عام مردانہ وجاہت کے پیمانوں سے کچھ آگے کی چیز معلوم ہوتی تھی۔

"یہ خوش نصیب ہے۔" شامیر نے اسے بتایا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اس نے اسی بل دار پیشانی کے ساتھ اپنی آنکھیں خوش نصیب کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"خوش نصیب ہوتی تو یہاں کیوں آتی۔" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوا اور اس کی آواز سن کر خوش نصیب کو ایسا لگا جیسے اب تک کی سنی ہوئی ساری ہی آوازیں، لہجے بے معنی سے تھے۔

"اسے پتا ہے؟" پھر اس نے پوچھا۔

"لاعلمی پہلی شرط تھی۔" شامیر مسکرایا۔

"اچھا..." وہ الجھا ہوا سا خاموش ہو گیا ایک نظر خوش نصیب کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔

شامیر نے ایک نظر خوش نصیب کو دیکھا اور مسکراتا ہوا باہر نکل کر کمرے کو تالا لگا دیا۔ اس سے پہلے کہ خوش نصیب ہڑبڑا کر جا کر دروازہ دھڑ دھڑاتی، شامیر دروازے کو تالا لگا کر جا چکا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

Watch Us On

YouTube

چہرے کے فالتو بالوں کا

بہت ہی آسان علاج

YouTube



Health Care Club



چہرے کی جھُریوں کا

بہت ہی آسان علاج

YouTube



Health Care Club



منشا محسن علی



کانچ کی چوڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی تھیں۔ وہ زور' زور سے دروازے پر دستک دیتے ہوئے رو رہی تھی۔

"ابا! آپ نے کبھی مجھے بیٹی نہیں سمجھا مگر آج تو بیٹی جیسا سمجھ کے ہی سر پر ہاتھ رکھ کے رخصت کرتے ہوئے کہہ دیتے۔ "جالالی تجھے اللہ خوش رکھے۔"

سرخ جوڑے میں سرسوں کا پھول بنی لالی "ساری" چوڑیاں توڑ بیٹھی تھی۔ در پھر بھی نہ کھلا' اندر بیٹھا شخص "پتھر" تھا۔

آنگن بھانت بھانت کی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔ ساری بارات جانے کو تیار کھڑی تھی۔ لمبی شام کا طویل سفر تھا۔ جانے کتنی گھاٹیاں' دریا پار کرنے تھے۔۔۔ مگر کھیل ختم نہ ہوتا تھا۔

اماں آنسو چھپاتی اس تک آئی تھیں۔ "بس کر لالی! بس کر۔" کلائیوں سے خون کی بوندیں فرش سرخ کرنے لگیں۔

"بس کر دوں اماں؟" آواز میں مردہ ابابیلوں کی مرگ کے بین تھے۔

"چل اٹھ۔۔۔ بارات نے لمبا سفر کرنا ہے۔ وہ دروازہ نہیں کھولے گا۔" لالی نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھے تھے۔

"تب تک چوکھٹ نہیں چھوڑوں گی' جب تک کہہ نہیں دیں گے' جالالی جا' تجھے اللہ خوش رکھے۔"

وہ زخمی ہاتھوں سے اب بھی دروازہ بجا رہی تھی۔ آنگن میں باراتی تماش بین تھے۔

"وہ نہیں کہے گا۔" اماں نے اپنے سر سے دوپٹا اتار کر اس کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ "لالی! میری عزت کی ہی لاج رکھ لے۔"

سو دکھوں کی ماری اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو بار گری۔ تیسری بار ہی اٹھ سکی تھی۔ ہولے ہولے چلتی کھڑکی تک آئی اور مدھم سرگوشی کی جو کہ تماش بینوں کی سماعتوں تک رسائی حاصل نہ کر سکی تھی۔

"ابا! جس طرح بچپن سے اپنے بچوں کے سر سے سکے وار کے مجھے صدقہ دیتے تھے اور میں ہنسی خوشی رکھ لیتی تھی۔ آج بھی خوشیاں اپنے بچوں کے سر سے صدقہ کر کے لالی کو دے دیتے۔ ہنسی خوشی چوکھٹ پار کر جاتی۔"

ننگے پاؤں کانچ پر قدم رکھتی' وہ سیڑھیوں تک آئی تھی۔

"اماں! میں جا رہی ہوں۔ اب کبھی پلٹ کر اس گھر کی چوکھٹ پر قدم نہ رکھوں گی۔"

سرخ گٹھڑی سے لرزتا کانپتا فرمان بلند ہوا۔۔۔ تماش بین ہنسنے لگے۔ وہ ننگے پاؤں جا رہی تھی۔

"باجی!" پلٹ کر دیکھا۔ شانی اس کا کھسّہ تھامے کھڑی تھی۔ زرد گیندے کے پھول سی اداس لڑکی' روتی ہوئی۔

"شانی! سفر پر جاتے مسافروں کو پیچھے سے آواز نہیں لگاتے۔"

"کیوں؟" جانے اس اہم وقت میں وہ غیر اہم سوال کیوں کیا گیا تھا۔

"گھوڑوں کے سم ٹوٹ جاتے ہیں۔" سرخ گٹھڑی نے فلسفے کا دقیق پہاڑ پڑھا۔ لکڑیوں سے سرمئی دھواں اٹھا۔ شانی اس کے پیروں میں کھسّہ پہنا رہی تھی۔ کھڑی ہوئی تو اس کے گلے آن لگی۔ چولہے میں



نکڑیاں پہنچ گئیں۔

"شانی!" وہ سرگوشی شانی پر بڑی بھاری تھی۔ بھاری ترین۔

"میرا ایک کام کرے گی۔" ترسوں کی دلہن پیلی ہوتی گئی۔

"جی باجی!" گیندے سی لڑکی کانپ گئی۔ بلبلوں کے جھنڈ راستے بھٹک گئے۔

"جب وہ دروازہ کھول کر باہر آئیں تو تلوار سی سیدھی ان کے سامنے کھڑی ہو جانا اور کہنا بیٹیاں تو پکھی ذات ہوتی ہیں۔ فجر کو ہوتی ہیں، شام کو اڑ جاتی ہیں۔ پکھی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا کرتے۔ ان کے پنکھ جھڑ جاتے ہیں اور وہ ساری عمر آس میں سفر کرتے ہیں۔"

ڈھول کی تھاپ پہ لالی کی سرگوشی لرز گئی۔ جھٹکے سے شانی کو چھوڑتی وہ آگے جا رہی تھی۔ چوکھٹ پر پہنچی تو آخری بار مڑ کے دیکھا۔ دروازہ بند ہی تھا۔ اماں، شانی، زلیخا، سلیم سیڑھیوں پر کھڑے رو رہے تھے۔

لالی نے کچی زمین سے خاک اٹھا کر بنارسی دوپٹے کے پلو میں باندھ لی اور مسکرا کر بولی تھی۔

"وہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں، جو کبھی میرا تھا ہی نہیں... دروازہ کھول کر باہر آئیں گے، تو اس ذرا سی مٹی پر سوال ضرور اٹھائیں گے۔ تب اماں کہہ دینا کہ پکھی ذات واپس نہیں آتے، مگر نشانی ساتھ لے جانے کا حق ضرور رکھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر آخری بار الوداعی ہاتھ ہلاتی وہ سرسوں سی دلہن دہلیز پار کر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

خاموشی شور مچاتی، منڈیروں پر بیٹھ گئی تھی۔ پیپل پر بیٹھے پکھی اڑان بھر گئے۔ وہ چاروں سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ کنڈی کھلی، وہ باہر آئے۔ شانی تڑپ کر اٹھی اور ان کے سامنے سیدھی تلوار ہو گئی۔ خاموشی نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

"بیٹیاں تو پکھی ذات ہوتی ہیں۔ فجر کو ہوتی ہیں شام کو اڑ جاتی ہیں۔ پکھی ذات کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا کرتے۔"

ابا نے غور سے اس پیام بر کو دیکھا تھا۔ "شانو... تم اچھی وکیل کبھی بھی نہیں بن سکتیں... تم استانی ہی بنو گی۔"

سیدھی تلوار ایک ہی وار میں چھوئی موئی ہو کر گر پڑی۔ بتاشوں کے ذرے اٹھائے چیونٹیاں زمین پر سفر میں تھیں۔ اب اماں کی باری تھی۔ زلیخا اور سلیم کو سیڑھیوں پر ہی بیٹھنے دیا تھا۔

"کھڑکی کی جھری سے دیکھ تو لیا ہو گا۔ لالی کو چوکھٹ کی مٹی پلو میں باندھتے۔" روئی روئی آواز میں بڑا گہرا طنز تھا۔

ابا بھی چلتے چلتے سیڑھیوں کے پاس آ گئے تھے۔ شانی ستون سے لگی کھڑی تھی۔ گیندے سی لڑکی ساکت تصویر ہو گئی تھی۔

"صرف مٹی نہیں لے گئی کلثوم بیگم!" اماں کا طنز ابا کے طنز کے نیچے دب گیا۔ سوگوار فضا نے اپنا رنگ نہ بدلنے کی ٹھانی۔ "آدھی رات کو مہندی والے ہاتھوں سے میرے پیر پکڑ لیے اور بوسے لیتی رہی۔ اب دیکھو، پیروں سے مہندی کا رنگ کیسے چھوٹے گا؟ چوکھٹ کی مٹی بخش دوں... مگر میری عطر کی شیشی بھی لے گئی ہے، ہونہہ..."

شانی ڈھے گئی۔ اماں پتھر ہو گئیں۔ زلیخا اور سلیم تماش بین

"بوسے لے رہی تھی تو کن اکھیوں سے دیکھتے کیوں رہے؟ دھکا مار کر پرے کر دیتے۔" اماں نے پھپک پھپک رونا شروع کر دیا تھا۔ چولہوں کی آگ بجھ گئی تھی۔ دھواں آنگن میں بھر گیا۔ حبس بڑھنے لگا۔

اور ابا کو یاد آیا تھا، وہ پکھی ذات ان کے پائنتی بیٹھی ان کے پیروں کے بوسے لیتی رو رہی تھی۔

"ابا۔۔۔ جانتی ہوں کل کے دن آپ لالی کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوشیوں کی دعا نہیں دیں گے۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ کر ہی نہیں سکتی۔ میں آپ کو دعا دیتی ہوں' جب جنتی لوگوں کا اعلان ہو تو آپ کی روشن پگڑی ضرور نظر آئے۔ لالی پکھی ذات دعا ہی دے سکتی ہے۔"

اور ابا کن اکھیوں سے دیکھتے' دھکا مارنے کی سوچتے ہی رہے۔ مگر رات نے وجود پر انگلی رکھ دی۔ شش۔

اماں نے انہیں جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ "ظرف ذرا سا بڑا کر لیتے۔ ایسا تکبر انسان ذات پر نہیں سجتا۔ تمہاری سوتیلی تھی' میری تو سگی تھی۔ تمہارے تین سگوں کا خیال کرتی ہوں۔ تم میری ایک سگی کی ہی لاج رکھ لیتے۔"

اور انہیں وہ یاد آ ہی گئی۔ جو اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتی تھی۔ جدھر جاتے' وہ ادھر گردن موڑ لیتی۔ وہ جھنجلا جاتے تھے۔ ذرا بڑی ہوئی تو پہلے ان کا نام لیا۔ چلنے لگی تو ان کی قمیص کا کونا پکڑ لیا۔

"ابا۔۔۔ ابا!" وہ ہاتھ سے جھٹک دیتے۔ سیڑھیوں پر گر جاتی اور خالی خالی آنکھوں سے دیکھے جاتی۔ وہ جتنا دور جاتے وہ ان کی طرف لپکتی۔

ابا نے شادی کی پہلی رات ہی سرخ گٹھڑی بنی اماں کو خبردار کر دیا تھا۔

"میں صرف اپنے بچوں کا وارث ہوں گا۔ تمہارے مرحوم شوہر کی بچی کو صرف یہاں سے کھانا' کپڑا ہی ملے گا اور مجھ سے امید رکھنا۔"

اماں نے امید کے درخت کو کاٹ پھینکا مگر لالی اسے سینچتی رہی۔ درخت تناور ہوا وہ الہڑ ہو گئی۔

شانی' زلیخا اور سلیم کی لاڈلی باجی' ابا کی کبھی لاڈلی نہ بن سکی تھی۔ جب بھی ابا' زلیخا اور شانی' سلیم کی ہتھیلی پر سکہ رکھتے تھے۔ وہ بھی ہتھیلی صاف کرتی آگے کر دیتی تھی۔ ابا سکہ چٹکی میں پکڑ کر زلیخا اور شانی' سلیم کے سر سے وار کے اس کی ہتھیلی پر دھر دیتے اور وہ انہیں موٹی موٹی آنکھوں سے تکے جاتی تھی۔ ابا کو آج تک پتا نہیں چل سکا کہ ان کی سگی اولاد کے سر سے وارا گیا وہ سکہ ان ہی کے پیٹ میں جاتا ہے۔

لالی نے گھرداری سیکھی تو ابا نے اماں کو خبردار کر دیا تھا۔ "لالی کے ہاتھ کا پکا نہیں کھاؤں گا۔"

اور انہیں آج تک پتا نہیں چل سکا کہ جس "سواد" کی وہ تعریف کرتے تھے وہ اماں کے ہاتھ کا تھا ہی نہیں۔

لمبی دوپہروں کو پسینہ بہاتے بھوک سے نڈھال گھر آتے تو اماں کھانا آگے رکھتیں۔ نوالہ لیتے ہی ٹھٹک کر اماں کو دیکھتے تھے۔

"جوں جوں وقت گزر رہا ہے' تیرے ہاتھ کا سواد بڑھتا ہی جا رہا ہے۔" اماں کاسنی دوپٹے کا پلو منہ میں دبائے لاج سے دہری ہو جاتی تھیں۔

باورچی خانے کی جالیوں سے جھانکتی لالی کا دل چاہتا شٹاپو کھیلتی شانی کا ہاتھ پکڑ کر وہ گول گول گھومے اور چکرا کر زمین پر جا گرے اور ایک دن واقعی اس نے یہ کر لیا۔ شانی دوڑی دوڑی اماں کی طرف گئی۔

"لالی باجی مر گئی۔" اماں کے ہاتھ سے چینی کی پلیٹ ٹوٹ گئی۔ دودھ ابل ابل کر گرتا رہا اور وہ باہر کی طرف بھاگیں۔

جسم کے گرد دوپٹا لپیٹتی وہ ہاتھ جھاڑ رہی تھی۔ اماں نے شانی کو پیٹ ڈالا تھا جو دل چھوڑ جانے والی خطرناک افواہیں پھیلاتی تھی۔ سردی کڑاکے کی پڑتی تھی۔ فصلوں پر کہر ٹھہر جاتی تھی۔

گہری اور اندھی دھند میں شانی اور زلیخا "آؤ سہیلی' بوجھیں پہیلی" کھیلتی تھیں۔ ایسے ہی ایک دن لالی کی آواز پہیلی بن گئی' کسی کو خاک سمجھ میں نہ آیا۔

کھانسی نے ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر کھانستی تھی۔

ابا غصے سے کروٹ بدلتے تھے۔ "ارے اس گھر میں سکون ہے یا نہیں۔۔۔ سارے دن کی تھکن سے بدن ٹوٹ رہا ہے۔"

اماں تو شانی اور زلیخا کو لپٹائے سو رہی ہوتی تھیں۔ سلیم 'ابا کے ساتھ چمٹا ہوتا تھا۔ منہ پر سختی سے ہاتھ رکھے لالی چارپائی سے اتر کر باہر بر آمدے کی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی کھانستی رہتی تھی۔ سارا ماحول پہیلی ہو جاتا تھا' وہ بوجھتی اور نڈھال ہو جاتی۔ دھند میں لپٹا کیکر کالا دیو ہے جو ابھی آن دبوچے گا۔۔۔ ہاں۔۔۔ ابھی۔۔۔ دیواروں پر شیطانی چڑیلوں کے سائے ناچتے ہیں۔ ٹھگنے بونے آنگن کا نلکا چلا کر برف ہوتے پانی میں مزے سے نہاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہوا چلتی تو جانے کہاں کہاں سے ماتمی آوازیں بین کرنے لگتی تھیں۔ وہ سردی سے لرزتی کانپتی اکیلی سیڑھیوں پر بیٹھی کھانستی رہتی تھی۔

شکورن نائن آئی تو اماں کو ٹوٹکا بتا گئی۔ "کچے امرود کو انگاروں پر پکا کے چٹکی نمک ڈال کر کھلاؤ۔"

لالی کے کام یہی ٹوٹکا آگیا۔ آواز کی پہیلی سلجھ ہی گئی اور وہ شام کو ہونے والی شانی کی گڑیا کی شادی میں پر سوز آواز میں گا رہی تھی۔ منڈیروں پر کونجیں آکر قطار ہو گئیں' جو کہیں نہیں ٹھہرتیں' وہ لالی کے سوز پر نیر بہانے لگیں۔

"دھیاں رانیاں۔۔۔ کناں جمیاں تے کناں لے جانڑیاں۔"

دروازے سے اندر آتے ابا نے اس کی آواز سن لی تھی' چوٹی سے پکڑ کر کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ "ارے میرے گھر میں یہ سب نہیں چلے گا۔ شریفوں کا گھر ہے کوئی کوٹھا نہیں۔"

لالی نے وہ رات اس کال کوٹھڑی میں گزار دی' جہاں دن کے وقت بھی وہ جانے سے ڈرتی تھی۔ اس نے کئی تنہا راتیں خوف سے لرزتے کانپتے کاٹی تھیں۔ راتوں سے اس کی تنہائی اور اداسی دیکھی ہی نہ گئی۔ صدیوں سے چپ راتوں نے پہلی بار لالی کے لیے اپنا چپ کا روزہ توڑا تھا۔ "لالی۔۔۔ ہم سے دوستی کرلے۔"

پھر لالی اور رات سہیلیاں ہو گئیں۔

شکورن نائن دور پار کا رشتہ لائی تھی۔ "زمین دار ہیں۔۔۔ گائے' بھینسیں قطاروں میں ہیں' نوکر چاکر ہوں گے۔"

اماں نے رات کو آخری نوالہ لیتے ابا سے کہا تھا۔

"شکورن بڑا اچھا رشتہ لائی ہے لالی کے لیے۔"

"تم وارث ہو اس کی' جو دل کو بھائے کر ڈالو۔"

انگیٹھی سے انگارہ اڑ کر لالی کے پاؤں پر جا پڑا۔۔۔ مگر درد کہیں اندر اٹھا تھا۔ اگلی فجر وضو کر کے نماز کے لیے سر پر دوپٹا جماتی وہ مصلے پر کھڑی تھی۔ ابا سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ رہے تھے۔

"بے جان چیز تو خیر چھوڑیں۔۔۔ کوئی جانور بھی کھونٹے سے بندھا ہو تو بڑی عجیب سی انسیت ہو جاتی ہے ابا! تو کیا آپ کی نظر میں میرا مقام اس جانور جتنا بھی نہیں؟" لالی کا سوال ابا نے نظر انداز کر دیا تھا مگر سلیم نظر انداز نہ کر پایا تھا۔

"اماں! لالی باجی جانور ہے؟" دھوئیں میں اماں کو سلیم نظر نہ آیا تھا بس سوال پہنچا تھا۔

"ہاں سلیم۔۔۔ میں پکھی ذات ہی تو ہوں۔" شانی کے بالوں کی چوٹیاں بناتی' رات کی سہیلی کی آواز میں بڑی کراہٹ تھی۔

اماں کے سامنے ایک پراٹھے پر ہی سارا مکھن کا پیڑا پگھل گیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی تھی۔



ابا نے آدھی رات کو اٹھ کر شانی کو جگا دیا تھا۔

"میرا بوسکی کا جوڑا اور تلے والا کھسہ نکال۔۔۔ میں گھوڑا لے کر آتا ہوں۔"

گیندے سی لڑکی نے بخار سے سلگتی اماں کو مطلع کیا۔ اماں ہکا بکا اٹھ بیٹھیں۔ لالٹین کی روشنی میں شانی نے بوسکی کا جوڑا اور تلے والا کھسہ پونچھ کر رکھا۔ آدھی رات کو صحن میں کھڑے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز گونجی تھی۔ ابا بوسکی کا جوڑا زیب تن کیے' تلے والا کھسہ پہنے' عطر کی پوری بوتل چھڑک کے باہر کی طرف جانے لگے' رکے' پلٹ کر دیکھا اور اماں سے

مخاطب ہوئے تھے۔
"سمجھتی کیا ہے تیری سگی خود کو' ایسے ہی چھوڑ دوں گا اسے' جاتے جاتے میرا دل بھی دوپٹے کے پلو سے باندھ کر لے گئی ہے۔ بہت چھوٹا ظرف ہے میرا' چوکھٹ کی مٹی کی چوری معاف کر سکتا ہوں۔ اپنے دل کی چوری معاف نہیں کر سکتا۔"
مسافر آگے بڑھ گیا۔ سیڑھیوں پر بکھرے پتے اڑنے لگے۔ رات سہیلی قل قل ہنس رہی تھی۔
اماں نے پیچھے سے آواز دینا چاہی تھی' مگر شانی نے کندھے سے پکڑ کر نفی میں سرہلا دیا تھا۔
"مت روکیں اماں! جانے دیں۔ مسافروں کو جاتے وقت پلٹ کر صدا نہیں لگاتے۔ گھوڑوں کے سم ٹوٹ جاتے ہیں۔" گیندے سی لڑکی بڑی عاقل تھی۔

✡ ✡ ✡

نئی دلہن نے پو پھٹتے سے نوکرانیوں سے کہا تھا۔
"دریچوں کی اوٹ سے جھانکتے رہنا تمہارا فرض ہے۔ ابھی راستوں پر دھول اڑے گی اور گھوڑے پر سوار ایک مسافر آئے گا۔ جیسے ہی اس پر نظر پڑے مجھے خبر کر دینا۔"
فرض شناس خادمائیں دریچوں میں کھڑی راستوں پر نظر گاڑے ساکت ہو گئیں۔
راستوں پر دھول اڑی ہے۔ نڈھال گھوڑے پر صدیوں کا تھکا ہارا مسافر آرہا ہے۔ مسافر کے وجود سے پسینہ ٹپ ٹپ زمین پر گر رہا ہے۔ دریچوں میں کھڑی خادمائیں فرض ادا کرنے کو دوڑیں۔
"راستوں پر دھول ہے۔ نڈھال گھوڑے پر مسافر آرہا ہے۔"
راہ داریاں' محراب' دریچے' دلہن کے بھاگتے قدموں کی پازیب سے گونج اٹھے ہیں۔ ہر ساز کو مات ہوئی ہے۔
ابا نے گھوڑے سے اتر کر سامنے دیکھا تھا۔ ننگے پاؤں داخلی دروازہ کھول کر وہ کھڑی تھی۔ دودھ کا کٹورا ہاتھ میں تھا۔ گھوڑے کی باگ چھوڑ دی۔ قدم قدم چلتے رات کی سہیلی تک آئے تھے۔ جو ناز سے سر اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔
پگڑی اتار کر اس کے قدموں میں رکھ دی۔
"لالی! چوکھٹ سے چوری کی گئی مٹی کی معافی ہے۔ مگر میرا دل واپس کر دو۔ تمہارا بوڑھا باپ جی نہیں پائے گا۔"
لالی کے ہاتھ میں پکڑا دودھ کا کٹورا چھلک گیا تھا۔ وہ ہولے ہولے روتی ہوئی پیچھے مڑ رہی تھی۔
"پلو سے بندھی مٹی لے جائیں۔ دل واپس نہیں کروں گی۔"
وہ پگڑی اٹھاتے ہوئے رو رہے تھے۔ "لالی! تیری ماں سے کہہ آیا ہوں' اپنا دل لینے جا رہا ہوں۔ خالی ہاتھ لوٹوں گا تو سوال کرے گی۔"
"اماں سوال نہیں کرے گی۔" وہ سسکیاں لیتی رو رہی تھی۔
"کیوں..."
"لالی آپ کو خالی ہاتھ نہیں بھیجے گی ابا! اپنا دل نکال کر آپ کو دیتی ہوں' لے جائیں' آپ کا دل واپس نہیں کروں گی۔" وہ چار قدم دور تھی۔ ابا پانچ قدم آگے آئے۔ اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔ وہ ان کے گلے لگی رو رہی تھی۔
"عطر کی شیشی واپسی نہیں کروں گی۔" سرگوشی کی گئی تھی۔
"نہ کرنا۔" سرگوشی میں ہی جواب ملا تھا۔
صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔ "کون آیا ہے... کون آیا ہے؟"
لالی نے ابا کے ہاتھ چومے اور پلٹ کر کہا تھا۔
"میرے ابا آئے ہیں۔"
وہ خالی کٹورا تھامے جا رہی تھی' جب پیچھے سے آواز آئی تھی۔ "لالی! اللہ دنیا جہان کی ساری خوشیاں تیری جھولی میں بھر دے۔" وقت نے "آمین" کہہ کر سر جھکایا تھا۔
لالی نے قل قل ہنستے ہوئے نفی میں سرہلایا تھا۔
"مگر دل واپس نہیں کروں گی۔"

✡

عطیہ خالد

سیاہ گناہ

پچھلی کھڑکی کی درزوں سے دھوپ کمرے میں جھانکنے لگی تھی۔ کچھ دیر وہ کسلمندی سے پڑا رہا پھر کمرے کے کواڑ کھول کر آنگن میں نکل آیا۔ رات بھر دوستوں نے جگائے رکھا تھا۔ رات کا خیال آتے ہی مسکراہٹ اس کے کرخت خدوخال میں اجنبی سلوٹوں کی طرح پھیل گئی۔ وہ مسواک کرتا ہوا بکائن کے نیچے بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سلیمہ صحن میں بنے چوکے پر ناشتا بنا رہی تھی بلکہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ بچے تو صبح ناشتا کرکے اسکول جاچکے تھے۔ اس نے کڑوے گھونٹ کی طرح بیوی کے تکنے کو برداشت کیا اور مسواک کرکے ــــــ منہ ہاتھ دھونے لگا۔

"کیسی منحوس عورت تھی۔۔۔ نہ اس کے آنے سے رزق میں فراخی آئی نہ خوش حالی برسی۔ ہاں بارہ سالوں میں نو بچے ضرور پھیل گئے گھر کے ہر کونے میں۔ اگر کچھ وقت سے پہلے پیدا ہوکر گزر نہ جاتے تو ان کی تعداد بارہ سے زیادہ ہی ہوتی اور کچھ کر نہیں سکتی منحوس سوائے جڑواں بچے پیدا کرنے کے۔ منہ ہاتھ اس نے کئی بار رگڑ رگڑ کر دھویا جیسے بیوی کی نحوست سے جان چھڑا رہا ہو۔ دیسی گھی کے پراٹھے اور مکھن سے بھری میٹھی لسی کے پورے تین گلاس پی کر قدرے ذائقہ تبدیل ہوا تھا کہ منحوس بیوی بولی۔

"سنتے ہو، تینوں چھوٹوں کی فیس جانی ہے اور ان کی وردیوں کے لیے کپڑا بھی لانا ہے۔ میں نے پانچ سیر گھی بنایا ہے رات۔ تم آج ہی گھی شہر لے جاؤ۔ پہلے جو سات کلو گھی دیا تھا اس کے پیسے بھی لانے ہیں دکان دار سے۔"

سلیمہ کی آواز ہمیشہ کی طرح نیچی تھی۔ لیکن اس کو تو گولی کی طرح لگی۔ اس جملے نے تو رات کا سارا نشہ ہرن کردیا تھا۔ آکاش سے دھرتی پر لا پٹخا تھا۔ رات بھر اکبر بادشاہ، اکبر صاحب سن سن کر جو سُرور چڑھا تھا، کمبخت نے اکبر دودھ والا بنا ڈالا تھا پھر سے آن کی آن میں۔ بد بخت عورت۔۔۔ جاہل گنوار۔۔۔ روزانہ کی طرح گالیاں دیتے ہوئے اس نے موٹر سائیکل نکالی اور دیسی گھی کا ڈول آگے لٹکا کر باہر نکل گیا۔

پانچ بھینسیں اور ایک گائے کو وہ منحوس عورت سنبھالتی تھی۔ چارہ دینے سے لے کر دودھ دوہنے تک۔ ارد گرد ہی سب باندھیں لگی تھیں۔ لوگ خود آکر لے جاتے تھے۔ کم بخت نہ پانی ملاتی تھی نہ ملانے دیتی تھی۔ کہتی تھی۔ "حرام کا نوالہ نہیں کھلاؤں گی اولاد کو۔"

کمینی مر بھی رہی ہوتی تو چارپائی ڈال کر لیٹ جاتی سامنے اور کسی کامے کو دہاڑی پر بلا لیتی۔ جو بھی کرتی، مگر اکبر علی کو دودھ کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ ایسی منحوس عورت تھی وہ۔

البتہ قیمت اکبر ہی وصولتا۔ اس پر اس نے کبھی اعتراض نہ کیا تھا۔ وہ دمڑی دھیلا اپنے پاس رکھنے کی روادار نہیں تھی۔ ٹکا ٹکا اس سے مانگتی تھی۔ مرضی ہوتی تو دے دیتا، نہ ہوتی تو جی بھر کے گالیاں دیتا۔ چپ چاپ گالیاں سنے جاتی، بے غیرت نہ ہو تو۔ بارہ سال سے یہ عفریت اس پر بلا کی طرح سوار تھی۔ کم بخت نہ کبھی میکے جانے کا نام لیتی نہ کسی شادی، غمی میں۔۔۔ منحوس نہ ہو تو۔۔۔۔

پانچ سیر گھی نئے نکور نوٹوں میں بدل گیا۔ پچھلی وصولیاں بھی ہوگئیں تو موٹر سائیکل کا رخ آنوں آپ



اسلم کی بیٹھک کی طرف مڑ گیا۔ کیا زبردست مچھلی تلی اسلم نے اور مرغے کا چٹخارے دار سالن۔ سب یاروں نے سرخ سرخ سیال لنڈھاتے ہوئے اکبر بادشاہ کو تخت شاہی پر لا بٹھایا تھا۔

آدھی رات کو ڈولتا ہوا وہ گھر پہنچا تو جیب میں دو سو روپے ہی تھے۔ وہ اس نے منحوس بیوی کے سرہانے رکھے اور وہیں لیٹ گیا۔ جانے کیسی آوازیں نکال رہی تھی۔ اس کو نہ غور کرنے فرصت تھی، نہ ضرورت۔ گھپ اندھیرا ہی ایسا دبیز پردہ تھا جس میں اس عورت کی نحوست چھپ جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

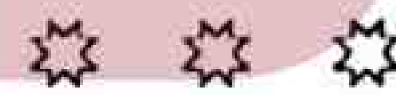
وہ چارپائی پر ماتھے پر کپڑا باندھے لیٹی تھی۔ اس کی دبی دبی کراہیں بتا رہی تھیں کہ اس کو واقعی کچھ ہوا ہے ورنہ وہ آواز نکالنے والی عورت نہیں تھی۔ کل شام کو

سسرال سے آنے والی بڑی بیٹی چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ باپ کو دیکھتے ہی اس نے آگ تیز کردی اور ناشتا بنانے لگی۔

"ابا، اماں کو بہت تیز بخار ہے کل شام سے۔" ناشتا کرکے اس کو موٹر سائیکل کی طرف بڑھتے دیکھ کر بیٹی بولی۔

"تو۔۔۔" اس کے کرخت چہرے پر ڈھیروں کڑوی لکیریں ابھر آئیں۔ وہ باہر نکل آیا۔ آج پہلی تاریخ تھی۔ وصولیوں کا دن تھا۔ اور اس نے نحوست ڈال دی تھی۔ بھلا سُدھر سکتی تھی یہ عورت۔ پھولی پھولی جیب لے کر وہ شہر چلا گیا۔ گھر کے لیے کچھ سودا خرید ا اور سینما کی طرف جاتا جاتا لوٹ آیا۔ پہلے سودا گھر دے دے۔ پھر اسلم یا شوکے کے ساتھ سینما کا مزا لیا جائے۔ دو گھنٹے سے بھی پہلے وہ اپنی گلی کا موڑ مڑ رہا تھا۔ اس کے دروازے کے باہر بھیڑ لگی تھی۔ حیران حیران سا وہ موٹر سائیکل سے اترا۔

"بھابھی سلیمہ فوت ہوگئی۔" پڑوسن نے روتے ہوئے بتایا۔ وہ بھیڑ کو ہٹاتا اندر آیا تو چارپائی پر پڑے وجود کے اردگرد لپٹی ہوئی اس کی بیٹیاں رو رہی تھیں۔



"اماں! کچھ بھی کہہ لے تو، میں نے سلیمہ سے ویاہ نہیں کرنا۔ مجھے شبنم پسند ہے۔" اکبر نے صاف صاف ماں سے بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

"شبنم چھوڑ کے تو جس کا نام لے گا میں راضی۔ پر پترا! شبنم گھر وسان والی کڑی نئیں۔ اوہ کاغذی پھل اے نرا۔ نہ کوئی خوشبو، نہ کوئی فیدا۔۔۔ نرا پھوک۔۔۔" ماں جی جیسی عورت کو تو صاف صاف کہنے میں بھی شرم آتی تھی۔ ورنہ شبنم کے قصے تو پورے محلے میں مشہور ہو چکے تھے۔

"تے تینوں کی پتا ماں کہ خشبو ہے یا نئیں۔ اس دی خوشبو دے چرچے تے چار چوفیرے۔" اکبر علی کی آنکھوں میں اس کا چنبیلی اور گلاب کے عطر میں بھیگا نازک سا سراپا تھا۔

"نہ، نہ پترا ایسو گل تا میں پئی آں سمجھاندی کہ عورت دی خشبو صرف گھر دے اندر۔ باہر والے کے نوں کوئی خبر نہ ہوں اس دی۔۔۔ ایہہ عورت دی خوبی۔ ایہہ اس دا موتی۔"

"ماں! ماں، پر مینوں سلیمہ بالکل پسند نئیں۔"

"سلیمہ نہ سہی ہور تیرے مامے دیاں دی کڑیاں بہت چنگیاں نے۔"

"اوہ وی نئیں۔" اکبر نے صفاچٹ انکار کیا۔

"اوہ وی نئیں؟ تے پتر آپ ہی دس دے مینوں جو تینوں پسند۔" ماں جی نے اپنی طرف سے بات ہی ختم کردی۔

اب اکبر علی سوچ میں گم تھا کہ ماں کو سلیمہ سے تو ہٹا لیا، اب شبنم تک کیسے لائے۔ لیکن شاید اس کا بخت ہی ماٹھا تھا۔ شام کو ہی شبنم کو علاقے کے چوہدری نے اپنی حویلی میں طلب کرلیا تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ اب شبنم اس کی ذاتی ملکیت تھی۔ حویلی سے باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ اب ختم تھا۔ گاؤں کے سارے کنواروں کی ماؤں کو سکون کی نیند آنے والی تھی اس رات۔ لیکن اکبر نے تو اس کو انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ کچھ یار دوستوں نے چھیڑا تو وہ سنجیدہ ہی ہوگیا۔

"ہمارے یار کو کوئی کمی تھوڑی ہے۔ ایک سے ایک لڑکی حاضر ہے جگر کے لیے۔ کتنی تو ایک "ہاں" کے انتظار میں ہیں۔" یہ اسلم تھا۔

اسے سب خبر تھی بلکہ ماں جی نے تو اس سے کئی بار کہا تھا کہ وہ اس کو سلیمہ کے لیے راضی کرے۔ اکبر کی خاموشی دیکھ کر اس نے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور محفل کی برخاست کا اشارہ کردیا۔

ہر کہانی کو ہمارا منتخب کردہ انجام نہیں ملتا۔ لیکن کم ہوتے ہیں جو تقدیر پر قانع ہوکر سر تسلیم خم کردیں اور مطمئن ہوجائیں۔ اکبر علی نے وقتی شرمندگی مٹانے

کے چکر میں اور دوسرے اسلم کے سمجھانے بجھانے پر ماں جی کو سلیمہ کے لیے ہاں کردی۔ نتیجتاً ''سلیمہ آج اس کے گھر میں موجود تھی۔ سرخ و سفید سلیمہ لال جوڑے میں اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ گاؤں کی ہر عورت نے ماں جی کو اس کی مبارک دی۔ بہت سوں نے تو باقاعدہ پوچھا تھا کہ اس کی کوئی بہن ہو تو وہ بھی رشتہ کرنے کی خواہش مند ہیں۔ لیکن سلیمہ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ خوب صورتی کے علاوہ ٹرک بھر کر جہیز ساتھ آیا تھا اس کے۔ ویسے تو اکبر کے گھر کوئی تنگی نہیں تھی۔ لیکن سلیمہ کے بھائیوں نے شہری طرز کے فرنیچر کے علاوہ دو بھینسیں بھی جہیز میں دی تھیں۔ پانچ تولے سونا علیحدہ۔ سلیمہ کے ماں، باپ یعنی اکبر کے خالہ خالو فوت ہو چکے تھے۔ لیکن بھائیوں نے کوئی کمی نہیں رکھی تھی — سلیمہ کی خوب صورتی، اس کا جہیز، اس کا سلیقہ، اس کا پڑھا لکھا ہونا، کوئی بھی چیز اس کو اکبر کے دل پر نہ چڑھا سکی۔

''نہ تو مجھے پسند ہے نہ تھی اور نہ کبھی ہوگی۔'' اس نے سلیمہ کا چہرہ دیکھے بنا ہی اپنی مردانگی کے زعم میں اسے اپنی طرف سے اس کی اوقات جتا دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لاڈلی سلیمہ بڑا واویلا کرے گی۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

عجیب عورت تھی سلیمہ۔ پیروں کے نیچے بچھی زمین کی طرح۔ جس پر چاہے ہل چلاؤ، چاہے برمے سے چھیدوں چھید کردو۔ وہ خاموش ہی رہتی ہے۔ نہ وہ روتی ہے، نہ چلاتی ہے، نہ شکوے شکایتیں کرتی ہے۔ نہ سامنے، نہ پیٹھ پیچھے..... بس ایسی ہی تھی وہ۔ پیٹھ پیچھے شکایت کرتی تو اماں ضرور باز پرس کرتی۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ اکبر کی انا پر ایک کاری ضرب پڑی۔ اس نے سختی میں اضافہ کردیا۔ وہ چپ چاپ مار کھا لیتی، گالیاں سن لیتی۔ وہ اس کا سنگھار اجاڑ دیتا، اس نے سنگھار کرنا چھوڑ دیا۔ وہ اس کے لفظوں کا مذاق اڑاتا، اس نے بولنا چھوڑ دیا۔ اکبر علی خود ہی بک جھک کر چپ ہو جاتا۔

قدرت نے ایک سال کے اندر ہی بیٹے کا باپ بنا دیا اور ابھی بچہ ایک ماہ کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اماں سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ اماں کے چلے جانے سے اکبر علی کی رہی سہی جھجک بھی ختم ہو گئی۔ اس نے رات دیر تک باہر رہنا شروع کردیا۔ صحبت خراب سے خراب ہوتی گئی۔ آوارگی دن بہ دن بڑھتی گئی۔

زمینوں کا سارا معاملہ ماں جی ہی دیکھتی تھیں۔ اب وہ نہیں رہی تھیں۔ زمینیں ایک ایک کرکے بکنے لگیں۔ اکبر کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

پانچ بچوں کی پیدائش تک زمینیں ختم ہو چکی تھیں اب صرف ایک ٹکڑا باقی بچا تھا جہاں چارہ بیجا جاتا تھا یا سلیمہ کچھ سبزی لگا لیتی تھی۔ گھر کے خرچ کا پورا انحصار جانوروں کے دودھ پر تھا۔ پانچ بھینسیں اور ایک گائے تھی اور سب ہی اچھا دودھ دیتی تھیں۔ سلیمہ دیسی گھی بھی بنا لیتی تھی جو شہر میں اچھی قیمت پر بک جاتا تھا۔

بوقت ضرورت ہی اس کو مخاطب کرنے والی بیوی بڑی ذمہ داری سے اس کو اور اس کی اولاد کو پال رہی تھی۔ اکبر کو یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی کوئی شکوہ کیا ہو۔ اس کو تو حسرت ہی تھی کہ کبھی وہ روئے، چلائے۔ کبھی اس کو لگتا کہ سلیمہ اس کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی یا شاید اس کی نظر میں اکبر علی کی اہمیت ہی نہیں تھی۔ وہ چاہتا کہ کوئی غلطی ہو کوئی کمی تو نظر آئے۔ لیکن اس کے کپڑے استری شدہ ملتے، لائٹ نہ ہوتی تو وہ کوئلوں والی استری سے اس کے کلف والے جوڑے کو دبا دبا کر استری کردیتی۔ اس کی کھیڑی پالش سے چمک رہی ہوتی۔ ہمیشہ صاف کنگھا دراز میں موجود ہوتا۔ نیل کٹر، اس کا بٹوہ، دھلا رومال، پرنا، عطر۔ اتنے سارے چھوٹے بچوں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی کوئی چیز ادھر ادھر نہ ہوتی۔

بچہ اس کے گھر جب پیدا ہوتا تب بھی اسے اپنی چیزیں اسی طرح ملتیں۔ وہ یہ کیسے کرتی، اس سے اکبر علی کو کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اس سب کو اپنا حق جان کر وصول کرتا تھا۔ من پسند ناشتا۔ تازہ کھانا کھاتے ہوئے اس نے ایک وقت بھی بیوی کے متعلق نہیں سوچا۔ بلکہ اس نے کبھی کسی بچے کو بھی ساتھ کھانے کی

دعوت نہیں دی تھی۔ بچے سلیمہ نے پیدا کیے تھے' اس کا مسئلہ تھے۔ وہ صبح گھر سے نکل جاتا۔ درمیان میں صرف کھانے کے لیے آتا۔ اکثر شام کا کھانا اسلم کی بیٹھک میں منگوالیتا۔ مرغ' گوشت' مچھلی کھاتے ہوئے اسے کبھی خیال نہیں آتا تھا کہ اس کے بچوں نے کیا کھایا ہو گا۔ دوست یار اس کو سجا بنا دیکھ کے رشک کرتے۔

"واہ اکبر یاؤ' واہ!" اکبر یاؤ سن کر مزید اکڑ جاتا۔ باہر ہی سے اس کو پتا چلتا کہ اس کے بچے اچھا پڑھ رہے ہیں۔ آتے جاتے وہ دیکھتا سلیمہ کھانا پکاتے' دہی بلوتے' بھینسوں کا چارہ کاٹتے بچوں کو پڑھا رہی ہے' تو ان کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے کہتا ہو' کچھ کرلو میرے قابل نہیں ہو سکتے ہو نہ۔۔۔ اور سلیمہ فورا" بچے کو ایک طرف ہٹا دیتی اور موقعے کے حساب سے اس کے لیے لسی' شربت یا چائے لے آتی۔

اس کے بڑے بچوں نے پانچویں میں وظیفہ لیا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا کہ اس کا داخلہ شاکر اکیڈمی میں کروادو۔ وہ خرچے کے ڈر سے کسی صورت نہ مانتا تھا لیکن سلیمہ نے اپنا بڑا والا سونے کا سیٹ بیچ کر ان کے نام سے جمع کروادیا۔ اب کم سے کم ان کی فیس کی فکر نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

بڑا بیٹا دسویں میں تھا اور اس سے چھوٹی دو بیٹیاں آٹھویں میں تھیں۔ ماسٹر صاحب کے ساتھ دونوں کو چھوڑنے شاکر اکیڈمی گیا تو باتوں باتوں میں اس کو اپنے بچوں کی کلاسوں اور قابلیت کا اندازہ ہوا۔ اس سے چھوٹے چاروں بیٹے پرائمری کلاسز میں تھے۔ ماسٹر صاحب پیچھے پڑے رہے اور ان چاروں کا داخلہ بھی شہر کے انگلش اسکول میں کروا دیا گیا۔ ویگن کا کرایہ اور فیسوں کی ذمہ داری سلیمہ کے ہی ذمے تھی۔ اس نے اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں ڈال رکھی تھیں۔

آمدن کا بیشتر حصہ تو وہ اپنے اللوں تللوں میں اڑا دیتا تھا۔ جب سے لال پری منہ کو لگی تھی' اس نے روز مرہ کے خرچے کے لیے بھی بیوی بچوں کو ترسا دیا تھا۔ وہ چارے کے ساتھ لگائی گئی سبزیوں سے گزارا کرلیتی۔ بچوں کو دہی لسی سے روٹی کھلا دیتی۔ وہ اکثر سنتا 'وہ بچوں کو کہہ رہی ہوتی تھی۔

"دودھ' دہی اور میٹھا میسّا' دے نہ خدا تو کس کے بس کا۔" اس کے ہونٹ تمسخر سے ٹیڑھے ہو جاتے۔ نہ جانے کس پر رعب ڈالتی تھی کہ بڑی شکر گزار ہے' نرا دکھاوا۔

نماز تو وہ پچھلے کمرے میں چھپ کر پڑھتی تھی۔ لیکن اس کی نماز لمبی ہی اتنی ہوتی کہ اکبر کو خبر ہو ہی جاتی۔ تن فن کرتا وہ اس کے سر پر پہنچ جاتا۔ لیکن اس کا انہماک اس کی گریہ وزاری دیکھ کر لوٹ آتا اور جس روز اس کو نماز پڑھتے دیکھ لیتا ایک عجیب طرح کی بے چینی میں مبتلا ہو جاتا۔ کبھی بچوں کو مارتا' کبھی جانوروں کو گالیاں دیتا۔ سلیمہ کے مطمئن چہرے کو غور سے دیکھتا۔ بہانے بہانے سے مارنے کو آتا' مگر رک جاتا اور بالآخر لال سیال میں ڈوب کر سلیمہ کا اطمینان غارت کر ڈالتا۔ چھوٹوں کے پانچویں پاس کرتے ہی ان چاروں کو بھی شاکر اکیڈمی بھیج دیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے' طعنے دیتا۔

"اتنا شوق تھا' مگروں لاہن ۔ تو پیدا کیوں کیے تھے۔"

سلیمہ پہلے کبھی بولی تھی تو جواب بولتی۔ بیٹیوں نے ایف اے کرلیا تو اس نے ان کی شادی کردی۔ نہ جانے کیا جلدی تھی اس کو۔ اکبر نے تو بس رخصت کرتے وقت سر پر ہاتھ پھیرا تھا ان کے۔ دینا لینا' زیور' کپڑا سب اس نے کیا بھی یا نہیں یا خالی ہاتھ روانہ کردیا۔ اکبر جیسا بے خبر باپ بھی ہو گا کوئی۔ رشتہ طے کرتے وقت سلیمہ نے پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا۔

"تیری اولاد سے میرا کوئی لینا دینا نہیں۔"

اس نے دوبارہ بات نہیں کی۔ اور ساتھ والے گاؤں میں بیٹیاں بیاہ دیں۔ داماد اس کے سگے بھتیجے تھے۔ اکبر نے تو کبھی ان سے سلام دعا بھی نہیں کی

تھی۔ سب سے بڑا بیٹا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ اس کو شہر میں ہی نوکری مل گئی تھی۔ اس سے چھوٹے دونوں آفیسر بن گئے تھے اور چھوٹے بھی کیڈٹ کالج میں پہنچ گئے تھے۔ چھٹیوں پر آئے تو سارا گاؤں مبارک دینے چلا آیا تھا۔ خوب صورت جوان، ہونہار بیٹے۔ لیکن اکبر علی نے خوش ہونا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

سلیمہ نے اپنا سارا زیور بیچ کر بھینسیں لے لی تھیں۔ پہلے اس نے سیٹ بیچے، پھر چوڑیاں۔ اب تو اس کے وہ چھوٹے موٹے زیور بھی غائب تھے جو وہ ہر وقت پہنے رہتی تھی۔ شاید بیٹیوں کو دے دیے ہوں۔ لیکن اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ مطمئن نظر آتا تھا۔ اکبر علی نظر بھر کے دیکھنا چاہتا تو دیکھ نہ سکتا تھا۔ نہ جانے کیا عمل کرتی پھرتی تھی۔ جانوروں کا احاطہ بیٹوں نے پکا بنوا دیا تھا۔ پکی ناند اور بجلی سے چلنے والا ٹوکہ۔ جانوروں کو سنبھالنے کے لیے دینو اور اس کے بھائی کو مستقل رکھ لیا تھا۔ کبھی بھی وہ ہی شہر لے جاتا تھا۔

اب ایک سال سے وہ بار بار بیمار ہو رہی تھی یا بیماری کا ڈراما کر رہی تھی۔ تھکی ڈھیلی ڈھیلی، مگر اپنے کام نپٹاتی پھرتی تھی۔ صبح بستر پر نظر آتی تو شام کو اس کے لوٹنے پر بھلی چنگی بیٹھی، دودھ ناپ تاپ کر دے رہی ہوتی۔ کوئی بچہ اب گھر میں نہیں تھا۔ سارا گھر اس اکیلی کے وجود سے بھرا بھرا لگتا۔ حالانکہ وہ ایک لفظ نہ بولتی۔ اکبر علی آجاتا تو کھانا سامنے رکھ دیتی اور خود سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اکبر کا دل چاہتا کہ وہ کوئی بات کرے لیکن وہ سر جھکائے زمین میں کچھ تلاش کرتی رہتی۔ نہ سر اٹھاتی نہ کچھ بولتی۔

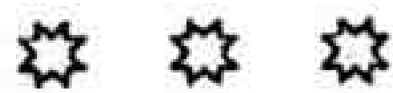
”ڈرامے باز عورت۔“ تلخی تو اکبر کے لوں لوں میں رچی بسی تھی۔ اور اب وہ ڈرامے باز عورت سچ مچ مر گئی تھی۔

”اماں۔۔۔ اماں۔۔۔“ کی گھٹی گھٹی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اسلم اس کے گلے لگ کے روتے روتے بولا۔

”اکبر! بھابھی چپ چاپ ہی چلی گئیں۔ کچھ بتایا ہی نہیں۔ مجھے تو بچوں سے پتا چلا کہ اس کو کل سے بہت تیز بخار تھا۔ تو اکیلا کیوں چلا گیا دوائی لینے شہر۔ بتاتا تو سہی، ہم ساتھ چلتے۔ بھابھی کو لے جاتے شہر۔ تو نے کچھ بتایا ہی نہیں۔“ اور اکبر تو گم صم سا ساتھ والی چارپائی پر گر گیا۔

سلیمہ کے بھائی آگئے تھے۔ سب بیٹے پہنچ گئے تھے۔ اکبر کو نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی دے رہا تھا۔ شام ڈھلے جنازہ اٹھا۔ اور کس شان سے جنازہ اٹھا تھا۔ سات جوان بیٹوں نے باری باری کندھوں پر اٹھائے میت کو قبرستان تک پہنچایا تھا اور اب یوں اسے لحد میں اتارا اور لٹایا تھا کہ وہاں موجود ہر باپ کے دل میں اس دھج سے مرنے کا ارمان جاگ اٹھا تھا۔ مائیں تو پہلے ہی سلیمہ کے انجام پر رشک کر رہی تھیں۔ بیٹے ہاتھوں سے مٹی اٹھا اٹھا کر ڈال رہے تھے۔ اپنے ماموؤں اور بہنوئیوں کو انہوں نے ایک ایک مٹھی سے زیادہ مٹی نہیں ڈالنے دی تھی۔ وہ یہ خدمت خود کرنا چاہتے تھے۔ مٹی برابر کر کے انہوں نے تازہ گلابوں سے اسے ڈھک دیا۔ ان کے آنسو بہت دنوں تک ان پھولوں کو تازہ رکھنے والے تھے۔ اکبر علی ایک کونے میں خاموش کھڑا ان کو دیکھ رہا تھا۔

چند دن مہمانوں کا جمگھٹا رہا تھا تو اکبر کو پوری طرح احساس نہیں ہوا کہ کیا ہو گیا ہے۔ گاؤں والے، عزیز رشتہ دار تعزیت کرنے والے، کثرت سے آرہے تھے۔ وہ سب اس کے بیٹوں اور بھائیوں سے تعزیت کرتے۔ اکبر علی سے کسی نے ملنے کی کوشش نہیں کی۔



ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ سب مہمان اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے تھے۔ اس کی بیٹیاں، داماد اور بیٹے شام سے بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے اکبر علی کو وہاں نہیں بلایا تھا۔ اگلے روز شام تک وہ سب بھی باری باری روانہ ہو گئے۔ رات وہ اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ سلیمہ کی خالی چارپائی بجائے خوشی دینے کے عجیب طرح سے ہولا رہی تھی۔

کروٹیں بدل بدل کر کمر دکھ گئی تو وہ اٹھ کر الماریاں دیکھنے لگا۔ اس کے سب کپڑے استری شدہ ٹنگے ہوئے تھے۔ درازیں دیکھیں تو اس کے سب پرنے، رومال دھلے پڑے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سلیمہ کے کپڑے اور چیزیں دیکھے لیکن کہیں بھی اس کے کپڑے نہیں تھے۔ اس نے ساری الماریاں الٹادیں لیکن سلیمہ کی کوئی چیز وہاں موجود نہیں تھی۔ جانے کیوں رات اتنی لمبی تھی۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ باہر آگیا۔ دینو' دودھ کی بالٹیاں لا لاکر چوکے کے پاس رکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی آگ جلا رہی تھی۔ اپنے گھر جاتے وقت اس کی بیٹیوں نے یہ انتظام کیا تھا۔

بددلی سے ناشتا کرکے وہ وہیں صحن میں لیٹا رہتا۔ اسلم کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے آواز لگاتا تو وہ سوتا ہوا بن جاتا۔ سارا سارا دن کسلمندی سے بکائن کے نیچے پڑا رہتا۔ نہ کپڑے بدلتا' نہ باہر نکلتا۔ یکم آئی تو دینو نے وصولیاں کرکے رقم لا تھمائی۔ لیکن اس پھولی پھولی جیب سے وہ سرمستی' وہ سرور حاصل نہ ہوا۔ اکبر نے دینو کو گھر کے اخراجات اور روزمرہ خرچ کے لیے رقم دے کر باقی رقم اپنی بیٹیوں کو دینو کے ذریعے ہی بھجوادی لیکن وہ لفافے جوں کے توں واپس آگئے۔

یہ پہلی ضرب تھی۔ اس نے گالی دی تو محسوس ہوا جیسے اپنے منہ پر ہی تھوک دیا ہو۔ وہ اسلم کی بیٹھک میں گیا تو وہاں بھی دل نہ لگا۔ وہ شہر چلا گیا۔ وہاں سارے پیسے اڑا کر نشے میں دھت لوٹ رہا تھا کہ کچھ اچکوں نے گھیر لیا۔ بٹوا اور موٹر سائیکل چھین کر سر پر ڈنڈا مارا۔ وہ دن چڑھے تک سڑک کنارے بے ہوش پڑا رہا۔ دینو پیچھے نہ آتا تو شاید خون بہنے سے وہ مرجاتا۔ دینو نے پٹی کروائی اور گھر لے آیا۔ اب اکیلے گھر میں اس کو ڈر لگنے لگا تھا۔ بیٹیاں پتا کرنے آئیں تو اس کی پراگندہ حالت دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔

اکبر کو وہ اپنے گھر بھی نہیں لے جاسکتی تھیں۔ وہ گھر سلیمہ کے بھائی کا تھا۔ اور وہ اکبر سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا تھا۔ انہوں نے بڑے بھائی کو بلایا اور اکبر کو شہر بھجوادیا۔ اکبر وہاں ایک ہفتہ بھی نہیں رہ سکا۔ وہ بیٹے کو بتائے بنا واپس گاؤں آگیا۔ ایک عجیب سی وحشت نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ زیادہ تر قبرستان میں سلیمہ کی قبر کے اردگرد پھرتا رہتا۔ کئی دفعہ اس کے بچوں نے اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کی مگر وہ وہاں سے بھاگ آتا۔ اسے ہر جگہ سے خوف آتا تھا۔ ہوا میں اس کے زہرخند لفظوں کی بازگشت تھی۔ سورج کی روشنی نے اس کے تنور کی طرح جلتے لہجے کی حدّت اسی پر الٹادی تھی۔ رات اپنے بے رحم ہاتھوں سے اس کا کلیجہ نوچ لیتی تھی۔ بستر پر خنجر اگ آئے تھے۔

ان سب سے بچتا' سر پر دونوں ہاتھ رکھے' چلاتا ہوا قبرستان کی طرف بھاگتا۔ اس کی قبر کے قریب پہنچتے ہی وحشتیں بھاگ جاتیں' لفظ خاموش ہوجاتے اور برچھیاں اپنی کمین گاہوں میں چلی جاتی تھیں۔ بڑھی ہوئی داڑھی اور مٹی سے اٹے ہوئے کپڑوں میں موسم کے گرم و سرد سے بے پروا وہ سلیمہ کی قبر سے لپٹ جاتا۔ صرف یہی جگہ تھی جو اسے طعنہ نہیں دیتی تھی۔ یہاں کوئی بازگشت نہیں تھی۔ ساری دنیا میں اب اکبر علی کے لیے یہی ایک پناہ گاہ تھی۔

☼



نگہت عبداللہ





رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک وہ گہری نیند سے جاگ گئی۔ کمرہ مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور سرد خانہ بنا ہوا تھا۔ حالانکہ وہ خود دروازے کھڑکیاں چیک کر کے سوئی تھی پھر جانے وسط جنوری کی سرد ہوا نے کون سا راستہ دیکھ لیا تھا۔ اس نے اندھیرے میں ادھر ادھر، پھر نشا اور روبی کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ کوئی آواز بھی نہیں تھی ورنہ سرد رات کی خاموشی میں سانسوں کی آمد و رفت تو محسوس ہوتی ہی ہے۔ وہ بھی نہیں تھی تب وہ گھبرا کر لحاف سے نکل آئی اور بتی جلا کر دیکھا۔ نشا اور روبی لحاف میں سر دیے سو رہی تھیں۔ اسے قدرے اطمینان ہوا۔ بتی بند کر کے وہ بھی اپنے لحاف میں گھس گئی۔ لیکن اب مشکل سے ہی نیند آئی تھی۔ عجیب سا خوف تھا جو اسے سونے نہیں دیتا تھا۔

رت جگے کے باوجود صبح وہ معمول کے مطابق اٹھ گئی اور پہلے آٹا گوندھا پھر چائے کا پانی رکھ رہی تھی کہ نشا اور روبی بھی اٹھ کر آ گئیں۔ چار دنوں میں دونوں کیسی مرجھا گئی تھیں۔ بنا کچھ بولے اس کے ساتھ مل کر ناشتا بنایا پھر ٹرے میں رکھ کر تینوں برآمدے میں رکھے تخت پر آ بیٹھیں۔ کچھ دن پہلے اسی جگہ کتنی شوخیاں ہوتی تھیں۔ اماں کے ٹوکنے کے باوجود دونوں باز نہیں آتی تھیں اور اب سب کچھ تھم گیا تھا۔ شاید اماں جاتے ہوئے ان دونوں کی ساری شوخیاں، شرارتیں اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ گو کہ اس کا اپنا دل بجھ گیا تھا پھر بھی ان دونوں کی خاطر چائے کا کپ رکھ کر کہنے لگی۔

”دیکھو، ہم خدائی کاموں میں دخل نہیں دے سکتے۔ اللہ نے اماں کی زندگی اتنی ہی لکھی تھی اور یہ تو طے ہے کہ سب کو ایک ساتھ نہیں جانا۔ جس کی جتنی سانسیں لکھی ہیں، وہ اسے پوری کرنی ہیں۔ اس لیے ہمارے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ رونے کڑھنے سے اماں واپس نہیں آ جائیں گی۔ سن رہی ہو ناں؟“ آخر میں اس نے اپنی باتوں کا ردعمل جانچنے کے لیے ٹوکا تو جواب میں نشا اور روبی اٹھ کر اندر چلی

مکمل ناول



گئیں۔

"یا اللہ۔" اس نے خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے ناشتے کے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے پھر ان دونوں کو دیکھنے اندر جانے لگی تھی کہ دروازے پر دستک سن کر درمیان سے پلٹ گئی۔ اس کا خیال تھا آس پڑوس کی کوئی خاتون خیر خبر لینے آئی ہو گی لیکن سامنے تائی اماں تھیں۔ وہ بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔

"تائی اماں! بہت مشکل ہے۔" اس کے منہ سے یہی نکلا تھا۔

"حوصلہ رکھو بیٹا، حوصلہ رکھو۔ اب تم ہی بڑی ہو اور تمہیں چھوٹیوں کو بھی دیکھنا ہے۔" تائی اماں نے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے حوصلہ دیا۔

"نشا اور روبی تو بالکل چپ ہو کر رہ گئی ہیں۔" وہ اپنی آنکھوں میں در آنے والے آنسو پونچھتے ہوئے بولی تھی۔

"ظاہر ہے' اتنا اچانک سانحہ ہوا۔ صبر آتے آتے ہی آئے گا۔" تائی اماں نے کہہ کر لمبی آہ بھری تو وہ انہیں بٹھا کر دروازے کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"آپ کس کے ساتھ آئی ہیں تائی اماں؟"

"اتنی صبح کون اٹھتا ہے بیٹا۔ میرا دھیان تم لوگوں کی طرف تھا' جب ہی کسی کے اٹھنے کا انتظار نہیں کیا' رکشہ پکڑا اور چلی آئی۔ تم کھڑی کیوں ہو میرے پاس بیٹھو۔" تائی اماں نے بتاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا پھر کہنے لگیں۔

"دراصل میں پرسوں شرجیل جا رہا ہے ناں' اس لیے رات دیر تک سب اسی کے ساتھ بیٹھے رہتے ہیں۔ فرح اور نیو کا تو دل ہی نہیں بھرتا' کہتی ہیں پھر پتا نہیں بھائی کب آئیں گے۔"

"شرجیل واپس جا رہا ہے۔" اس نے بس یہی ایک بات سنی تھی اس کے بعد پتا نہیں تائی اماں کیا کہہ رہی تھیں۔

"ہاں اچانک جو آنا پڑا اسے۔ اس لیے مشکل سے ہفتے بھر کی چھٹی ملی۔ اب کیا کرے نوکری میں تو یہی ہوتا ہے۔" وہ ایک لفظ جی تک نہ کہہ سکی۔

"ہا ہائے۔" تائی اماں آہ بھر کر پھر شروع ہو گئیں۔ انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ میں نے تمہاری اماں سے کہا تھا کہ اب کے شرجیل آئے گا تو میں اس کی شادی کروں گی تم بھی تیاری کر رکھنا۔ خوش ہو گئی تھیں تمہاری اماں۔ اب کیا پتا تھا کہ اس کے نصیب میں بیٹیوں کو رخصت کرنا لکھا ہی نہیں تھا۔" وہ سر جھکا کر اپنے ناخن دیکھنے لگی۔ آنسو کہیں اندر گر رہے تھے۔

"رات شرجیل بھی بہت پریشان ہو رہا تھا کہ تم تین لڑکیاں اکیلی کیسے رہو گی۔ میں بھی کیسی مجبور ہوں۔ تمہیں پتا ہے میری بہو کو فرح اور نیو کھلتی ہیں ہم تین بہنوں کو کہاں برداشت کرے گی۔ وہ نہ ہوتی تو تم میرے پاس آجاتیں اور تمہیں تو آنا ہی اس گھر میں ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں تائی اماں! ہمارا اللہ مالک ہے۔" وہ بڑی دقتوں سے بولی تھی۔

"ہاں بیٹا! اللہ کے حوالے ہم ہمت پکڑو۔ آس پاس کے لوگ تو اچھے ہیں ناں؟" تائی اماں نے کریدنے کے انداز میں پوچھا تھا۔

"جی میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں میں تو ایسے ہی ناشتا کیے بغیر چلی آئی۔" تائی اماں نے گویا چائے کے ساتھ ناشتے کا آرڈر بھی دے دیا تو اس نے پہلے کمرے میں جھانک کر نشا اور روبی کو تائی اماں کے آنے کا بتایا پھر کچن میں آگئی۔ چائے کے ساتھ پراٹھا اور ایک انڈے کا آملیٹ بنا کر وہ سلیقے سے ٹرے میں رکھ کر تائی اماں کے لیے لے کر آئی تو وہ نشا اور روبی کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھا رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔

تائی اماں نے باتوں کے دوران ناشتا کیا پھر خاص طور سے اسے اپنا اور چھوٹیوں کا خیال رکھنے کا کہہ کر چلی گئیں۔

"شرجیل بھائی پرسوں واپس جا رہے ہیں؟" وہ

دروازہ بند کر کے واپس آئی تو نشا نے اسے دیکھ کر جانے بتایا یا پوچھا تھا۔ اس نے بس اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور تیزی سے اندر چلی گئی تھی۔

پھر دوپہر کے بعد شرجیل آ گیا تھا۔ تو وہ اپنے انداز میں تینوں بہنوں کو تسلی دلاسا دیتا رہا اور کیوں کہ نشا اور روبی اس سے کافی مانوس تھیں اس لیے وہ اس کی باتوں سے بہل گئی تھیں ——— وہ تنہائی ملتے ہی شرجیل سے کہنے لگی۔

"تھینک یو شرجیل۔ تم نے نشا اور روبی کو سیٹ کر دیا ورنہ میں تو پریشان ہو گئی تھی کہ کیسے ان دونوں کو سنبھالوں گی۔"

"ارے وہ کوئی ننھی بچیاں تھوڑی ہیں' آہستہ آہستہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی اور مجھے تو لگ رہا ہے ان سے زیادہ تمہیں سنبھالنے کی ضرورت ہے۔"

شرجیل نے اس کے نڈھال وجود اور زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"تم کیوں جا رہے ہو شرجیل۔"

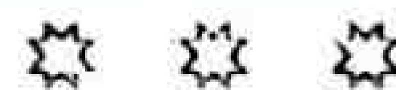
"کیا کروں' نوکری کا معاملہ ہے ورنہ سچ پوچھو تو تمہیں اس حال میں چھوڑ کر جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا۔" شرجیل نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تو اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"زینی! خدا کے لیے مجھے مشکل میں مت ڈالو۔ تمہارے آنسو مجھے کمزور بنا دیں گے' یہ کچھ وقت صبر اور حوصلے سے گزار لو۔" شرجیل نے اس کی پلکوں کی نمی اپنی انگلی پر سمیٹ لی۔

"لیکن شرجیل میں اکیلی تو نہیں ہوں' میرے ساتھ نشا اور روبی بھی ہیں۔" اس نے کہا تو وہ فوراً" بولا تھا۔

"میں نہیں جانتا کیا اور اب وہ دونوں صرف تمہاری ہی نہیں میری بھی ذمہ داری ہیں۔ تم تنہا خود کو ہلکان مت کرو زینی! بس سال دو سال کی بات ہے پھر ہم سب ساتھ رہیں گے۔"

"سال دو سال۔" اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا تھا۔



سب سے بڑا مرہم وقت ہے، زخم بھرتا نہیں تو اس پر کھرنڈ ضرور جما دیتا ہے۔ شرجیل کے جانے کے بعد گو کہ تنہائی کا احساس بڑھ گیا تھا پھر بھی زندگی معمول پر آنے لگی تھی۔ آج پورے پندرہ دنوں بعد اس کے بہت سمجھانے بجھانے پر نشا اور روبی کالج گئی تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ انہیں پڑھنے کا شوق نہیں تھا بلکہ ان دونوں کو بھی اس کا خیال تھا کہ وہ اکیلی کیسے رہے گی۔ اور وہ بڑی مشکل سے اپنی طرف سے اطمینان دلا پائی تھی۔

بہرحال ان کے جانے کے بعد اس نے معمول کے کام نمٹائے پھر کھانا بنا کر فارغ ہوئی تھی کہ جدہ سے شرجیل کا فون آگیا۔

"کیسی ہو کیا کر رہی تھیں؟" شرجیل غالباً عجلت میں تھا۔

"کچھ نہیں۔ میرا مطلب ہے ابھی کھانا بنا کر فارغ ہوئی ہوں۔" وہ شرجیل کی آواز سن کر ہی ساری تھکن بھول گئی تھی۔

"اور وہ دونوں کہاں ہیں؟" شرجیل نے نشا اور روبی کا پوچھا تو وہ گہری سانس کے ساتھ بولی تھی۔

"شکر آج دونوں کالج گئی ہیں۔"

"ہاں میں بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ ان دونوں کو کالج نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اور تم بھی اگر یونیورسٹی جوائن کر لو تو آدھا دن اس مصروفیت میں اچھا گزر جائے گا۔"

"نہیں شرجیل! اب یہ ممکن نہیں ہے پھر آدھا دن تو ایسے ہی گزر گیا کام کاج میں پتا ہی نہیں چلا۔ اب وہ دونوں بھی آنے والی ہوں گی۔" اس نے سہولت سے کہا تھا۔

"اور ہاں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہنا۔" شرجیل ہمیشہ یہ بات ضرور کرتا تھا اور اس نے بھی ہمیشہ والا جواب دیا تھا۔

"فکر مت کرو تم سے ہی کہوں گی۔"

"اچھی بات ہے اپنا خیال رکھنا۔" شرجیل نے کہہ کر فون بند کر دیا تو اس نے اپنے سیل فون کو شاکی نظروں سے دیکھا، پھر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹنا چاہتی تھی کہ بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی۔ خاصا جارحانہ انداز تھا' اسے خاصا ناگوار گزرا اور دروازہ کھول کر ٹوکنا چاہتی تھی لیکن جیسے ہی اس نے کنڈی گرائی' دھاڑ سے دروازہ دھکیل کر نشا اور اس کے پیچھے روبی انتہائی غصے میں جانے کیا بولتی ہوئی تیز قدموں سے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

"الٰہی خیر۔" وہ جلدی سے دروازہ بند کر کے ان کے پیچھے آئی تو روبی اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔

"لوفر کمینہ' اس کے اپنے گھر میں بہنیں نہیں ہیں کیا۔ صبح بھی اسٹاپ تک پیچھا کیا اور ابھی پھر گلی کے موڑ پر کھڑا تھا۔ دو چار اور لفنگے لے کر۔"

"روبی' روبی۔۔۔" انتہائی پریشان ہو کر اس نے روبی کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ "کون' کس کی بات کر رہی ہو؟"

"وہی جو محلے کا دادا بنا پھرتا ہے۔" نشا بول پڑی۔

"اماں کے ہوتے تو کبھی اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ اب ہم اکیلی ہو گئی ہیں تو۔"

"ک۔۔۔ کچھ کہا اس نے؟" اس کی اپنی جان پر بن آئی تھی۔

"پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا اور ہم دونوں کی طرف اشارا کر کے سب ہنس بھی رہے تھے۔" روبی بتاتے ہوئے رو پڑی تو وہ مزید پریشان ہو گئی۔

"روبی میری جان' تم رو نہیں۔"

"تو اور کیا کروں۔ اب ہمارے ساتھ یہ سب ہو گا' میں نہیں جاؤں گی کل سے کالج۔"

"میں بھی نہیں جاؤں گی۔" نشا نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔

"پاگل ہو تم دونوں۔ اب اس کے ڈر سے ہم کیا گھر میں بند ہو کر بیٹھ جائیں گے۔" اس نے سنبھل کر دونوں کو ٹوکا۔

"تماشا بھی نہیں بننا ہمیں۔" روبی تڑخ کر بولی تھی۔

"اچھا بس چپ ہو جاؤ اور چلو منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" وہ کہہ کر کچن میں آ

گئی۔ اصل میں تو اس صورت حال سے اس کا اپنا ذہن چیخ گیا تھا۔ معاشرے کے ان ناسوروں کا مقابلہ وہ نہیں کر سکتی تھی۔ تو چھوٹی بہنوں کو کیسے حوصلہ دیتی۔ پھر بھی کھانے کے دوران وہ انہیں یہی سمجھاتی رہی کہ انہیں کسی کی پروا نہیں کرنی چاہیے اور کسی حد تک وہ دونوں تو سمجھ گئیں لیکن خود وہ اطمینان سے تو پہلے بھی نہیں تھی اب تو سب کچھ درہم برہم ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مدد کے لیے کسے پکارے کوئی بھی تو اپنا نہیں تھا۔ ایک صرف شرجیل تھا جس سے دو سال پہلے اس کی منگنی ہوئی تھی، وہ بھی جدہ چلا گیا تھا۔ اس کی اپنی مجبوریاں بلکہ اس پر ذمہ داریاں بھی تھیں۔ یہ وہ بھی سمجھتی تھی پھر بھی ایک مبہم آس کے سہارے

رات میں جب نشا اور روبی سو گئیں تب اس نے شرجیل کے سیل فون پر بیل دی تو چند لمحوں بعد ہی اس کا فون آگیا۔

"کیا بات ہے، نیند نہیں آرہی؟" شرجیل نے چھوٹتے ہی اپنے قیاس کو زبان دی تو جواب میں وہ رو پڑی۔

"ارے زینی! کیا ہوا۔" شرجیل کی پریشانی فطری تھی۔

"شرجی میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

"کیا کیا برداشت نہیں کر سکتیں۔ کیا ہوا ہے؟ بولو زینی۔" شرجیل کے بار بار پکارنے پر اس نے بتا دیا کہ اسے کیسی پریشانی کا سامنا ہے۔ اور یہ کہ نشا اور روبی کو تو وہ سمجھا بجھا کر کالج بھیج دے گی لیکن اس کے بعد خود چین سے نہیں رہ سکے گی۔ اس کی ساری بات سن کر شرجیل غالباً سوچ میں پڑ گیا تھا۔ جب ہی کتنی دیر تک کچھ بولا ہی نہیں تو وہ ـــــ زچ ہو گئی۔

"بتاؤ ناں شرجی میں کیا کروں۔"

"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس روبی اور نشا سے کہو ان لڑکوں کی طرف بالکل دھیان نہ دیں۔ تب کچھ دنوں میں وہ خود ہی راستے سے ہٹ جائیں گے۔"

"لیکن شرجی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ حقیقتاً "ڈری ہوئی تھی۔

"پاگل مت بنو۔ تم بڑی ہو، وقت حالات کا مقابلہ تمہیں کرنا ہے۔ ڈرو گی تو چھوٹیوں پر کیا اثر ہو گا۔ سمجھ رہی ہو ناں۔" وہ سمجھی یا نہیں بلا ارادہ ہی فون بند کر دیا تھا۔

پھر اگلے کتنے دن اس کی جان سولی پر اٹکی رہی۔ نشا اور روبی کو کالج بھیج کر جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکراتی پھرتی اور ان کے آنے پر ہی خیال آتا کہ معمول کے سارے کام ایسے ہی پڑے ہیں۔ جلدی جلدی کھانا بناتی اس کے بعد صفائی ستھرائی میں لگتی۔ نشا اور روبی نے گو کہ پھر ان لڑکوں کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن جس طرح وہ دھواں دھواں چہرے لیے گھر میں داخل ہوتی تھیں اس سے وہ سمجھ جاتی کہ لڑکوں نے پیچھا چھوڑا نہیں۔ شرجیل سے اب کچھ کہنا فضول تھا۔ وہ تسلی دلاسے کے ساتھ ہمت حوصلے کا طویل لیکچر تو دے سکتا تھا آ نہیں سکتا تھا۔

اس وقت وہ سبزی کی باسکٹ لے کر برآمدے میں تخت پر آ بیٹھی۔ کچھ دیر میں ٹیوشن کے بچے آنے والے تھے۔ اس لیے وہ جلدی جلدی سبزی کاٹ رہی تھی کہ اندر سے آتی روبی کی آواز پر اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"اب میں چپ نہیں رہوں گی۔ ایسی کھری کھری سناؤں گی اس لوفر کو کہ پھر ہمارے تو کیا کسی کے راستے میں بھی کھڑا ہونا بھول جائے گا۔"

"میں بھی یہی سوچ چکی ہوں روبی اور اب ہمیں یہ کرنا پڑے گا۔" نشا نے روبی کی تائید کی تو وہ ایک دم اٹھ کر اندر آگئی اور تیز لہجے میں بولی تھی۔

"کچھ نہیں کرو گی تم دونوں، سمجھیں۔"

"ہاں تو کب تک ہم اس کی گھٹیا حرکتیں برداشت کریں۔ وہ ایسے باز آنے والا نہیں ہے۔" روبی نے تنک کر کہا تو اس نے پہلے خود ضبط کیا پھر کہنے لگی۔

"آجائے گا باز میں سوچ رہی ہوں محلے میں کسی سے بات کروں۔ وہ اسے سمجھا لیں گے۔ تم لوگوں کو

اس کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"سوچ لیں آپا۔ محلے والے تو اور باتیں ہی بنائیں گے اور مجھے نہیں لگتا کوئی اسے سمجھانے کی ہمت کرے گا۔" نشا غلط نہیں کہہ رہی تھی پھر بھی وہ ان دونوں کو باز رکھنے کی خاطر کہنے لگی۔

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگر محلے والے اسے نہ سمجھا سکے پھر کچھ اور سوچیں گے۔"

"ٹھیک ہے، آپ کوشش کر دیکھیں اس کے بعد ہمیں مت روکیے گا۔" روبی گویا اس سے نمٹنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

"اچھا چلو اب تم دونوں کھانے کی تیاری کرو۔ میرے ٹیوشن کے بچے آتے ہوں گے۔" اس نے ان دونوں کو تو اس موضوع سے ہٹا دیا لیکن اپنا دھیان کسی طرح بھی ادھر ادھر منتقل نہیں کر سکی۔ بچوں کو پڑھاتے ہوئے بھی اس کا ذہن الجھتا رہا تھا۔ مزید اس رات شرجیل کا فون آیا تو اس کی باتوں کے جواب میں بھی وہ بس ہوں ہاں کرتی رہی، جب اس نے ٹوکا تو وہ سیل فون روبی کو تھما کر کروٹ بدل گئی۔

"ہاں شاید آپا کو نیند آ رہی ہے۔" اس نے روبی کو کہتے سنا پھر لحاف سر تک کھینچ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

روبی اور نشا کو کالج بھیج کر اس نے جلدی جلدی ناشتے کے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے پھر بیرونی دروازے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کا دل بڑی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد باہر سے اونچا بولنے اور ہنسنے کی آواز آئی تو اس نے ساری ہمتیں یکجا کر کے دروازہ کھول دیا اور بمشکل پکارا تھا۔

"سنیں۔"

ادھر پہلے جیسی اندر ہوئی پھر آس پاس یوں دیکھا جیسے جاننا چاہتا ہو کسے پکارا گیا ہے۔ اس کے بعد اپنے ساتھی لڑکے کو دیکھا تو اس نے آنکھ مار کر جانے کا اشارہ کیا پھر بھی اس نے اپنی طرف اشارہ کیا تھا۔

"جی آپ....." اس نے جی کڑا کر کے کہا تو وہ غیر یقینی کی کیفیت میں پاس آ گیا۔

"سوری میں آپ کو زحمت دے رہی ہوں۔ اصل میں اس وقت کوئی ہے نہیں اور مجھے اسٹور سے کچھ سامان منگوانا ہے۔ آپ لا دیں گے۔" اس نے ایک ہی سانس میں اپنا مدعا بیان کر ڈالا تو اس نے پہلے پلٹ کر قدرے فاصلے پر کھڑے اپنے ساتھی کو دیکھا پھر اس سے بولا تھا۔

"لا دوں گا۔"

"ایک منٹ میں پرچی لے کر آتی ہوں۔" وہ دروازہ بھیڑ کر اندر آئی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور پرچی پر کچھ چیزیں لکھتے ہوئے ہاتھ بھی۔ پھر پرچی کے ساتھ پیسے اسے دے کر وہ برآمدے کے فرش پر ہی ایک طرح سے ڈھے گئی تھی۔ تقریباً" پندرہ منٹ بعد جب دروازے پر دستک ہوئی تب وہ کسی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔

"بہت شکریہ۔" اس کے ہاتھ سے سامان کا تھیلا لیا تو وہ پوچھنے لگا۔

"اور کوئی کام۔"

"نہیں بس۔" وہ جانے لگا تو پھر پکار لیا۔

"سنیں۔" وہ پورا اس کی طرف گھوما تھا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"گل۔۔۔ گل ریز۔"

"اچھا نام ہے۔ بہت شکریہ گل ریز۔" وہ کوشش کر کے مسکرائی اور اسے حیرت زدہ چھوڑ کر دروازہ بند کرتے ہی اس کی آنکھوں کے پیمانے چھلک گئے تھے۔ اس کا رونا اپنی بے بسی پر تھا۔ کام کے دوران بار بار آنکھیں بھیگتی رہیں۔ ایسا کب سوچا تھا اس نے ابا کے بعد بھی گو کہ حالات خراب ہوئے تھے لیکن اماں نے بہت صبر اور حوصلے سے گزارہ کیا تھا۔ وہ صبر اور حوصلہ اس میں بھی تھا اگر جو بات صرف تنگیٔ حالات کی ہوتی۔ اب تو معاملہ ہی اور تھا۔ کسی سے کہنے کا مطلب تھا، نہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی اس گھر پر ٹک جائیں۔ اس لیے اس نے خود ہی اس سے بات کرنے کا سوچا تھا۔ اور پہلے مقام پر ہی ڈھے گئی تھی۔

لیکن کچھ بھی ہو' رات اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسے نشا اور روبی کے راستے سے ہٹا کر رہے گی۔

جب وہ دونوں کالج سے لوٹیں تو بظاہر وہ کھانا گرم کرنے اور دستر خوان لگانے میں لگی رہی لیکن سارا دھیان ان دونوں کی طرف ہی تھا۔ جن کے چہرے گزشتہ دنوں کی طرح دھواں دھواں تو نہیں تھے البتہ ناگواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے خود سے کچھ بھی کہنے یا پوچھنے سے گریز کیا۔ جب تینوں دستر خوان پر بیٹھیں تب روبی اس سے پوچھنے لگی۔

"آپا! آپ نے کسی سے بات کی ہے؟"

"کیا بات.....؟" اس کا نوالہ توڑتا ہاتھ وہیں رک گیا۔

"ان لوفر لڑکوں کے بارے میں؟" روبی سیدھے سادے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں وہ ایک بڑی بی آئی تھیں' میں نے ان سے کہا' ذرا ان لڑکوں کو سمجھا دیں۔ کچھ کہا ان لوگوں نے کیا؟" اس نے بتا کر پوچھا تو روبی بولی۔

"نہیں آج تو کوئی بے ہودہ بات نہیں کی۔"

"شکر ہے' ایک دو بار اور سمجھائیں گی بڑی بی تو ان شاءاللہ راستے سے بھی ہٹ جائیں گے۔"

"کون سی بڑی بی؟ وہ جو اماں کے پاس آتی تھیں؟" نشا نے پوچھا تو وہ بوکھلا گئی۔

"اماں کے پاس کون آتی تھیں؟"

"وہ جو پچھلی گلی میں رہتی ہیں۔ اکثر اپنے پوتے کو بھی لے کر آتی تھیں۔" نشا نے یاد دلایا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں' نہیں یہ کوئی اور تھیں۔" اس نے اس خیال سے نفی کی کہ کہیں ان سے ملاقات پر دونوں ان کا شکریہ ادا کرنے نہ کھڑی ہو جائیں پھر اس موضوع سے ہٹنے کی خاطر کہنے لگی۔

"تائی اماں نہیں آئیں اتنے دنوں سے' اللہ کرے ان کی طبیعت ٹھیک ہو۔"

"ہاں تو آپا ہم چلتے ہیں ناں تائی اماں کے پاس بلکہ ہمیں جانا چاہیے۔" روبی یکدم مشتاق ہو گئی تو وہ اسے دیکھ کر بولی۔

"چلیں گے کسی دن۔"

"کسی دن نہیں آپا آج ہی چلیں۔"

"آج میں کیسے جا سکتی ہوں۔ ٹیوشن کے بچے آتے ہیں۔" اس نے بہانہ نہیں کیا تھا وہ پہلے بھی پابند تھی۔ چھٹی کے دن کے علاوہ کہیں آ جا نہیں سکتی تھی لیکن اس وقت نشا اور روبی کے سامنے مجبور ہو گئی۔ اتنے دنوں بعد تو وہ دونوں اچھے موڈ میں آئی تھیں۔ بچوں کی ماؤں کو اس نے آج چھٹی کا میسج کر دیا اور کچھ دیر آرام کے بعد تینوں تیار ہو کر گھر سے نکلیں تو بیکری پر کھڑے گل ریز نے پہلے چونک کر اسے دیکھا پھر نشا اور روبی کی نظر بچا کر ہاتھ کے اشارے سے سلام کر ڈالا۔

"یا اللہ....." وہ گرتے گرتے بچی' پیر مڑ گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے آپا۔" روبی نے اس کا بازو تھام لیا۔

"کچھ نہیں' وہ اتنے دنوں بعد گھر سے نکلی ہوں ناں۔" وہ سچ مچ روہانسی ہو گئی تھی۔

"توبہ ہے آپا! آپ تو بالکل بچی بن گئی ہیں۔ چلیں رکشے میں بیٹھیں۔" نشا کے اشارے پر رکنے والے رکشے میں روبی نے پہلے اسے بٹھایا تھا۔ پھر تمام راستہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی' اندر سے خائف ہو گئی تھی۔ بار بار کن اکھیوں سے روبی اور نشا کو دیکھتی کہ کہیں انہوں نے گل ریز کو اشارہ کرتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔ لیکن وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن تھیں۔ ساتھ ساتھ رکشہ والے کو راستہ بھی بتا رہی تھیں۔ جیسے ہی رکشہ رکا' تائی اماں کا گھر دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گئی۔ ایسی حالت میں وہ ان کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن اب یہاں سے واپسی بھی ممکن نہیں تھی۔ بمشکل خود کو گھسیٹتے ہوئے وہ روبی اور نشا کے ساتھ اندر آئی تو تائی اماں کے ساتھ فرح اور نیو بھی انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

"اچھا کیا آ گئیں۔ ایسے ہی آ جایا کرو۔ میں تو گھٹنوں کے درد سے مجبور ہوں۔ ورنہ دھیان تم لوگوں کی طرف ہی لگا رہتا ہے۔" تائی اماں بولے چلی گئیں' پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پوچھنے لگیں۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے' پیلی زرد رنگت ہو رہی

ہے۔"
"اصل میں تائی اماں' ابھی آتے ہوئے آپا گرتے گرتے بچی ہیں' اس لیے ایسی ہو رہی ہیں۔" روبی نے بتایا تو نیرہ تشویش سے پوچھنے لگی۔
"ارے کیسے......"
"کچھ نہیں' بس وہ پیر مڑ گیا تھا۔" وہ اب فوراً" بولی تھی۔
"درد تو نہیں ہو رہا۔ چلو میں آیوڈیکس لگا دوں۔"
نیرہ اس کی ہم عمر تھی' جھک کر اس کا پیر دیکھنے لگی تو اس نے ایک دم پیر پیچھے کر لیے۔
"اوہو کیا کر رہی ہو۔ کوئی درد ورد نہیں ہو رہا۔"
"اچھا چلو میرے کمرے میں کچھ دیر لیٹ جاؤ۔"
نیرہ زبردستی اسے اٹھا کر کمرے میں لے آئی۔ اس نے لیٹتے ہی کمبل ٹانگوں تک کھینچا تو دل چاہا پوری اس میں چھپ جائے کیونکہ اس کا دل ابھی تک سہا ہوا تھا۔ نیرہ اس کے پاس بیٹھ گئی تو پھر اس کی باتوں میں کافی حد تک اس کا دھیان بٹ گیا۔
تائی اماں نے رات کے کھانے تک انہیں روک لیا تھا۔ روبی اور نشا' فرح کے ساتھ مصروف رہیں۔ پھر کھانے کے بعد راحیل بھائی اور ان کی بیگم انہیں چھوڑنے آئے تھے۔
سردی کافی بڑھ گئی تھی جب ہی آتے ہی نشا اور روبی تو لحاف میں گھس گئیں لیکن اس نے کچن کا رخ کیا۔ وہ صبح ناشتے کے لیے اس وقت آٹا گوندھ کر رکھتی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے بیرونی دروازہ اچھی طرح بند کیا پھر اندر آ گئی۔
"آپا! نیرہ آپا نے آپ کو بتایا؟" نشا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"کیا......؟"
"اپنے پرپوزل کے بارے میں اور یہ کہ تائی اماں ہامی بھرنے والی ہیں۔" نشا نے بتایا تو وہ حیران ہوئی۔
"نہیں' نیرہ نے تو مجھ سے ذکر نہیں کیا۔"
"ہیں؟" روبی اور نشا کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تھا۔ پھر روبی کہنے لگی۔ "کمال ہے' ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ نیرہ آپا آپ کو کمرے میں لے کر ہی اس لیے گئی تھیں اور پوری تفصیل بتا ڈالی ہو گی۔"
"تم لوگوں کو کس نے بتایا؟"
"فرح نے' بہت تعریف کر رہی تھی کہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ لڑکا کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہے۔ نیرہ آپا نے آپ کو کیوں نہیں بتایا؟" روبی نے پھر حیرت کا اظہار کیا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔
"بھول گئی ہو گی۔"
"لیجیے یہ کوئی بھولنے والی بات ہے۔ فرح کے پاس تو اور کوئی موضوع ہی نہیں تھا۔ آپ پوچھیے گا نیرہ آپا سے' انہوں نے آپ سے کیوں چھپایا اور اصولاً" تو تائی اماں کو بھی بتانا چاہیے تھا کیونکہ آپ اس گھر کی ہونے والی بہو ہیں۔" روبی کو کسی طرح نیرہ کی رازداری ہضم نہیں ہو رہی تھی۔
"اچھا تمہیں کیوں اتنی تشویش ہو رہی ہے' ایسے معاملات میں رازداری برتی جاتی ہے' بات پکی ہو جائے گی پھر دیکھنا تائی اماں خود ہی سب کو بتائیں گی۔"
اسے روبی کا زیادہ بولنا اچھا نہیں لگا تو ٹوک دیا۔
"پھر فرح نے کیوں بتایا۔"
"فرح بھی تم لوگوں کی طرح پاگل ہے اس لیے۔ چلو اب سونے کی کرو' صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے۔" اس نے کہہ کر بتی بند کر دی۔



ایک تو سردی اوپر سے دھوپ کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے ناشتے کے بعد بھی چولہا جلتا چھوڑ دیا تھا' جس کی وجہ سے کچن کا ماحول قدرے گرم اور اچھا لگ رہا تھا۔ وہ وہیں اسٹول پر بیٹھ کر ابھی سوچ ہی رہی تھی چاول کی ڈش بنائے یا سالن کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اسے گرم ماحول سے نکلنا خاصا کوفت میں مبتلا کر گیا۔ ناچار شال اچھی طرح لپیٹ کر دروازے تک آئی تھی۔
"کون؟"
"جی گل ریز۔"

"یا اللہ۔" شال میں لپٹا اس کا بدن کانپنے لگا۔ بمشکل کنڈی کھول کر ذرا سا دروازہ کھولا تو گل ریز نے فوراً سلام کیا۔

"وعلیکم۔۔۔" اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"وہ میں اس لیے آیا تھا کہ آپ کو کوئی کام ہو تو؟" اس نے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ نہیں کہتے کہتے رک گئی۔

"کچھ منگوانا تو نہیں ہے۔" "ہاں ایک اور کام ہے۔"

"جی بتائیں۔" وہ بولی کا جن لگ رہا تھا۔ اس کا سر دروازے کی چوکھٹ سے اوپر نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ تھوک نگل کر کہنے لگی۔

"آپ کو پتا ہو گا' ہماری اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب ہم بہنیں اکیلے رہتے ہیں۔ میری چھوٹی بہنیں کالج جاتی ہیں تو کچھ لڑکے انہیں تنگ کرتے ہیں' اگر آپ ان لڑکوں کو سمجھا دیں تو۔" اس کی بات سن کر گل ریز نے بھی پہلے کھنکھار کر گلا صاف کیا تھا غالباً" اس کے حلق میں کچھ اٹک گیا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی بہنیں میری بہنیں ہیں۔ میں ایسا سبق سکھاؤں گا ان لڑکوں کو کہ اپنی بہنوں کو دیکھنا بھی بھول جائیں گے۔"

"نہیں پلیز' جھگڑا نہیں۔"

"جھگڑا تو کرنا پڑے گا۔ آپ اطمینان رکھیں آپ لوگوں پر کوئی بات نہیں آئے گی اور کبھی کوئی ادھر میلی آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔ سمجھ رہی ہیں ناں' ایسا کوئی بھی مسئلہ ہو فوراً" مجھے بلا لینا۔" وہ اب جوش سے بول رہا تھا۔

"جی شکریہ۔" وہ دروازہ بند کر کے واپس کچن میں آئی تو اب خود کو داد دے رہی تھی اور اس کی بات دہرا کر ہنسی بھی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں' آپ کی بہنیں میری بہنیں ہیں۔" "اتنی نادان نہیں تھی وہ' پھر جانے کیوں اس نے سمجھ لیا کہ یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا۔ بہرحال اس خوشی یا خوش فہمی میں اس نے وہیں کھڑے کھڑے دو تین اسپیشل ڈشز بنا ڈالیں۔ پھر رسالا لے کر لحاف میں گھس گئی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ روبی کی مخصوص دستک نے ہی اس کی محویت توڑی تھی۔

دسترخوان پر اتنا اہتمام دیکھ کر بے شک روبی اور نشا کی بھوک چمک اٹھی تھی' پھر بھی انہوں نے فوراً" کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اور وہ جو مزید ڈش لے کر آرہی تھی' اسے دیکھ کر روبی پوچھنے لگی۔

"آپا یہ اتنا اہتمام کس خوشی میں۔ کیا کوئی لاٹری نکلی ہے۔"

"لاٹری کہاں سے نکلے گی۔" وہ ڈش رکھنے کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"پھر؟" دونوں سوالیہ نشان بن گئیں۔

"پھر یہ کہ چولہے کے پاس سے ہٹنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا' اس لیے یہ سب بنا ڈالا۔ چلو اب شروع کرو۔" وہ کہہ کر اپنی پلیٹ میں چاول نکالنے لگی تو ان دونوں نے اس کی تقلید کی۔

"آج تو دھوپ بھی نہیں نکلی' لگتا ہے بارش ہو گی۔" نشا نے کہا تو وہ جھرجھری لے کر بولی۔

"اللہ نہ کرے۔ مجھ سے تو یہ سردی برداشت نہیں ہو رہی۔"

"بارش کے بعد سردی کا زور ٹوٹ جائے گا آپا۔ اس لیے بارش ہونی چاہیے۔"

"بس رہنے دو اور تم ایک مہربانی کرنا کھانے کے بعد چائے بنا دینا اور ٹیوشن کے بچوں کو بھی تم دونوں مل کر پڑھا دینا۔ میں آج آرام کروں گی۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو روبی پوچھنے لگی۔

"تھک گئی ہیں آپا۔۔۔؟"

"نہیں' بس یونہی لیٹنے کو دل چاہ رہا ہے۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو وہ دونوں دسترخوان سمیٹ رہی تھیں۔ اس نے لحاف میں گھس کر پھر رسالا اٹھا لیا۔ اصل میں تو جو ناول پڑھ رہی تھی اسے مکمل کرنا چاہتی تھی۔ روبی بہت جلدی چائے بنا کر لے آئی تھی۔ چائے پینے کے دوران بھی اس کی نظریں رسالے پر سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ وہ اتنی مگن تھی کہ دروازے پر دستک بھی سنائی نہیں دی ورنہ بھاگ کر جاتی۔ کیونکہ جب سے اماں کا

انتقال ہوا تھا وہ روبی اور نشا کو دروازے پر نہیں جانے دیتی تھی۔ منع بھی نہیں کیا تھا لیکن موقع نہیں دیتی تھی۔ اس لیے اسے مصروف دیکھ کر نشا چلی گئی اور "فوراً" ہی واپس آکر اس کی طرف لفافہ بڑھا کر بولی۔

"آپا، رفیق چاچا دکان کا کرایہ دے گئے ہیں۔"

"ہیں۔" لفافہ لیتے ہوئے وہ بے دھیانی میں نشا کو دیکھے گئی تو وہ زور سے بولی۔

"رفیق چاچا کرایہ دے گئے ہیں دکان کا۔"

"تو چلا کیوں رہی ہو۔" اس نے لفافہ تکیے کے نیچے کھسکاتے ہوئے ٹوکا۔

"آپ سن جو نہیں رہیں۔" اس نے سر جھٹک کر چائے کا خالی کپ ایک طرف رکھا پھر لیٹنا چاہتی تھی کہ روبی چھلانگ مار کر اس کے سامنے آبیٹھی اور لجاجت سے بولی۔

"آپا! مجھے موبائل دلا دیں۔"

"کہاں سے دلا دوں اور تمہیں کیا ضرورت ہے موبائل کی گھر میں ایک ہے تو۔" اسے روبی کی فرمائش ذرا نہیں بھائی تھی۔

"اور گھروں میں ایک نہیں، ہر ایک کے پاس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کام کرنے والی ماسیاں بھی جیب میں موبائل رکھتی ہیں۔ صبح صبح دیکھیں تو سر پر گٹھڑی رکھے موبائل پر باتیں کرتی ہوئی جا رہی ہوتی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" اس کی بے نیازی پر روبی اس کا بازو کھینچ کر بولی۔

"آپ بس مجھے موبائل دلا دیں۔"

"میں کیسے دلا دوں۔ میرے پاس خزانہ ہے کیا۔" اس نے رسالا پٹخ دیا پھر تکیے کے نیچے سے لفافہ کھینچ کر کہنے لگی۔ "یہ جو کرایہ آیا ہے ناں اس سے راشن پانی آئے گا۔ بل بھی بھرنے ہوتے ہیں اور روزانہ کا سبزی، گوشت، مجھے نہیں پتا اماں کیسے پورا کرتی تھیں۔ مجھے تو بجٹ بنانے میں بھی وقت لگے گا۔ سمجھیں۔"

"تو آپ شرجیل بھائی سے کہیں وہ ایک موبائل۔"

"خبردار!" وہ روبی کی بات پوری ہونے سے پہلے چیخ پڑی۔ "ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔ ابھی اگر اماں ہوتیں تو زبان کھینچ لیتیں تمہاری۔ چلو اٹھو یہاں سے۔" روبی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی تو اس نے لیٹتے ہی لحاف سر تک کھینچ لیا۔ وہ خاصی بدمزا ہو گئی تھی۔ روبی کی کم عقلی پر کڑھتے کڑھتے وہ اچانک حالات پر کڑھنے لگی تھی۔

اگلے دن جب اس نے مہینے بھر کے راشن کی فہرست بنائی تو نہ صرف ہر شے میں کمی کی کافی چیزیں نظرانداز بھی کر گئی اور پیسوں کا حساب لگا کر اس نے روبی کے لیے موبائل کی گنجائش نکال ہی لی۔ پھر پہلے راشن کی خریداری کا سوچ کر وہ پہلے جنرل اسٹور پہنچی تو ابتدائی تاریخ ہونے کے باعث وہاں پیر رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ وہ چھوٹی ٹرالی لے کر ایک طرف کھڑی ہو گئی کہ کچھ رش کم ہو تو وہ اندر جائے۔ اس کی نظریں اسٹور کے اندر ہی بھٹک رہی تھیں کہ اچانک سلام کی آواز پر وہ اچھل پڑی۔

"آج آپ خود ہی سودا لینے آگئیں۔" وہ بوتل کا جن اس کے سر پر کھڑا تھا۔

"ظاہر ہے اب میں بار بار تو آپ کو زحمت نہیں دے سکتی۔" وہ سنبھل کر بولی تھی۔

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے اور یہاں کھڑے کھڑے تو آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ مجھے بتائیں کیا لینا ہے۔"

"نہیں، بس میں لے لوں گی۔" وہ جز بز ہوئی۔ دل تو چاہا کہہ دے اپنا راستہ لو۔ لیکن اتنی جلدی وہ اس سے نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

"ضد نہ کریں۔" وہ اس کے ہاتھ سے ٹرالی کھینچ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو اس نے جلدی سے پرس میں سے راشن کی لسٹ نکال کر اسے تھما دی، اور خود الٹے پیروں چلتے ہوئے اسٹور کے بیرونی احاطے سے نکلی ہی تھی کہ اچانک اس کے بازو کو زوردار جھٹکا لگا یوں کہ چند قدم وہ گھسٹتی چلی گئی، پھر خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے ایک کھڑی بائیک کا ہینڈل تھام لیا اور اپنے چکراتے سر کو تھامتے ہی اس پر

انکشاف ہوا کہ اس کا پرس چھن چکا ہے۔ اگلے پل اس کے حلق سے بے اختیار چیخ نما آواز بلند ہوئی تھی۔

"گل ریز۔" اور وہ جہاں تھا' ڈالی چھوڑ کر بھاگا چلا آیا۔

"وہ میرا پرس۔" وہ کانپتے ہوئے دور جاتی بائیک کی طرف اشارہ کررہی تھی۔

"اوئے..." گل ریز نے للکار کر دو تین موٹی موٹی گالیاں دیں لیکن واردات کرنے والے کہاں ہاتھ آنے والے تھے۔ آناً"فاناً" بائیک نظروں سے اوجھل ہوگئی تب وہ اسے دیکھ کر پریشان ہوگیا جو چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بری طرح کانپ رہی تھی۔ "غالباً" اس خیال سے کہ اب اس کے گرد جمگھٹا لگ جائے گا۔

"آ' آپ ادھر آؤ..." گل ریز نے اس کا بازو تھاما اور اسے تقریباً" کھینچتے ہوئے ایک کولڈ کارنر کے اندر لے آیا۔

"پانی پیو۔" فوراً" ہی منرل واٹر کی بوتل کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔ جسے دیکھتے ہوئے وہ بمشکل بول پائی تھی۔

"مم... میں گھر جاؤں گی۔"

"ہاں ہاں' پہلے ریلیکس تو ہو جاؤ۔ یہ لو پانی پیو۔" گل ریز نے خاصے جارحانہ انداز میں بوتل اس کے ہاتھ میں تھمائی تو اندر سے خائف ہو کر اس نے بوتل منہ سے لگالی۔

"آپ کا سامان تو رہ گیا۔ آپ یہیں بیٹھو' میں لے کر آتا ہوں۔" وہ کہہ کر اٹھنے لگا تھا کہ اس نے سختی سے روک دیا۔

"نہیں۔ مجھے کچھ نہیں لینا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ پیسے پرس میں تھے۔ ابھی میں کہاں سے پے منٹ کروں گی۔"

"پے منٹ ہو جائے گی۔ آپ فکر نہ کرو۔" وہ کہہ کر پھر اٹھنا چاہتا تھا۔

"میں نے کہانا' نہیں۔ مجھے ابھی کچھ نہیں لینا۔"

وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ کی مرضی۔" وہ اس کے ساتھ چلنا چاہتا تھا لیکن کولڈ کارنر سے نکلتے ہی اس نے روک دیا۔

"دیکھیں گل ریز! مجھے محلے میں تماشا نہیں بننا' آپ پلیز۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر تیز قدموں سے چل پڑی۔

گھر آتے ہی وہ بستر پر ڈھے گئی اور اس فکر میں کہ اب مہینہ کیسے چلے گا وہ رونا بھی بھول گئی اور کھانا پکانا بھی۔ روبی اور نشا کے آنے پر وہ دروازہ کھول کر پھر بستر پر آن بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا آپا! طبیعت ٹھیک ہے۔" نشا نے فوراً" اس کی غیر معمولی خاموشی محسوس کرلی تھی اور وہ جو رونا بھولی ہوئی تھی ایک دم رو پڑی۔

"ارے کیا ہوا آپا۔"

"آپا... آپا کیا ہوا بتائیں ناں۔" دونوں پریشان ہو کر اس کے دائیں بائیں آبیٹھیں اور اسے ہلا ہلا کر پوچھنے لگیں۔

"کچھ نہیں بس۔" وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

"کیا بس' بتائیں کیا ہوا ہے۔" روبی پیچھے پڑ گئی اور وہ جانتی تھی جانے بنا نہیں رہے گی تب ہی ناچار پرس چھننے کا واقعہ بتایا تو روبی الٹا بگڑ گئی۔

"کیا ضرورت تھی اکیلے جانے کی۔ ہمارا انتظار کر لیتیں' ہم ساتھ چلتے۔"

"اوہو روبی اب ایسے تو نہ کرو۔ آپا پہلے ہی پریشان ہیں۔" نشا نے روبی کو ٹوکتے ہوئے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اس پریشانی کا کوئی حل نہیں ہے۔" روبی کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ نشا نے اپنی سمجھ کے مطابق کچھ دیر اسے تسلی دلاسا دیا۔ پھر دیکھا کہ کھانا بھی تیار نہیں ہے تو روبی کو ملا کر جلدی جلدی روٹی کے ساتھ آملیٹ بنا کر لے آئی اور اسے بھی زبردستی کھلایا۔ اس دوران روبی کا مزاج برہم ہی رہا تھا۔ حالانکہ روبی اور نشا میں عمروں کا فرق نہیں تھا۔ جڑواں تھیں لیکن عادات' مزاج ذرا

نہیں ملتے تھے۔ روبی بہت جلدی برا مانتی اور غصے میں آجاتی تھی' اس کے برعکس نشا ٹھنڈے مزاج کی اور صلح پسند تھی۔ بہرحال کھانے کے بعد وہ پھر لیٹی تو سو گئی تھی۔ اور اسے سوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ نشا نے جھنجھوڑ کر اسے اٹھادیا۔ اور پھولی سانس کے ساتھ بولی۔

"آپا' آپا وہ آیا ہے۔"

"وہ کون؟" روبی سنتے ہوئے آگئی تھی۔

"وہ' وہ بدمعاش۔ وہ جو راستے میں کھڑا ہوتا تھا۔" نشا بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے الگ پریشان ہو کر روبی کو دیکھا تو وہ نشا سے پوچھنے لگی۔

"کیا کہہ رہا ہے؟"

"کہہ رہا ہے اپنی باجی کو بھیجو۔" نشا نے بتایا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم دونوں یہیں رکو۔" وہ کہہ کر دروازے پر آئی اور گل ریز کو دیکھ کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بڑے دو تھیلے فوراً" اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

"یہ آپ کا سامان۔"

"آپ۔۔۔"

"دیکھیں' ابھی آپ یہ رکھ لیں بعد میں بے شک میرا قرض اتار دینا۔" گل ریز نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور زبردستی دونوں تھیلے اسے تھما کر چلتا بنا۔ وہ بمشکل خود کو گھسیٹتے ہوئے اندر آئی تو روبی اور نشا سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں۔ اس سے فوراً" کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ شاپر رکھ کر خود بھی بیٹھ گئی تب روبی آگے آ کر پوچھنے لگی۔

"یہ کیا دے گیا ہے وہ؟"

"را۔۔۔ راشن ہے۔ پتا نہیں کون تھا کہہ رہا تھا اس نے میرا پرس چھینتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر اس نے ان لڑکوں کو پکڑا۔ میرا پرس لیا اور واپس اسٹور پر گیا تو میرا سامان پیک رکھا تھا۔ وہ یہ لے آیا۔" سوچ سوچ کر بولتے ہوئے اس نے شاپرز کی طرف دیکھا پھر ان دونوں سے بولی۔ "چیک کرو اس میں سامان کی لسٹ بھی ہو گی۔ ہمارا ہی ہے یا کسی اور کا اٹھا لایا ہے۔"

اس سے پہلے کہ روبی کوئی جرح کرتی نشا فوراً" شاپر میں سے چیزیں نکالنے لگی۔

"چینی' پتی' صابن اور یہ موبائل۔۔۔ آپا موبائل۔" نشا چیخی۔ روبی نے فوراً" بڑھ کر اس کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا۔

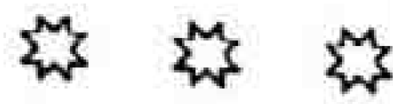
"ہاں میں نے راشن میں کمی بیشی کر کے روبی کے لیے موبائل کی گنجائش نکال لی تھی۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے بتایا تو روبی ایک دم خوش ہو گئی۔

"تھینک یو آپا تھینک یو۔"

"تمہیں ان شاء اللہ اگلے مہینے دلا دوں گی۔" اس نے نشا سے کہا تو وہ شاکی انداز میں بولی۔

"میں نے کچھ کہا ہے آپا۔۔۔"

"کہا نہیں پھر بھی میں دلا دوں گی۔ چلو اب تم دونوں یہ سامان اٹھا کر کچن میں رکھو۔" وہ ان دونوں کو کام سے لگا کر پھر سو گئی تھی۔



آج دھوپ میں خاصی تیزی تھی۔ جب ہی اس نے واشنگ مشین لگالی اور ابھی پہلے چکر سے کپڑے نکال کر دوسرے ڈالے تھے کہ تائی اماں آگئیں۔ مٹھائی کا ڈبا لیے ہوئے۔

"خیر سے نیو کی بات پکی کر دی ہے۔" انہوں نے بتایا تو اسے واقعی خوشی ہوئی۔

"اچھا' بہت مبارک ہو تائی اماں۔"

"خیر مبارک' تم بھی تیاری کر رکھو۔ لڑکے کی ماں شادی کی جلدی مچا رہی ہے' آج کل میں تاریخ رکھ دے گی۔" تائی اماں نے کہا تو اس کا دل چاہا پوچھے شرجیل بھی آئے گا لیکن شرم آڑے آگئی۔

"چھوٹی دونوں نظر نہیں آرہیں۔" تائی اماں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کالج جاتی ہیں تائی اماں۔"

"اچھا ہاں۔ دوپہر میں آتی ہوں گی؟"

"جی' آپ آرام سے بیٹھ جائیں تائی اماں' اب شام میں ہی جائیے گا۔" اس نے ان کے پیچھے تکیہ

لگاتے ہوئے کہا۔
"نہ بیٹا شام میں ٹھنڈ ہو جائے گی۔"
"اچھا روبی اور نشا کے آنے تک تو رکیں۔" وہ انہیں کمبل اوڑھانے لگی کہ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آواز دبا کر پوچھنے لگیں۔
"سنو۔ سامنے ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ پچھلی بار جب میں آئی تھی تب بھی دیکھا تھا کیا یہیں ڈیرہ جمائے رکھتا ہے۔"
"پ... پتا نہیں تائی اماں۔ میں تو اندر ہوتی ہوں۔" وہ اندر سے خائف ہو گئی تھی۔
"سبزی وغیرہ تو لیتی ہو گی دروازے سے۔" تائی اماں کی نظریں اسے اندر تک چھلنی کر گئیں۔
"جی لیکن تائی اماں میں نے تو کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔"
"مجھے پتا ہے۔" تائی اماں کو غالباً اس کی رونی شکل پر رحم آیا تھا۔ "تم اپنے کام سے کام رکھتی ہو، پھر بھی بیٹا احتیاط کرنا۔ کبھی یونہی بے دھڑک دروازہ مت کھولنا۔"
وہ ایک لفظ جی تک نہیں کہہ سکی۔ اور غنیمت تھا کہ واشنگ مشین کا بزر بج اٹھا، وہ اسی بہانے ان کے پاس سے اٹھ آئی اور کپڑوں کی دھلائی کے ساتھ ساتھ اس نے جلدی سے کھانا بھی بنا ڈالا۔ اس دوران وہ مسلسل گل ریز کو گالیوں سے نوازتی رہی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا ابھی جا کر اس کی طبیعت صاف کر دے۔ جیسے روبی اور نشا غصے میں آتی تھیں ان سے کہیں زیادہ غصہ اس کے اندر بھر گیا تھا۔ اگر وہ اس کی مقروض نہ ہوتی تو کبھی اپنے غصے کو نہ دباتی... پھر بھی اس نے گل ریز سے بات کرنے کا سوچ لیا تھا۔
یوں اگلے دن وہ صبح کے کام جلدی جلدی نمٹا کر قریبی مارکیٹ جانے کے لیے گھر سے نکل آئی۔ اس نے دور ہی سے گل ریز کو بیکری پر کھڑے دیکھ لیا تھا پھر وہ ادھر متوجہ نہیں ہوئی۔ سر جھکائے ہوئے بس اسٹاپ تک آئی تھی کہ وہ بائیک پر اس کے قریب آ گیا۔
"کہاں جانا ہے؟"
"تمہیں کیا میں کہیں بھی جاؤں۔ تم اپنا راستہ لو اور خبردار جو آئندہ مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کی تو۔" یہ ساری باتیں اس کے اندر رہ گئیں۔ بمشکل ضبط سے بولی۔
"بس یہیں مارکیٹ تک۔"
"بیٹھیں، میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔" گل ریز نے اسے اپنے پیچھے بیٹھنے کا اشارا کیا تو اس کی جان ہی نکل گئی۔
"ن... نہیں میں۔"
"بیٹھ جائیں۔" انداز ایسا تھا جیسے ابھی اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دے گا اور اس تصور نے ہی اسے مجبور کر دیا۔ چہرے کو چادر میں چھپا کر دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی۔ گو کہ وہ اس سے ہی بات کرنے نکلی تھی اور اس کا خیال تھا وہ مارکیٹ تک اس کے پیچھے آئے گا تو وہیں کہیں وہ اس سے بات کرے گی۔ یہ تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں اس کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا۔ پھر جیسے ہی بائیک رکی، وہ فوراً اتر کر تیز قدموں سے چل پڑی۔ حقیقتاً وہ اس سے بہت دور بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن اتنا ہی وہ قریب آ گیا۔
"کیا لینا ہے؟" وہ بری طرح چکرا گئی۔
"پتا نہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"
"کیا سمجھ میں نہیں آ رہا؟"
"میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں کبھی بائیک پر نہیں بیٹھی۔ آپ پلیز جائیں، میں اب بائیک پر نہیں بیٹھوں گی۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔
"ارے تو آپ مجھے پہلے بتاتیں۔ میں بائیک وہیں چھوڑ دیتا۔ رکشہ کر لیتے، چلیں آئیں ادھر بیٹھیں، پہلے ریلیکس ہو جائیں۔" وہ زبردستی اس کے ساتھ کولڈ کارنر میں آ بیٹھا۔ تو کتنی دیر اسے اپنے حواس قابو کرنے میں لگے۔ اس کے بعد وہ کہنا کچھ چاہتی تھی کہہ کچھ اور گئی۔
"آپ پڑھے لکھے لگتے ہیں۔"
"اچھا۔" وہ ذرا سا ہنسا تھا۔ "یہ آپ کیسے کہہ رہی ہیں۔"

گئی۔

"تو تم نہیں آؤ گے۔"

"کوشش کر رہا ہوں یار! تم دعا کرو چھٹی مل جائے۔"

"ٹھیک ہے میں ابھی مصلے پر بیٹھ جاتی ہوں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا، پھر نشا اور روبی کو دیکھا، دونوں ساتھ لیٹی موبائل پر غالباً کوئی فلم دیکھ رہی تھیں۔ وہ ٹوکتے ٹوکتے رہ گئی کہ بے چاریوں کے پاس اور تو کوئی تفریح نہیں تھی۔

"اچھا میں سو رہی ہوں۔" اس نے تکیہ سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"لائٹ بند کردوں آپا؟"

"نہیں جب سونے لگو تب بند کر دینا۔" اس نے کمبل سر تک کھینچ لیا اور شرجیل کو سوچتے ہوئے اچانک اس کی سماعتوں پر دستک ہوئی تھی۔

"آپ مجھ سے بھاگ رہی ہیں؟" اس کے لہجے میں کچھ تھا جو اس وقت وہ محسوس نہیں کر پائی تھی لیکن اب بری طرح محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک لمحہ اس سے مِس ہو گیا تھا اور وہ اس لمحے کی کھوج میں نکل گئی تھی۔



صبح ناشتے کے دوران وہ خواہ مخواہ جھنجلا رہی تھی۔ روبی نے ٹوکا تو وہ جلے انداز میں بولی تھی۔

"شرجیل نہیں آرہا نیو کی شادی پر۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟" روبی کو اس کا جھنجلانا سمجھ میں آگیا۔

"خود ہی کہہ رہا تھا کہ شاید ہی چھٹی ملے۔"

"ایسے ہی آپ کو تنگ کر رہے ہوں گے شرجیل بھائی۔ ورنہ یہ ہو سکتا ہے بھلا بہن کی شادی میں نہ آئیں۔"

"روبی ٹھیک کہہ رہی ہے آپا! شرجیل بھائی ضرور آئیں گے۔" نشا نے روبی کی تائید کی تو وہ خاموش ہو رہی پھر ان دونوں کے جانے کے بعد ناشتے کے برتن دھو کر رکھے تھے کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"شاید تائی اماں ہوں۔" اس نے بھاگ کر دروازہ کھولا اور سامنے گل ریز کو دیکھ کر چاہا کہ فوراً دروازہ بند کردے لیکن وہ ایک پٹ تھام کر بولا۔

"ماں قسم! میں ساری رات نہیں سویا۔" وہ اس کے انداز پر ناگواری سے بولی تھی۔

"تم پلیز چلے جاؤ۔"

"ایسے کیسے چلا جاؤں۔ تم پہلے میری بات سنو۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہوئے میں ساری رات۔"

"بس کرو گل ریز۔ خدا کے لیے یہاں مت آیا کرو۔" اس نے عاجزی سے ٹوکا تو وہ سادگی سے پوچھنے لگا۔

"یہاں نہ آؤں تو کہاں جاؤں۔"

"اف تم سمجھ کیوں نہیں رہے کیوں مجھے محلے میں بدنام کرنے پر تلے ہو۔ میں یہاں تم سے بات نہیں کر سکتی۔ جاؤ پلیز۔" وہ پھر رو دینے کو ہو گئی تھی۔

"رونا نہیں زینب!" وہ فوراً ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا۔ "مجھ سے تمہارے آنسو برداشت نہیں ہوں گے۔ بس اتنا بتاؤ یہاں بات نہیں کر سکتی تو کہاں؟"

"اف۔۔۔" وہ بری طرح پھنس گئی۔

"بتاؤ زینب کہاں ملو گی؟" وہ بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں، میں تمہیں فون کر لوں گی ابھی تم جاؤ۔" وہ گلی میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

"میں انتظار کروں گا لیکن میرا نمبر۔"

"ہاں بتاؤ۔" اس نے جلدی جلدی اس کے ساتھ نمبر دہرا کر دروازہ بند کر دیا اور اندر آتے ہی پہلے اس کا نمبر سیف کیا تاکہ ٹھیک طریقے سے اسے سمجھا سکے۔

یہ صورت حال اس کے لیے انتہائی پریشان کن تھی۔ روبی اور نشا کو بچاتے بچاتے وہ خود پھنس جائے گی ایسا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بہرحال اس سے پہلے کہ وہ پھر دروازے پر آن موجود ہو وہ اس سے بات کر لینا چاہتی تھی۔ دو دن تو پریشانی میں ہی گزر گئے

''آپ کی بات چیت سے۔'' وہ اب اسے دیکھنے لگی تھی' جو جانے کیوں خود کو چھپانا چاہ رہا تھا۔
''کیا کوالیفیکیشن ہے آپ کی؟'' اس کے پوچھنے پر وہ گہری سانس کے ساتھ بولا تھا۔
''ماسٹر کر رہا تھا۔''
''کر رہا تھا مطلب؟''
''چھوڑ دیا۔''
''کیوں؟''
''بس حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے۔ سوچا جاب کے ساتھ پڑھ بھی لوں گا۔ لیکن اپنی قسمت میں شاید جاب تھی ہی نہیں۔ پورا ایک سال خوار ہوا۔ اس کے بعد ہر شے سے دل اچاٹ ہو گیا۔ مزید پڑھ لیتا تب ہی دھکے ہی کھاتا' اس لیے دوبارہ یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھی' نہ کبھی دیکھوں گا۔'' اس کے چہرے پر ملال کے ساتھ عجیب سی حقارت بھی تھی۔
''تو ابھی آپ کیا کرتے ہیں؟'' اس نے خود کو حد درجہ انجان ظاہر کیا تو گل ریز سگریٹ سلگاتے سلگاتے رہ گیا۔ چہرہ اوپر نہیں کیا بس نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔
''مشکل سوال ہے کیا؟'' اس نے جی کڑا کر کے پوچھا تھا۔
''سوال تو مشکل نہیں ہے لیکن مجھے حیرت میں ڈال گیا ہے۔'' وہ سگریٹ سلگا کر گویا ہوا تھا۔ ''یعنی جسے یہاں سے وہاں تک سب جانتے ہیں' اس سے آپ پوچھ رہی ہیں کیا کرتے ہو۔ تو ایسا ہے مس۔۔۔؟''
''زینب۔۔۔'' اس کے حلق میں کچھ اٹکا تھا۔
''ہاں تو مس زینب! کیا واقعی آپ میرے بارے میں نہیں جانتیں؟'' اس نے جیسے ہی نفی میں سر ہلایا۔ گل ریز نے اونچی آواز میں جانے کسے پکارا کہ کاؤنٹر پر بیٹھا شخص بھاگا چلا آیا۔
''حکم صاب۔''
''یہ کیا خالی بوتل پکڑا دی ہے۔ دیکھتا نہیں اپن کے ساتھ مہمان ہے۔ خاطر مدارت کر۔'' اس آدمی پر دھاڑنے کے ساتھ گل ریز نے اپنی جیب سے پسٹل نکال کر میز پر رکھ دیا' جسے دیکھتے ہوئے وہ پیلی پڑ گئی تھی۔
چند لمحوں میں ہی پوری ٹیبل بھر گئی لیکن اس کی نظریں پسٹل پر ہی ساکت تھیں۔
''لیجیے۔'' گل ریز نے اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے پسٹل اٹھایا اور غیر ارادی طور پر اس سے کھانے کے لوازمات کی طرف اشارا کیا تو وہ مزید سہم کر اسے دیکھنے لگی۔
''سوری۔'' اس نے فوراً'' پسٹل جیب میں رکھا پھر اسے دیکھ کر مسکرایا تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔
''میں چلتی ہوں۔''
''ارے ایسے کیسے' یہ سب آپ کے لیے۔''
''شکریہ۔۔۔ میں ابھی ناشتا کر کے نکلی ہوں اور مجھے دیر بھی ہو رہی ہے پلیز آپ مجھے مت روکیں۔'' اس کا لہجہ ملتجی اور آنکھیں یکلخت آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔
''آپ مجھ سے بھاگ رہی ہیں؟''
''نہیں' آپ کی شہرت سے۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں تیزی سے باہر نکلی تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔
اسے گل ریز پر نہیں' اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ کیوں ادھر ادھر کی باتیں لے بیٹھی۔ جس مقصد سے گئی تھی' وہی اسے باور کرا کے آجاتی۔ شام تک وہ یونہی کھولتی رہی۔ نشا اور روبی کو بھی بے بات کے ڈانٹ دیا۔ رات میں شرجیل کا فون آیا تب اس کا دھیان بٹا تھا۔
''شرجی! تم نیو کی شادی میں آؤ گے نا؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔
''ہاں کوشش کروں گا۔'' شرجیل کے جواب پر وہ چیخ گئی۔
''کوشش نہیں تمہیں ضرور آنا ہے۔''
''جاب چھوڑ کے آجاؤں کیا۔''
''یہ میں نے کب کہا۔''
''ظاہر ہے چھٹی نہیں ملے گی تو جاب ہی چھوڑنی پڑے گی۔'' شرجیل کی وضاحت پر وہ ایک دم ڈھیلی پڑ

تھے۔ تیسرے دن روبی اور نشا کے آنے سے پہلے اس نے اس کا نمبر ملایا تو پہلی گھنٹی پر ہی فون اٹھالیا گیا۔

"کون؟ گل ریز کے لہجے میں بلا کی بے قراری تھی جسے محسوس کر کے بھی اس نے خود کو کمزور نہیں پڑنے دیا۔

"زینب۔۔۔" اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑا۔

"بڑا انتظار کرایا زینب! لگتا ہے جیسے میں صدیوں سے تمہاری کال کا منتظر تھا۔" وہ خاموش رہی تو پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے، تم پریشان ہو۔۔۔؟"

"ہاں تمہاری وجہ سے پریشان ہوں۔" اس نے کہا تو وہ جیسے لیٹے سے اٹھ بیٹھا تھا۔

"میری وجہ سے۔۔۔؟"

"ہاں تمہاری وجہ سے تم بلکہ سب جانتے ہیں کہ اس گھر میں میں اور میری دو چھوٹی بہنیں رہتی ہیں، کوئی مرد نہیں ہے۔ پھر تمہارا اس طرح میرے دروازے پر آنا ہمیں لوگوں کی نظروں میں مشکوک بنا رہا ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

"کسی نے کچھ کہا ہے؟" وہ یوں بولا جیسے ابھی کہنے والے کا منہ توڑ دے گا۔

"کوئی کچھ کہے گا تب ہی تم سمجھو گے۔"

"کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ۔۔۔"

"گل ریز۔" وہ ٹوک کر کہنے لگی۔ "اپنے حساب سے مت سوچو، جانتی ہوں محلے والے تمہارے ڈر سے منہ نہیں کھولیں گے لیکن ہمیں کیا سمجھا جائے گا، یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر تم ماشاء اللہ پڑھے لکھے ہو، تمہیں یوں گلیوں میں آوارہ گردی کرنا زیب نہیں دیتا۔ سن رہے ہو؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"نہیں لیکن ٹھیک بھی نہیں ہے۔" وہ جیسے سمجھ کر بولا تھا۔

"کیا ٹھیک نہیں ہے۔۔۔؟"

"یہی جو تم چاہ رہی ہو، میں خود کو تمہارے پاس آنے سے نہیں روک سکتا کیونکہ جب سے تم نے مجھ سے بات کی ہے اس کے بعد میں نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا نہ دیکھوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔"

"گل ریز۔۔۔" وہ اندر تک سہم گئی۔ "یہ، یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی۔" اس کے ٹھوس لہجے پر وہ مزید پریشان ہو کر بولی تھی۔

"اور میری زندگی کی سچائی یہ ہے کہ میں اپنے تایا زاد سے منسوب ہوں۔"

"نہیں، میں ایسا کچھ سننا نہیں چاہتا، آئندہ ایسا مت کہنا۔ سمجھیں۔" وہ یکدم بھڑک اٹھا تھا۔

"سچائی جھٹلائی نہیں جاسکتی گل ریز۔" وہ خائف ہونے کے باوجود کہہ گئی۔

"مٹائی تو جاسکتی ہے۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تو کتنی دیر وہ سناٹے میں بیٹھی رہ گئی۔ اس کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے تو کبھی کچن میں کبھی کمرے میں خود کو مصروف کرنے کی کوشش کرتے کرتے وہ ڈھے گئی تھی۔ پتا نہیں کیا وقت ہوا تھا۔ دروازے پر دستک سن کر وہ یہی سمجھی روبی اور نشا ہوں گی۔ بمشکل خود کو گھسیٹتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا تو ابھی وہ گل ریز کو بھی دیکھ ہی نہیں پائی تھی کہ عین سامنے راحیل بھائی کی گاڑی آن رکی۔ وہ غائب دماغی سے راحیل بھائی اور ثمینہ بھابھی کو اترتے دیکھے گئی۔

"کون ہے؟ گل ریز کی آواز پر اسے جھٹکا لگا تھا۔

"خدا کے لیے جاؤ۔۔۔" اس نے ہونٹ نہیں ہلائے تھے دانتوں پر دانت جما کر بولی تھی۔ اور شاید اسے کچھ احساس ہوا تھا کہ "پھر آؤں گا" کہتے ہوئے چلا گیا تب دروازے کے سہارے اس نے خود کو ایک طرف کر کے راحیل بھائی اور ثمینہ بھابھی کو اندر آنے دیا جبکہ بہت کوشش سے بھی مسکرانے میں ناکام رہی تھی۔

"کون تھا؟" برآمدے میں تخت پر تکلف سے بیٹھتے ہی ثمینہ بھابھی نے پوچھا تو وہ تھوک نگل کر بولی تھی۔

"وہ کمیٹی کا پوچھنے آیا تھا۔"

"چھوٹی دونوں کہاں ہیں؟" راحیل بھائی کو غالباً

کمیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
"کالج بس آتی ہوں گی۔ آپ آرام سے بیٹھیں راحیل بھائی۔" وہ یوں عجلت میں بولی جیسے ان کی تواضع کے لیے کچھ لانے کو وہاں سے بھاگنا چاہتی ہو۔
"بیٹھنے کا وقت نہیں ہے بھئی، بہت کام ہیں۔ ہم یہ نیرہ کی شادی کا کارڈ دینے آئے ہیں اور بہت جگہوں پر جانا ہے۔" راحیل بھائی نے بولنے کے ساتھ اس کے نام کا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔
"پھر بھی راحیل بھائی چائے ٹھنڈا۔" اس نے کہتے ہوئے ثمینہ بھابھی کو دیکھا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"چلیں راحیل۔"
"ہاں۔" راحیل بھائی حکم کے غلام فوراً اٹھ کر چل پڑے تو وہ بس انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی پھر وہیں بیٹھ کر ابھی لفافے سے کارڈ نکالا تھا کہ روبی اور نشا آگئیں۔
"راحیل بھائی آئے تھے آپا؟" روبی نے غالباً راحیل کی گاڑی جاتے ہوئے دیکھ لی تھی۔
"ہاں یہ نیرو کی شادی کا کارڈ دے گئے ہیں۔"
"اچھا کب ہے شادی۔" روبی اس کے ہاتھ سے کارڈ جھپٹ کر دیکھنے لگی، نشا نے بھی اس کے ساتھ سر جوڑ لیا پھر دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔
"آپا اتنے کم دن ہیں اور ہماری تیاری۔"
"ہو جائے گی۔" اس کا ذہن الجھا ہوا تھا جب ہی سرسری کہہ کر اٹھنے لگی تھی۔ کہ دونوں نے اس کے بازو پکڑ لیے۔
"کیسے ہو جائے گی آپا۔ تین فنکشن ہیں اور ہمیں تینوں کے لیے نئے کپڑے چاہئیں، ہم پرانے نہیں پہنیں گے دس بار کے دیکھے ہوئے۔" روبی نے منہ پھلا لیا تو اس نے پہلے نشا کو دیکھا پھر دونوں کو اطمینان دلا کر اٹھی تھی۔
شام میں اس نے وہ بکس کھول لیا جس میں اماں اس کے جہیز میں دینے کے لیے جوڑے جمع کر رہی تھیں۔ پھر روبی اور نشا کو بلا کر ان کی پسند سے دونوں کے لیے تین تین جوڑے نکال کر اسی وقت سے مشین سنبھال لی تھی۔ اس کام میں کافی حد تک اس کا دھیان بٹ گیا تھا پھر یہ بھی اچھا ہوا کہ کل ریز دوبارہ نہیں آیا ورنہ وہ نئے سرے سے پریشان ہو جاتی۔ بہرحال چار دن میں اس نے روبی اور نشا کے کپڑے تیار کر لیے تھے۔
اس کے بعد میچنگ جیولری اور سینڈلز کے لیے وہ دونوں کے ساتھ مارکیٹ آئی تھی اور وہ دونوں جس شوق سے چھوٹی موٹی چیزیں لے کر خوش ہو رہی تھیں اس سے گویا اس کی ساری تھکن دور ہو گئی تھی۔ شاپنگ کے بعد نشا نے کولڈ ڈرنک پینے کی خواہش ظاہر کی تو وہ ٹال نہیں سکی اور دونوں کے ساتھ کولڈ کارنر میں آ بیٹھی اور ابھی تینوں کیا لیں، طے کر رہی تھیں کہ ان کی میز پر مختلف لوازمات رکھے جانے لگے۔
"ارے ہم نے یہ سب کب آرڈر کیا۔" روبی نے حیرت سے کہا جبکہ وہ پریشان ہو گئی تھی۔
"آپ گلو بادشاہ کی مہمان ہیں میڈم!" لڑکے نے کہا تو اس سے پہلے کہ روبی 'گلو بادشاہ' کا پوچھتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ہم کسی کے مہمان نہیں ہیں۔ روبی، نشا چلو پتا نہیں کیا سمجھ رہا ہے یہ۔"
"آپا پوچھنے تو دیں۔"
"کیا ضرورت ہے، چلو۔" اس نے آنکھیں دکھائیں تو روبی بڑبڑاتے ہوئے اٹھی تھی اور اتنے اچھے لوازمات سے محرومی پر گھر آ کر بھی جھنجلا رہی تھی۔ اس نے قصداً ٹوکنے سے گریز کرتے ہوئے اس کی توجہ خریدی ہوئی چیزوں کی طرف کرائی۔

☆ ☆ ☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ وہ گہری نیند میں تھی کہ اچانک روبی نے اس کا بازو اتنی زور سے دبایا کہ اس کے ناخنوں کی چبھن سے وہ کراہ اٹھی۔ اور اس سے پہلے کہ کچھ بولتی روبی اس کے ہونٹوں پر ہاتھ جما کر سرگوشی میں بولی۔
"آپا کوئی ہے۔" اسے سمجھنے میں چند سیکنڈ لگے پھر اس کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔

"شاید چور‘ دیوار سے کودنے کی آواز آئی ہے۔"

دھیمی آواز میں کہتے ہوئے روبی نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا دیا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے کمرے کا دروازہ چیک کیا جو وہ اندر سے لاک کرکے ہی سوتی تھیں پھر نشا کو دیکھا جو سہم کر رو رہی تھی۔

"کیا کروں آپا! شور مچاؤں۔" روبی نے پوچھا تو اس نے فوراً" اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خبردار... چلو تم نشا کو لے کر اسٹور میں جاؤ‘ میں دیکھتی ہوں۔"

"کیا دیکھیں گی آپ..." روبی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر پوچھا تو جواب دینے کی بجائے اس نے نشا کا ہاتھ کھینچ کر اٹھایا اور زبردستی دونوں کو دھکیل کر اسٹور میں بند کر دیا۔ اس کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی پھر بھی اس نے دروازے سے کان لگا دیے۔ دوسرے کمرے سے سرگوشی میں بات کرنے کی آواز سن کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نظر موبائل پر پڑی تو یکدم وہ متحرک ہو گئی۔ موبائل اٹھا کر نمبر ملایا۔

"زینب..." فوراً" ہی کال ریسیو ہوئی تھی۔

"ہاں گل ریز... پلیز ہیلپ می۔ ہمارے گھر میں کوئی کود کے آیا ہے۔" اس نے بغیر تمہید کے اسے مدد کے لیے پکار لیا تھا۔

"ارے گھبراؤ مت‘ میں آرہا ہوں۔"

اور وہ بوتل کا جن فوراً" ہی آگیا تھا۔ وہ دروازے سے لگی اس طرف کی کارروائی پر کانپتی رہی‘ جب ادھر خاموشی چھا گئی تب اس نے چونک کر پہلے روبی اور نشا کو اسٹور سے نکالا پھر بتی جلائی تو روبی پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا آپا‘ چلے گئے کیا؟"

"ہاں شاید‘ آواز تو نہیں آرہی۔" اس نے کہا تب ہی کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"آپا..." نشا بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔

"کوئی نہیں ہے‘ تم بیٹھو آرام سے۔ روبی سنبھالو اسے۔" اس نے نشا کو خود سے الگ کر کے دروازہ کھول دیا۔

"بھگا دیا۔" گل ریز پہلے بولا تھا پھر باری باری تینوں کو دیکھتے ہی احساس ہوا کہ شاید اسے بھی نہیں رکنا چاہیے تھا۔ جب ہی فوراً" پلٹ کر جانے لگا تھا کہ روبی نے پکار لیا۔

"سنیں۔"

"جی...؟" وہ واپس پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کون لوگ تھے کیا آپ بھی ان کے ساتھ..."

روبی کی بات پر اس نے گھبرا کر گل ریز کو دیکھا تھا۔

"نہیں بی بی! میں تو یہیں رہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے اسی محلے میں‘ اتفاق سے میں نے دو آدمیوں کو آپ کی دیوار کودتے ہوئے دیکھ لیا تو چلا آیا۔ اب آپ بے فکر ہو جائیں‘ آئندہ کوئی ایسی جرأت نہیں کرے گا۔"

گل ریز کے طریقے سے بات بنانے یا سنبھالنے پر اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔

"بہت شکریہ..."

"شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ آپ میرا نمبر لکھ لیں۔ خدانخواستہ پھر بھی کوئی پریشانی کی بات ہو تو فوراً" مجھے کال کر لینا۔ آج تو اتفاقاً" میں نے دیکھ لیا لیکن ہمیشہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔" گل ریز نے بات کے اختتام پر اسے دیکھا تو وہ نظریں چرا گئی۔

"جی نمبر بتائیں۔" روبی نے پین سنبھالا پھر نمبر لکھ کر پوچھنے لگی۔

"اور آپ کا نام؟"

"گل ریز..." وہ اسے دیکھ کر شرارت سے مسکرایا تھا۔ وہ اندر ہی اندر روبی کو کوسنے لگی پھر اس کے جاتے ہی روبی پر چڑھ دوڑی۔

"دماغ خراب ہے تمہارا‘ کیا ضرورت تھی اس سے اتنی باتیں کرنے کی‘ کیا لگتا ہے تمہارا۔"

"کیا ہو گیا ہے آپا۔ میں نے کون سی باتیں کی ہیں۔ صرف شکریہ ادا کیا ہے‘ جو کہ ضرور کرنا چاہیے تھا۔ کیوں نشا..." روبی نے کہہ کر نشا سے تائید چاہی تو وہ منمناتی آواز میں کہنے لگی۔

"یہ وہی تو تھا جو پہلے ہمارے راستے میں کھڑا ہوتا تھا۔ بدمعاش۔۔۔"

"ہوگا لیکن ابھی تو اس نے ہماری مدد کی ہے۔ سوچو، اگر یہ نہ آتا تو ہمارا کیا ہوتا۔ صبح اس گھر سے تین بہنوں کے جنازے ایک ساتھ نکل رہے ہوتے۔" روبی نے خوفناک حقیقت بتا کر نشا کو رلا دیا پھر خود ہی اس کے لیے پانی لینے چلی گئی جبکہ وہ دانت پیس کر رہ گئی تھی۔

دو دن بعد نیو کی شادی کے فنکشن شروع ہونے والے تھے۔ تائی اماں تو راحیل کے ہاتھ کارڈ بھجوا کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس کے بعد پوچھا تک نہیں۔ کم از کم انہیں یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ تین لڑکیاں رات کے وقت کیسے آئیں جائیں گی۔ یہی کہہ دیتیں کہ تین چار دن وہ ان ہی کے ہاں رہ جائیں۔ خود اس نے یہی سوچا تھا لیکن جب تائی اماں نے فون تک نہیں کیا تو وہ خود سے کیسے روبی اور نشا کو لے کر چلی جاتی۔ اس وقت وہ اسی فکر میں تھی کہ شرجیل نے آکر اسے حیران کر دیا۔ کیونکہ کل تک تو وہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ نہیں آسکے گا۔

"کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی کہ نہیں آسکوں گا، نہیں آسکوں گا۔" حیرت سے نکل کر وہ بجائے خوش ہونے کے روٹھ گئی۔

"سرپرائز یار! میں نے سوچا تم مجھے اچانک دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی۔"

"ہاہا! بہت خوش ہوئی۔" اس نے چڑایا تو وہ ہنسنے لگا پھر اسے پاس بٹھا کر پوچھا۔

"کیسی ہو؟"

"جی رہی ہوں، بہت مشکل زندگی۔" وہ ہنوز روٹھی ہوئی تھی۔ "تم سوچ ہی نہیں سکتے تو سمجھو گے کیا۔"

"سمجھتا ہوں یار، سمجھتا ہوں۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔" شرجیل نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنائیت کا احساس دینا چاہا لیکن وہ مزید چڑ گئی۔

"کچھ دنوں کی بات۔ سالوں کو تم دنوں میں کیسے سمیٹ لیتے ہو جبکہ میرے لیے دن سال ہیں۔"

"اوہو تم تو بہت خفا لگتی ہو۔ ایسا کرو جاؤ ٹھنڈا پانی لے کر آؤ، خود بھی پیو اور مجھے بھی پلاؤ، اس کے بعد بات کریں گے۔" وہ کہہ کر جس انداز سے بیٹھا تھا اسی طرح خود کو پیچھے گرا کر لیٹ گیا تو ناچار وہ اٹھ کر کچن میں آگئی۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور وہیں بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پانی پیتے ہوئے جانے کیا کچھ سوچ گئی۔ یاد ہی نہیں رہا کہ شرجیل نے پانی لانے کو کہا تھا۔ کتنی دیر ہو گئی تب وہ خود ہی اٹھ کر آگیا اور اسے گم صم دیکھ کر اچنبھے سے پکارا۔

"زینی۔"

"ہاں۔۔۔" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تو وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"حد ہے یار! میں اتنی دور سے تمہارے لیے آیا ہوں اور تم ہو کہ بات ہی نہیں کرنا چاہتیں۔"

"میرے لیے نہیں آئے بہن کی شادی میں آئے ہو۔" اس نے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اب تم لڑنے والی باتیں کرو گی تو میں چلا جاؤں گا۔" شرجیل نے کہہ کر ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے اسے تھما دیا۔

"اور۔۔۔"

"نہیں بس۔۔۔" وہ کچن سے نکل کر پھر برآمدے میں جا بیٹھا۔ تب خود کو سرزنش کرتے ہوئے وہ اس کے پیچھے چلی آئی اور بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

"کھانے میں کیا کھاؤ گے۔"

"کچھ خاص نہیں، جو پکا ہوگا وہی کھا لوں گا۔" اس نے کہا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بیٹھ گئی۔ تب باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ روبی اور نشا آگئیں۔ دونوں نے شرجیل کو دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا اور اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔

"دیکھا آپا! میں نے کہا تھا ناں شرجیل بھائی ضرور آئیں گے۔" روبی نے اسے دیکھ کر کہا۔

"اچھا زیادہ اتراؤ نہیں، جلدی سے دونوں چینج کرو، میں کھانا گرم کر کے لگاتی ہوں۔" اس نے کہہ کر کچن کا رخ کیا پھر کھانا گرم کر کے دستر خوان بچھانے کی غرض

سے واپس آئی تو ان دونوں کو اسی طرح بیٹھے دیکھ کر ٹوکنا چاہتی تھی کہ شرجیل اسے مخاطب کرکے بولا تھا۔
"زینی تم نے مجھے نہیں بتایا۔"
"کیا؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"یہی کہ یہاں چور آگئے تھے۔" شرجیل نے کہا تو اس نے پہلے روبی اور نشا کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔ جس سے وہ دونوں فوراً" اٹھ کر اندر چلی گئیں پھر شرجیل سے کہنے لگی۔
"میں آتے ہی تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بعد میں بتادیتی خیر تم اٹھو ہاتھ وات دھو' میں کھانا لگا رہی ہوں۔"
"روبی نشا آجاؤ۔" شرجیل پکارتے ہوئے اٹھا تھا۔
پھر کھانے کے دوران نشا اور روبی کی باتوں سے پتا چلا کہ نیو کی شادی کے لیے ان دونوں کی تو خوب اچھی تیاری ہو گئی ہے جبکہ زینب نے اپنے لیے کچھ نیا نہیں بنایا۔ شرجیل نے ٹوکا تو نہیں لیکن کھانے کے بعد زبردستی اسے لے کر نکل آیا تھا۔
"میں نے کبھی ان دونوں کو اکیلا گھر پر نہیں چھوڑا۔" وہ اسی فکر میں تھی۔
"وہ دو اکیلی نہیں ہیں۔ پھر ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں اور ہم کون سا بہت دیر لگادیں گے۔ تم اگر کچھ دیر کو ساری فکریں چھوڑ کر صرف اپنی باتیں کرو تو میں اچھا فیل کروں گا۔" شرجیل نے ٹوکتے ہوئے کہا تو وہ سر جھکا کر بولی تھی۔
"اپنی بات کروں تو یہی کہوں گی کہ اگر نیو کے ساتھ ہماری شادی بھی ہو جاتی تو اچھا تھا۔" شرجیل اسٹیرنگ پر ہاتھوں کی گرفت مضبوط کرکے اسے دیکھنے لگا' بولا کچھ نہیں تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر کہنے لگی۔
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں شرجی۔ جب سے وہ چوروں والا واقعہ ہوا ہے۔ میں بہت خوفزدہ ہو گئی ہوں۔ تم تائی اماں سے بات کرو نا۔"
"وہ تو میں کرلوں لیکن اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا۔ میرا مطلب ہے شادی کرکے میں تمہیں اپنے ساتھ تو نہیں لے جا سکتا۔" وہ اس کی غیر معمولی سنجیدگی پر ہی سنجیدہ ہوا تھا۔
"میں نے کب تمہارے ساتھ چلنے کو کہا ہے۔"
"پھر...؟"
"پھر یہ کہ میں سمجھتی ہوں شادی شدہ عورت کا ایک رعب ہوتا ہے۔ مجھے وہ رعب چاہیے تاکہ میں ہر قسم کے حالات کا سامنا کرسکوں۔" اس نے کہا تو وہ خاموش ہو رہا غالباً" سوچ میں پڑ گیا تھا۔
"یہ ناممکن تو نہیں ہے شرجیل۔ میرا مطلب ہے ہماری شادی۔" وہ کچھ انتظار کے بعد بولی تھی۔
"ناممکن تو نہیں ہے لیکن پتا نہیں امی مانیں گی کہ نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے انداز میں ہی بولا تھا۔ پھر ایک دم اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ "خیر تم فکر مت کرو' میں امی سے بات کرتا ہوں بلکہ پوری کوشش کروں گا کہ وہ مان بھی جائیں۔"
"اللہ کرے۔"
"اب بتاؤ نیو کی شادی میں پہننے کی شاپنگ کرنی ہے یا اپنی شادی کی۔" وہ اب شوخ ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے شرجیل سے کچھ بھی کہا ہو لیکن سچ یہ تھا کہ اس نے گل ریز سے بچنے کی خاطر خود سے شادی کی بات کی تھی اور پتا نہیں شرجیل نے کس طرح بات کی' اپنی سی کتنی کوشش کی کہ تائی اماں مانیں ہی نہیں پھر بعد میں اس سے ہنس ہنس کر کہہ رہی تھیں۔
"شرجی کو دیکھو' کہہ رہا تھا نیو کے ساتھ ساتھ میری بھی شادی کردیں۔ کیا کرتا شادی کرکے پانچویں دن تو واپس چلا گیا۔ کم سے کم مہینے بھر کی چھٹی پر آیا ہوتا تب تو ہو بھی سکتی تھی۔ دو دن کی دلہن چھوڑ کر جاتا تو پھر وہاں نہیں ٹک سکتا تھا۔ تم الگ رو رو ہلکان ہوتیں۔ ہے نال۔" وہ کیا کہتی سر جھکائے سنتی رہی تھی۔
پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے روبی اور نشا امتحان قریب ہونے کی وجہ سے اب کالج لائبریری میں دوستوں کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کررہی تھیں جس کی

وجہ سے انہیں آنے میں بہت دیر ہو جاتی۔ اس لیے تو کام کاج میں آدھا دن گزرتے پتا بھی نہیں چلتا تھا اور وہ دونوں آجاتیں۔ اب دن بھی لمبے ہو گئے تھے۔ وہ اکیلی پریشان ہی ہوئی تھی۔ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ آج کیونکہ اس نے واشنگ مشین لگائی تھی اس لیے کچھ تھکن ہو گئی تھی' دل چاہ رہا تھا سو جائے لیکن جب تک روبی اور نشا نہ آجاتیں وہ چین سے سو بھی نہیں سکتی تھی۔ ان ہی کے انتظار میں چکراتی پھر رہی تھی کہ دستک کی آواز پر بھاگی۔ دروازہ کھولا تو سامنے گل ریز تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس کی پیشانی آپ ہی آپ شکن آلود ہو گئی تھی۔

"تمہیں دیکھنے آیا ہوں' کیسی ہو۔ اب تو نظر ہی نہیں آتیں۔ کہاں رہتی ہو؟" وہ سوال پر سوال کیے جاتا اگر جو وہ بول نہ پڑتی۔

"کہاں جاؤں گی گھر میں ہی ہوتی ہوں۔"

"کیوں خود کو اتنا پابند کر لیا ہے تم نے؟"

"گل ریز' جاؤ پلیز۔۔۔" اس نے تنگ ہو کر دروازہ بند کرنا چاہا کہ وہ پٹ تھام کر پوچھنے لگا۔

"چھوٹی دونوں کہاں ہیں؟"

"کالج۔"

"آئی نہیں ابھی تک بہت دیر ہو گئی چار بجنے والے ہیں۔" اس نے کہا تو وہ زچ انداز میں بولی تھی۔

"اب ایسے ہی آتی ہیں امتحان سر پر ہیں' وہیں کالج لائبریری میں اسٹڈی کرتی ہیں۔"

"اچھا۔۔۔" اس کی ذرا سی ہنسی میں استہزا تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ کالج لائبریری میں اسٹڈی کرتی ہیں۔"

"اس میں یقین نہ کرنے کی کیا بات ہے۔" اس نے ناگواری سے ٹوکا تو وہ سانس کھینچ کر کہنے لگا۔

"اس لیے کہہ رہا ہوں خود کو اتنا پابند مت کرو۔ باہر کی خبر بھی رکھا کرو' تمہاری بہنیں کالج لائبریری میں نہیں بیٹھتیں' اکثر وہ دونوں مجھے پارکوں میں نظر آتی ہیں۔ ساتھ لڑکے بھی تھے۔"

"لڑ۔۔۔" اسے اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ "یہ' یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"ہاں میں نے خود کئی بار ان دونوں کو لڑکوں کے ساتھ دیکھا ہے۔ ابھی بھی دیکھ کر آرہا ہوں۔ تم بتاؤ' کون ہیں وہ لڑکے؟" اس نے یوں پوچھا جیسے وہ جانتی ہو اور وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر روتے ہوئے اندر بھاگ آئی۔

"زینب۔" وہ اس کے پیچھے آگیا تھا۔ "بے وقوف لڑکی رونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔۔۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں' ٹھکانے لگادوں ان لڑکوں کو۔"

"نہیں۔ وہ ایک دم ہاتھ ہٹا کر اس پر بگڑ گئی۔ "تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ کیوں اتنی خوفناک باتیں کرتے ہو۔"

"تو تم بتاؤ کیا کرنا ہے۔"

"کچھ نہیں کرنا تمہیں۔ میں خود روبی اور نشا سے بات کروں گی۔ تم جاؤ یہاں سے۔" وہ کہہ کر خود ہی وہاں سے جانے لگی کہ گل ریز نے اس کی کلائی تھام لی۔

"سنو' تمہارے بات کرنے سے معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔"

"کیوں بگڑ سکتا ہے۔" وہ تنک کر بولی تھی۔

"اگر وہ دونوں بدلحاظی پر اتر آئیں تو کیا کرو گی۔" اس نے کہا تو وہ یکدم ڈھیلی پڑ گئی۔

"پھر کیا کروں۔"

"تم ابھی ان پر کچھ ظاہر مت کرنا۔ میں پہلے ان لڑکوں سے طریقے سے بات کرتا ہوں' سمجھ گئے تو ٹھیک ورنہ پھر دوسرے طریقے سے سمجھاؤں گا انہیں۔" گل ریز نے کہہ کر یوں ہاتھ اٹھایا جیسے اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہونٹ بھینچ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"پریشان مت ہو اب یہ میرا مسئلہ بلکہ میری ذمہ داری ہے' روبی اور نشا جیسے تمہاری بہنیں ہیں ویسے میری۔ میں ان پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ سمجھیں۔۔۔ اٹھو دروازہ بند کر لو۔" وہ ٹھوس لہجے میں

اپنا مان دے کر چلا گیا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ ساتھ ہی روبی اور نشا کے پراسرار انداز یاد آتے گئے۔ دونوں کتنے آرام سے پڑھائی کے بہانے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھیں۔ کتاب سامنے کھولے یوں دونوں سر جوڑے بیٹھی ہوتیں جیسے ان سے زیادہ پڑھاکو کوئی نہیں۔

"آپا کوئی آیا ہے؟" روبی کی آواز پر وہ یونہی بھیگے چہرے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ارے آپ رو رہی ہیں۔ کیا ہوا ہے آپا؟" دونوں بھاگ کر اس کے دائیں بائیں آبیٹھیں تو وہ بچوں کی طرح سسکنے لگی۔

"آپا' آپا۔" دونوں پریشان ہوگئیں' نشا بھاگ کر پانی لے آئی تو روبی نے ہاتھ میں پانی لے کر اس کے منہ پر ڈالا پھر دوپٹے سے اس کا منہ صاف کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا ہے آپا بتائیں ناں۔" اس کا دل چاہا پوچھے کہاں سے آرہی ہو' لیکن وہی بات اگر جو انہوں نے ڈھٹائی سے سچ بول دیا تو وہ کیا کرے گی۔ اس نے نفی میں سرہلا دیا۔

"کون آیا تھا؟ دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔" نشا نے پوچھا تو وہ حلق میں اٹکا آنسوؤں کا گولہ اندر اتار کر بولی تھی۔

"کوئی نہیں۔ میں تم لوگوں کو دیکھنے دروازے تک گئی تھی' وہیں پتا نہیں کیسے گر گئی۔ بڑی مشکل سے یہاں تک آئی ہوں۔"

"ہائے آپا کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔" روبی اسے ادھر ادھر سے دیکھنے لگی۔ اس نے بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھا تھا کہ آنسو پھر بہہ نکلے۔

"آپا لیٹ جائیں آپ کھانا کھایا؟"

"ہاں تم لوگ کھالو۔" وہ کہہ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر پہلے تھکن کے باعث نیند آرہی تھی اب درد کہاں سونے دے گا۔ آنکھیں بند کیں وہ ان دونوں کا کھانا پینا' چلنا پھرنا یہاں تک کے آنکھوں کے اشارے بھی محسوس کرتی رہی تھی۔

اگلے دن وہ قصداً" صبح نہیں اٹھی۔ شدت گریہ کے باعث حرارت بھی ہو رہی تھی۔ اور ہمیشہ تو اس نے کبھی پروا نہیں کی تھی۔ ان دونوں کو کالج بھیج کر ہی ٹیبلٹ لے کر کچھ دیر آرام کرلیتی تھی۔ لیکن آج وہ جان بوجھ کر نہیں اٹھی کہ وہ دونوں اس کی طبیعت دیکھتے ہوئے کالج جانا ملتوی کردیں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دونوں نے جلدی جلدی ناشتا بنایا اور اسے بھی اٹھا کر زبردستی کھلایا پھر دوپہر کا کھانا بنانے سے منع کرتے ہوئے جلدی آنے کا کہہ کر چلی گئیں تو اسے خود پر غصہ آنے لگا کہ اس نے کیوں انہیں جانے دیا۔

"پتا نہیں کہاں جائیں گی۔" وہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی۔ کبھی نیند آجاتی پھر ایک دم گھبرا کر اٹھ جاتی۔ اسی طرح دوپہر ہوگئی۔ اس کی نظریں گھڑی پر اور دل ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ کسی اتھاہ میں اتر رہا تھا کہ ٹھیک ایک بجے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس نے جاکر دروازہ کھولا تو روبی اور نشا کے ساتھ گل ریز کو کھڑے دیکھ کر وہ جیسے سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔

"بھئی تمہاری آپا تو راستہ ہی نہیں چھوڑ رہیں۔" گل ریز نے ان دونوں کو دیکھ کر کہا تو روبی جلدی سے بولی۔

"کیا ہوگیا ہے آپا۔ اندر تو آنے دیں۔"

"ہاں۔" وہ سامنے سے ہٹ گئی۔

"آیئے بھائی' اندر آئیں۔" روبی' گل ریز کو لیے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کرکے نشا کو دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

"آپا وہ راستے میں ہمیں کچھ لڑکے پریشان کررہے تھے۔ اتفاق سے گل ریز بھائی وہاں آگئے تو پھر ہم ان کے ساتھ آگئے۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ ست قدموں سے چلتی کمرے میں داخل ہوتے ہی رک گئی۔

گل ریز آرام کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے اطمینان سے بیٹھا تھا۔

"تم۔" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور جواب میں وہ اونچی آواز میں بولا تھا۔

"بھئی یہ چھوٹی بہنوں نے مجھے کھانے پر روکا ہے۔ کیا پکایا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے کہا تو روبی اسٹور سے نکلتے ہوئے کہنے لگی۔

"آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی بھائی۔ لیکن آپ فکر نہ کریں' میں اور نشا جھٹ پٹ کھانا بنا لیں گے۔"

"ہاں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔ جاؤ نشا۔" وہ ان دونوں کو بھیج کر اسے دیکھنے لگا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"سب ٹھیک ہو گیا۔" وہ خود ہی بتانے لگا۔ "میں موقع پر ہی ان کے سر پر جا کھڑا ہوا تو مجھے دیکھ کر دونوں بہنیں گھبرا گئیں۔ لڑکوں کو بس میں نے مارا نہیں' ڈانٹ ڈپٹ سے ہی حالت پتلی ہو گئی تھی ان کی۔ پھر روبی اور نشا سے تمہیں نہ بتانے کی شرط پر وعدہ لیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت کبھی نہیں کریں گی۔ لہٰذا تم کبھی ان پر ظاہر مت کرنا۔ سمجھیں۔"

"بس اب یہ دونوں کالج نہیں جائیں گی۔" اس نے گل ریز کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا جس سے وہ خاصا بددل ہوا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ تم ہر وقت ان کی نگرانی نہیں کر سکتے نہ میں ایسا چاہوں گی' اس لیے بہتر یہی ہے کہ اب یہ گھر بیٹھیں۔" وہ غالباً "سوچ چکی تھی۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ خود تو چار دیواری میں قید ہو' انہیں قید کرنے کا مت سوچو۔ ٹھیک ہے کہ میں ہر وقت ان کی نگرانی نہیں کر سکتا لیکن ان کے کالج آنے جانے کا انتظام کر دوں گا۔" گل ریز نے اسے ٹوک کر کہا تو وہ بگڑ گئی۔

"تم ہم کیوں انتظام کرو گے۔"

"ایک منٹ۔" گل ریز نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ "اب مت کہہ دینا کہ میں ہوتا کون ہوں۔ جو بھی ہوں جیسا بھی ہوں اس گھر اور گھر کے مکینوں کی پاسبانی میں نے خود پر فرض کر لی ہے اور اس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ تم بھی نہیں' سمجھیں۔"

"اپنے آپ جو چاہے خود پر فرض کر لیتے ہو۔ سوری گل ریز میں یہ سب افورڈ نہیں کر سکتی۔" وہ کہہ کر اٹھ کر جانے لگی تھی کہ وہ پکار کر بولا۔

"سنو' میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔"

"پھر؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تب ہی روبی دستر خوان لیے آ گئی۔

"کھانا پک گیا ہے۔ کہاں بیٹھیں گے۔"

"یہیں" گل ریز نے کرسی کا رخ بیڈ کی طرف موڑ دیا تو روبی نے وہیں دستر خوان بچھا دیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ کہہ کر دوسرے کمرے میں آ گئی تھی۔



گل ریز نے روبی اور نشا کے کالج آنے جانے کے لیے رکشہ لگوا دیا' ساتھ ہی روبی کو رکشہ والے بابا غلام علی کا سیل نمبر دے کر کہا کہ کالج کے علاوہ تینوں بہنوں کو کہیں آنا جانا ہو تو وہ کال کر کے بابا کو بلا لے۔ یوں یہ مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن اس کے لیے مسئلہ ہی مسئلہ تھا۔ گل ریز جس طرح گھر کا فرد بننے کی کوشش کر رہا تھا' اس سے وہ بے حد پریشان تھی۔ جبکہ روبی اور نشا خوش تھیں' انہیں ہر کام کے لیے گل ریز مطلوب ہوتا۔

"بھائی کو بلا لیتے ہیں۔ وہ یہ کر دیں گے۔ وہ کر دیں گے۔" دونوں بھائی بھائی کی تسبیح پڑھنے لگی تھیں۔

وہ بھی پہلی پکار پر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاتا۔ یہ صورت حال اس کے لیے بے انتہا پریشان کن اور اب ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ روبی اور نشا کو ٹوکتی تو وہ الٹا اسے رام کرنے بیٹھ جاتیں۔

"کیا ہے آپا۔ ہمارا اور ہے ہی کون۔ گل ریز بھائی آ جاتے ہیں تو کچھ دیر کو ہم بھی ہنس بول لیتے ہیں۔ پھر دیکھیں ہمارے کتنے کام آتے ہیں۔"

"ہاں آپا آپ کو یہ خوف ہے نا کہ لوگ باتیں بناتے ہیں تو جو لوگ باتیں بناتے ہیں ذرا ان سے کوئی کام کہہ کر تو دیکھیں۔" نشا بھی اب بولنے لگی تھی۔

گویا گل ریز کا جادو چل گیا تھا۔ وہ بے بس ہو گئی تو بات بے بات جھنجلانے لگی تھی۔ شرجیل کا فون آتا تو اس سے بھی الجھتی رہتی پھر غصے میں فون بند کر دیتی۔ اس وقت وہ بنا کسی بات کے نشا پر بگڑ رہی تھی کہ روبی نے آکر اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"آپا بور ہو رہی ہیں آپ، چلیں تائی اماں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہاں آپا چلیں ناں۔" نشا فوراً اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "جب سے نیو آپا کی شادی ہوئی ہے پھر ہم گئے ہی نہیں۔"

"تو وہاں سے کون آیا ہے؟" وہ تنک کر بولی تھی۔

"وہاں سے کیوں کوئی آئے گا اصولاً" ہمیں جانا چاہیے اور ہمیں نیو آپا اور ان کے میاں کی دعوت بھی کرنی چاہیے۔ آپ کو یہ خیال نہیں آیا؟" روبی نے کہہ کر اسے ٹوکا بھی تو وہ ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"روبی ٹھیک کہہ رہی ہے آپا۔ آخر آپ کو بھی اس گھر میں جانا ہے۔ یہ سب تو کرنا پڑے گا۔" نشا نے تائید کی تو وہ تنک گئی۔

"اچھا بس چپ کر کے بیٹھو۔"

"بیٹھیں نہیں چلیں اٹھیں، تیار ہوں۔ میں بابا کو فون کرتی ہوں رکشہ گھر پر آجائے گا۔ چلیں اٹھیں۔ خواہ مخواہ غصہ کرتی رہتی ہیں۔ ذرا گھوم پھر آئیں گی تو فریش ہو جائیں گی چلیں۔" دونوں نے اپنے ساتھ اسے بھی اٹھا دیا تھا۔

وہ دونوں ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ مستقل گھر میں بند رہ کر بھی اس کی طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ تائی اماں کے گھر آکر اور ان سے باتوں میں وہ کافی بہل گئی۔ فرح نے چائے پر ناشتے کا اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا۔ جس پر روبی اور نشا تو باقاعدہ ٹوٹ پڑیں۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔ پھر تائی اماں سے کہنے لگی۔

"تائی اماں! میں نیو اور اس کے میاں کی دعوت کرنا چاہتی ہوں۔"

"ارے بیٹا! اسے تو دعوتوں سے فرصت ہی نہیں ہے۔ ماشاء اللہ اتنا بڑا سسرال ہے، روزانہ کہیں نہ کہیں جا رہی ہوتی ہے۔"

"آپ مجھے نیو کا نمبر دے دیں تائی اماں! میں اس سے اس کے مطابق دن طے کر کے دعوت دے دوں گی۔" اس نے کہا تو تائی اماں ٹالنے کے انداز میں بات بدل گئیں۔

"ہاں وہ۔ تم یہ لو ناں۔ کچے قیمے کے کباب فرح بہت اچھے بناتی ہے۔"

"جی۔" وہ کبابوں کی طرف صرف دیکھ کر رہ گئی۔ سمجھ گئی تھی کہ تائی اماں نیو کا نمبر نہیں دینا چاہتیں، اس نے دوبارہ کہا بھی نہیں اور قدرے رک کر روبی کو چلنے کا اشارہ کیا تو وہ کہنے لگی۔

"کیا ہے آپا ابھی ہم نیو آپا کی شادی کی مووی دیکھیں گے۔"

"اس میں تو بہت دیر ہو جائے گی۔ پھر کسی دن، دن میں آکر دیکھ لینا۔" اس نے کہنے کے ساتھ روبی کو گھورا بھی تھا۔

"اچھا البم تو دیکھ لیں۔ میں لے کر آتی ہوں۔" فرح کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اسے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میز سے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھ آئی۔ پھر البم دیکھتے ہوئے فرح نیو کے سسرالیوں کے بارے میں بتاتے ہوئے اچانک ہنسنے لگی پھر ایک تصویر پر انگلی رکھ کر کہنے لگی۔

"یہ نیو آپا کی چچی ساس ہیں۔ شرجیل بھائی پر بہت فدا ہو رہی تھیں جب میں نے انہیں بتایا کہ شرجیل بھائی کی منگنی ہو چکی ہے تو کرید کرید کر تم سب کے بارے میں پوچھا آخر میں کہنے لگیں تو شرجیل کے جہیز میں دو سالیاں بھی ساتھ آئیں گی۔"

"صرف سالیاں ہی تو آئیں گی۔" مزید تائی اماں کی بڑبڑاہٹ نے اسے جیسے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ کن انکھیوں سے روبی اور نشا کو دیکھا بظاہر دونوں ہنس رہی تھیں ورنہ ہرٹ وہ بھی ہوئی تھیں۔ جب ہی گھر آکر روبی اس سے الجھ گئی۔

"آپا ہم کوئی ننھی بچیاں نہیں ہیں جو آپ یہ

سوچے بیٹھی ہیں کہ آپ کی شادی کے بعد ہم دونوں بھی تائی اماں کے ہاں جا رہیں گی۔ اپنے دل سے یہ خیال نکال دیں۔"

"تو تم دونوں یہاں اکیلی کیسے رہو گی؟" گو کہ اسے خود تائی اماں کی بات بری طرح محسوس ہوئی تھی لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔

"جیسے اب رہ رہی ہیں۔ آپ کو ہماری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" روبی نے تو بڑے آرام سے کہہ دیا کہ ہماری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس نے اس وقت اس سے بحث بھی نہیں کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی فکر سوا ہو گئی تھی۔ کتنے دن وہ اسی فکر میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہی۔ آخر اسے یہی سمجھ میں آیا کہ پہلے اسے روبی اور نشا کی شادی کرنی چاہیے۔ ان دونوں کی فکر سے آزاد ہو کر ہی وہ اپنے لیے سوچ سکتی تھی۔ یوں بھی شرجیل لاکھ کہے کہ کچھ دنوں کی بات ہے۔ تائی اماں فرح کی شادی سے پہلے کبھی شرجیل کا نہیں سوچیں گی اور اس عرصے میں وہ روبی اور نشا کی شادی کر سکتی تھی۔ یہ اس نے سوچ تو لیا لیکن پھر اسے تگ و دو بھی کرنی تھی۔

"سنو، میں نے سوچا ہے کہ میں جاب کر لوں۔" بالآخر اس نے فیصلہ کر کے ان دونوں کو آگاہ کیا تو وہ اچھل پڑیں۔

"کیا آپ جاب کریں گی۔ کیوں؟"

"کیوں کا کیا مطلب ؟میں بیکار بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گئی ہوں۔" اس نے قصداً" ان پر اصل مقصد ظاہر نہیں کیا کہ وہ ان کی شادی کے لیے جمع کرنا چاہتی ہے۔

"بیزار ہو گئی ہیں تو۔" روبی جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ وہ بول پڑی۔

"دیکھو مجھے مشورے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس میں نے سوچ بلکہ فیصلہ کر لیا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آپا لیکن جاب آسانی سے تو نہیں مل جاتی۔" نشا نے کہا تو وہ گہری سانس سینے میں دبا کر بولی۔

"کوشش سے بہرحال مل جاتی ہے۔"

"چلیں کر دیکھیں کوشش، بلکہ ایسا کریں گل ریز بھائی سے کہیں۔" روبی کی بات پر اسے پتنگے لگ گئے۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ ہر بات میں گل ریز بھائی گل ریز بھائی۔ خبردار جو اسے بتایا بھی۔ زہر لگنے لگا ہے مجھے وہ آدمی۔"

"واقعی بھلے کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ ایک تو وہ ہمارے اتنا کام آتے ہیں۔" روبی بولتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی تو اس نے سر جھٹک کر اخبار اٹھا لیا۔

پھر روزانہ ہی وہ کہیں نہ کہیں اپنی سی وی بھیجنے لگی تھی اور بالآخر پندرھویں دن ایک جگہ سے انٹرویو کال آ گئی۔ صبح دس بجے کا ٹائم تھا اس لیے اس نے روبی اور نشا کو بتایا ہی نہیں کیونکہ ان کے کالج سے آنے سے پہلے ہی وہ جانا آنا کر سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جب اسے جاب مل جائے گی تب وہ ان دونوں کو بتائے گی۔ بہرحال اگلے دن وہ مقررہ وقت پر انٹرویو کے لیے پہنچ گئی۔ کیونکہ پہلا تجربہ تھا اس لیے نروس بھی تھی اور دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں اسے اپنا آپ بہت ہلکا بھی لگ رہا تھا پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔ انٹرویو دے کر نکلی تو پھر گھر پہنچ کر ہی اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ کہ گل ریز آن موجود ہوا۔ وہ اب دروازے پر تو رکتا ہی نہیں تھا سیدھے اندر آ جاتا گو کہ اسی وقت آتا جب روبی اور نشا موجود ہوتیں۔ آج جانے کیسے اس نے یہ حد بندی توڑ دی تھی۔

"کہاں گئی تھیں ؟" پورے استحقاق سے پوچھ رہا تھا اور وہ اس وقت اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی اس لیے سیدھا سادا جواب دیا۔

"جاب کے لیے ایک جگہ سے انٹرویو کال آئی تھی۔ وہیں گئی تھی۔"

"ہیں، تم نے جاب کرنے کا کب سوچا؟" اس کی حیرت پر وہ اندر ہی اندر تلملا کر کہنے لگی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا یعنی میں کوئی بھی بات سوچنے سے پہلے تمہیں آگاہ کروں؟"

"نہیں، بندہ مشورہ تو کرتا ہی ہے۔" وہ اب بے نیازی سے کہہ کر بیٹھ گیا تو پوچھنے لگا۔

"کسی فرم سے کال تھی یا..."

"سنو، مجھے ابھی بہت کام ہیں اور یہ تم کس خوشی میں اتنے آرام سے بیٹھ گئے ہو، دیکھ نہیں رہے گھر میں کوئی نہیں ہے۔" اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"کیوں کوئی نہیں ہے۔ تم ہو، میں ہوں یعنی دو زندہ وجود۔" وہ کہنے کے ساتھ اٹھ بھی گیا پھر جاتے جاتے بولا تھا۔ "شام میں آؤں گا۔"

"یا اللہ..." وہ دروازہ بند کر کے سیدھی کچن میں آ گئی۔ مٹر چھلے رکھے تھے۔ اس نے جلدی میں مٹر پلاؤ کے ساتھ ٹماٹر کی چٹنی بنالی۔ پھر نہا کر یوں فریش ہو گئی جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ روبی اور نشا کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اصل میں وہ ان کے مشوروں سے چڑتی تھی۔ چاہے کوئی بھی بات ہو، ان کی زبان پر گل ریز کا نام ضرور آتا تھا جس سے اسے آگ لگ جاتی اور اب کسی بھی انداز سے سہی وہ لاشعوری طور پر اسے ہی سوچ رہی تھی۔

"عجیب آدمی ہے۔ لگتا ہے ہر پل میری نگرانی پر کھڑا رہتا ہے اور کوئی کام ہی نہیں ہے اسے... کام کیوں نہیں کرتا۔ میں کہوں گی اس سے، بیکار وقت ضائع کرنے کے بجائے کسی کام سے لگے۔ باعزت روزگار... اچھا خاصا ہے، ڈھنگ کا کام کرے گا تو۔"

دروازہ بری طرح دھڑ دھڑایا جا رہا تھا اور جانے کب سے۔ اس نے چونکتے ہی بھاگ کر دروازہ کھولا تو روبی نے وہیں اسے سنانی شروع کر دیں۔

"حد ہے آپا، کس کونے میں گھسی تھیں کہ دستک ہی سنائی نہیں دی۔ گھنٹے بھر سے دروازہ پیٹ رہی ہوں۔"

"میں واش روم میں تھی۔" وہ کہہ کر رکی نہیں، فوراً" پلٹ کر کچن کا رخ کیا تھا۔



پندرہ دن ہو گئے تھے۔ وہ جہاں انٹرویو دے کر آئی تھی، وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ گو کہ اسے اتنا یقین نہیں تھا، مبہم سی آس تھی، آخر مایوس ہو کر وہ پھر سے اخبار میں اشتہار دیکھ رہی تھی کہ روبی پوچھنے لگی۔

"آپا آپ کی جاب کا کیا ہوا؟"

"ہاں کوشش کر رہی ہوں۔" اس نے اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

"اور وہ جو انٹرویو دے کر آئی تھیں؟" روبی نے کہا تو وہ ایک دم سر اونچا کر کے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ نے تو نہیں بتایا تھا لیکن مجھے پتا چل گیا۔"

روبی کے جتانے پر وہ سلگ کر بولی تھی۔

"جانتی ہوں، اس جاسوس نے بتایا ہو گا۔"

"آپ نے کیوں چھپایا؟" روبی کے شاکی ہونے پر وہ جھنجلا گئی۔

"چھپانے کی کیا بات ہے۔ اچانک کال آئی تھی، میں چلی گئی۔ پھر کیونکہ میں پر امید نہیں تھی اس لیے نہیں بتایا۔"

"خیر میں آپ کو بتا دوں کہ بغیر سفارش کے جاب نہیں ملے گی۔" روبی نے کہا تو وہ پھر سلگ گئی۔

"اب تم گل ریز کا نام لو گی۔" روبی خاموش ہو گئی تو وہ اخبار تہہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے کل ہی ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا ہے۔"

"بیکار ہے۔" روبی نے سر جھٹکا تو وہ بمشکل خود کو کچھ کہنے سے باز رکھتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

اگلے روز وہ انٹرویو دے کر نکلی تو آگے گل ریز موجود تھا۔ انداز سے ہی ظاہر تھا کہ باقاعدہ اس کے انتظار میں کھڑا ہے۔ اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا پھر اسے نظر انداز کر کے گزر جانا چاہتی تھی کہ وہ بائیک اس کے قریب لے آیا۔

"سنو، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے کہا تو وہ رک کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے کہو کیا بات ہے۔ تب وہ بھی یوں ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے یہاں بات نہیں ہو سکتی۔

"تم آخر میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔" وہ زچ ہوئی تھی۔

"اور تم پیچھا کیوں چھڑانا چاہتی ہو۔" اس کے برعکس وہ اطمینان سے پوچھ رہا تھا۔

"کیونکہ میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔" اس نے اچانک آر یا پار سوچ لیا۔

"اور میں نے صرف تمہیں پسند کیا ہے۔" وہ بولا۔

"غلط کہتے ہو۔ تم جھوٹ بولتے ہو تم اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ لڑکیوں کے راستے میں۔" وہ غصے میں آکر جانے کیا کچھ سنانا چاہتی تھی کہ وہ ٹوک کر کہنے لگا۔

"ایک منٹ۔ وہ سب محض شغل تھا جس سے میں توبہ کر چکا ہوں۔ اور پلیز تم میرا محاسبہ پھر کسی وقت کر لینا ابھی مجھے روبی اور نشا سے متعلق بات کرنی ہے۔"

"روبی اور نشا؟" وہ یکدم پریشان ہو گئی۔

"ہاں اور یہاں کھڑے کھڑے بات نہیں ہو سکتی۔" اس نے کہا تو اب اس نے کوئی جرح نہیں کی۔ فوراً اس کے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔

ٹھنڈے ماحول میں آکر بھی اس کے حواس ٹھکانے نہیں آرہے تھے۔ گزشتہ واقعے کے باعث اب وہ کچھ اچھا سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اور برا سننے کی اس میں سکت نہیں تھی۔

"کیا لو گی؟" گل ریز نے پوچھا لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ تب خود سے آرڈر کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور اسے پریشان دیکھ کر کہنے لگا۔

"پریشانی کی بات نہیں ہے زینب۔ ریلکس ہو جاؤ۔"

"تم بتاتے کیوں نہیں۔ اب کیا معاملہ ہے۔" اس نے بے صبری کا مظاہرہ کیا تو وہ شہادت کی انگلی اس کی طرف اٹھا کر بولا۔

"پہلے تم وعدہ کرو، سکون سے میری بات سنو گی اور پھر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو گی۔"

"تم مجھے مزید پریشان کر رہے ہو۔"

"میں نے کہا ناں پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ایک منٹ۔" وہ اٹھ کر خود ہی فریج سے سوفٹ ڈرنک نکال لایا اور اس کے سامنے رکھ دی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم اصل بات کرو۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی سوفٹ ڈرنک کا گھونٹ لے کر حلق سے اتارا پھر اسے دیکھنے لگی۔

"بات یہ ہے کہ جب سے روبی اور نشا مجھ سے مانوس ہوئی ہیں تو بحیثیت بڑا بھائی میں ان کے بارے میں سوچنے لگا ہوں۔ اور ابھی میری نظر میں ایک دو اچھے پروپوزل ہیں۔ جنہیں اگر تم دیکھ لو اور مناسب سمجھو تو پھر بات آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔" وہ بہت سنجیدگی سے بول رہا تھا اور وہ جو کوئی اچھی بات سوچ ہی نہیں پا رہی تھی ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"میرا خیال ہے ان دونوں کے لیے پریشان تو تم بھی ہو اور شاید یہ بھی چاہتی ہو کہ تم سے پہلے وہ دونوں اپنے گھر کی ہو جائیں۔ ہے ناں۔" اس نے تصدیق چاہی تو اس کے سینے سے آپ ہی آپ گہری سانس خارج ہو گئی۔ قوت گویائی ساتھ دیتی تب بھی فوراً کچھ کہہ نہیں سکتی تھی اور یہ احساس بھی تھا کہ اسے فوراً اس کا ممنون نہیں ہونا چاہیے۔ جب ہی سوفٹ ڈرنک گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارنے لگی۔

"میرا خیال ہے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" گل ریز نے اس کی خاموشی کو شش و پنج سمجھ کر کہا۔

"ہوں...." اس نے پرسوچ انداز میں ہوں کی آواز نکالی۔ پھر بہت سنبھل کر کہنے لگی۔

"حرج تو نہیں ہے گل ریز اور یہ بھی سچ ہے کہ میں ان دونوں کی شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن کیسے کر سکتی ہوں۔ میرا مطلب ہے ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ شادی کے اخراجات کے لیے کافی پیسہ چاہیے ہو گا اور ابھی تو مجھے جاب بھی نہیں ملی۔"

"جاب کر کے تم کون سا اتنے پیسے کما لو گی؟" وہ کہہ کر خود ہی جھنجلایا جیسے اسے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو لیکن ایک آسرا تو ہو جائے گا۔ کمیٹی ڈال لوں گی پھر۔" ویٹر کے آنے پر وہ خاموش ہو گئی اور غور کرنے لگی کہ اس نے پہلے کی طرح یہیں بیٹھے بیٹھے آواز نہیں لگائی تھی اور نہ ہی پہلے کی طرح پوری میز سج گئی تھی۔

"تم کیا کر رہے ہو آج کل؟" وہ بے اختیار اس سے پوچھ گئی۔

"جاب ..." گل ریز نے سینڈوچ اٹھاتے ہوئے لاپروائی کا مظاہرہ کیا پھر اسے دیکھا وہ مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"سچ کہہ رہا ہوں۔ تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مارکیٹنگ کی جاب ہے جب ہی ہر جگہ نظر آتا ہوں۔ اب پلیز کچھ لے لو۔" اس نے کہہ کر پھر خود ہی سینڈوچ اٹھا کر اسے تھما دیا۔

"ہاں تو میں روبی اور نشا کی بات کر رہا تھا۔ کیا کرنا ہے۔" قدرے رک کر اس نے پوچھا تو وہ سر ہلا کر بولی۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"ایسا کرو' پروپوزل دیکھ لو کیونکہ بات بننے میں بھی وقت تو لگے گا اور اگر فوراً" بات بن بھی گئی تو شادی کے لیے ٹائم لیا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں سوچوں گی۔" اس نے اچانک گھر جانے کے خیال سے بات ختم کر دی۔

"پھر مجھے کب بتاؤ گی؟"

"بتادوں گی' جیسے ہی کسی نتیجے پر پہنچی' بتادوں گی۔" وہ عجلت میں بولتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اگر تم کہو تو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔" اس نے ویٹر کو بل لانے کا اشارا کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں شکریہ' میں چلی جاؤں گی ٹھیک ہے۔" وہ قصداً" مسکرائی تھی۔



اسے زیادہ سوچنا نہیں تھا کیونکہ وہ خود یہی چاہتی تھی کہ روبی اور نشا کو ان کے گھر کا کردے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس معاملے میں گل ریز شامل ہو رہا تھا۔ وہ جتنا اس سے بچنا چاہتی تھی وہ اس قدر حاوی ہو رہا تھا۔ اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔ گل ریز کو صاف جواب دے دیتی تب اس کے لیے اور مسئلہ ہو جاتا کہ وہ کہاں رشتے تلاش کرے گی۔

اس دوران شرجیل کا فون آیا تو اس نے یہ ذمہ داری اسے سونپنی چاہی کہ وہ خود یا تائی اماں سے کہے کہ وہ روبی اور نشا کے لیے کوئی رشتہ دیکھیں۔ شرجیل نے ہامی بھر تو لی لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی فرح موجود ہے اور ظاہر ہے امی پہلے اس کے لیے دیکھیں گی۔ پھر یہ بھی کہا کہ تمہیں جلدی کیا ہے' ہماری شادی ہو جائے پھر ہم مل کر ان دونوں کے بارے میں سوچیں گے۔ اور یہی تو وہ نہیں چاہ رہی تھی کہ شرجیل کو جہیز میں صرف سالیاں ملیں۔ اس پر روبی اور نشا بھی راضی نہیں تھیں۔ آخر گھوم پھر کر وہ بوتل کا جن ہی سامنے آتا تھا۔ تب اس نے گل ریز سے صاف بات کرنے کا سوچ لیا کہ اگر جو وہ یہ سوچ رہا ہے کہ اس کے احسانوں یا مہربانیوں کے بدلے وہ اس کے سامنے ہتھیار ڈال دے گی تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔ اگر وہ واقعی روبی اور نشا کو بہنیں سمجھتا ہے تو صرف ان ہی کا سوچے' اس کا خیال چھوڑ دے۔

اس وقت وہ اسی نہج پر سوچ رہی تھی کہ وہ آگیا۔ نشا کچن میں مصروف تھی' وہ روبی کے ساتھ برآمدے ہی میں بیٹھ گیا۔ اس نے کمرے سے نکلنے کا تکلف نہیں کیا اور بس کچھ دیر کو اس کی اور روبی کی باتیں سنیں پھر اپنی سوچ میں یوں گم ہوئی کہ سب کچھ کہیں پس منظر میں چلا گیا تھا۔ کتنی دیر بعد روبی نے "کر اسے پکارا تب وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپا' آپا ایک بات مانیں گی۔" روبی نے اس کے پاس بیٹھ کر لجاجت سے کہا تو وہ جیسے سمجھی نہیں۔

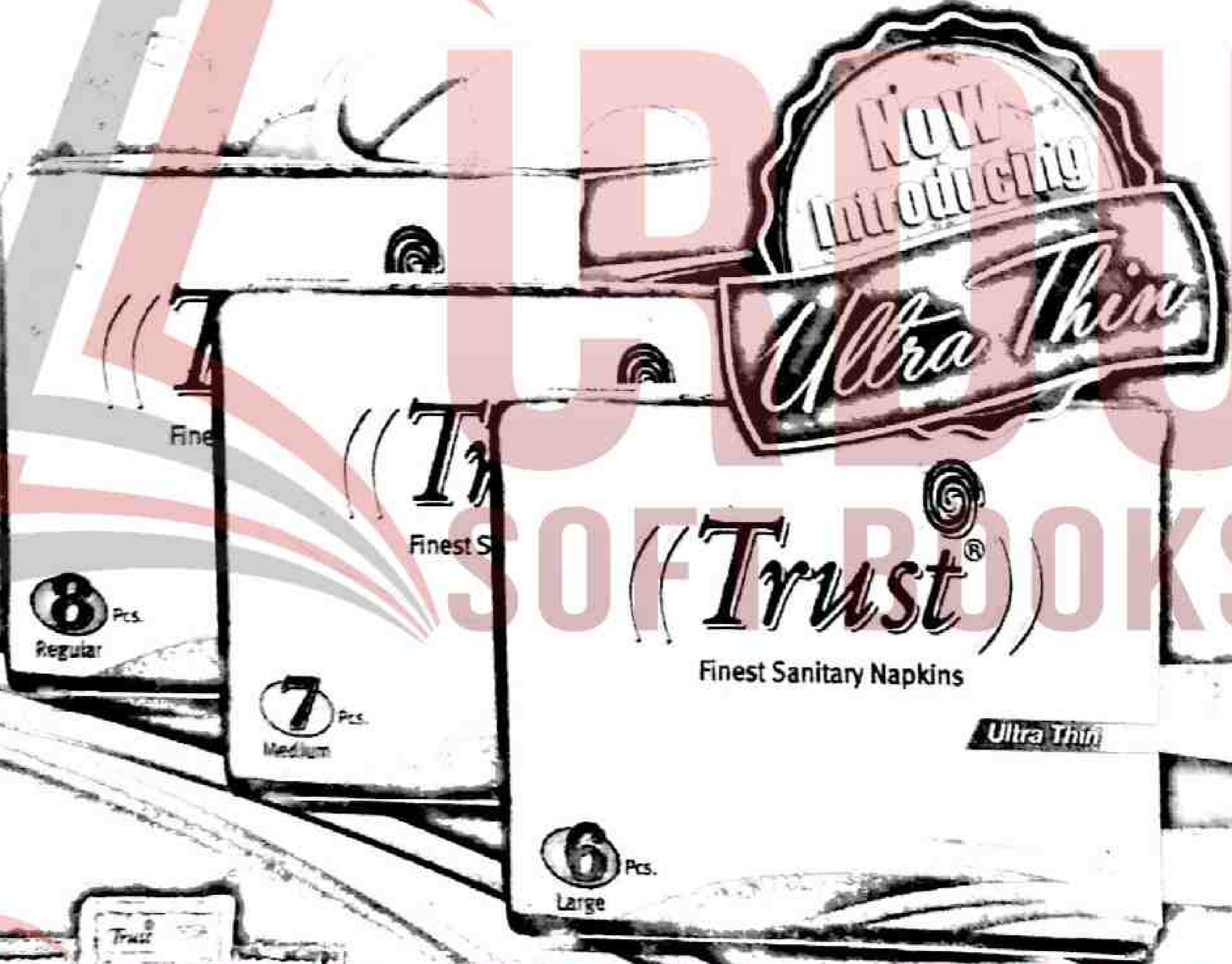
"آپا پلیز...." روبی نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "کہیں گھومنے چلتے ہیں۔"

"کیا...؟"

"کتنا عرصہ ہو گیا ہے آپا' ہم کہیں بھی نہیں گئے۔ بس ایک تائی اماں کا گھر' اب تو وہاں بھی جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"تو اور ہم کہاں جا سکتے ہیں؟" روبی کے بسورنے پر وہ نرمی سے بولی تھی۔

"کہیں بھی' اتنی جگہ ہیں۔ چلیں ناں آپا۔" روبی کا


Now Introducing
Ultra Thin
Trust®
Finest Sanitary Napkins
Ultra Thin
8 Pcs.
Regular
7 Pcs.
Medium
6 Pcs.
Large


Trust

زور چلنے پر تھا۔

"لیکن روبی ہم کہیں بھی جائیں گی تو واپسی میں رات ہو جائیں گی۔ شہر میں ٹریفک کا حال تم جانتی ہو۔" اس نے منع نہیں کیا اور روبی کو باز رکھنے کی کوشش بھی کرنے لگی تھی۔

"جانتی ہوں آپا اور ہم اگلی تھوڑی ہوں گے گل ریز بھائی گاڑی لے آئیں گے۔" روبی اپنی دوسری بات پر خائف نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ جب ہی اس نے کچھ کہنے کی بجائے منہ دوسری طرف کرلیا۔

"میری اچھی آپا ہماری خاطر۔ دیکھیں ہم آپ سے کوئی فرمائش نہیں کرتے لیکن کبھی کبھی تو ہمارا حق بنتا ہے۔" روبی بولے جارہی تھی اور اس نے کچھ دیر پہلے کی اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ کر ہامی بھرلی تو روبی نے خوشی سے نعرہ لگا کر نشا کو پکارا پھر سیل فون اٹھا کر گل ریز کو کال ملادی۔

تقریباً" پندرہ منٹ بعد گل ریز گاڑی لیے موجود تھا۔ روبی اور نشا تو خوشی خوشی بیٹھ گئیں جبکہ وہ اس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھتے ہوئے جھجکنے کے ساتھ اچانک خائف بھی ہوگئی تھی کہ جانے کتنی نظریں ان پر جمی ہیں۔ بے شک گل ریز کے ڈر سے سامنے کوئی کچھ نہ کہتا ہو لیکن پیٹھ پیچھے تو باتیں ہوتی ہوں گی اس خیال سے ہی اس کی پیشانی اور ہتھیلیاں تر ہوگئی تھیں۔

"کہاں چلیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ روبی اور نشا نے یک زبان جانے کیا کہا اس نے سنا ہی نہیں۔ پھر تمام راستہ وہ ان دونوں کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا وہ بالکل خاموش تھی۔

پی ایف میوزیم خوب صورت ماحول اور خوشگوار ہوا بھی اس پر طاری جمود توڑنے میں ناکام ہوگئے تھے جبکہ روبی اور نشا کھلکھلا رہی تھیں۔

"تھوڑی مسکراہٹ اپنی آپا کو بھی مستعار دے دو۔ یوں لگ رہا ہے جیسے انہیں زبردستی مار پیٹ کر لایا گیا ہو۔" گل ریز نے اسے دیکھتے ہوئے ان دونوں سے کہا تو روبی نے فوراً" اس کی تائید کی۔

"ہاں آپا واقعی ایسا لگ رہا ہے۔"

"تم لوگ ایسا کرو۔" گل ریز جانے کیا کہنے جا رہا تھا کہ سیل فون کی گھنٹی سن کر انہیں ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرکے اس نے جیب سے سیل فون نکال کر کال سنی۔

"ہاں کیا بات ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" دوسری طرف کی پوری بات سننے کے بعد اس نے اسی قدر کہہ کر فون بند کرکے جیب میں رکھا پھر ایک نظر روبی اور نشا پر ڈال کر اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"مسئلہ ہوگیا ہے۔"

"کیا گل ریز بھائی ہم ابھی تو آئے ہیں۔" روبی یہی سمجھی وہ واپس چلنے کو کہے گا اور وہ ان سنی کرکے کہنے لگا۔

"بات یہ ہے کہ تمہارے گھر کوئی مہمان آئے ہیں۔ گھر پر تالا تھا اس لیے شاید انہوں نے پڑوس سے پوچھا تو پڑوس کی آنٹی نے انہیں اپنے گھر بٹھا لیا ہے۔"

"تائی اماں ہوں گی۔ وہی آتی ہیں اور تو کوئی نہیں۔" یہ روبی تھی۔

"انہیں بھی اسی وقت آنا تھا۔" نشا جھنجلائی اور وہ کسی گھومتے دائرے میں پاتال میں اترتی جارہی تھی۔ اس بری طرح چکر آرہے تھے کہ وہ گرنے کو ہوگئی۔

"آپا۔" روبی نے ایک دم اسے تھاما تھا۔ "کیا ہوگیا ہے آپا۔"

اس نے خالی نظروں سے دونوں بہنوں کو دیکھا پھر اس کی نظریں گل ریز پر ٹھہر گئیں۔ جانے کیا تھا اس کی نظروں میں یا شاید معاملے کی نزاکت سمجھتے ہوئے وہ بھی خائف ہوگیا تھا۔

"وہ میرا خیال ہے تم تینوں رکشہ لے کر گھر چلی جاؤ۔" روبی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ گل ریز نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو روبی! تمہاری تائی اگر پڑوس میں بیٹھ گئی ہیں تو وہ تم لوگوں کی واپسی تک وہیں بیٹھی

رہیں گی۔ اس خیال سے ہی تمہاری آپا پریشان کھڑی ہیں۔ ڈر رہی ہیں۔ کیا بتائیں گی انہیں کس کس کے ساتھ، کہاں گئی تھیں۔"

"اف یہ شخص ہر بات سمجھتا ہے..." اس نے آنکھیں بند کیں تو یوں لگا جیسے وہ مجرموں کی طرح تائی اماں کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہے اور ادھر سے لعن طعن کے بعد ساتھ سنگساری کے آرڈر جاری ہو رہے ہیں۔

"نہیں۔" آنکھیں کھولنے کے ساتھ ہی اس پر طاری جمود ٹوٹ گیا اور وہ جو یہ سوچ کر آئی تھی کہ گل ریز سے صاف بات کرے گی کہ اگر وہ واقعی روبی اور نشا کو بہنیں سمجھتا ہے تو صرف ان کا ہی سوچے اس کا خیال چھوڑ دے۔ تو وہ اس کے مقابل کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

"مجھ سے نکاح کرو گے؟"

"ہیں !!" وہ چونکا پھر یکلخت اپنی جون میں آگیا۔ "تم سے صرف میں ہی نکاح کروں گا۔ کوئی اور ایسی بات کر کے تو دیکھے، سیدھا اوپر۔"

"ابھی..." گل ریز کی زبان کو بریک لگی۔

"بولو ابھی ورنہ کبھی نہیں۔" وہ اپنے اچانک فیصلے میں اٹل تھی۔ گل ریز نے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر ہونٹ بھینچ کر مبہم سا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جیب سے سیل فون نکال کر نمبر ملاتے ہوئے ان سے چند قدم آگے چلا گیا۔ تو وہ روبی اور نشا کو دیکھنے لگی جو ہونقوں کی طرح کبھی اسے کبھی گل ریز کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں خود پر الزام برداشت کر سکتی ہوں۔ تم دونوں پر آنچ بھی نہیں۔" اس نے کہا تو دونوں اس کے قریب آگئیں۔

"ہاں اب تک پڑوس کی آنٹی، تائی اماں سے جانے کیا کچھ کہہ چکی ہوں گی، پھر محلے والے بھی گواہی دیں گے۔ بات اگر صرف میری حد تک ہوتی تو میں سہہ لیتی لیکن یہاں یہ کہا جائے گا کہ میں نے تم دونوں کو بھی اپنے راستے پر لگا دیا ہے۔ اور یہ میں نہیں سہہ سکتی تھی اس لیے میں نے اس جن کا ساتھ قبول کر لیا جس کے چنگل سے تم دونوں نکلنے کو تیار ہی نہیں۔"

وہ خاموش ہو کر گل ریز کو دیکھنے لگی جو ایک کے بعد ایک جانے کس کس کو کال کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی اس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ ابھی یہاں سب میں چھوارے بٹوا دے گا۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد وہ قدرے اٹھلا کر اس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھی تو کن اکھیوں سے اسے دیکھنے لگی۔ جانے کیسا تصور ابھرا تھا کہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

"تمہارے سینگ کہاں ہیں؟"

"ہیں؟" وہ کسی خوب صورت خیال میں تھا۔ ایک دم اسے دیکھا تو اس کی کھلکھلاتی ہنسی نے سارے میں جلترنگ بجا دیے تھے۔



Watch Us On

YouTube

چہرے کے فالتو بالوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

چہرے کی جھُریوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

قرۃ العین سکندر

نالۂ دل کی صدا

آج ہاسٹل میں اس کی نئی روم میٹ فروا احسان آئی تھی۔ جبکہ وہ ردا کو بے حد مس کر رہی تھی۔ ردا وقتی طور پر ہاسٹل کی رہائشی تھی۔ ردا ایک چھوٹے سے قصبے سے محض اعلا تعلیم کے حصول کی غرض سے یہاں شہر آئی تھی اور اس کے والدین نے اپنی اکلوتی بیٹی کی خوشی کی خاطر شہر میں ہی اپنی رہائش کا بندوبست کر لیا تھا۔ یوں ہاسٹل میں اس کا وہ آخری دن تھا۔

اگرچہ وہ اور ردا ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں۔ مگر اب چوبیس گھنٹوں کا ساتھ نہ رہا تھا۔ اس کی نئی روم میٹ، ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بولڈ واقع ہوئی تھی۔ بغیر آستینوں کا تنگ لباس، شانے تک اسٹیپ کٹنگ اور چیونگم چباتی وہ خاصی لاابالی سی لگی تھی۔ اس نے کومل پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور ہیلو کہا۔ پھر اپنے بیڈ پر دھم سے گر گئی تھی۔

واک مین پر موسیقی سے لطف اندوز ہوتی وہ مسلسل تھرک رہی تھی۔ ایک پاؤں مسلسل گردش میں تھا۔ کومل تنہائی پسند نہیں تھی۔ یہاں تعلیم حاصل کرنا اس کی مجبوری تھی۔ اس لیے ہاسٹل میں رہائش اختیار کرنا اس کا اختیاری عمل تھا۔ وہ فطرتاً ''ہلا گلا پسند کرتی تھی۔ آج اسے شدت سے اپنا آشیانہ غنی ہاؤس یاد آرہا تھا۔ جہاں ہردم قہقہوں کی جھنکار گونجا کرتی تھی۔ وہ بے فکری اور آزادی کے ہنستے کھلکھلاتے دن، مصروفیت اور ذمہ داریوں کی نذر ہو گئے تھے۔ یہاں آنے کی اجازت بھی اسے اپنے چچا زاد کزن عثمان کی بدولت ملی تھی۔ عثمان اس سے ایک کلاس سینئر تھا۔ اور اس طرح اس کی سفارش پر اسے بھی مزید تعلیم حاصل کرنے اور یہاں ہاسٹل میں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔

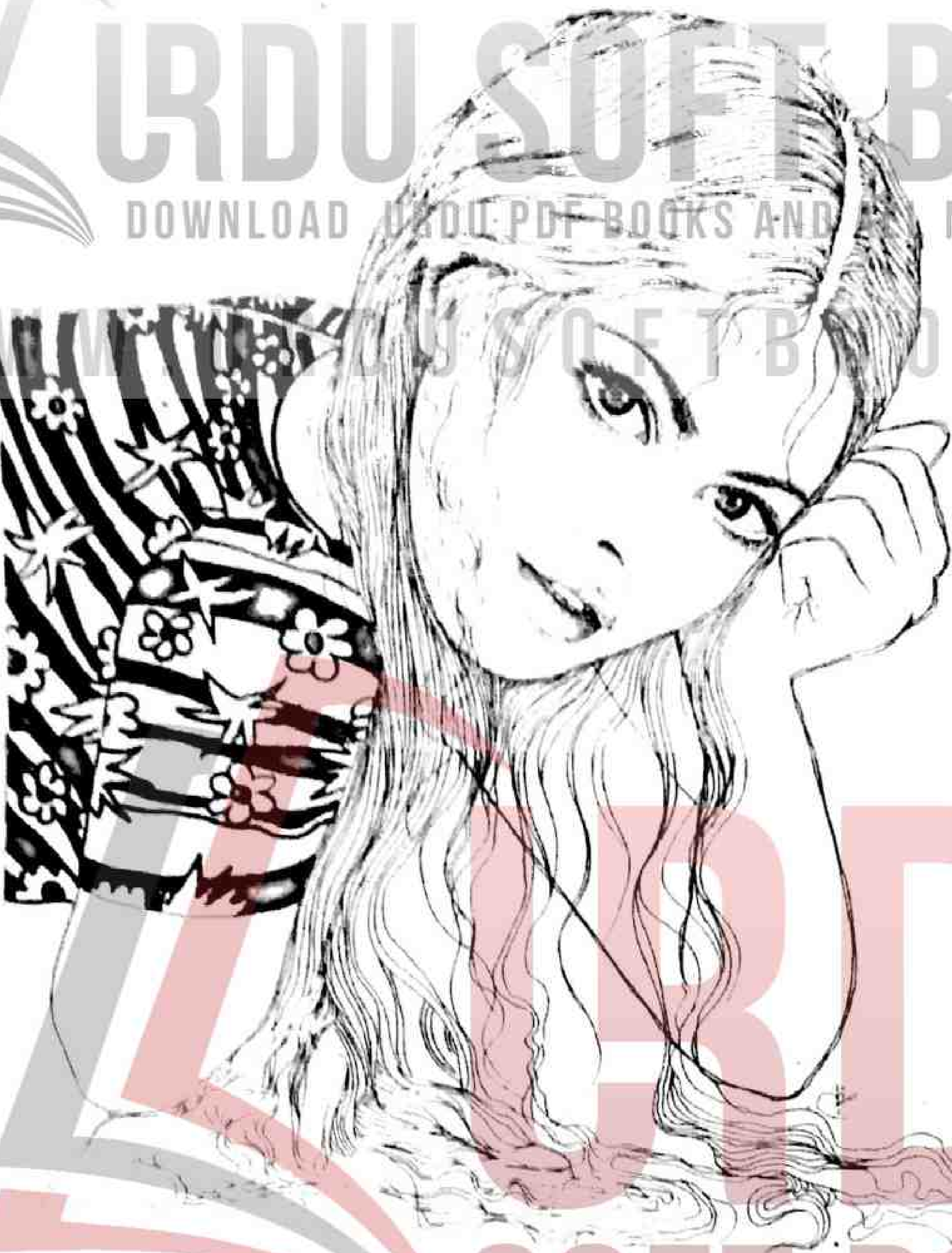
یہاں ہاسٹل میں اداسی کا راج تھا۔ فروا بے حد کم گو اور خود ساختہ خول میں مقید رہنے والی لڑکی تھی۔ کومل نے ایک آدھ مرتبہ اسے بلانے کی سعی کی تھی۔ مگر فروا کے سرد رویے نے اس کو فروا سے ایک خاص فاصلے تک رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔



فروا تیز بخار کی حدت سے تپ رہی تھی۔ وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ دل میں پنپتے دکھوں نے اس کی روح کو ہی نہیں اس کے جسم و جاں کو بھی زخمی کر ڈالا تھا۔ جب انسان کے من میں بہت سے دکھ کرلانے لگیں۔ تو زخم رسیدہ وجود آپ بیتی بن جاتا ہے۔ فروا بھی بہت چھوٹی تھی تب سے ہی ڈائری لکھنے لگی تھی۔ اپنے دکھوں کا اشتہار لگوانا اسے قطعی منظور نہ تھا۔ وہ اپنے دل کے زخموں کو لفظوں میں ڈھال کر صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے خود کو قدرے ہلکا محسوس کرتی تھی۔ مگر بسا اوقات دکھ اتنے گہرے اور کاری ہوا کرتے ہیں کہ انسان کی ہر کوشش لاحاصل ٹھہرتی ہے۔ ناجانے یہ کیسی تنہائی تھی جو آسیب بن کر اس کی ذات سے چمٹ گئی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس آسیب سے رہائی نہیں پاسکتی تھی۔

یوں بہ ظاہر تو اس کو کوئی دکھ نہ تھا۔ اس کی ساتھی لڑکیاں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں۔ وہ احسان گروپ آف کمپنیز کی اکلوتی وارث تھی۔ لیکن بعض دکھ دولت کے انبار میں بھی نہیں دب سکتے۔ بلکہ اس ملبے کو چیر کر سر ابھارتے رہتے ہیں۔ اور دولت کا سارا ملبہ ان دکھوں تلے دب کر رہ جاتا ہے۔





بخار کی شدت سے اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔ باہر سے گاہے گاہے آنے والی ہاسٹل کی لڑکیوں کی زندہ دل آوازیں زندگی کا پتا دیتی تھیں۔ تب ہی کمرے میں آہٹ ہوئی تھی۔ اس نے اپنی دگرگوں ہوتی حالت کے باوجود اس جانی پہچانی آہٹ پر اپنی نیم غنودہ آنکھیں وا کر کے دیکھا تھا۔ سامنے کومل تھی۔ متفکر چہرہ لیے اس پر جھکی ہوئی، فروا کی تشویشناک حالت کو دیکھ کر قدرے حواس باختہ سی باہر کی جانب لپکی تھی۔ پھر فروا کی نیم بے ہوشی مکمل بے ہوشی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اطراف سے یکسر بے گانہ ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ کون سا وقت ہے گھر آنے کا؟" احسان کی آواز گرج دار بھی تھی اور اشتعال انگیز بھی۔

"اوہو! ایسا کیا ہو گیا، رات کا ایک ہی تو بجا ہے۔ تم تو ایسے چلا رہے ہو جیسے نجانے کون سی آفت آگئی ہو۔" رابعہ نے نخوت سے کہا۔

"تمہیں احساس بھی ہے کہ جب میں گھر میں آیا تو فروا کس قدر ڈری سہمی ایک کونے میں چپکی بیٹھی تھی۔ اور وہ گورنس جو تم نے فروا کی دیکھ بھال کے لیے رکھی ہے، اس گورنس کو خبر تک نہ تھی۔ وہ بے خبر گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔" کھرا ملال تھا جو احسان کے لہجے میں در آیا تھا۔

"تو تم آجایا کرو نا جلدی۔ یوں بھی یہ سب میرے ڈیڈ کی جائیداد ہے۔ بہت ورکرز ہیں' کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے۔ تم گھر ٹائم پر آجاؤ تو فروا کو بھی دیکھ لیا کرو۔ میں آج ہی ڈیڈ سے بات کروں گی نا۔" وہ قدرے بے فکری سے بولی تو احسان ___ کو لگا جیسے اس کا خون گرم ہوگیا ہو۔ اشتعال کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

"تمہیں احساس بھی ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔ فروا کو ماں کی ضرورت ہے اور رات کے پچھلے پہر تم جس نازیبا لباس میں گھر واپس لوٹی ہو۔ کوئی شریف آدمی یہ سب برداشت نہیں کرسکتا۔ میں فقط فروا کی خاطر اتنے عرصے خاموش رہا۔ مگر اب جبکہ فروا ہی نظر انداز ہو رہی ہے تو مجھے یہ سب قطعی گوارا نہیں ہے۔ تم کل سے کہیں نہیں جاؤ گی۔ گھر پر رہوں گی۔ امید ہے میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔" احسان ___ نے حتی الوسع لہجے کو قابو میں رکھا تھا۔ مگر یہ سب سن کر رابعہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

"مائی فٹ! تم ہوتے کون ہو مجھ پر پابندیاں لگانے والے۔ تم دقیانوسی سوچ رکھنے والے مڈل کلاس مین یہ سوشل ایکٹویٹی میری زندگی ہے۔ اور فروا میری ہی نہیں تمہاری بھی ذمہ داری ہے۔ مجھ پر اس کی پوری ذمہ داری ڈال کر یوں بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔ وہ تمہاری بھی اتنی ہی ذمہ داری ہے جتنی میری۔ تم کو اتنی ہی فکر ہے تو تم دو قربانی۔" وہ جاتے جاتے پلٹی تھی۔ "اور ہاں' آئندہ میرے معاملات میں مداخلت نہ کرنا۔" رابعہ واش روم میں گھس گئی تھی اور دروازہ قوت سے بند کیا تھا۔ احسان کو لگا کہ یہ دروازہ اس نے اسی کے منہ پر دے مارا ہے۔

دونوں کو اس بات سے بالکل فرق نہیں پڑتا تھا کہ چار سالہ فروا یہ ساری باتیں سن بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔ والدین کے ناروا سلوک اور جھگڑے نے اس کے ننھے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ وہ سہمی ہوئی آنکھوں میں ہر اس سمیٹے' روزانہ کے ان جھگڑوں کو دیکھ کر پروان چڑھ رہی تھی۔

پھر اگلے دن جب رابعہ پورے طمطراق کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کر کے رات گئے گھر واپس لوٹی تو احسان بے صبری سے اس کی واپسی کا منتظر تھا۔ رابعہ نے آتے ہی تین لفظ طلاق کے کسی تمغے کی طرح سمیٹے تھے اور روتی بلکتی ہوئی فروا کی پروا کیے بنا اپنے ضروری سامان کو اٹیچی میں بھرے بے حد غصیلے انداز میں اپنے ڈیڈ کو فون پر ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی مین گیٹ پر اس کے ڈیڈ کی گاڑی اس کی منتظر تھی۔ جاتے جاتے وہ پلٹی تھی۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں تم جیسے سو کالڈ' دقیانوسی سوچ کے مالک شخص پر۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم جیسے آدمی کے ساتھ میں نے اتنے سال برباد کیے۔ نکلے نا تم وہی مڈل کلاس ہلکی سوچ کے مالک مرد۔ مگر کسی بھول میں مت رہنا۔ یہ بنگلہ ضرور تمہاری ملکیت ہے مگر تمہارے اس رویے کا بدلہ میرے ڈیڈ تم سے خود لیں گے۔ دو ٹکے کے آدمی بن کر رہ جاؤ گے تب عقل ٹھکانے آئی گی۔" وہ زعم اور تکبر سے بولی۔

"مجھے تمہارے ڈیڈ کی کارروائی کا انتظار رہے گا اور جس دولت کی تم بات کررہی ہو' وہ میری اصل دولت نہیں۔ میری اصل دولت تو فروا ہے' جسے تم چھوڑے جارہی ہو۔ اور مجھے فخر ہے اپنے مڈل کلاس آدمی ہونے پر۔ کم از کم غیرت مند تو ہوں۔ تم جیسے اپر کلاس کے لوگ مخصوصاً" تمہارے ڈیڈ جیسے بے غیرت لوگ جنہیں اپنی بیٹیوں کے عیب دکھائی نہیں دیتے۔ بے شرمی اور ڈھٹائی سے بیٹیوں کی بے باکی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔"

احسان کا لہجہ بے حد سرد اور ٹھوس تھا۔ پھر رابعہ رکی نہیں تھی۔ اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی تھی۔ چند شیئرز احسان کے نام تھے۔ اسے وہ تمام پراپرٹی دے دی گئی تھی جو اس کی اپنی محنت کی کمائی تھی۔ اتنے سالوں میں اس نے ہی اس کاروبار کو وسعت دی تھی۔ احسان' فروا کی محبت کے پیش نظر

دوسری شادی نہ کرسکا یوں بھی لفظ شادی سے ہی انہیں نفرت ہوگئی تھی۔ اس نے شب و روز اپنی بیٹی کے بہترین مستقبل کے لیے اپنی ذات، بزنس کی وسعت میں غرق کردی تھی۔ مگر یہ بھی جان نہیں سکا کہ فروا کو دولت کی نہیں فقط شفقت بھری آغوش کی ضرورت ہے۔ شعور کی پہلی منزل پر قدم رکھتے ہی اسے ہاسٹل منتقل کردیا گیا تھا۔ اس کی ذات میں دکھ مدغم ہو کر رہ گئے تھے۔ بعض دکھ اتنے ہی گہرے ہوتے ہیں کہ جو رگ و پے میں بس جاتے ہیں۔ محبت کی محرومی کا احساس فروا پر حاوی تر ہوچکا تھا۔ سارے درد جہاں اور غم فقط محبت کی محرومی کے ہی تو تھے۔



کومل بے فکری سے لمبا سانس لے رہی تھی۔ اتنے دن بعد اس نے سکون محسوس کیا تھا۔ کیونکہ فروا پورے دو دن بعد مکمل ہوش و حواس میں لوٹی تھی۔ نقاہت فروا کے چہرے سے ہویدا تھی۔ کومل کی تکان سے بھرپور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ فروا کے لیے جاگتی رہی ہے۔ اصل بات تو یہ تھی کہ کومل نے ان دو دنوں میں فروا کی ڈائری پڑھ لی تھی۔ اگرچہ اسے پسند نہ تھا کسی کی ذاتیات کو پڑھنا۔ مگر اسے یہ لڑکی ہمیشہ سے ایک معمہ لگا کرتی تھی۔ اب جبکہ وہ اس کے گہرے رازوں کی امین بن گئی تھی تو وہ دل میں فروا کے لیے گہری انسیت محسوس کررہی تھی۔ جبکہ فروا کومل کے اس بدلے ہوئے رویے پر محو حیرت تھی۔ پھر وہ دونوں کب یک جان اور دو قالب بن گئیں۔ ان دونوں کو ہی معلوم نہ ہوسکا۔

ردا بھی ان دونوں کے گروپ کا حصہ تھی مگر ردا کو شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ اب اس کی حیثیت محض اضافی شخص جیسی ہو کر رہ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ فروا سے بے حد حسد محسوس کرنے لگی تھی۔ مگر بہ ظاہر ان کے ساتھ گھلی ملی باتوں میں منہمک رہا کرتی تھی۔ اس دن وہ اور فروا گھاس پر بیٹھیں نوٹس بنارہی تھیں۔ ٹھنڈی سی دھوپ دسمبر کے اس موسم میں خوشگوار احساس اجاگر کررہی تھی۔

"ایک تو تم ہر وقت پڑھتی رہتی ہو۔ کیسے پڑھ لیتی ہو اتنا سارا۔" فروا قنوطیت سے بولی تھی۔

"جان کومل! اگر میں پڑھوں گی نہیں تو میرے بابا جانی کا خواب کیسے پورا ہوگا۔ جانتی ہو' ان کا سپنا ہی تو پورا کرنے میں اتنی دور اس جگہ بیٹھی ہوں اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں ان کی آنکھوں میں چمکتے خوابوں کو تعبیر نہ دوں۔" کومل ہنسی تھی۔

تب ہی عثمان اور اس کے ساتھ ازلان شاہ کو آتا دیکھ کر فروا نے منہ بسورا تھا۔ "لو جی" آگئے خدائی فوجدار اب تمہارا انٹرویو شروع ہوگا۔ کیا ہورہا ہے۔ آج کل کیسے پڑھ رہی ہو کوئی دقت تو نہیں وغیرہ وغیرہ۔ سچ میں مجھے تو ان کے یہ فرمودات اب ازبر ہوچکے۔" کومل فروا کا منہ بنا کر بول کر عثمان کی نقل اتارنے پر خوب ہنسی تھی۔

"کس بات پر اتنا خوش ہوا جارہا ہے؟"

ازلان نے کومل کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ کومل تعلقات کے معاملے میں بے حد محتاط تھی۔ وہ اپنی زیست کا نصب العین تعلیم کو بنا چکی تھی۔ اس لیے وہ ازلان سے ایک فاصلے پر رہ کر ہی بات کرتی محبت فقط نظروں تک ہی محدود رہے گی' لبوں تک منتقل نہ ہوسکے گی۔

"آپ سے مطلب؟" کومل کی بجائے فروا نے تنک کر کہا تھا۔ عثمان کو یہ لڑکی فروا نجانے کیوں دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ہر انداز پر وہ اسے گہرے ارتکاز سے تکا کرتا تھا۔

پھر عثمان نے فروا کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ اسے پرپوز کیا تھا۔ فروا واقعی بے حد خوب صورت لڑکی تھی۔ بہت ردوکد اور نخروں کے بعد اس نے عثمان کی محبت پر لبیک کہا تھا۔ وہ دن کسی طلسم کی مانند تھے جیسے کسی جادو نگری میں ان دونوں نے قدم رکھ دیے ہوں۔ فروا کو لگتا تھا کہ اس کی زیست پر چھائے جمود کے بادل چھٹ رہے ہیں۔ وہ محبت کے اڑن کھٹولے میں بیٹھی محو پرواز بلندیوں کو چھوتی

کسی اور ہی جہان کی سیر کر رہی تھی۔ یہ تجربہ اس کے لیے یکسر نیا تھا۔

وہ جو سوچا کرتی تھی کہ کبھی شادی نہ کرے گی اور شادی کے نام سے ہی چڑ جایا کرتی تھی۔ اب ہر دم عثمان کی محبت کا دم بھرنے لگی تھی۔ درحقیقت وہ عثمان کی نگاہوں سے نئے سرے سے اس دنیا کو دیکھ اور پرکھ رہی تھی۔ اس طرح محبت کی نگری کی باسی ہو کر اسے سب کچھ بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ اسے ماضی کے دکھ بھی اب خواب و خیال کی مانند لگنے لگے تھے۔ وہ دوبارہ جی اٹھی تھی۔ فقط عثمان کی چاہت کی لو پا کر۔

"عثمان تم بے حد خوش قسمت ہو' جسے چاہا اس کی محبت بھی پالی۔ مجھے دیکھو ابھی تک تہی داماں ہوں۔" ایک دن ازلان شاہ نے دکھ بھرے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

"کون ہے وہ جسے تم اتنی شدت سے چاہتے ہو۔ کیا اس نے تمہاری محبت سے انکار کر دیا؟" عثمان نے حیرت سے پوچھا تھا۔

ازلان شاہ نہ صرف کلاس کا سی آر تھا بلکہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔ اس کی شخصیت کے سحر سے آزاد ہونا ممکن نہ تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی لڑکی اس کی محبت پر لبیک کہتے ہوئے اسیر محبت نہ ہوتی۔

"تم جانتے ہو اسے بخوبی' مگر ابھی تک میں نے اسے بتایا ہی نہیں۔ اگرچہ واضح طور پر نہیں' مگر اسے اندازہ تو ہو گا میری شدتوں کا۔" جذبات کی شدت سے اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"کون ہے وہ۔ تم نے تو کبھی ذکر تک نہیں کیا مجھ سے۔" عثمان نے کہا۔

"سوچا کہیں تمہاری حمیت ہماری محبت کے آڑے نہ آ جائے۔ ہماری دوستی میں خلیج نہ آ جائے۔"

"اوہ تو کیا وہ کومل ہے۔" عثمان کے ہونٹ سکڑ سے گئے تھے۔ کچھ عجیب سے احساسات تھے جو عود کر آئے تھے۔ وہ انہیں کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔

"کہا تھا نا' برا لگ جائے گا۔" ازلان کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ تم اگر کچھ عرصہ پہلے ایسا کہتے تو میں ضرور ناراض ہو جاتا۔ میں خود محبت کا راہی نہ ہوتا۔ یا میں تم کو جانتا نہ ہوتا۔ تمہاری بات سمجھ نہ پاتا۔ اب میں تمہارے ساتھ ہوں ازلان۔ تم بلاجھجک بات کر سکتے ہو کومل سے۔"

عثمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تھپتھپایا تھا۔ ازلان کو لگا جیسے اسے ہفت اقلیم مل گئی ہو۔ محبت کی سند تو نہ ملی تھی' مگر محبت کی اجازت باضابطہ طور پر مل گئی تھی۔



کومل اور فروا شاپنگ کے لیے روانہ ہوئی تھیں۔ لنک روڈ میں شاپنگ کرتے ہوئے وہ دونوں خوب انجوائے کر رہی تھیں۔ اس بات سے قطعی انجان کہ ازلان شاہ تھوڑے فاصلے پر موجود ان کی تمام حرکات و سکنات ملاحظہ کر رہا تھا۔ شوکیس میں ایک نہایت ہی خوب صورت سوٹ سجا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر کومل لحظہ بھر کے لیے ٹھٹکی تھی۔ جذب کی کیفیت میں وہ اس سوٹ کو دیکھے گئی تھی' مگر ٹیگ پر لکھی قیمت دیکھ کر وہ چونکی تھی۔ بے حد دلی سے اس نے اپنے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

مگر ازلان کو اس ایک پل میں کومل کی بڑھتی ہوئی دلچسپی نے متاثر کیا تھا۔ پھر وہ دونوں تو شاپنگ کر کے ہاسٹل کے لیے روانہ ہو گئی تھیں' اور وہ اس دکان میں داخل ہوا تھا اور سیلز مین سے اس سوٹ کو پیک کرنے کا کہا تھا۔ سرشاری کی عجیب سی کیفیت اس کے وجود میں جاگزیں تھی۔ سرشام جب زنیرو بی بی اس کے لیے ایک پیک شاپر اور ساتھ میں ایک لفافہ لائیں تو کومل حیران رہ گئی تھی۔

"کون دے گیا ہے۔ بی بی یہ۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی تھی۔

"کوئی ازلان شاہ دے کر گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ کومل صاحبہ کو دے آئیں۔" زنیرو یہ کہہ کر واپس پلٹ گئی

تھی۔
اس وقت کمرے میں کومل بالکل تنہا تھی۔ فروا باہر چہل قدمی کرنے گئی تھی۔ اس کی عادت تھی اُسے بھی بہت کہا تھا، مگر اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ اب اتنا سخت دن گزارنے کے بعد ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس پیکٹ کو کھولا تھا۔ سفید کامدار نفیس سا سوٹ اس کی نگاہوں کو چکاچوند کر گیا تھا۔ یہی سوٹ تو آج اس نے دکان پر دیکھا تھا، مگر اتنی زیادہ قیمت دیکھ کر وہ لوٹ آئی تھی۔

ایسا نہ تھا کہ وہ کوئی غریب لڑکی تھی مگر وہ اپنا بجٹ دیکھ کر چلتی تھی اور پھر یہاں پردیس تھی۔ وہاں کشمیر میں تو وہ جس شے پر ہاتھ رکھ دیتی تھی اُس کی فرمائش من و عن پوری کرنا بابا جان کا جیسے فرض بن جاتا تھا۔

اس نے بڑھ کر لفافہ چاک کیا تھا۔

"پیاری کومل!

میں جانتا ہوں تمہیں میری جانب سے کوئی تحفہ شاید قابل قبول نہ ہو، مگر میری آرزو ہے کہ تم جس شے پر ہاتھ رکھ دو، وہ تمہاری ہو جائے۔ تم جانتی ہو ایک عرصہ ہوا تمہیں یوں چاہتے ہوئے مگر ایسا لگتا ہے جیسے یہ عرصہ صدیوں پر محیط ہو۔

ہو سکے تو میرا حقیر سا تحفہ قبول کر کے میری محبت کو قبول کر لو۔

ازلان شاہ

اس کے لیے یہ سب بے حد حیران کن تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ازلان کی نگاہوں میں لو دیتے جذبے محض وقتی دل لگی سے بڑھ کر کچھ نہیں مگر یہ سب.....

اس نے جلدی سے پیکٹ میں وہ سوٹ واپس ڈال دیا تھا اور خط کو چھپا دیا تھا۔ نجانے کیوں اسے فی الوقت فروا کو یہ سب بتانا بے حد مشکل لگ رہا تھا۔

جب کہ وہ خود ایک عجب دوراہے پر آکھڑی ہوئی تھی۔ ازلان ایک شریف النفس لڑکا تھا، مگر اسے اپنے بابا کے پاس کورے کاغذ کی طرح صاف شفاف واپس لوٹنا تھا۔

☼ ☼ ☼

کومل، ردا کے پاس بیٹھی کینٹین میں سموسوں کے ساتھ انصاف کر رہی تھی۔

"یہ تمہاری عزیز از جان دوست فروا احسان نظر نہیں آرہی۔" طنزیہ لب و لہجہ لیے ردا آنکھیں مٹکاتے بولی تھی۔ کومل جانتی تھی کہ فروا اس وقت کہاں ہوگی، مگر ردا کو وضاحت دینا فضول تھا۔

"آج کل تمہارے ہینڈسم کزن پر فریفتہ ہو رہی ہے فروا احسان۔" ردا نے طنزاً ہنس کر کہا تو کومل کو لگا کہ آج اس کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔

"دیکھو ردا! میں فروا کے حوالے سے کوئی بات نہیں سن سکتی اور میں عثمان کو بھی جانتی ہوں اور فروا کو بھی۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے میں انوالو ہیں تو تمہیں اس سب سے کیا مسئلہ ہے؟" کومل کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔ غصے نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"تم کیوں اتنا ناراض ہو رہی ہو۔ سچ تو کڑوا ہی ہوتا ہے۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کی اور تمہیں تو غصہ ہی آگیا۔" ردا نے بھی خفگی سے کہا تو کومل نے بات ختم کرنے کی نیت سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لیا اور وہاں سے چل دی۔

کومل یونیورسٹی سے باہر نکلی تھی جب اس نے ازلان شاہ کو اپنی گاڑی کے پاس دونوں بازو باندھے اپنے لیے محو انتظار پایا۔ کومل نے اسے نظر انداز کر کے تیزی سے قدم آگے بڑھائے تھے۔ وہ چاہتی تھی یہاں سے فرار ہو جائے۔ وہ ازلان کا سامنا کرنے سے کترانے لگی تھی۔

"کومل! پلیز ون منٹ۔" اس نے سن گلاسز اپنی آنکھوں سے اتارے تھے۔ ڈارک براؤن آنکھوں میں اپنا جھلملاتا ہوا عکس دیکھ کر کومل ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھی۔

"جی بولیں۔" اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر بالآخر دوبدو بات کرنے کی ٹھان ہی لی تھی۔

"میں اپنے والدین کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں رشتے کی غرض سے۔ اس سے قبل تمہاری رضامندی

مطلوب ہے۔ بھی کبھی مجھے لگتا ہے کچھ انمول جذبے میرے حوالے سے تم بھی دیکھتی ہو۔ تمہارے اندر بھی محبت کی وہی کونپل پھوٹی ہے جس نے صرف مجھے ہی اپنے حصار میں نہیں لے لیا۔ کیا میں غلط ہوں۔ اگر ہوں تو آج آخری بار میری ہر امید کو توڑ دو 'ابھی اس وقت۔ خدا کی قسم بھی پلٹ کر نہیں دیکھوں گا۔"

اس کا سچا جذبہ کومل کو گنگ کر گیا تھا۔ وہ محض سر جھکائے کھڑی تھی۔ لفظوں کا ماہر تو ازلان تھا۔ اس کے پاس تو جواب کے لیے ایک لفظ بھی نہ بچا تھا۔

"تم کچھ تو بولو 'کوئی آس کا دیپ ہی جلا دو جسے تھام کر میں روشنی کا مسافر بن جاؤں۔" اس کا مخمور لہجہ تھکن سے چُور تھا۔ محبت کی روشنی سے چمکتی آنکھیں اس کے چہرے کا احاطہ کیے تھیں۔ ازلان کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کومل کے عشق میں قطرہ قطرہ پگھل رہا ہو۔

"آپ اپنے والدین کو بھیج دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں 'مگر میں جیسی محبت آپ چاہتے ہیں ویسی نہیں کر سکتی۔ مثلاً" ہوٹلنگ کرنا' پارک میں ملنا یا پھر لانگ ڈرائیو پہ جانا۔ میرے نزدیک محبت کی اصل خوبصورتی شادی کے بعد ہے۔ آپ یقیناً" میرے لیے سنجیدہ ہوں گے لیکن میں اس سے زیادہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔" اس کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

"مجھے فخر ہے کومل کہ تم میری چاہت ہو۔ تمہارا یہی انداز تو میرے دل کو بھایا ہے۔ تم سب سے الگ سب سے منفرد ہو۔ بارش کے پہلے قطرے کی طرح پاک اور شفاف۔"

ازلان کی بات پر اس کے چہرے پر لحہ بھر کے لیے دھیمی سی مسکان پھیل گئی۔ وہ یہاں سے واپس تو پلٹ گئی تھی 'مگر اپنا دل ہمیشہ کے لیے ازلان شاہ کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ وہ ریت و رواج کی پاسداری میں اٹل تھی 'مگر محبت تو دل پر دستک کا نام ہے۔

پھر تو جیسے ازلان کی دور سے ایک پیار بھری مسکان ہی اس کا کل سرمایہ بن گئی۔ جب وہ واپسی کے لیے روانہ ہوتی تھی ازلان بالکل خاموشی سے قدرے فاصلے سے اس کو دیکھتا رہتا تھا۔ جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ محبت کے آگے وہ ہارنے لگی تھی۔ اب اسے لگتا تھا کہ جس دن وہ ازلان کی صورت نہ دیکھے گی اس دن اسے زندگی نوید بھی نہ ملے گی۔ وہ ہر لباس پہننے سے پہلے سو بار سوچا کرتی تھی کہ ازلان کو کیا میں اس رنگ میں اچھی لگوں گی۔

اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ محبت رنگوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ محبت کا تو اپنا ایک رنگ ہوتا ہے۔ ایسا گہرا ایسا پکا رنگ 'جو جس پر چڑھ جاتا ہے تاعمر نہیں اترتا۔

یہ آخری سمسٹر تھا۔ اس کے بعد فراغت ہی فراغت ہو جاتی۔ پیپرز سے پہلے کچھ چھٹیاں تھیں جو محض تیاری کی غرض سے دی گئی تھیں۔ ہاسٹل سے سب لڑکیاں رخصت ہو رہی تھیں۔ وہ بھی مجبورا" واپس جا رہی تھی۔ اس کا دل بے انتہا اداس تھا۔ فروا کا تو رو رو کر برا حال تھا۔

"میں اتنے دن عثمان کے بنا نہیں رہ سکتی۔" فروا نے روتے ہوئے کہا تھا۔ کومل کی اپنی کیفیت بھی فروا سے مختلف نہ تھی 'مگر وہ کومل تھی مضبوط دل کی مالک جو اندر سے ریزہ ریزہ بھی ہو جائے تو بھی کسی پر آشکار نہ ہو۔

کومل نے دکھی دل سے فروا کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھی تھیں پھر اسے ایک پل لگا تھا فیصلہ کرنے میں۔

"اس بار تم بھی میرے ساتھ چلو نا چھٹیوں میں۔ یوں بھی تم کو تو اتنی آزادی حاصل ہے۔ اجازت بھی مل جائے گی۔" کومل نے چٹکی بجاتے حل نکالا۔

"سچ۔ اوہ مائی سویٹ فرینڈ۔" فروا نے اسے اتنی سختی سے گلے لگایا کہ اسے لگا کہ اب اس کی چیخ ہی نکل جائے گی۔

"آرام سے 'رحم کرو' مجھے زندہ جانے دو گھر' بابا کے پاس۔" کومل نے ہنستے ہوئے اس پگلی سی لڑکی کو دیکھا۔ فروا نے جوش و خروش سے اپنی پیکنگ شروع کر دی تھی اور کومل اس کی حرکات دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

احسان صاحب ایک دو بار کومل سے مل چکے تھے۔ جب فروا نے فون پر اپنے پاپا سے اجازت لی تو احسان صاحب نے بلا تامل اسے اجازت دے دی۔ فروا تو

پھولے نہیں سما رہی تھی۔

"اف میں اپنی سسرال جا رہی ہوں پہلی دفعہ اتنی کنفیوز ہوں۔" فروا کی بات پر کومل نے باقاعدہ اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

"ہائے فروا! کچھ تو شرم کرو۔" کومل نے دیدے پھاڑے تھے۔

"شرم کیسی؟ سچ ہی تو ہے. جس لڑکی سے عثمان کی شادی ہوگی وہ میں ہوں گی۔ کوئی اور کر کے تو دیکھے اس کے ہاتھ اور پاؤں توڑ ڈالوں گی۔ لنگڑی ہو جائے گی اور پھر کرتی رہے شادی۔" فروا ایک دم طیش میں آگئی تھی۔

"اچھا بابا تم ہی ہوگی وہ چڑیل۔"

کومل نے اسے چڑایا تھا' مگر وہ اس میں بھی خوش ہوگئی تھی۔ دلہن تو وہی ہوگی نا عثمان کی۔

غنی ہاؤس میں سب نے کھلے دل سے فروا کا استقبال کیا تھا۔ بطور کومل کی دوست وہ ان کے لیے کومل جیسی ہی تھی۔ کومل کی چچی' تائی' پھوپھیاں' خالائیں سب یہاں جمع تھیں۔ دعاؤں کا حصار تھا جو ان کے گرد بندھ سا گیا تھا۔ کومل نہال ہو رہی تھی جب

کہ فروا حیران اتنے رشتے اس نے کہاں دیکھے تھے۔ وہ تو رشتوں کی تشنگی لیے پروان چڑھی تھی۔ اگرچہ کومل نے آتے ہوئے فروا کو اسکارف اوڑھا دیا تھا۔ کومل جھجک رکھتی تھی اس لیے فروا کو کہہ نہ سکی کہ وہ بھی مکمل قمیص شلوار پہنے اور چادر اوڑھے۔ جیسا کہ وہ اوڑھتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی پہلی بار میں ہی فروا گھبرا جائے۔ کومل کا خیال تھا کہ فروا یہاں کا ماحول دیکھ کر خود بخود اس ماحول میں ڈھل جائے گی۔ اس لباس کو دیکھ کر تائی جان نے قدرے حیرت سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔

جاگرز کے اوپر جینز کے پائنچے مڑے ہوئے تھے۔ ٹی شرٹ میں ملبوس وہ اپنی زینت چھپانے میں ناکام تھی۔ اس پر مسلسل چیونگم چباتے ہوئے وہ عجیب سی لگ رہی تھی ان اتنی باپردہ اور حیادار خواتین میں۔ صد شکر کہ کومل کو کسی نے کچھ نہ کہا تھا۔ تائی

جان کا فروا کو پاس کرنا ضروری تھا۔ آخر کار وہ عثمان کی والدہ ماجدہ جو ٹھہری تھیں ہمگران کا سرو سارویہ کومل ہی نہیں خود فروا نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا۔ بہت لیا دیا سا انداز تھا ان کا۔ عقب میں کھڑے عثمان نے بھی یہ منظر دیکھا تھا مگر اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ فروا بہت جلد اس ماحول کے رنگ میں خود کو رنگ لے گی اس کو فروا کی محبت پر یقین تھا۔

کومل نے اتنے دن بعد گھر کا چکر لگایا تھا تو غنی ہاؤس میں تو جیسے بہار آگئی تھی۔ سب کومل کو گھیرے کچھ نہ کچھ کھلا پلا رہی تھیں۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کومل بن ماں کی بچی ہے۔ اتنا لاڈ اتنا نخرہ تھا اس کا یہاں۔ فروا دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ ہر ایک کومل کی فکر میں ہلکان تھا۔ اگر ایک چچی اس کے سر کی تیل مالش کر رہی ہیں تو دوسری پھل کاٹ کر کھلا رہی ہیں اور عثمان کی امی راشدہ تائی تو کومل کے صدقے وارے ہوتے نہ تھک رہی تھیں۔

”پڑھ پڑھ کر اتنا سا منہ نکل آیا ہے لڑکی کا سارا گلابی پن گیا ہے۔ لو بادام کھاؤ۔“ اور نہ نہ کرتے بھی کومل کو سب کا دل رکھنے کی خاطر سب کچھ کھانا پڑ رہا تھا۔ فروا کو اب اصل معنوں میں کومل کی زندگی پر رشک آ رہا تھا۔ اگرچہ کومل کی دوست ہونے کے ناتے اس کی بھی خوب آؤ بھگت ہوئی تھی۔ پھر تائی اماں نے اسے اور کومل کو شاپنگ کرنے کے لیے عثمان کے ساتھ بھیجا تھا۔ نا معلوم کیا کہا تھا کہ تائی جان نے کومل کے کان کے پاس کہ کومل چپ سی ہو گئی تھی۔ فروا پوچھ نہ سکی اور یہ راز تو بازار جا کر کھلا تھا۔ جب کومل نے فروا کے لیے کئی ریڈی میڈ شلوار سوٹ لیے تھے اور فروا نہ نہ کرتی رہ گئی مگر عثمان کے کہنے پر اسے اپنی نہ ہاں میں بدلنی پڑی تھی۔

”یہاں سب شلوار سوٹ پہنتے ہیں۔ تم پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ سب تو ہم خلوص سے تحفتاً دے رہے ہیں۔ پہلی مرتبہ آئی ہو نا اس لیے۔“

ڈھکے چھپے الفاظ میں کومل نے اسے تمام صورت حال سے بھی آگاہ کر دیا تھا جسے جان کر اسے رنج ہوا تھا۔ سب اس کے لباس کو ناپسند کر رہے تھے۔ وہ کیا کرتی۔ بچپن سے اب تک کسی نے ٹوکا ہی نہ تھا۔ جو چاہتی لے آتی۔ اب کہا تو اس نے سر تسلیم خم کر لیا تھا۔ عثمان اسے بار بار واپسی پر بیک مرر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمائے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ چھلکے دھنک کے رنگ قدرتی تھے۔ وہ ایک لڑکی تھی جس کے تمام احساسات محبت سے جڑے تھے۔

”بڑے اچھے وقت پر آئی ہو بیٹی! جلد ہی گھر میں ایک بہت اہم تقریب بھی ہے۔“ تائی جان نے ہنستے ہوئے اس کی شاپنگ دیکھ کر کہا تھا۔

”جی کون سی تقریب؟“ فروا نے متعجب ہو کر پوچھا تھا۔

”پتا چل جائے گا آج شام کو ہی ہے۔“ تائی جان نے بات ٹالتے ہوئے کہا تو اس کو بھی اصرار اچھا نہ لگا۔ شام کو لان کو پھولوں سے سجایا جانے لگا۔ ہر جانب قمقمے روشن ہونے لگے۔ فروا نے کومل سے اس بابت پوچھا تو کومل نظریں چرا گئی تھی۔ فروا نے مزید اصرار نہ کیا۔ اور اپنی شاپنگ میں سے ایک اچھا رنگوں کا امتزاج والا سوٹ زیب تن کر لیا تھا۔

کومل کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی، نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ وہ اس کی تلاش میں سرگرداں تھی کہ تائی جان کے کمرے کے باہر سے گزرتے اپنا نام سن کر اس کے قدم تھم سے گئے تھے۔

”امی! فروا میری چاہت ہے۔“ عثمان کا تھکا ہارا لہجہ اس کے ٹوٹنے کا گواہ تھا۔

”ہوا کرے، مگر اس کے رنگ ڈھنگ بھی تو دیکھو۔ امیر گھرانے کی لڑکیاں محبت کو بھی دل لگی ہی سمجھتی ہیں۔ آج تم پر فدا ہے کل کلاں کوئی اور بھا جائے گا۔ اب تم نے مزید بحث کی تو میں تمہارے بابا کو حرف بہ حرف بتا دوں گی۔“ تائی جان دھمکانے والے لہجے میں بولی تھیں۔

”امی! میں نے کومل کو کبھی اس نگاہ سے نہیں دیکھا اور کومل بھی شاید اس رشتے پر آمادہ نہ ہو۔“ عثمان ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھا۔ ایک اور جواز تراشا۔

”تو بھلا اُس بچی کو کیا اعتراض‘ اُس نے تو آرام سے سر جھکا دیا۔ ایک لفظ نہ بولی منہ سے۔ ایسی نیک بچی ہے وہ۔“ تائی جان نے مزید کیا کہا وہ سن نہ سکی۔ اگر وہ دیوار کا سہارا نہ لیتی تو لڑکھڑا کر گر جاتی‘ مگر ابھی تو بہت کچھ سہنا باقی تھا۔ شام کو اسٹیج پر عثمان کے پہلو میں کامدار سرخ لہنگے میں بجی سنوری بے انتہا حسین سی لڑکی کوئی اور نہیں کومل تھی۔ اتنی خوب صورت کہ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی‘ مگر اس کی خوب صورتی میں بھی حزن کی آمیزش تھی۔ فروا کو لگا اس کے دل کی دھڑکن تھم جائے گی۔ مگر وہ ساکن وجود لیے وہاں تھی۔

اس کے سامنے نکاح کے دو بولوں نے عثمان اور کومل کو عمر بھر کا ساتھی بنا ڈالا تھا۔ فروا کا دل چاہا کہ چیخ چیخ کر کومل سے پوچھے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ شاید یہی وہ جواب تھا جس کی طلب میں وہ یہ سارا تماشا دیکھتی رہی۔ کھٹا کھٹ تصاویر لی جا رہی تھیں۔ بلائیں لی جا رہی تھیں۔

عثمان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا جب کہ کومل کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ رات گئے جب یہ فنکشن اختتام پذیر ہوا اور سب سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے تو فروا نے بھی دل کڑا کر کے کومل کے کمرے کا رخ کیا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ کھلا ملا۔ وہ تھکے ہوئے جواری کی مانند آگے بڑھی تھی۔ کومل نے چوڑیاں بیڈ پر پھینکی ہوئی تھیں۔ گجرے زمین بوس تھے۔ آنکھوں کا پھیلا کاجل اس کے آنسوؤں کا گواہ تھا۔

”کاش کومل‘ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو میں لڑائی جھگڑا کر لیتی محبت کا حساب مانگ لیتی عثمان سے۔ تم نے ایسا کیوں کیا کومل۔ کیوں مجھے ـــ اجاڑ دیا؟“ فروا پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ کومل آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔

”یہ تم ازلان کو دے دینا۔ اس سے کہنا ہمارے ہاں لڑکیاں محبت نہیں کر سکتیں وہ بے زبان‘ کٹی پتنگ کی مانند‘ ایک کٹھ پتلی کی طرح زیست کے ماہ و سال بتا دیتی ہیں۔ میں نے چاہا تھا ازلان کے خواب نہ دیکھوں‘ مگر ان آنکھوں میں اس کے چہرے کے سوا کوئی چہرہ ٹھہرتا ہی نہیں۔ میں نے یہ خون تمہاری نہیں اپنی محبت کا کیا ہے۔ صرف اپنے بابا کی آن ـــ بان کی خاطر۔ میں ان کا غرور ہوں نا‘ تو کیسے ان کی آس توڑ دیتی۔ ازلان کو کہنا ہو سکے تو مجھے معاف کر دے اور شاید میں تمہاری مجرم بھی ہوں‘ مگر معافی نہیں مانگوں گی کیوں کہ تاعمر اب مجھے تمہاری بددعاؤں کے حصار میں جینا ہو گا۔“

کومل کا ٹوٹا ہوا لہجہ‘ سوجی آنکھیں اس کی بے اماں مسافت کا پتا دے رہی تھیں۔





سائرہ رضا

حسن المآب اور...

صحرا کا آگ اگلتا سورج ' شدید پیاس ' پھوڑے ' پھنسیوں سے بھرا جسم وہ سب کچھ بھول چکا تھا ۔ نام ' عہدہ ' شخصیت ' رشتے ' محبت ' نفرت... اس لمحے اسے اپنے گناہ یاد آرہے تھے وہ اللہ کو پکار رہا تھا۔

ماہ رو ' اریبہ ' حلیمہ اور حسن المآب کالج میں دوست تھیں۔ ماہ رو کا آزاد خیال اور ماڈرن گھرانے سے تعلق ہے۔ اریبہ ایک مڈل کلاس فیملی سے ہے اور بڑی بہنوں کے رشتے نہ ہونے سے پریشان رہتی ہے۔ حلیمہ کا تعلق ایک بہت مذہبی گھرانے سے ہے۔ حسن المآب غیر معمولی حسین ہے۔ اس نے سن شعور سے اپنے گھر میں شریعت کے احکام سنے اور مذہب کی سختی سے پابندی دیکھی ہے۔ مفتی عبدالرحمٰن اس کے نانا تھے۔

حسنل کا خاندان تبلیغ دین کے لیے مشہور تھا۔ جبکہ حلیمہ کے گھر والوں کی حیثیت ان کے مریدین جیسی تھی۔ حلیمہ کے والد کی انتہاپسندی کی وجہ سے حلیمہ کی بڑی بہن اور دو بھائیوں کے رشتے نہ ہو سکے تھے۔

مکمل ناول

حلیمہ اپنے والد کا پرتو تھی' جبکہ حسنل اپنے مذہبی ماحول سے شدید بے زار تھی۔
میری اپنی خالہ زاد کی شادی میں شرکت کرنے چرچ جاتی ہے۔ وہاں دولہا یوحنا اسے شکوہ بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ یوحنا نے پہلے اس کے لیے رشتہ دیا تھا۔ ماما کو بھی شدید رنج ہے کہ میری نے یوحنا کے رشتے سے انکار کیوں کیا۔
حسنل کے لیے عبدالمبین اور عبدالمتین کا نام لیا جاتا ہے۔ جن سے حسنل شدید نفرت کرتی ہے۔
حسنل ماہ رو اور اریبہ کے شدید اصرار پر ایک میوزک کنسرٹ میں جاتی ہے۔ وہاں موسیٰ بی کو دیکھتی ہے۔ اسے لگتا



ہے کہ جس شخص کو وہ اپنے تصورات میں دیکھتی رہی ہے۔ وہ موسیٰ بی ہے۔ اس کا خیال پیکر مجسم ہو کر سامنے آگیا تھا۔
عقیلہ بیگم اس کے آنے سے بہت خوش تھیں۔ ان کا پوتا ساری زندگی ان سے دور رہا تھا۔ ان کا پوتا ماورائی حسن کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بے حد نازک مزاج بھی تھا۔ خصوصاً" کھانے کے معاملے میں اس کے ہزار نخرے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے خاص طور پر شیف رکھا تھا۔
حسنل کی تصورات کی دنیا موسیٰ بی سے آباد تھی۔ موسیٰ انڈین میوزک ڈائریکٹر کی چال بازیوں سے دل برداشتہ ہو کر پاکستان اپنا کیریئر بنانے آگیا۔ جہاں چالاک اور نسبتا" بڑی عمر کی اداکارہ شہرزاد عیسائی نے اسے گھیر لیا اور دونوں ہی اپنے مفادات کی خاطر دوستی کے رشتے میں بندھ گئے۔
سعد حسن نے دور اندیشی سے کام لے کر محی الدین سہگل کو اپنا داماد بنا لیا۔ جو کہ مفتی عبیدالرحمٰن کا کلاس فیلو تھا۔ محی الدین سہگل نے ذہانت کے بل بوتے پر خوب ترقی کی اور اسی دوران وہ ایک بیٹے بدرالدین کا باپ بن گیا۔ بدرالدین کی آمد

سہگل اور عقیلہ کے لیے ڈراؤنا خواب تھی۔ وہ صرف کیریئر بنانا چاہتے تھے۔
وہ اپنے دوستوں ایڈورڈ اور کیلاش کے ساتھ تفریح کی غرض سے نکلا تھا۔ مگر ایڈونچر کے شوق میں راستہ بھٹک گیا۔ اس کے دوستوں نے اسے بہت ڈھونڈا مگر وہ صحرا میں کہیں کھو گیا تھا۔
خدیجہ بانو نوعمری میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے بل بوتے پر پالا۔ خدیجہ بانو کے اپنے بھائی اور اس کی فیملی سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ خدیجہ بانو کا بیٹا ماریہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ماریہ عیسائی ہے۔ دونوں کے خاندان اس رشتے کے لیے تیار نہیں۔ مگر ماریہ اور منا دونوں ہی کسی معجزے کے منتظر ہیں۔
اپنے اپنے تحفظات کے ساتھ ماریہ اور منے کی فیملی مان جاتی ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ ماریہ کے والدین اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ خدیجہ اور ماریہ کے درمیان روایتی ساس بہو والی چپقلش نہیں ۔۔ ماریہ عملی مسلمان بننے کی کوشش کرتی ہے، مگر خدیجہ بانو اس کے عقائد کے بارے میں شک میں پڑ جاتی ہیں۔
حسنل کو اس کی سہیلیاں سمجھاتی ہیں کہ موسیٰ کا حصول ایک خواب ہے، مگر حسنل اسے اپنی دعاؤں کا حصہ بنا لیتی ہے اور اسے پانے کے لیے نیک بن جاتی ہے۔ اس کی یہ کوشش اس کے نانا سے مخفی نہیں، مگر وہ اصل بات نہیں جانتے۔ موسیٰ نئی نئی ماڈلز کے ساتھ کام کرتا ہے، جس پر شہرزاد چراغ پا ہو جاتی ہے، مگر حقیقت کا ادراک کر کے موسیٰ سے دوبارہ دوستی کر لیتی ہے۔
محی الدین سہگل نے بدر کی تربیت کے لیے فلپ اینڈرسن کو رکھا تھا۔ وہ ایک ہوس ناک مرد تھا جس نے بدر کو لوٹ لیا۔ بدر لندن تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے، فلپ اس کے ساتھ ہے، مگر ایک حادثے میں فلپ ہلاک ہو جاتا ہے۔ فلپ کی موت بدر الدین کو توڑ دیتی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ سے برگشتہ ہو کر اسکارلٹ کی دوستی میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ جو بلا کی مے نوش ہے۔
کیلاش اسے تلاش کرنے میں اور وہ صحرا میں راستہ تلاش کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اب اس کی تلاش ملکی سطح پر ہو رہی ہے کیوں کہ وہ برطانوی شہریت رکھتا ہے۔
جیک کی دوست اس کی محبت میں گرفتار ہے اور خود بھی اس کی تلاش کا عزم رکھتی ہے۔ محی الدین سہگل اپنے پوتے سمیع الدین کے ساتھ کچھ بے باک لڑکیوں کو دیکھ کر خدشات کا اظہار کرتے ہیں، مگر سمیع ان کی تسلی کرا کے اپنی شادی کے سارے اختیارات انہیں سونپ دیتا ہے۔

چوتھی قسط

☆ ☆ ☆

سو دن پر محیط دوستانہ اختتام پذیر ہوا۔ رواداری اور برداشت بھی یہیں تک تھی۔ وہ گال پر ہاتھ جما کر تسلی سے سوچنے بیٹھ گئیں۔ بہو کی گزشتہ زندگی کیسی رہی ہوگی۔ خود پر اتنا افسوس ہوا کہ حد نہیں تھی۔ انہیں ایک بار بھی خیال نہ آیا اور اب یہ حال ہو گیا کہ خیالات کی یلغار سوتے میں بھی پیچھا نہ چھوڑتی۔ خواب تک ایسے ہی آتے۔ انہوں نے ماریہ کو سینے پر صلیب بناتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر خواب میں نظر آجاتا کبھی وہ چرچ کی بینچ پر سر جھکائے بیٹھی نظر آتی۔ کبھی لہو لعب میں ڈوبی۔ کبھی کسی گناہ عظیم میں مبتلا دکھائی دیتی۔۔۔ اور کبھی۔۔۔
کہاں تو وہ سر جھکا کر اپنے جوتوں پر نگاہ رکھ کر چلنے والی خاتون تھیں۔ جس نے کبھی دنیا کو چار اطراف میں نگاہ بھر کے نہیں دیکھا اور کہاں یہ ہو گیا کہ تخیل کی پرواز انہیں اتنا اونچا اڑانے لگی کہ جو جی چاہتا کسی ماہر فلم ساز کی طرح بنا کر گھنٹوں دیکھا کرتیں۔ کمی بیشی دور کرتیں۔ بس وہ سب، جو ماریہ کو گناہ گار ثابت کر دے۔
"وہ ایسی نہیں ہے امی۔"
"چپ کرو تم اسے جانتے ہی کتنا ہو۔ نہ جانے کیسے

جال ڈال کر تمہیں قابو میں کرلیا۔" بیٹا چپ کر گیا' ورنہ کہہ دیتا۔ قسمت سے بڑا شکاری کون ہو سکتا ہے۔
"میں اسے گھر سے تو نہیں نکال سکتا امی! نکاح سے بڑا عہد اور کوئی نہیں ہوتا اور اب تو..." اس نے نگاہیں قالین پر جمادیں۔ "وہ ماں بننے والی ہے۔"
خدیجہ بانو کو چھت اپنے اوپر گرنے کا یقین ہو گیا۔
"ماں..."
یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہ تھا اور صحیح ہے نا' وہ کہاں تھیں اتنی دور بین... اگر ہوتیں تو بات کو یہاں تک آنے ہی نہ دیتیں۔
وہ اس لمحے کو کوستیں۔ جب وہ جذبات کے دباؤ میں آگئی تھیں اور اب انہیں ساری زندگی اس لمحے کو کوسنا تھا۔ اپنی عقل کو لتاڑنا تھا۔ جب آنکھوں پر پٹی بندھ گئی اور یہ احساس زیاں دوچند ہو گیا۔ جب ان کی گود میں جڑواں پوتیاں آئیں۔ انہیں بیٹی ذات پر یا اکٹھی دو پر ذرا اعتراض نہ تھا۔ نرس نے جب دونوں بچیاں ان کی گود میں لا کر ڈالیں۔ تو ان کا چہرہ صحرا بن گیا' ایسا صحرا جس پہ سو برس پہلے بارش برسی ہو۔
وہ تڑخ گئیں۔ دونوں کو خود میں بھینچ کر ایسا روئیں کہ زندگی میں کبھی نہ روئی ہوں گی۔ اتنا دکھ... نرسیں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔
"بیٹی تو رحمت ہوتی ہے آنٹی!" ڈاکٹر کا ایسی جہالت سے روز کا واسطہ تھا۔
"آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں۔" شور کی آواز پر کچھ اور لوگ بھی آگئے۔
"یہ مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔" منے نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں خود کو بری الذمہ کر دیا۔
"کیا ہو گیا ہے آنٹی۔ ایسے نہیں کرتے اور آپ کے تو اکلوتے بیٹے کی پہلی اولاد ہے۔ آپ کا تو گھر بھر گیا ماشاء اللہ' فکر نہ کریں۔ اللہ پوتا بھی دے گا ان شاء اللہ۔"
ایک رقیق القلب نرس اسپتال میں تسلیاں دینے کا کام فی سبیل اللہ کرتی تھی۔
خدیجہ بانو نے پلکیں اٹھائیں' انہیں معلوم تھا بیٹی رحمت ہے اور منے کی پیدائش کے بعد انہیں بیٹی کی بڑی خواہش تھی' مگر بیٹی اور ماریہ کے بطن سے' اب وہ اصل بات کیسے بتاتیں۔
"اف... ان کی نظریں پوتیوں پر ٹک گئیں۔ بالکل ایک جیسی ان کا نقشہ ماں' باپ دونوں سے مشابہت رکھتا تھا۔ ہاں رنگت باپ سے لی تھی۔ کھلتی گندمی رنگت' ماریہ کے سامنے تو وہ دودھ سی سفید دکھائی دیتی تھیں۔
بظاہر دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مگر وہ جس باریک بینی سے جائزہ لے رہی تھیں۔ ایک کے بال سیدھے تھے۔ اور دوسری کے... دوسری والی کے گھنگریالے' تو دوسری والی کے بال خدیجہ بانو پر پڑے تھے۔ ان کے ڈوبتے دل کو تقویت پہنچی۔ وہ ان کی پوتیاں تھیں اور وہ انہیں خود پالیں گی اور ماریہ کا تو سایہ بھی نہ پڑنے دیں گی۔ مگر یہ عملاً" ناممکن تھا اور قولاً" بہت ظلم... ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔
"آپ کو کس بات کی فکر ہے امی... ایک ہی گھر ہے۔ شیر خوار بچی کو کیسے ماں سے الگ کر سکتے ہیں۔"
"میں چاہتی ہوں' ماریہ دودھ بھی نہ پلائے بچیوں کو..." انہوں نے بیٹے کے سر پر ہتھوڑا مارا۔
"جی... ؟ مگر کیوں..." وہ بدقت بولا۔
"دودھ کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے' میں نہیں چاہتی کہ..."
"اثر تو پھر خون کا اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں وجود ماریہ کے خون سے ہی سینچے ہیں اللہ نے..." ماؤں کو منہ توڑ جواب نہیں دینے چاہئیں۔ بڑا گناہ ہوتا ہے۔
خدیجہ بانو کے لب باہم پیوست ہو گئے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بیٹا اپنی کہہ کر کسی شکست خوردہ سالار کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔
"اور آپ یہ کیوں بھول گئی ہیں کہ تربیت' دودھ اور خون پر حاوی ہو جاتی ہے۔" اس نے طویل خاموشی کے بعد آہستہ سے کہا اور خدیجہ بانو کے پورے جسم

میں برقی رو دوڑ گئی۔ لو یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں۔ تو ٹھیک ہے، وہ اپنی پوتیوں کو اپنے حساب سے پالیں گی۔ اور کون ہے جو انہیں روکے گا۔ کیا ماریہ۔۔۔ جس نے بچیوں کے نام رکھتے وقت پہلی بار اختلاف کیا تھا۔ ورنہ خدیجہ بانو کی تمام باتوں پر اس نے ایک چپ سو سکھ کی پالیسی اپنا رکھی تھی۔

اور نام رکھنے کی چپقلش اتنی بڑھی کہ سارے گھر کا ماحول خراب ہو گیا۔ آخری حربے کے طور پر منے کو اپنی مرضی کرنا پڑی۔ اس نے ماں اور بیوی دونوں کے چنیدہ ناموں کو کلی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پسند کے نام نہ صرف رکھ دیے بلکہ برتھ سرٹیفکیٹ بھی بنوا لیا۔

دونوں کو چپ لگ گئی۔ مگر ہار نہ ماننے کا عہد بھی دونوں کر چکی تھیں۔ دونوں نے نک نیم رکھ دیے۔ ماریہ کی میری کو خدیجہ بانو میرو پکارتیں۔ بچیاں بڑی ہو گئیں۔

میری اور میرو کی گردان ہوتی رہی۔ بڑی والی کے ساتھ عجیب بات ہو گئی۔ باپ کا دیا نام بس سرکاری کاغذوں میں رہا۔

اسے اس کے لمبے گھنگھریالے بالوں کی وجہ سے کلاس ٹیچر نے میگی کا نام دے دیا۔ براؤن رنگ کے میگی نوڈلز۔۔۔

اس نام پر ساس، بہو بھی متفق ہو گئیں۔ لوگ اصل نام تو مانو بھول گئے۔

پوتوں کے دنیا میں آنے تک خدیجہ بانو کے احتجاج و ناپسندیدگی کی شدت میں کمی واقع ہو چکی تھی۔ بیٹے ماں اور دادی کی نسبت باپ سے زیادہ قریب تھے۔ شاید یہ باپ کی شعوری کوشش تھی۔ مگر اس نے ذکر کسی سے نہیں کیا۔

دوسرے خدیجہ بانو اور ماریہ نے سمجھ لیا تھا۔ دونوں کو زندگی بھر ریل کی پٹڑی کی طرح ساتھ ساتھ رہنا تھا۔ جو کبھی باہم نہیں ہوتیں۔ لازم و ملزوم تو ہوتی ہیں۔ نہ ہو تو زندگی کا سفر رک جائے۔۔۔ مگر۔۔۔

خدیجہ بانو نے بڑی مشکل سے دل کو ماریہ کی طرف مائل کیا تھا۔ مگر پھر جب دل متنفر ہو گیا اور محبت کی طرح نفرت کا بھی ایک پل ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت سے دیکھا جاتا تو ہوا کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔

یہی تو کہا تھا نا ماریہ نے کہ اسے بائبل زبانی یاد ہے۔ ایسے ہی جیسے آپ کو قرآن پاک۔

خدیجہ بانو آنکھوں پر لگی تعصب کی عینک اتار کر دیکھتیں۔ تو یہ کون سی انہونی بات تھی۔ کون سا جرم تھی۔

اور ماریہ خون کے آنسو روئی تھی۔

پھر اس نے صبر و تحمل اور بے نیازی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ زندگی میں بڑی مشکل ہی سے سہی سکون اتر آیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا سبق پڑھا دیا تھا۔

"تم وہاں خوش ہم یہاں ہم ایسے تو ہم ویسے۔"

خدیجہ بیگم کو لگتا تھا۔ اب زندگی سکون سے گزرے گی۔ مگر زندگی انسان کے قیافوں اندازوں سے بہت اوپر کی چیز ہوتی ہے۔

ماریہ کو بھی یہی لگتا تھا۔ مگر پھر ایک روز اس نے ڈیڈی کو دیکھ لیا۔

خدیجہ کے رشتے داروں میں سے کسی کی شادی میں مدعو تھیں ــــ بہو بھی ہمراہ تھی۔ پوتے، پوتیاں بھی۔ بیٹے نے آفس سے واپسی پر سیدھا ادھر ہی آنے کا کہہ دیا تھا۔

رونق بھرے ماحول میں خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ان کے منے کا ادھر آتے ہوئے بڑا خطرناک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ادھر بارات نکلنے کو تیار۔ خدیجہ بانو نے ہاتھ پیر چھوڑ دیے۔ ماریہ نے رونے دھونے کے بجائے ہوش مندی سے کام لیا۔ خود آگے بڑھ کر معاملے کو دیکھا۔ ساس کو ہمت دلائی اور اپنے ہونے کا یقین، ایکسیڈنٹ خطرناک تھا۔ آنے والے چوبیس گھنٹے اہم تھے۔ سات برس کی جڑواں پوتیاں دادی کے ساتھ بینچ پر بیٹھی تھیں۔ چھ برس والا بیٹا ماں کے ساتھ راہ داری میں ٹہل رہا تھا۔ ایک برس والا دادی کی

گود میں اونگھ رہا تھا۔

ڈاکٹر پرچیاں تھماتے اور ماریہ بھاگتی تھی۔ رات صبح میں ڈھل گئی۔ ماریہ کے پیر شل ہو گئے۔ بڑی مشکلوں سے بچوں کو کینٹین سے کھانا کھلایا۔ کسے فون کرتی، کسے بلاتی۔ جاننے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مگر ایک اکیلا پن اسے کاٹ رہا تھا۔ خدیجہ بانو رو رہی تھیں۔

دونوں کا غم مشترکہ تھا۔ ایک قدر مشترک محبت۔ انہیں اپنے بیٹے سے محبت تھی۔ بیٹے کو ماریہ سے محبت تھی اور ماریہ کو۔۔۔ ان تین راتوں میں انہوں نے ماریہ کی اپنے بیٹے سے محبت کی شدت دیکھ لی تھی۔ وہ جیسے پنجوں کے بل کھڑی تھی یا سولی پر ٹنگی تھی اور ابھی بھی اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ جب اس کے شوہر کو ہوش آگیا تھا اور خطرہ ٹل گیا تھا۔

بلکہ گزری رات میں ایک پل انہیں لگا۔ وہ جیسے بھوت دیکھ آئی ہو اور وہ اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ بتاؤ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے میرے منے کے بارے میں؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بتاؤ مجھے۔۔۔" انہوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اور وہ تسلیاں دینے میں ہلکان ہو گئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی! ان شا اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں، بالکل نہیں! اگر ایسا ہے تو تمہارا رنگ کیوں فق ہے۔ ایسی اُجڑی صورت کیوں ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے سارا لہو نچوڑ لیا ہے۔"

اور وہ نفی میں سر ہلاتی رہی۔ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو پیتی رہی۔ لب کچلتی رہی۔

خدیجہ بانو اپنے تئیں اس پر لعنت بھیج کر ڈاکٹر کے سر پر پہنچ گئیں اور پوری تشفی کے بعد لوٹیں۔

"ہاں انسان ہے نا تھک گئی ہو گی۔" اس کی حواس باختگی پر قائل ہو گئیں۔

"اب میں ٹھیک ہوں یار۔۔۔" ان کا بیٹا پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کا لہجہ بشاش تھا۔

"ہاں۔۔۔" اس کی آنکھوں میں فریاد سی ابھر کر معدوم ہو گئی۔ وہ جیسے کسی اذیت کا شکار تھی۔

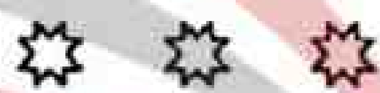
"ادھر آؤ۔" اس نے اپنا ڈرپ لگا ہاتھ بدقت اٹھایا اور اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ جیسے چھوئے جانے کی منتظر تھی۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھیں بہنے لگیں۔ خدیجہ بانو نے ایک پل کی حیرت کے بعد آنسوؤں کو خوشی کے آنسوؤں سے تشبیہ دے دی؟ خیر ہے۔ خوشی کے آنسو نہیں تھے۔ قطعاً نہیں تھے۔ یہ تو جیسے دل پھٹا تھا۔ باڑھ ٹوٹی تھی۔

"کیا ہوا؟" اور وہ اس کے منہ سے اسی سوال کی تو منتظر تھی۔ اس کے لب کھلے اس لفظ سے پہلے ہچکی نکلی۔ وہ ہاتھ لمبا کر کے اشارہ کر رہی تھی۔

"ساتھ والے وارڈ میں بچ ساتھ والے بچ بچ ڈیڈی ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

تو گزری رات اس کا اُڑا اُڑا رنگ، اٹکتی سانسیں اور حواس باختگی شوہر کے لیے نہیں تھی۔ خدیجہ بانو شاک سے بہت دیر میں ابھری تھیں۔ پہلا خیال یہی آیا۔



"ڈیڈی نے کہا تھا گھر مت آنا اور تم نے مان لیا۔ اتنی تو تم فرماں بردار تھیں ہی نہیں۔" فاریہ کے لہجے میں استہزا آمیز دکھ تھا۔

"میں نے سوچا اتنی بڑی نافرمانی کر چکی ہوں۔ اب کوئی بات تو مان لوں۔" اس کی نظروں کی طرح آواز بھی شرمندہ تھی۔

"تم پچھتا رہی ہو ماریہ!" فاریہ پر جیسے شادی مرگ طاری ہو گئی۔ وہ ایک قدم آگے سرک آئی اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ماریہ کا جھکا سر تیزی سے اٹھا۔

"نہیں۔۔۔" ماریہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ پچھتاوا کس بات کا۔۔۔"

اور فاریہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے اس کے آنسوؤں کو سخت تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ "تو پھر یہ کیوں بھلا؟"

"تم نے ایک مرد کی محبت میں دین بدل لیا۔ کیا تھیں اور کیا ہو گئیں۔ غلط سے صحیح ہوئیں یا صحیح سے غلط۔۔۔ بحث یہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے ایک انسان کو پانے کے لیے، راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو عبور کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر وہ رشتے ہوں۔ محبتیں ہوں یا مذہب۔۔۔"

"ہاں!" اس نے فاریہ کے لہجے کی تیزی کو صبر سے سنا تھا۔ "ایک انسان کی محبت نے مذہب تبدیل کروادیا۔ پھر مذہب نے مجھے بدل دیا۔ میں اب وہ ماریہ نہیں رہی۔"

"بتانے کی ضرورت نہیں۔ صاف دکھائی دیتا ہے۔" فاریہ کے لہجے میں تلخی آگئی، جسے اس نے چھپانے کی ضرورت نہ سمجھی۔

ماریہ نے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا کر دروازے کے اس حصے میں گاڑ دیں جہاں لکڑی کی جگہ شیشہ لگا تھا اور شیشے کے اس پار ڈیڈی پڑے تھے۔ اور وہ ان کا سامنا کر پائے گی؟ اس نے ڈیڈی کی بے پناہ محبت کو چھوڑا تھا۔ محبتوں کو چھوڑنے والے نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہتے۔ اس نے تو پھر محبتوں پر محبت کو ترجیح دینے جیسا جرم کیا تھا۔

ڈیڈی کہتے تھے اس نے پھولوں کی ٹوکری کو چھوڑ کر صرف ایک پھول پر اکتفا کیا تھا اور ٹوکری پھولوں کی ہو یا۔۔۔ سر پر اٹھانی پڑتی ہے، بوجھ کی طرح کندھے شل بھی ہو جاتے ہیں جبکہ ایک پھول بالوں میں لگایا جا سکتا ہے۔ کالر پر ٹکایا جاتا ہے۔ ایک پھول کتاب میں رکھ کر "یاد" بھی تو منائی جاتی ہے۔

مگر یہ سب وہ ڈیڈی سے کہہ دیتی تو وہ کتنا دکھی ہوتے۔ اس سے بھی زیادہ جتنا وہ اسے سامنے دیکھ کر ہو رہے تھے۔ دکھ "مائع" میں تبدیل ہو کر کنپٹیوں سے بہتا تکیے میں جذب ہو رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ڈیڈی کی حالت کے لیے بہ حیثیت بیٹی کے سارے جذبات تھے۔ مگر وہ جو ایک قطعیت تھی۔ ثابت قدمی، وہ آٹھ برس پرانی۔

کمرے میں گیس بھر گئی۔ ڈیڈی کی نظر دھندلانے لگی۔ ماریہ کا چہرہ بھی دھواں بن گیا۔ وہ بھی ٹھوس رہنا چاہتے تھے۔ مگر فالج کے اس اٹیک نے ان کا خود پر سے کنٹرول چھین لیا تھا۔ ماریہ نے ان کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ بے آواز بوسے لیتی تھی۔ بیٹی تھی نا، جگر کا ٹکڑا، وجود کا حصہ۔

مگر رشتہ تو نہیں بدلتا۔ راستے بدل بھی جائیں تو۔۔۔

"تمہارے بچے بہت پیارے ہیں۔" فاریہ نے کہا۔ ڈیڈی کی آنکھوں میں تائید ابھری۔ ماریہ نے پھیکی مسکراہٹ سے اپنے دائیں بائیں کھڑی میری اور میگی، سامنے کھڑے۔ احد اور گود والے موحد۔۔۔ کو دیکھا۔ اس کا کیا کمال اللہ نے بنائے تھے۔

"ڈیڈی نے بتایا تھا۔ تمہاری بیٹیاں بہت گوری ہیں۔ یہ تو بہت سے بھی زیادہ گوری ہیں۔" ماریہ نے حیران کھڑی بچیوں کو دیکھا۔ وہ کھلتے گندمی رنگ کی مالک تھیں۔ مگر ماں کے آگے دودھ ملائی ہی دکھتی تھیں۔

"ہاں اپنے پاپا اور دادی پر گئی ہیں۔" اس نے دھیرے سے تسلیم کیا۔ ساتھ ہی بری طرح چونکی تھی۔ ڈیڈی نے بتایا تھا۔ فاریہ نے یہی کہا تھا نا ابھی، ڈیڈی نے کیسے بتایا انہوں نے کب دیکھی تھیں اس کی بیٹیاں؟

"ڈیڈی نے تو یہ بھی بتایا کہ سیدھے بالوں والی بالکل تمہاری طرح فرسٹ فنگر پکڑ کر چلنے کے بجائے سب سے چھوٹی والی فنگر پکڑ کر چلتی ہے۔" ممی نے آہستہ سے کہا۔ اس نے چونک کر ڈیڈی کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے مسکراہٹ چمکی تھی۔ جیسے تائید کرتے ہوں۔

"تو یعنی۔۔۔"

"وہ چاہ کے بھی تمہیں بھول نہ سکے۔ تم سے نفرت نہ کر سکے۔ تم ایسا زخم بن گئیں ماریہ۔۔۔ جسے ہم نے

اپنے ہاتھوں سے ہر بار نوچا۔ جب جب بھرتا محسوس کیا۔ "ممی کے لہجے میں اپنے لیے استہزا تھا۔

"یہ تم تھیں ماریہ! جس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔"

فاریہ کے لہجے میں ٹوٹے کانچ سی آواز تھی۔ "ڈیڈی نے اپنی قسم بہت جلد توڑ دی تھی۔ اتنی جلدی کہ اتنی سی دیر میں تو ہاتھ سے چھوٹا گلاس زمین پر نہیں گرتا۔"

"آواز کا سفر نہیں ہوتا۔ روشنی کا بھی نہیں۔"

ماریہ کے ہر موئے بدن سے پسینہ بہہ نکلا۔

ڈیڈی مسجد تک چھوڑنے آئے تھے۔ اسے کھلی چھوٹ دی تھی۔ وہ گھر سے جو بھی لے جانا چاہے، لے جاسکتی ہے۔ سب حیران تھے۔ ڈیڈی کا دماغی توازن درست تھا نا۔۔۔ مسجد تک جانے کی کیا تک تھی، یا یہ بھی خود اذیتی کی ایک شکل تھی، یا ایک امید، وہ شاید آخری منٹ میں ان کی صورت پر ترس کھالیتی۔ پلٹ جاتی۔

وہ پہلے ہی طے کرچکے تھے۔ وہ آج کے بعد دوبارہ بھی اس کی صورت نہیں دیکھیں گے۔ اپنے گھر کے دروازے اس پر بند کردیں گے۔ (دل کے تو ہوئے نہیں تھے انسان اور اس کے ارادے۔۔۔ محض لفاظی۔۔۔ ہنہ۔۔۔)

عہد اتنی جلدی ٹوٹا۔ جیسے آواز کا سفر۔۔۔ روشنی کا سفر۔۔۔ آہ۔۔۔ آہ۔۔۔

ماریہ کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔ وہ سننا چاہتی تھی۔ کوئی بولتا رہے، کانوں میں رس گھلتا تھا۔ فاریہ خاموش ہوتی تو۔۔۔

"مجھے پہلے ہی مرحلے پر زبردستی اسے باز رکھنا چاہیے تھا۔ بچے تو غلطیاں کرتے ہی ہیں، یہ بڑوں کا کام ہے کہ وہ انہیں درست راستہ دکھائیں۔ اور دیکھو سارہ، فاریہ! میں کتنا بڑا بے وقوف ہوں، بلکہ ہم سب۔۔۔ اس نے لڑکا پسند کرلیا۔ وہ غیر مذہب سے ہے۔ ہم نے ان دو باتوں کے آگے کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ وہ کون لوگ ہیں۔ لڑکا کرتا کیا ہے۔ وہ برے لوگ بھی تو ہوسکتے ہیں نا۔ جو لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر لے جاتے ہیں اور آگے بیچ دیتے ہیں یا غلط راستوں پر چلاتے ہیں۔ مجھے چیک تو کرنا چاہیے تھا۔ میں یہاں اس سے خفا ہوں کہ اس نے من مانی کی اور گناہ کیا اور وہ ادھر کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ میں جارہا ہوں فاریہ۔"

اور پھر ڈیڈی نے تحقیقات شروع کیں۔ "وہ عورت کون تھی اور کیسی تھی اور اس کا بیٹا۔۔۔ ان کا گھر کہاں ہے۔ میں تو یہ تک نہیں جانتا۔" وہ کفِ افسوس مل رہے تھے۔

اور پھر وہ چپکے سے دروازے کے باہر گاڑی کھڑی کرکے سر پر کیپ جھکا کر بیٹھ گئے۔

ساری رپورٹیں بہت اچھی تھیں۔ پھر انہوں نے گھر کے گیٹ سے گاڑی نکلتے دیکھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہ بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر خدیجہ بانو۔۔۔ اور سب سے آخر میں بھاگ کر آتی فرنٹ سیٹ پر بیٹھتی ماریہ۔۔۔

اور اس کی ہنسی اتنی کھنک دار تو پہلے کبھی نہیں تھی اور نہ اس کی آنکھوں میں ستارے کوٹ کر بھرے جانے کا احساس ہوتا تھا۔

اور وہ کسی احساس جرم میں مبتلا نہیں لگتی تھی اور نہ احساس زیاں کا شکار تھی۔

ڈیڈی اتنے ہلکے پھلکے ہوگئے کہ زمین سے اوپر اٹھ گئے۔ پھر اتنے بوجھل ہوگئے جیسے پانی پر لاش تیرتی ہے۔ اور اسے دیکھ کے آنے کا یہ بہانا بھی گیا۔ اب اور کیا بہانہ بنائیں۔ انہوں نے خود کو ہزار بار سرزنش کی۔ وہ کبھی نہیں جائیں گے۔ خود سے عہد باندھا۔

وہ ماں بننے والی تھی۔ ڈیڈی نے اس کے بے ڈھنگے سراپے کو دیکھا، پھر قصداً" نگاہ چرالی اور پھر جڑواں بیٹیاں۔۔۔

بیٹیاں اور وہ بھی دو، کہیں یہ جرم نہ بن جائے۔

انہوں نے سینے پر کراس بنایا اور بہت سی دعائیں کر ڈالیں۔

اور پھر سال بعد ہی اس کی گود میں بیٹا تھا۔ یعنی ڈیڈی کی دعا قبول ہوئی۔ گرینڈ مام بہت کم گو تھیں۔ مگر

ڈیڈی کو اس دیوانگی پر ٹوکتی تھیں۔ اور پھر خداوند کے حضور جھک جاتیں۔ وہ ان کے بیٹے کو صبر دے۔
یہ بے قراری ہی تو باعث فساد تھی۔ بی پی ہائی رہتا۔ دل تیز تیز دھڑکتا اور اب فالج کا اٹیک ہو گیا۔
"بے صبری' بے چینی کو جنم دیتی ہے۔ تشکر سے دور کردیتی ہے۔ جلد باز بنا دیتی ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لیتی ہے۔ غلط فیصلے کرواتی ہے۔ صحیح غلط کی تمیز نہیں رہتی' بے صبری فتنہ ہے۔ انتشار ہے۔ بے صبر کو قرار نہیں آتا۔"
اور صبر وصف یعقوب ہے۔ فکر یعقوب ہے۔ اور صبر ہی کا صلہ ملتا ہے۔
صبر جمیل ہے۔ صبر وکیل ہے۔ صبر دلیل ہے۔
صبر توکل ہوتا ہے۔
صبر تشکر ہوتا ہے۔
اور سب سے اہم بات صابر اللہ کی نظر میں ہوتا

☆ ☆ ☆

امتحان کا زمانہ نزدیک آیا تو لائبریری میں کتابوں کا کال پڑ گیا۔ فوٹو اسٹیٹ شاپ پر انتظار میں کھڑی لڑکیاں ادھ موئی ہو جاتیں۔
ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ اسلام اور سوشیالوجی کی کتابیں اور دیگر بہت سی گھر کے لیے دینی بند کردی گئیں۔ صبح آکر ایشو کروائیں' بارہ بجے تک نوٹس بنائیں اور واپس جمع کروادیں۔
"یہ زیادتی ہے۔" ماہ رو نے دہائی دی۔ "میں جتنی بھی جلدی پہنچوں' بک ایشو ہو چکی ہوتی ہے۔" وہ لائبریرین مس شمیمہ نقوی کے آگے باقاعدہ رو پڑی۔ "میں نے سوچ لیا ہے۔ آج گھر ہی نہ جاؤں گی۔ رات ادھر لائبریری ہی میں گزاروں گی۔ تاکہ صبح قطار میں سب سے آگے کھڑی ہوں۔" اس کا اعلان سب نے سنا۔
مس شمیمہ کا مہربان چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔ پھر وہ مسکرادیں۔
"کر سکتی ہیں تو ضرور کریں۔" وہ رات ٹھہر جانے والے آئیڈیے پر راضی ہو گئیں۔ مگر دوست۔۔۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
دوست سرے سے تھے ہی نہیں
واہ۔۔۔ مصرع بدل گیا۔ اصول یہ تھا جہاں ماہ رو پٹڑی سے اترے تینوں اپنی راہ پکڑلیتی تھیں۔ حلیمہ نے اللہ جانے کون سی موٹی کتاب چہرے سے اتنی قریب کرلی کہ ناک اور ماتھے سے ٹکرانے لگی۔ اریبہ نے اشتہارات کا صفحہ کھول لیا۔ واہ ریما' شان کی فلموں کے اشتہار اور حسنل کھڑکی کے پٹ پر ہاتھ جما کر چغتائی کا آرٹ بن گئی ہے۔ نہیں ہے۔
"ویسے پوچھ سکتی ہوں آج فہمیدہ مسعود کی عمرانیات کس نے ایشو کروائی ہے۔ دراصل مجھے بس چند صفحات میچ کرنے ہیں۔" اس نے التجائی انداز میں' مس سے پوچھا۔ عام طور پر مس ایسے جوابات کی پابند نہیں تھیں مگر۔۔۔ آج چوتھا دن تھا۔ وہ لاکھ بھاگتی آتی قطار میں نمبر دسواں بارھواں ہی ہوتا۔
"پانچ لڑکیوں نے لی ہے' اب میں نام تو نہیں بتاسکتی۔ مگر۔۔۔" انہوں نے نظر اٹھائی۔ "ایک تو یہ سامنے کھڑی ہیں حسن المآب منان۔۔۔ آپ نے یہی بک لی ہے نا بی بی؟"
"آں ہاں۔۔۔" چغتائی کے شاہکار میں جان پڑ گئی۔ مئودب ہو کر سامنے آگئی۔ "جی میم۔۔۔!" اس نے بغل میں دبی فیروزی جلد والی کتاب نکال کر پیش کردی۔
"حسن المآب کی بچی!" ماہ رو نے دانت کچکچائے۔
"آپ اگر انہیں دے سکیں تو۔۔۔ ساتھ مل کر کام کرلیں' آپ لوگ تو کلاس فیلوز بھی ہیں نا؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔
حسن المآب نے بہت تمیز و تابعداری سے پھر سر ہلایا۔ مس شمیمہ نے ماہ رو کو دیکھا۔ "اب تو مسئلہ حل ہو گیا نا۔"
"جی میم۔۔۔!" ماہ رو کی نظریں دھیرے دھیرے سرکتی حلیمہ اور اریبہ پر تھیں۔ گویا یہ تینوں اسے بے وقوف بنا رہی تھیں۔ جانی پہچانی شکل ہے۔ دیکھا ہوگا کبھی

کلاس میں۔" وہ سرہلا ہلا کر کہہ رہی تھی۔
"اوکے میم۔" حسنل خمیدہ ہوئی ماہ رو کو دیکھا۔
"آپ آجایئے گا کیا نام بتایا' سوری۔" اسے ماہ رو کا نام بھی بھول گیا تھا۔
"میں نے ابھی آپ کو نام بتایا ہی نہیں حسن المآب منان!" دونوں ساتھ ساتھ نکلنے لگیں۔
"اچھا۔" حسنل نے تجاہل برتا۔ "مجھے لگا آپ نے بتایا ہے۔ ماہ رو فیاض۔" وہ مروت کی پتلی بنی ہوئی تھی۔
لائبریری کی حدود ختم ہوگئی تھی۔ دونوں سیڑھیوں پر آچکی تھیں۔
"ابھی میں نے صرف نام ہی بتایا ہے۔ کام آپ نے دیکھے نہیں۔"
"تیری تو۔ ماہ رو نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ ساتھ ساتھ بولتی جارہی تھی۔" صرف نام تعارف نہیں ہوتا میری جان۔ وہ کروں گی تمہارے ساتھ کہ زندگی بھر نہیں بھولوگی' ایک ہوتی تھی ماہ رو۔" گدگدیوں کو سہہ سہہ کر بے دم ہوتی حسنل کو وہیں چھوڑا اور کتاب لے کر بھاگ گئی۔

☆ ☆ ☆

"ہم نے کوشش کی تھی ماہ رو! تمہیں بتانے کی۔ کہ ہم نے ٹکس ایشو کروالی ہیں۔ مگر تم نے تو آتے ہی رولا ڈال دیا۔" حلیمہ نے کہا۔
"ہوم۔" حسنل کا قلم چل رہا تھا۔ سر اٹھائے بغیر تائید کی۔ وہ پوری تندہی سے تین کتابیں کھولے نوٹس بنارہی تھی۔
اریبہ پڑھ پڑھ کر انڈر لائن کرتی تھی۔ حسنل اتارتی جاتی تھی۔ اس کا قلم بہت رواں تھا۔ ماہ رو نے ناراضی کے اظہار کے لیے کچھ بھی کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ وہ سب نوٹس تیار کریں گی اور وہ ان سے لے گی۔
حلیمہ عبدالرحمٰن الداخل سے اندلس فتح کروانے کے چکر میں ہلکان ہوگئی تھی۔
"اتنی مشکل تو عبدالرحمٰن کو اندلس فتح کرنے میں نہیں ہوئی ہوگی' جتنی مجھے نوٹس بنانے میں ہوتی ہے۔" اس کی آواز تکان زدہ تھی۔
"ہاں مجھے بھی۔" ماہ رو نے اپنا سر اس کے کندھے پر ڈال دیا۔ "میں تمہیں دیکھ دیکھ کر تھک گئی۔"
"ہٹو پیچھے۔" حلیمہ جھٹکے سے دور ہوئی۔ "اپنا نو من کا تربوز مجھ پر ڈال دیا۔" اس نے کندھا دبانا شروع کردیا۔
"تو من۔" ماہ رو کی احتجاجی پکار پر آتی جاتی لڑکیاں بھی متوجہ ہوگئیں۔ "لوگ تو مجھے من موہنی کہتے ہیں۔ من موجی کہتے ہیں۔ من مست۔"
"تم نے غور نہیں کیا۔ ان میں کچھ من ہی من میں گالیاں بھی دیتے ہوں گے۔" اریبہ نے دانت کچکچائے۔
اور حسنل۔ اس نے اریبہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور ہنسی یوں پھوٹی جیسے شگوفہ ہو شاید۔
"مگران کا پھر بھی یہ حال ہے۔ گالیاں کھاکے بھی بے مزانہ ہوئے۔" اس نے ہنسی سے بوجھل آواز میں کہا تھا اور مصنوعی ناراضی سے منہ پھلاکر تینوں کو گھورتی ماہ رو چونکی تھی۔ حسنل اپنے جملے کے اختتام پر اپنی ہی بات کا مزا لیتے ہوئے دوبارہ ہنسنے لگی تھی۔
تینوں کے لیے حسن المآب کا رویہ حیران کن تھا۔ مگر اتنی خوش مزاجی و بذلہ سنجی کا مظاہرہ تو اس نے کبھی عام حالات میں بھی نہیں کیا تھا۔ کجا کہ وہ خاص حالات جو پچھلے دنوں لاحق ہوگئے تھے۔ ابھی زیادہ دن تو نہیں گزرے تھے جب وہ پھپک پھپک کر روتی تھی اور قفس میں پڑی مینا کی طرح مردنی سے گردن ڈالے پڑی رہتی تھی۔
اس کی سرد آہوں سے اعصاب ٹھٹھرتے تھے۔ کیسا پاگل پن تھا۔ کیسی بے وقوفی تھی۔ کیسی خواہش تھی اور کیسا رونا پیٹنا تھا اور وہ تینوں کتنی

فکر مند ہو گئی تھیں۔ اٹھارہ 'انیس برس کی عمر میں اتنا تجربہ نہیں تھا'نہ زمانہ شناسی کا دعوا تھا۔ مگر عقل رکھتی تھیں۔ اس سے ایسی بے عقلی کی امید نہیں تھی۔
اپنے تئیں اپنے اپنے انداز سے سمجھانے بجھانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔
حلیمہ جب بحث لاحاصل سے اوب جاتی۔ تب وہ کہتی اے اللہ اس کم فہم کو ہدایت دے۔
تو کیا اللہ نے اس کی دعا قبول فرمائی تھی۔
"تو کیا حسن المآب تائب ہو گئی تھی؟"
ماہ رو کی آنکھوں میں اترا سوال حلیمہ نے پڑھ لیا۔

مگر جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔
"پھر بھی میرا دل نہیں مانتا۔ بڑی چیز ہے جس کا نام ہے حسن المآب..." ماہ رو کا چہرہ بے پناہ سنجیدہ ہو گیا۔
"کیا ہوا 'تمہاری بولتی کیوں بند ہو گئی؟" حسنل کا کام ختم ہو گیا تھا۔
"نہیں کچھ نہیں۔ میری بولتی کیوں بند ہونے لگی۔"
"نہیں 'کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔"
حسنل اپنی انگلیاں دبا رہی تھی۔
"ہاں۔" ماہ رو نے معنی خیزی سے حلیمہ کو دیکھا۔
"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔"
"آو کینٹین سے کچھ کھانے پینے کو لے آئیں۔"
اریبہ کپڑے جھاڑتی کھڑی ہو گئی۔ اریبہ نے ہاتھ بڑھایا کہ ماہ رو ہاتھ پکڑ کر اٹھ جائے۔ کیونکہ ماہ رو کا اپنے بارے میں فرمان عظیم تھا۔
"وہ کینٹین کے شدید رش میں اسی طرح جگہ بنانا جانتی ہے۔ جیسے مزدا میں کنڈیکٹر... ہی ہی ہی... کیسا بھی رش ہو 'ماہ رو کا نمبر سب سے پہلا..."
"ہم لائن میں کھڑے نہیں ہوتے۔ بلکہ جہاں ہم کھڑے ہوتے ہیں 'لائن وہاں سے شروع ہوتی ہے۔"
یہ شہرہ آفاق جملہ بھی ماہ رو کے علاوہ اور کون کہہ سکتا تھا۔ مگر اس وقت ماہ رو نے اریبہ کے بڑھے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔
"تم جاؤ 'میں یہیں ہوں۔" اس کے لہجے میں کچھ تھا۔ اریبہ نے چونک کر دیکھا۔ "تم جاؤ اس کے ساتھ حلیمہ..." ماہ رو نے حلیمہ کو بھی منظر سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔
"ایسے کیوں گھور رہی ہو۔" حسنل نے آنکھیں سکیڑ کر ماہ رو کو دیکھا۔
"ادھر میری بات سنو۔" ماہ رو کے لہجے میں سرسراہٹ سی آگئی۔
حسنل نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ پھر اس نے کسی مجرم کی طرح نگاہیں چرائی تھیں۔ ماہ رو کے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔

☆ ☆ ☆

"میں نے استخارہ بھی کر دیا۔" اس کا لہجہ اتنا پرسکون تھا جیسے دسمبر کی چاندنی رات... مگر اس سکون میں بعض دفعہ ایک ہولناک سی پراسراریت دبی ہوتی ہے۔
"ہر روز میری امید بڑھتی جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے بس دو کام ہی رہ گئے ہیں پیچھے۔"
"حسنل... تم اتنا آگے چلی گئیں۔ ہمارے سمجھانے بجھانے کا یہ اثر ہوا؟"
ماہ رو کے الفاظ دغا دے گئے اور ایسا بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ اسے لاجواب کرنا آسان نہیں تھا 'مگر... حسنل... اور اس کے کان... اس کے ارادے 'وہ جو وہ کرنا چاہتی تھی اور وہ سب جو وہ کر چکی تھی۔
"حلیمہ نے کہا تھا وظیفے کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ کمزور اعصاب کے لوگوں کا دماغ الٹ جایا کرتا ہے۔" ماہ رو کے اندر خیالات کی یلغار تھی۔ اس کا ذہن بیک وقت بہت کچھ سوچ رہا تھا۔
"حلیمہ نے یہ نہیں بتایا۔ میں کتنے مضبوط اعصاب کی مالک ہوں۔" وہ مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔
"بلکہ حلیمہ کی گواہی کی کیا ضرورت ہے۔ تم بھی تو جانتی ہو نا؟"

"تم اتنے دن سے اتنا سب کر رہی ہو اور ظاہر یوں کرتی ہو جیسے کچھ ہوا نہیں' ہمیں لگا تم۔۔۔"

"راہ راست پر آچکی ہوں۔ ہے نا؟" اس نے اس کی بات اچک لی۔ وہ یوں مسکرائی تھی جیسے کسی معصوم بچے کو بہلا رہی ہو۔ حالانکہ ماہ رو معصوم بچہ کبھی بھی نہیں تھی۔ اس نے بہت بچپن میں چہروں کی تحریریں پڑھنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔

وہ ٹیلی پیتھی جاننے کی دعوے دار تو نہیں تھی۔ مگر دلوں میں جھانک لیا کرتی تھی۔ مگر حسنل اس کے سارے اندازوں' قیافوں اور علم پر جیسے پاؤں رکھ کر آگے بڑھ چکی تھی۔ اتنی آگے کہ واپسی کی کوئی راہ نہ بچی۔

اور ماہ رو کے ہکابکا تاثرات کو بالکل نظرانداز کیے۔

حسنل کسی اور ہی جہان میں پہنچی ہوئی تھی۔

اور کتنی خاموشی سے اس نے یہ سفر طے کرلیا تھا۔

اس کے لبوں پر الوہی مسکان تھی اور آنکھوں میں جہان آباد تھا اور وہ اسی جہان میں پہنچی ہوئی تھی' اتنی مگن اور ایسی مست۔

"پتا ہے وہ ہر روز میرے خوابوں میں آجاتا ہے اور وہ ایسے خواب ہوتے ہیں کہ انسان قیامت تک بیدار نہ ہونا چاہے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو حسنل۔۔۔ تم کو واقعی بے دار نہیں ہونا چاہیے' مرجاؤ۔" غصے کی شدید لہر نے اسے پھونک دیا تھا۔ اس کی زبان سے گویا لپٹیں نکلیں۔ مگر یہ کیا حسنل کھلکھلا کر ہنس دی۔

"سچ کہتی ہو مر ہی نہ جاؤں کہیں۔" اس نے اپنی بانہیں ماہ رو کے گرد حمائل کردیں۔ پل بھر کو ساکت و جامد رہنے کے بعد ماہ رو نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کی بانہوں کا حلقہ توڑ دیا۔ حسنل بہ مشکل پیٹھ کے بل گرنے سے بچی' مگر اس نے برا نہ مانا۔ مسکراہٹ ہنوز برقرار تھی۔

"تم ایک انسان کو مانگنے کے لیے اس حد تک چلی جاؤ گی' میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

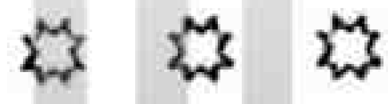
"اس حد۔۔۔ میں اس حد تک بھی جاچکی ہوں میری پارو۔۔۔ اور یہ تو ایک انسان ہے میری آنے والی پوری زندگی کالائحہ عمل۔۔۔ ایک تغیر جو میں ہمیشہ سے چاہتی تھی۔ تمہیں پتا ہے اللہ کہتا ہے۔ نمک کا ذرہ تک چاہیے تو مجھ سے مانگو۔ مانگنا شرط ہے۔ کیا مانگنا ہے شرط نہیں۔"

حسنل جیسے کسی بچے کو سمجھا رہی تھی۔ ماہ رو کے کندھے اور سر جھک گیا اور بہت دیر گزر گئی۔

"میں تم سے زیادہ دین کو نہیں جانتی۔ یا پھر یہ کہ میری معلومات ناقص ہیں۔ یا یہ کہ میں انہیں تمہاری طرح اتنے وثوق سے استعمال کرنا نہیں جانتی۔ مگر حسنل۔۔۔ ایسے منہ پھاڑ کر تو نہیں مانگا جاتا۔ تم نے تو دینے والے کے مقام کا بھی خیال نہ رکھا۔"

ماہ رو کی آواز و انداز ایسا مدھم کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اس نے بہت سال پہلے سیکھ لیا تھا۔ معلومات کم

ہوں تو علمیت کے اظہار سے پرہیز برتنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ ذکر اللہ کا ہو تو محتاط رہنا شرط ہے۔
وہ... وہ کہ جسے کہنے کے لیے کہنے کا منہ ہونا چاہیے۔
بھانڈ کا قہقہہ اور عالم کا تبسم... پلڑا کس کا بھاری ہے؟ یہ تو سوچنے سمجھنے کی بات ہے نا۔ تو ماہ رو کو لگا تھا اسے اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔
"خیال نہیں کیا' میں نے..." حسنل نے بھرپور مسکراہٹ سے انگشت شہادت اپنے سینے پر رکھی۔
"میں نے تو اتنا خیال کیا ہے ماہ رو کہ... وہ مانگ رہی ہوں جو ایک دنیا کو لگتا ہے۔ کبھی نہیں مل سکتا۔ مجھ سے زیادہ اس کی شان کے اس کے دین کو اور کوئی جاننے والا میری نگاہ میں فی الوقت تو کہیں نہیں' میرا یقین وہاں سے شروع ہو رہا ہے۔ جہاں سے تم سب کا ختم ہوتا ہے۔"
"اس سب کے باوجود پھر بھی وہ تمہیں نہ ملا تو..."
"آہ..." حسنل کے چہرے کا رنگ اڑا۔ بالکل ویسے جو رنگ کاٹ ست رنگی چنری کے ساتھ کر دیتا ہے۔ "نہیں۔" اس کے چہرے کی نسبت آواز صاف تھی۔ "ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ دعا کی قبولیت کی پہلی شرط یقین ہے۔"
"ہاں... مگر دعا کے لیے ہزاروں شرائط اس کے علاوہ بھی ہیں۔ چنے کے کھیت میں انگور کے خوشے نہیں لگتے۔"
ماہ رو اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ قائل وہ ان تینوں سے زیادہ تھی۔ جواب دینے آتے تھے۔
"اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔" اس کا انداز شکست خوردہ کم اور فکر مند زیادہ تھا۔
جبکہ حسنل... اس نے کتابیں سمیٹنی شروع کردیں' مگر اس سے پہلے وہ صدق دل سے آمین کہہ چکی تھی۔ اس کے لہجے کی شوخی۔ آنکھوں سے بھی عیاں تھی۔
"کاش میں کسی سے اس سارے معاملے پر گفتگو کر سکتی۔" ماہ رو کو شدت سے احساس ہو رہا تھا۔



آب احمر سے بھرا گلاس موسیٰ کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے دو گھونٹ بھرے اور کتنی دیر گزر گئی' مگر گلاس چھوڑا ابھی نہیں... یا وہ دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ فراموش کر گیا۔
اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتی شہرزاد نے پہلو بدلا۔
"کہاں کھو گئے موسیٰ...؟" اس نے بہت نرمی' مگر حق سے اس کا بازو چھوا۔
"ہاں... ہاں کہیں نہیں۔" وہ بری طرح چونکا۔ شہر زاد کو دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھ کے گلاس کو... پھر اس نے اکتاہٹ آمیز انداز میں گلاس رکھ دیا۔
شہرزاد کی نظریں سوالیہ ہو گئیں۔ وہ دو گھونٹ لینے والا آدمی نہیں تھا تو پھر آج کیوں... وہ اپنے گلاس کو دیکھنے لگی۔ تو کیا وہ بھی چھوڑ دے اور پھر اس نے بھی چھوڑ دیا اور اسے مسکرا کر دیکھا۔
وہ وہی سب کرتی تھی جو موسیٰ کرتا تھا۔ وہ وہی سب کرے گی جو موسیٰ چاہے گا۔ مگر مسئلہ یہ تھا موسیٰ بتاتا کچھ نہیں تھا۔ نہ ماضی' نہ حال... نہ مستقبل' پہلے وہ بے قرار رہتی۔ پھر ایک روز اس نے سوچا... ماضی تو گزر چکا اور مستقبل غیر یقینی ہوتا ہے۔
"تو شہرزاد عیسائی تم حال میں کیوں نہیں جیتیں۔"
"احمق نہ ہو تو... حال کی خوب صورتی یہ تھی کہ موسیٰ اس کے ساتھ تھا۔ کل کے اندیشوں میں وہ آج کو کیوں خراب کرے۔ آج' بلکہ ابھی' یہی وقت لے لو۔ کتنا خوب صورت وقت تھا۔
وہ موسیٰ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر مدھم میوزک سنتی اس پارٹی میں آئی۔ برتھ ڈے پارٹی! جو کیک منہ پر ملنے کے بعد ڈانس پارٹی میں بدل گئی اور اب کمرہ کسی مے خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔
سگریٹ کا دھواں... دل فریب پرفیومز کی

خوشبوئیں۔ قہقہے اور گلاس ٹکرانے کی آوازیں۔۔۔ جن میں کبھی کبھار میوزک دب جاتا۔ شہرزاد دونوں ہاتھوں میں پیسٹری پکڑے موسیٰ کی سمت بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں ______ شرارت تھی۔ مگر ساتھ ہی ایک خوف۔۔۔ وہ اسے اجازت دے گا۔ کیونکہ اس نے سب کو سختی۔۔۔ سے خود سے دور رہنے کا کہا تھا اور اس کا لیا دیا قطعیت سے بھرپور انداز' مقابل کو باز آجانے کی تلقین کرتا تھا۔ شہرزاد اسی کو نوٹ کر رہی تھی۔ بلکہ جب کچھ نوعمر شریر لڑکیاں موسیٰ کے منہ پر کیک لگانے پر بضد رہیں۔ تب شہرزاد کو اپنے وجود میں چیونٹیاں چلتی محسوس ہونے لگیں۔

وہ اتنی کم عمر شریر لڑکیاں تھیں کہ ان کے آگے شہرزاد کو اپنا سن پیدائش یاد آتا تھا۔ مگر موسیٰ نے ان کو بھی دور رہنے کا کہہ دیا۔ شہرزاد کے دل کو سکون محسوس ہوا۔

لڑکیاں مایوس ہو کر پیچھے ہوئیں۔ وہ خفگی سے موسی کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں برا لگا تھا۔ وہ سنگر تھا۔ تو وہ بھی ایک پرستار کی طرح ذرا سی شرارت ہی تو کر رہی تھیں۔ پتا نہیں اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔

وہ بار بار موسی کو دیکھتی تھیں۔ ایک کے انداز میں خفگی کے ساتھ ساتھ حسرت بھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی' ایسا کیا کرے کہ وہ موسی کے قریب جاسکے' بات کرسکے۔ ایک ڈرنک اگر اکٹھے ہو جائے اور بعد میں ڈانس بھی۔۔۔

شہرزاد کے دل میں ایک جوار بھاٹا سا اٹھا۔ اس کی یہ مجال کہ اس نے وہاں تک سوچا کیسے اور اس نے یہ بھی کیسے اندازہ لگایا کہ موسی وہاں تنہا تھا اور اسے ایک ساتھی درکار ہے۔ اس نے کیا شہرزاد کو نہیں دیکھا اور کیا وہ شہرزاد کو جانتی نہیں تھی۔ وہ جو اس کی سب سے اچھی دوست تھی۔ تو وہ کیسے اس کی موجودگی میں کسی اور کے ساتھ۔۔۔

حالانکہ وہ دیکھ چکی تھی۔ موسیٰ نے کیک سے کھیلنے کو ناپسند کیا تھا۔ یہ اس کی نظروں سے عیاں تھا' مگر پھر بھی شہرزاد کو حق جتانے کے لیے فوری طور پر اور کچھ نہ سوجھا۔

موسیٰ نے سخت حیرت سے شہرزاد کے بڑھے ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر حیرت کی جگہ سخت ناگواری نے لے لی۔ ناگواری پر طیش غالب ہونے کا تھا۔

شہرزاد کا دل ڈوب کر ابھرا۔ اف یہ اس نے کیا حماقت کردی۔ پارٹی میں کچھ اخباری شخصیات بھی تھیں۔ چٹخارے دار خبر بنتی۔ مسالا حسب ذائقہ' اف خدا۔

اسے ضرورت ہی کیا تھی۔ جب دیکھ چکی تھی' موسیٰ کی قطعیت و ناگواری تو حق جتانے کے دس اور بھی تو طریقے ہوسکتے تھے اور وہ دونوں نوعمر لڑکیاں تو پہلے ہی متوجہ تھیں۔ اب چند قدم آگے سرک آئیں۔ وہ شہرزاد کو پہلے ہی ناپسند کرتی تھیں اور موسیٰ سے دوستی کے بعد تو باقاعدہ نفرین بھیجی جاتی تھی۔

وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی منت کرنا چاہتی تھی۔ بس آج آخری بار قسم سے۔۔۔ اس کی عزت بے عزتی کا سوال تھا۔۔۔ مگر۔۔۔ موسیٰ نے اس کے کیک سے لتھڑے ہاتھ کلائی سے پکڑ لیے۔ اسے باز رکھنے کے لیے۔۔۔ اف وہ اسے اب دھکیل دے گا۔ شہرزاد کا دل لرزا۔۔۔ اسے چاہیے وہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑوائے اور بھاگ جائے۔

سب یوں متوجہ ہو گئے تھے جیسے سین شوٹ ہو رہا ہو۔ ایسی خاموشی کہ سوئی گرنے کی آواز آئے اور تب ہی شہرزاد ششدر رہ گئی' پھر اس پر شادیٔ مرگ طاری ہو گئی۔ موسیٰ نے اس کا مان رکھ لیا تھا۔

پہلے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ کلائی کے پاس سے ایک ہاتھ میں بند کردیے۔ اور دوسرے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ذرا سی پیسٹری اس کی ناک کی نوک پر لگادی۔

"تم چھوٹے بچے ایسے کھیل نہیں کھیلتے۔" وہ شریر لہجے و انداز سے کہہ رہا تھا۔ "جاؤ ہاتھ دھو کر آؤ۔۔۔ یا وہ بھی

میں دھلواؤں گا۔" آخری جملہ اس نے سب کو دیکھ کر کہا۔

وہ سین میں جان پڑنے جیسا پل تھا۔ ویسی ہی جان جو شہزاد کے بے جان وجود میں دوڑی تھی۔ جیسے رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ تو شہزاد نے ایسے زندگی پائی تھی۔

اس نے شہزادے نہیں دیکھے تھے۔ مگر وہ موسیٰ سے کیا برتر ہوتے اور اس نے بادشاہوں کا جلال سن رکھا تھا۔ وہ موسیٰ کے آگے نظر نہیں اٹھا پاتی تھی اور یہ بھی نہیں تھا کہ آج سے پہلے اس نے مرد نہیں دیکھے تھے یا دلکش مرد نہیں دیکھے تھے۔ مگر بات تو دل کی تھی جو ایک گیا تھا۔

فیصلہ مشکل تھا، اسے دیکھنا اچھا لگتا تھا یا اسے سوچنا۔ شہزاد کو مخاطب کرنے میں جھجک محسوس ہوئی۔ اس نے ادھورا مشروب چھوڑ دیا تھا اور اب وہ صرف اپنے گردوپیش کے ماحول کو یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے حفظ کر رہا ہو۔ جیسے اسے رپورٹ دینی ہو۔ پتا نہیں وہ کن سوچوں میں پڑ گیا تھا۔

شہزاد باوجود شدید خواہش کے اسے ڈانس کی آفر نہ کر سکی۔ حالانکہ دل لہک لہک جاتا تھا۔ مگر وہ متوجہ ہی نہ تھا۔

ٹھیک ہے، وہ دوسروں کو دیکھے اور وہ صرف اسے۔۔۔ مزا تو اس میں بھی کم نہ تھا۔ وہ فرصت سے کرسی سے پشت ٹکا کر بیٹھ گئی اور دوسری طرف بظاہر پرسکون نظر آتے موسیٰ کے اندر کچھ عجیب سوچیں برپا تھیں۔

لندن، امریکہ، دبئی و دیگر ممالک، وہاں ایسی ڈانس پارٹیاں معمول کی بات تھیں، مگر اس نے غلطی سے بھی پاکستان میں ایسی سرگرمیوں کا نہیں سوچا تھا۔ اس سے جب بھی اس کے ملک کا نام پوچھا جاتا۔ اس نے ہمیشہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کہا تھا۔

اس نے بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ کلمہ اس کی اساس ہے۔ اسے اساس کا مطلب نہیں پتا تھا۔ دراصل اس کی اردو اچھی تھی۔ مگر وہ اتنی گہرائی سے معنی و مطالب نہیں جانتا تھا۔ وہ سادہ الفاظ استعمال کرتا تھا۔ پر اس نے سوچا یہ کوئی اہم بات ہی ہو گی۔ کلمہ عام معنوں میں تو استعمال نہیں ہو سکتا نا۔ اسی طرح اس کی اسلام کے بارے میں معلومات بھی بہت کم تھیں۔

مگر یہ جو جشن یہاں برپا تھا۔ اسلام میں ایسی پارٹیز کی گنجائش نہیں تھی۔ یا وہ کسی سے پوچھے "اس نے سن رکھا تھا۔ اسلام دین فطرت ہے۔ مرد و زن کا باہم ہونا بھی تو فطرت ہے۔ مگر ایسے۔۔۔ نہیں، نہیں یہ غلط تھا۔ یہ ماحول، یہ آوازیں، یہ لوگ یہ برہنگی۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ موسیٰ جیسا فارن پلٹ 'ماڈرن دکھائی دیتا انسان جس کے سامنے ادھورا گلاس اور بھری بوتل موجود تھی۔ اس وقت یہ سب سوچ رہا تھا۔ اسے برہنہ دکھائی دیتی عورتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اور کب سے، یہ دل میں دبی ناپسندیدگی تھی۔

اسے مے نوش عورتیں زہر لگتی تھیں۔ اس نے بے ساختہ شہزاد کو دیکھا۔ جو اس کی دیکھا دیکھی گلاس چھوڑ چکی تھی۔ اسے بہت اچھا لگا۔ (حالانکہ خود پیتا تھا۔) اسی پل شہزاد نے اسے دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

برائی کی حد یہ تھی کہ اسے چیزیں بری لگتی تھیں۔ اچھائی یہ تھی کہ وہ محض اسے دکھانے کو ہی چھوڑے گلاس کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ دراصل اس کے پاس علم نہیں تھا۔ اسے اصل کی خبر نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

بظاہر آسان نظر آنے والا کام اب بے حد مشکل، بلکہ ایک آدھ بار تو ناممکن نظر آنا شروع ہو گیا۔ سمیع کا عندیہ پا کر وہ دونوں ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ اپنے اندر ایک نئی امید طاقت جوش و ولولہ پیدا ہوتا دیکھ رہے تھے۔ مگر چند ہی دنوں میں ہمت جیسے جواب دینے لگی۔

وہ اپنے حلقہ احباب میں، جس ۔۔۔ لڑکی پر ہاتھ رکھتے ——— منٹوں میں رضامندی حاصل

کرتے' مگر اپنے حلقہ احباب کی لڑکیاں۔۔۔ خاندانی' پڑھی لکھی' پروفیشنل' خوب صورت' طرح دار' مگر کوئی بھی ان کے بنائے خاکے پر پوری نہیں اترتی تھی۔

"جیسی بہو آپ سوچ بیٹھے ہیں' ویسی لڑکی تو مڈل کلاس میں ہوتی ہے اور ہمارا مڈل کلاس سے کیا واسطہ۔" عقیلہ نے پریشانی بتائی' ہاں لہجے کا تفاخر نمایاں تھا۔ "دوسرے مڈل کلاس لڑکی یقیناً" مل جائے گی' مگر اتنا سب کچھ پاکر وہ ایسے پرپرزے نکالے گی کہ آپ اور میں دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"نہیں۔۔۔" محی الدین سہگل متفق نہ ہوئے۔ "ایک خاندانی' شرافت و نجابت کو سب سے آگے رکھنے والی لڑکی مستحکم ہوتی ہے۔ وہ ان ترغیبات کے جھانسے میں آسانی سے نہیں آتی۔ اس کے پیر ہمیشہ اپنی زمین پر مضبوطی سے جمے رہتے ہیں۔ میں کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں ہوں۔"

محی الدین کی پرسوچ نگاہیں حساب کتاب جوڑ رہی تھیں۔

"تو پھر آپ ہی ڈھونڈیے۔۔۔" عقیلہ نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "پارٹیز اور دیگر ایکٹویٹیز میں جانا اب چھوٹ ہی چکا ہے۔ مگر اب بھی جہاں کچھ فرینڈز یا جان پہچان والی ملتی ہیں تو اپنی بہنوں' بیٹیوں کا تعارف کرواتی ہیں۔ میں تو دنیا سے کٹ کر سکون سے رہتی ہوں۔ مگر اب اکثر مجھ سے ملنے لوگ آتے ہیں' اچھی مصروفیت مل گئی ہے۔" وہ ہنس رہی تھیں۔

"یعنی تمہاری مارکیٹ ویلیو بڑھ گئی ہے۔"

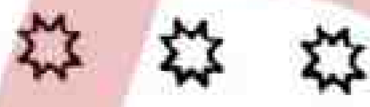
"مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ خوش دلی سے مسکرائیں۔

"تمام باتوں سے پرے۔۔۔" محی الدین نے سنجیدگی کا چولا پہنا۔ "ہمیں جلد از جلد اس معاملے کو نپٹانا ہوگا۔ جس طرح کا ماحول ہے اور جیسی اس کی گیدرنگ ہے۔ کبھی بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" وہ گفتگو کرتے کرتے ٹیرس میں آرکے۔

نیچے وہ کسرت کررہا تھا۔ وہ بے حد مضبوط' خوب صورت جسم کا مالک تھا۔۔۔ تولیے سے۔ اپنا چہرہ پونچھتا' شیف کی جانب متوجہ تھا۔ جو بے حد نفاست اور محتاط روی سے چلتا آرہا تھا۔

ٹرے میں کچھ کھانے کے لیے اور بہترین پھلوں سے کشید کیا تازہ جوس تھا۔ گلاس کی دیوار پر پائن ایپل کا ٹکڑا چیرا لگا کر کھڑا کیا گیا تھا۔ وہ انہیں اپنی جوانی کی جھلک دکھاتا تھا۔ اس کے ماتھے کی تیوریاں بدر کی یاد دلاتیں۔ ناک' بھنویں عقیلہ جیسی تھیں۔

اس کے چہرے کی سب سے خوب صورت چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ وہ ہو بہو اسکارلٹ جیسی تھیں ہر تاثر میں۔۔۔ وہ چاہ کر بھی اسکارلٹ کا اس گھر سے رشتہ بھول نہیں سکتے تھے۔



اور صحرا کی راتیں بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں اور اگر کوئی کھلے آسمان کے نیچے ننگی زمین پر پڑا ہو۔ تب موسم برفاب لگنے لگتا ہے۔ اسے لگتا تھا وہ جم گیا ہے۔ لیکن پھر جب صبح ہوئی' سورج مشرق سے سرکتے سرکتے اس کے سر کے عین اوپر آکر ٹک گیا۔ تب اس نے سوچا اور صحرا کے دن بے حد گرم ہوتے ہیں۔

ریت اسے تپا گئی جیسے دانے بھننے والی مائی کا کڑاہا۔۔۔ جس میں دہکتی ریت میں وہ کڑچھا چلاتی ہے اور دانے بھنتے ہیں۔ اسے لگا وہ چنا ہے۔ اس نے سوچا وہ سردی کے باعث مرے گا۔

پھر صبح اس نے اپنا خیال بدل ڈالا۔ وہ گرمی سے مرے گا۔ وہ بھوک سے مرے گا۔

وہ پیاسا مرے گا۔ اسے کچھ بھی مل جائے' وہ پی لے گا۔

لیکن شام کو جب سورج غروب ہونے لگا۔ تب اس نے اپنی متوقع موت کی وجہ سوچ لی۔ ہاں۔۔۔ وہ بے بسی سے مرے گا۔

اس رات ریت کا ایک اور طوفان اٹھا۔ وہ بہت خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے دیکھا تھا۔ ریت کے پرانے ٹیلے ڈھل جاتے تھے اور نئے پہاڑ کھڑے ہوجاتے۔

کہیں وہ کسی ریت کے مرغولے میں دب نہ جائے۔ ریت کی قبر میں دفن ہو جاتا، پھر کب ریت دوبارہ چڑھے اور اترے اور پھر اس کا پنجر برآمد ہو۔

نہیں، کبھی نہیں، زندگی کو بچانے کی کوشش کرتے کرتے مرجانا تو ٹھیک تھا۔ مگر موت کا انتظار کرنا تو نری بے وقوفی و بزدلی ہے۔

موت برحق ہے، مگر زندگی اتنا حق تو رکھتی تھی کہ وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا۔ اس کا حال دگرگوں تھا۔

مگر نہ جانے کہاں سے ہمت آئی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاروں اطراف دیکھا۔ تہہ در تہہ... نیلا آسمان... جس پر روئی کے گالے سے اڑ رہے تھے۔ تو دنیا تین رنگوں پر محیط ہو گئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر آسمان کی سمت اٹھائے گول گول گھومنے لگا۔

پھر اس کے ہاتھ نیچے گر گئے۔ اس کے اندر اتنی توانائی کہاں بچی تھی۔

"کہاں مر گئے سالوں، مجھے ڈھونڈتے کیوں نہیں، کہیں مجھے جان کر تو نہیں پھنسایا، ڈھونڈو مجھے۔" وہ حلق کے بل چلایا۔

یونہی بلاوجہ کی زحمت... گھڑے میں منہ دے کر دی جانے والی صدائیں اندر ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ اس کی آواز میں تو بازگشت بھی نہیں تھی۔

"کتو، کمینو، بے غیرتو! تم سب آرام سے ہو، مجھے یہاں تمہاری... آخ تھو۔"

اس نے تھوکا... کف تو بک ہی رہا تھا۔ پھر زمین پر تشنج کی حالت میں گر گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ریت اڑا رہا تھا۔ پھر گر گیا۔ عین سجدے کی حالت، مگر اسے سجدے میں پڑھی جانے والی تسبیح قطعاً یاد نہیں تھی۔ حالانکہ اسے یاد کروائی گئی تھی اور عید بقرعید پر اس نے پڑھی بھی تھی۔

وہ کوس رہا تھا۔ پیٹ رہا تھا۔ بددعا دے رہا تھا۔

اس نے ریت اڑا، اڑا کر خود کو ریتیلا بھوت بنا ڈالا تھا۔

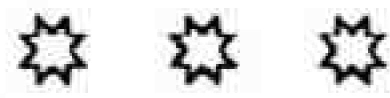
اس کی کیفیت کا بیان کچھ یوں تھا۔ جیسے کسی نے کمرے میں آگ لگا کر باہر سے کنڈی لگا دی ہو اور وہ اندر اچھل رہا تھا۔ ایک پیر رکھتا، ایک پیر اٹھاتا۔ 48 درجہ حرارت... ایک دہکتے تندور کی طرح تھا۔ جس میں وہ بھن رہا تھا۔ اور نہ جانے کب تک بھنتا رہتا۔

اور پھر جل کر خاک ہو جاتا۔ راکھ ہو جاتا۔ راکھ ریت سے مل جاتی۔ ریت کو ہوا اڑا لے جاتی۔ نہ جانے کہاں کہاں...

پھر کیسے کوئی پہچانتا کہ کون سی ریت اور کون سا وہ...

ہاں مگر ایک ذات ہے۔ جو اس تفریق و پہچان سے واقف ہے۔

وہ ایک حکم جاری کرے گی اور پارے کے ٹکڑے مجسم ہو جائیں گے۔ لاکھ بھاگ لے، تدبیر لڑا لے۔ انسان جو ابد ہی کے لیے تیار کھڑا ہو گا۔ تو اگر آج بکھر جاتا تو اللہ جوڑ لیتا۔ کیونکہ "یحیی العظام وھی رمیم۔" اس کے لیے تو مشکل نہیں۔ بالکل ویسے ہی... ان شاھا اول مرۃ...



بہت حوصلہ افزا پیش رفت تھی۔ دنیا بھر کا میڈیا متوجہ ہو چکا تھا۔ زمینی پارٹیوں کے ساتھ اب فضائی جائزہ لینے کے لیے ہیلی کاپٹر کا استعمال کیا جا رہا تھا۔ دعوے داروں نے کہہ دیا تھا۔ زندہ یا مردہ... اوہ... اس کی ماؤس پر چلتی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔

وہ ایسی بات سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

پتا نہیں وہ کس حال میں ہو گا۔ شفاف پانی کے گلاس پر نگاہ پڑتے ہی اس کا دھیان بھٹکا۔ بھوکا پیاسا...

"ہو نہ ہو وہ کسی کی قید میں ہے۔" اس نے کہا۔

"ورنہ زندہ انسان تو کوشش کرتا ہے۔" یہ یقین بھی تھا، امید بھی، سوال بھی تھا اور وہ جواب میں ہاں کے سوا کچھ نہیں چاہتی تھی۔

جیک کا سر ہلا۔ "ہاں... تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"وہ زندہ تو ہے نا جیک۔۔۔" اسے پتا بھی نہ چلا اور منہ سے وہ نکلا جو وہ سوچتی بھی نہیں تھی۔
اور جیک کوئی اس کے ساتھ تو نہیں رہتا تھا نہ اس سے رابطے میں تھا کہ جواب دیتا۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔
"آف کورس ڈیئر۔"
"مائیکل کو جانتی ہو نا۔" بہت دیر تک اس کا چہرہ پڑھنے کے بعد اس نے پوچھا۔
"مائیکل۔۔۔ کون؟" اسے فوری طور پر یاد نہ آسکا۔
مائیکل۔۔۔ ناٹ جیووالا۔۔۔ وہ جو ڈاکومنٹریز بناتا ہے۔
"اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اسے کیا ہوا؟"
"اسے کچھ نہیں ہوا۔ اس کی بہت نالج ہے۔ اس طرح سے مس پلیس ہو جانے والے لوگوں کے بارے میں۔۔۔ اس طرح کے حالات میں سے بھی لوگ بچ کر واپس آجاتے ہیں۔ آٹھ سے دس دن تک بھوکے پیاسے بھی زندہ رہتے ہیں اور۔۔۔"
"آٹھ سے دس دن!" اس کی سانس اٹک گئی۔
"مثال کے لیے بتا رہا ہوں۔" جیک نے فوراً کہا۔
مگر اس کے چہرے کا رنگ بحال نہ ہوا۔ "میری بات ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اس سارے معاملے پر نظر رکھے ہوئے ہے بلکہ وہ تو خاصا پرجوش ہے۔"
"وہ کیوں؟" وہ حیران رہ گئی۔
"کہہ رہا تھا۔۔۔ یہ بندہ واپس آجائے تو وہ اس کے اس سارے واقعے کو فلم بند کرے گا۔۔۔ کہ وہ کیسے پھنسا۔۔۔ اس کے ساتھ کیا کیا بیتی' کیسے گزارے اس نے یہ سارے شب و روز' اس کی ذہنی و جسمانی کیفیات۔۔۔ زندگی اور موت کی کشمکش۔۔۔ وہ کیا سوچتا رہا' اس نے خود کو بچانے کی کون کون سی کوششیں کیں۔ کب کب ہار گیا۔ کب ہمت پکڑی تم نے دیکھی تو ہیں نا ایسی ڈاکومنٹری فلمز۔۔۔"
بہت جوش سے بولتے بولتے اسے یک دم خیال آیا اور یہ بھی کہ وہ اتنی خاموشی سے سن رہی ہے۔
دراصل اسے شدید دھچکا پہنچا تھا۔
"کسی کی جان پر بنی ہے اور مائیکل فلم کی بات کر رہا ہے۔" اسے واقعی سخت افسوس ہوا تھا۔ اس نے بہت ہلکی آواز میں سرزنش کی۔
"اوہ۔۔۔" جیک ہمدردی سے مسکرایا۔ "میں تو تمہیں ہمت دلا رہا تھا۔ یہ ساری صورت حال بہت خطرناک ہے مگر۔۔۔ انسان کی زندگی ہو تو۔۔۔ موت کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ اگر اس کی زندگی ہے تو وہ ان مشکل حالات سے بھی نکل کر ہم سب کے بیچ آجائے گا۔ اور اگر وقت پورا ہو جائے تو۔۔۔ میں یا تم اگلا سانس بھی نہیں لے سکتے۔ تمہیں کیا لگتا ہے۔ نرم گرم بستر اور محفوظ دروازے موت کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ یہ تو سامنے بات ہے۔ تمہیں نہیں معلوم۔" وہ اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔
"معلوم ہے مجھے۔" اس کا لہجہ بشاش ہو گیا۔ اسے ایسی ہی تشفی درکار تھی۔ "مگر دل تو گھبراتا ہے نا۔" اس نے سادگی سے کہا۔
"خداوند تم پر رحم کرے۔"
"آمین" اسے صحرا میں بھٹکے ہوئے کا خیال آیا۔
"خدا ہم سب پر رحم کرے اور بالخصوص اس پر۔"
اس کے چہرے سے تفکر کے بادل چھٹ گئے تھے۔ وہ اپنے اندر ایک نئی ہمت محسوس کر رہی تھی۔ جیک نے سر ہلا کر اسے مضبوط رہنے کی تلقین کی۔



"مجھے ڈیڈی سے ملنا ہے۔" ماریہ بہت دیر سے ہونٹ کاٹ کو نادانت میں دبائے ڈنر سرو کر رہی تھی۔ وہ سب کے بیچ ہوتے ہوئے بھی حاضر نہیں تھی۔ اس کی منتشر سوچوں نے اس کی کارگزاریوں پر ذرا فرق نہ ڈالا تھا۔ پوری ذمہ داری سے وہ اپنی روٹین کے عین مطابق لگی ہوئی تھی مگر وہ شوہر تھا۔ اس کا غائب ہونا محسوس کر چکا تھا اور تنہائی ملتے ہی پوچھنا چاہتا تھا۔ ابھی تو وہ چھوٹے بیٹے کو کھانا کھلانے کی کوشش میں تھی۔
بات ماریہ کے منہ میں دبی ہوتی یا دل میں' ادھیڑ عمر خدیجہ بانو کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہی۔ اس وقت بھی وہ چہرے پر بے پناہ سنجیدگی کا ملمع چڑھائے نوالے

بتاتی رہیں۔ سنجیدگی میں ایک تہہ ناراضی کی بھی تھی۔

اور یہاں دلچسپ صورت حال یہ تھی کہ وہ وجہ بتانے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی تو کسی کو پوچھنے سے بھی علاقہ نہ تھا۔ سب نظر چرا کر بیٹھے تھے۔ بیٹا جانتا تھا۔ (ماریہ بھی واقف تھی۔) خدیجہ بانو ڈیڈی سے اتفاقی ملاقات کو بڑی مشکل سے برداشت کیے ہوئے تھیں۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولیں۔ بس ان کے جبڑوں کی ہڈیاں بھنچ گئیں، مگر معاملہ اس وقت بے حد گمبھیر بلکہ آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا۔

جب ڈیڈی سے ملاقات کے لیے برابر کے وارڈ میں جاتے ہوئے ماریہ نے بچوں کو ساتھ لے جانا چاہا۔

"نہیں۔۔۔ یہ نہیں جائیں گے بلکہ تم بھی نہیں جاؤ گی۔ یہ طے تھا منے!"

خدیجہ بانو نے ایک ہی سانس میں فیصلہ سنایا۔ ساتھ ہی پوتیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ بڑا پوتا درمیان میں کھڑا ماں اور دادی کی صورت دیکھنے لگا جبکہ گود والا ماں کے کان کی بالی سے کھیلتا رہا۔

ماریہ کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت طاری ہو گئی اور رنگت سیاہ پڑ گئی۔

"بچے میرے ساتھ جائیں گے امی!" اس نے اپنے تنفس پر بدقت قابو پا کر بیٹیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ وہ آجائیں۔

مہکی نے فوراً تعمیل کی، جبکہ میری نے پہلا قدم تو تیزی سے اٹھایا تھا مگر دوسرے پر اس نے بے ساختہ دادی کو دیکھا تھا اور پھر اس کے قدم تھم گئے۔

اس پر ابھی ابھی منکشف ہوا تھا کہ صرف گرگٹ نہیں، انسان بھی رنگ بدل لیتے ہیں۔ پہلے ممی، پھر دادی۔۔۔ وہ کالی تو نہیں تھیں۔ اور دادی کے ساتھ تو عجیب معاملہ ہوا تھا۔ پہلے ان کا چہرا سیاہ پڑ گیا، پھر سفید۔۔۔ جب پاپا نے کہا۔ "ماریہ کو بچے لے جانے دیں امی۔"

"نہیں۔۔۔" خدیجہ بانو کے لہجے میں بے یقینی آمیز قطعیت تھی۔ صدمہ تھا۔ انہیں بیٹے سے یہ امید نہیں تھی۔

"پلیز امی۔۔۔ تھوڑی دیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" بیٹے کا لہجہ پُرسکون تھا۔

"تھوڑی دیر۔۔۔؟ ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں۔" ان کا لہجہ آہنی ہو گیا۔ "میرے مسلمان بچے اور وہ۔۔۔"

"میں ان کا بپتسمہ کروانے نہیں لے جا رہی امی۔۔۔ وہ بس انہیں ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

شدت ضبط سے ماریہ کی آنکھیں لہورنگ ہو گئیں۔

"میں وہ ایک نظر بھی نہیں چاہتی۔" خدیجہ بانو نے آگے بڑھ کر مہکی اور احد کو دوبارہ خود سے نزدیک کر لیا۔ میری تو پہلے ہی ان کی ٹانگ سے چپکی کھڑی تھی۔

"پلیز امی۔۔۔ کیا پتا یہ ان کی آخری خواہش ہو۔ ڈاکٹر انہیں گھر لے جانے کا کہہ چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں زندگی باقی رہی تو نہ جانے کب تک جی لیں۔ مگر ان میں کچھ بچا نہیں ہے۔ بس ایک دل ہے، جو خواہش کرتا ہے۔ ایک زبان ہے، جو منت کر رہی ہے۔ مجھے اتنی سی فرماں برداری تو کرنے دیجیے۔" آخر میں لہجہ کرچیوں کا ڈھیر بن گیا۔

"میں نے کہا تھا نا، یہ پچھتائے گی؟" خدیجہ بانو کو اتنے دل گیر جملوں کے اثر سے نکلنے میں چند منٹ تو لگے ہی۔۔۔ پھر وہ چلائی تھیں۔

"میں ابھی نہیں پچھتائی امی۔۔۔ لیکن۔۔ اگر ڈیڈی میری طرف سے یہ حسرت لیے مر گئے تو پھر ایسا پچھتاؤں گی جیسے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد گناہ گار پچھتائیں گے۔ میرا وقت ضائع نہ کریں۔ میرا سورج ابھی مشرق سے ہی نکلا ہے۔" (یعنی اس نے اسلامی کتب کا مطالعہ کر کے یاد بھی رکھا ہوا تھا۔)

خدیجہ بانو کی نسبت ماریہ کا لہجہ بہت دھیما، مگر معنی آفرین تھا۔

خدیجہ بانو کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور بچے پہلی بار اپنے نانا نانی، خالہ اور ماموں سے ملے۔

ڈیڈی کے ساتھ بہت سارے مسائل تھے۔ شوگر، ہارٹ، بلڈ پریشر اور اب یہ فالج۔۔۔

جتنے دن شوہر ہسپتال میں رہا۔ ماریہ کے لیے ڈیڈی

سے ملنا بہت آسان رہا۔ مگر اب جب وہ صحت یاب ہو کر گھر آچکا تھا تب۔۔۔

بچوں کو سلا کر وہ کمرے میں آئی تو نگاہ ملتے ہی اس کے لبوں سے فقرہ ادا ہو گیا۔ ساتھ ہی دل کے اندر سکون کی لہر ابھری۔ تو یہ مشکل کہہ دینے ہی سے حل ہوئی تھی۔

"م بھی کل تو ملی تھیں۔"

"ہاں۔۔۔ مگر میں۔۔۔ میرا۔۔۔ کچھ اور مطلب تھا" اس نے بے خوفی سے آنکھوں میں بس آنکھیں ڈال دیں۔

"کہو۔۔۔"

"میں ان کی بیماری کے حوالے سے نہیں کہہ رہی۔ میں اب ان سے ملتے ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"م وہ۔۔۔ لیکن انہوں نے خود ہی تو تمہیں کہہ دیا تھا قطع تعلقی کا۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ انہوں نے کہا تھا مگر عمل نہ وہ کر سکے۔۔۔"

"اور نہ تم۔" شوہر نے اٹکنے پر جملہ مکمل کر دیا۔ ماریہ کی نگاہیں بے ساختہ اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ ہاں اس نے کبھی اس بات کو شوہر سے چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ وہ یوں ہی چار' چھ ماہ بعد ڈیڈی کے آفس سے دور کھڑی ہو جایا کرتی تھی۔

وہی اک نظر کی چاہ میں۔۔۔

اور یہ دل بندے کو بڑا مجبور کر دیتا ہے۔ اپنے بس میں کر لیتا ہے' من مانی کرتا ہے' اڑ جاتا ہے۔

مصلحتوں کو نہیں مانتا۔ نافرمان بنا دیتا ہے۔

اس نے ماریہ کو بھی بنا دیا تھا۔ ڈیڈی نے کہا تھا نا۔۔۔ آج کے بعد تمہارا مجھ سے اور میرا تم سے کوئی ناتا نہیں۔۔۔ مجھ سے ملنا نہیں۔۔۔ (دیکھنے سے تو منع نہیں کیا تھا نا۔۔۔ سو۔) وہ بہت یاد آنے پر اک نظر کی تڑپ لیے ان راستوں پر چلی آتی۔ جہاں سے انہیں گزرنا ہوتا تھا۔

بربادیوں کے رنگین کھیل کی خاص بات یہ ہے کہ وقت کی دھوپ کب رنگ چرا لیتی ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا۔

احساس جرم اور پچھتاووں کی گرد بھی وقت گزرنے کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے۔ زندگی انسان کو مگن کر دینا جانتی ہے۔ وقت گزرا تو دل چاہتا بھی تو مصروفیات ان گم گشتہ رستوں پر سفر کے بیچ حائل ہو جاتیں۔

ماریہ کو ڈیڈی یاد آتے تو آہ بھر لیتی۔ ان کے حق میں دعا کرتی یا پھر اپنے بیٹے احد کو دیکھ لیتی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ شکل و صورت اور عادات میں اپنے نانا کا پرتو تھا۔

لیکن اب جبکہ وہ ڈیڈی کو اس حال میں دیکھ آئی تھی اور ڈاکٹرز نے کہا تھا۔ زیادہ دیر نہیں دیکھ سکے گی تو وہ مدعا لے کر شوہر کے سامنے بیٹھ گئی۔ اور شوہر اس کے نمکین حسن کو دیکھ رہا تھا۔ نمک جو گھل رہا تھا۔

اف۔۔۔ جن سے محبت ہو ان کی آنکھ میں آنسو دیکھنا کتنا محال ہوتا ہے۔ اسے احساس ہوا۔۔۔ اور سر اثبات میں ہلنے لگا۔

وہ جذبات میں بہہ کر کیا جانے والا فیصلہ تھا۔ ماریہ اس کے کندھے پر چہرہ ٹکائے رو رہی تھی۔ کالر بھیگتا جا رہا تھا۔

بڑا محبت بھرا جذباتی لمحہ۔۔۔ اور جذبات میں آکر ہی تو انسان غلط فیصلے کرتا ہے۔ خدیجہ بانو نے حقیقتاً" اپنا سر دیواروں سے ٹکرایا۔ وہ چلا رہی تھیں۔

"بہو نہیں جائے گی اور میرے بچے قطعی نہیں۔"

مگر حقیقت یہ ہے کہ چیزیں ازل سے طے ہیں اور جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ تعلقات بحال ہو گئے۔ ہاں منا بے حال ہو گیا۔ دلائل دے دے کر۔۔۔ خدیجہ بانو کو چپ ہونا پڑا۔ منا بات ہی ایسی کر گیا تھا۔ دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیے مانو۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ جو سب سے آخر میں چڑھائی جانے والی دو بوتلیں خون کی تھیں۔ وہ لہو جو خدیجہ بانو کے بیٹے کی رگوں میں زندگی بن کر دوڑنے لگا تھا اور اب اندر جسم میں ایسا مدغم ہو گیا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں بتا سکتی تھی کہ

منے کا اپنا خون کون سا تھا اور ڈیوڈ کا خون کون سا تھا۔ ڈیوڈ۔۔۔ ماریہ کا بھائی نا۔۔۔ کتنی بہت ساری بوتلیں چڑھائی گئی تھیں ان کے بیٹے کو۔۔۔ پر وہ جو آخری والی تو۔۔۔

''اوہ۔۔۔'' خدیجہ بانو ششدر رہ گئیں۔

خون۔۔۔ خون سے یوں مل گیا تھا جیسے آٹے میں نمک۔۔۔ یا نمک میں پانی۔۔۔ یا پانی میں پانی۔۔۔ اور کہانی ختم۔۔۔

تو کاش یہ ممکن ہوتا۔ وہ ڈیوڈ کے سارے خون کو منے کے خون سے الگ کر سکتیں۔

لیکن خدیجہ بانو اس وقت کو تو یاد کرو جب تمہارا بیٹا موت و زیست کی کشمکش میں تھا اور تم اس کے لیے زندگی مانگتی تھیں۔ تب تو تمہیں صرف خون درکار تھا۔ تب تو تم نے ایک بار بھی خون کے اوصاف نہیں گنوائے۔ شرائط کا ذکر تک نہ تھا۔ تم کو تو صرف زندگی چاہیے تھی۔ تو دے دی گئی نا۔ دیکھو تمہارا بیٹا تمہارے سامنے جیتا جاگتا ہے۔

ہنستا باتیں کرتا اور وہ کچھ بول رہا تھا۔ اور یہ ایک نئی کہانی تھی۔

''ایک بار سوچیے امی۔۔۔ اگر آج میں آپ سب کے بیچ نہ ہوتا۔''

خدیجہ بانو کا کلیجہ منہ کو آیا۔

''مجھے تو خود ابھی تک اپنی زندگی پر یقین نہیں آتا کہ میں بچ گیا ہوں۔ تب میں نے بہت سوچا امی۔۔۔ جب انسان موت کا منہ دیکھ کر زندگی کی طرف پلٹتا ہے نا تو اسے نئی زندگی کے ساتھ ساتھ نئی سوچ بھی عطا کر دی جاتی ہے۔ زندگی کو سمجھنے کے لیے موت کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے امی۔۔۔ موت کو پہچان لینے والے شخص کی زندگی بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ وہ اسرار خداوندی کو سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اللہ والا ہو جاتا ہے۔ اللہ کے لیے ہو جاتا ہے۔ میں اتنا نیک تو نہیں ہوا۔۔۔ مگر۔۔۔ میں خوف زدہ ضرور ہو گیا ہوں۔ اگر آج میں نہ ہوتا۔۔۔ تو سب سے زیادہ دکھی آپ ہوتیں اور سب سے زیادہ نقصان ماریہ کا ہوتا۔''

خدیجہ بانو نے تڑپ کر سر اٹھایا۔ مگر بیٹا متوجہ نہیں تھا۔ وہ بہت گہری سوچ کے زیر اثر بول رہا تھا۔

''ابو کے انتقال کے بعد ماموں۔۔۔ ماں اور دیگر رشتے دار آپ کے مددگار تھے۔ مالی نہ سہی، قولی ہی سہی۔۔۔ مگر یہ سہارا بہت تھا میرے لیے بھی کہ دیوار کے اس پار میرے ماموں رہتے ہیں اور ان کے بچے۔۔۔ آپ کے لیے تو پھر یہ بہت بڑی بات تھی۔ ایک جوان بیوہ کے لیے سب سے بڑی ضرورت ایک ڈھال کی ہوتی ہے۔ ماموں آپ کے لیے ایک ڈھال بنے رہے۔ کوئی میلی آنکھ سے دیکھتا تو۔۔۔ کوئی انگلی کو اٹھا کر دکھاتا۔ آپ کا تو پتا نہیں، مگر میں نے اس تحفظ کو ہمیشہ محسوس کیا۔

کوئی کچھ کہہ دیتا، تو میں بڑے یقین سے دھمکاتا تھا۔ میرے ماموں کو جانتے ہو نا۔۔۔ یا پھر ماموں کے بیٹوں کا نام لے لیتا۔ میں اپنے بھائی کو بلا کر لاؤں گا، پھر دیکھنا وہ تمہارا کیسا حشر کریں گے۔ اور سب ڈر جاتے تھے۔ کیونکہ دونوں بھائی میری چھوٹی شکایتوں پر بھی طوفان اٹھا دیتے تھے۔ مجھے اچانک خیال آیا امی۔۔۔ اگر آج میں نہ رہتا تو میرے بیٹے کس کو بلا کر لاتے اور ماریہ کے لیے دیوار کے اس پار بھیڑیے بیٹھے ہوتے اور میری میگی کے لیے شکرے، وہ کتنی تنہا ہو جاتی امی۔۔۔

اس کے پاس کوئی رشتہ نہ ہوتا۔ تو امی، وہ ماریہ کے رشتے ہیں۔ اس کے ماں، باپ، بہن، بھائی۔۔۔ اور اس کے ڈیڈی۔۔۔ امی! وہ اس سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ میرے پاس بتانے کو مثال نہیں ہے۔ ہاں سچ کہوں تو یہ کہ۔۔۔ ایک بار دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں۔ ایسی بیٹی کی تڑپ کون کرے، جس نے نہ صرف اپنی من مرضی سے شادی کی، بلکہ مذہب بھی بدل لیا۔ میں خود کو اس کے باپ کی جگہ رکھ کر دیکھوں تو لرز جاتا ہوں۔ میری بھی تو دو بیٹیاں ہیں نا، اگر کل کو وہ ایسا کچھ کرلیں، تو میں۔۔۔ میں ان کی جان لے لوں۔ یا۔۔۔ یا خود کو مار لوں یا پھر زندگی بھر ان کی شکل نہ دیکھوں۔ یہ بہت بڑی بات ہے امی۔۔۔ اور پھر اس کے ڈیڈی اس کے غم میں گھل گئے۔ کچھ بھی سہی۔۔۔ وہ اس کے خونی رشتے ہیں۔

میں نے شیر و شکر ہو جانے کی اجازت نہیں دی۔

مگر ایک ذرا سا رابطہ بحال رہنا چاہیے۔ میں بہت ڈر گیا ہوں امی۔۔۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میری مہکی کے پاس اس پوری دنیا میں کوئی محرم نہیں ہو گا۔ ان کے اپنے محرم تو بہت چھوٹے ہیں ابھی۔۔۔"

اس کی آواز کپکپائی۔

بے یقینی آمیز تفکر سے سنتی خدیجہ بانو نے بیٹے کی صورت دیکھی۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ اور ابھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہے، مگر نہ جانے کس خیال بد نے زبان روک لی۔

"میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گی منے!" اتنی جذباتی دلیلوں سے نکلنے میں انہیں دیر تو لگی مگر۔۔۔ وہ خدیجہ بانو تھیں جوان کی دور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں وہ منے کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

"ان کے مسلمان بچوں کا ایک غیر مسلم خاندان سے رشتہ رکھنا اور بچے پر سب سے زیادہ اثر ماں کا ہوتا ہے اور ماں پر اپنے ماں باپ اور گھر کا۔۔۔ تربیت، ماحول سب ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں جب خون جوش مارتا ہے۔"

ہاں وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار تھیں کہ ماریہ جب سے ان کے گھر میں آئی تھی۔ وہ ان کے گھر کے طریقوں پر کاربند رہی تھی۔ مگر۔۔۔ اس لیے کہ خدیجہ بانو کے اصول و ضوابط تھے۔ مگر اس کا کیا بھروسا جب تعلقات بحال ہو جائیں گے تو۔۔۔

"اور آج صرف ماریہ ملے گی تو کل کو بچے بھی۔۔۔ نہیں۔" انہوں نے جھرجھری لی۔ منا متوقع نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"نہیں منے۔۔۔!" ان کا انکار مصمم تھا۔ پھر چہرے پر استہزاء پھیل گیا "ساری دلیلیں بہت خوب دیں تم نے دل لرز گیا میرا۔۔۔ ایک بھی بات جھوٹ نہیں۔ ایک بھی خدشہ، وہم نہیں مگر جن رشتوں کی بات کرتے ہو۔ محرم رشتے ان لوگوں کو کیا پتا، محرم نامحرم ہوتا کیا ہے۔ اس کی کیا تعریف ہے۔ محرم نامحرم کے خانے میں کون کون بیٹھتا ہے۔ انہیں کیا پتا رشتوں کی حد بندی کا تقدس کا۔" ان کا لہجہ ہتک آمیز ہو گیا۔

"نہیں امی!" منے نے شتابی سے انہیں ٹوک دیا۔ "ایسا مت کہیں۔ دنیا کے ہر مذہب میں بھائی بھائی ہوتا ہے۔ باپ باپ اور ماں ماں۔۔۔ دنیا کا ہر معاشرہ اور ہر مذہب بڑے خوب صورت اصولوں پر استوار کیا جاتا ہے۔ وہ اہل کتاب ہیں۔۔۔ اللہ کی قائم کردہ حدود کو مانتے ہیں، کچھ چیزیں روز اول سے واضح ہیں اور آخیر تک واضح رہیں گی۔"

خدیجہ بانو کا سر جھک گیا۔ ہاں وہ اپنے تنفر میں بہت کچھ کہہ دینا چاہتی تھیں۔

وہ جانتی تھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا منبع بھی خدائے بزرگ و برتر ہے اور ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ قرآن پر ایمان رکھے۔۔۔ اور اس سے پہلے کی کتابوں پر بھی۔۔۔ تو یہ غلطی ہو گئی۔ انہیں یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ ان کو کیا پتا محرم، نامحرم کی تفریق و تعظیم کا۔

خدیجہ بانو کی نظر بیٹے کی جانب اٹھی۔ ان کی نگاہ میں شرمساری تھی جبکہ منے کے چہرے پر تاسف انگیز غم تھا۔ بات کہاں پہنچ گئی تھی۔

"دنیا کا کوئی مذہب اور معاشرہ بدی کی ترویج نہیں کرتا امی! ہاں یہ الگ بات ہے کسی فرد پر ابلیس فتح پا جائے اور وہ فرد کسی بھی معاشرے اور مذہب کا پیروکار ہو سکتا ہے۔ کیا ہمارے ہاں برے لوگ نہیں ہوتے۔ آپ ماریہ کو اجازت نہیں دینا چاہتیں۔ میری کسی بات کا اثر نہیں لینا چاہتیں، نہ لیں۔ مگر ایسی باتیں مت کریں جن سے انسانیت کی تذلیل ہو۔"

منا فیصلہ کیے بغیر اٹھ گیا۔ اور یوں فیصلہ خود بخود ماریہ کے حق میں ہو گیا۔

پہلے پہل وہ اکیلی جاتی۔۔۔ مگر پھر گود کا بیٹا ساتھ ہونے لگا۔ وہ دودھ پیتا بچہ تھا۔ جب ڈیڈی کی طبیعت بہت زیادہ بگڑتی تب ماریہ کو اسپتال میں رکنا پڑتا تب بھی بچہ ساتھ۔۔۔ چھوٹے بھائی کو ساتھ دیکھ کر بڑے والا بھی ضد پکڑتا اور ماں کے ساتھ چلا جاتا۔ خدیجہ بانو میری اور مہکی کے سلسلے میں زیادہ احتیاط کرتیں۔ وہ ان دونوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے بہت

فکر مند رہتیں۔ ہمہ وقت انہیں اپنے ساتھ رکھتیں۔
اور ماریہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ٹھیک ہے' وہ پوتیاں اپنی مرضی اپنے حساب سے پالیں۔

عام مسلمان گھرانوں کی نسبت دونوں بچیاں مذہب کے حوالے سے زیادہ باخبر تھیں۔ عام بچوں کو چالیس دعائیں یاد کروائی جاتی تھیں مدرسے میں۔۔۔ انہیں پچاس سے زیادہ یاد تھیں۔ نماز کی فرضیت کی شرط بلوغت تھی۔ آغاز سات برس سے 'میری نے پانچ سال کی عمر ہی میں اپنی چھوٹی سی جائے نماز دادی کے ساتھ بچھانا شروع کر دی۔ ساری دنیا اللہ کی ہے' سو وہ جس رخ چاہے سجدے کرتی رہتی۔ خدیجہ بانو کا سیروں خون بڑھتا۔

پھر سجدے کے مقام کا پتا بھی لگ گیا۔ اور یہ بھی پتا لگ گیا کہ ان کا گھر عام گھروں سے کچھ مختلف ہے اور یہ معلومات خدیجہ بانو کے سوا اور کون دیتا۔ وہ بچوں کے سامنے محتاط روی کی قائل تھیں۔

مگر بلب جلا کر کمرے کی تاریکی کو تو دور کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں چھپایا جا سکتا کہ باہر اندھیرا نہیں ہے۔ حقیقتیں آشکار ہو ہی جاتی ہیں۔ میری اور میگی بھی۔

ماں اور باپ کی لو اسٹوری اور اس میں دادی کے کردار سے واقف ہو ہی گئیں۔

خدیجہ بانو منافقت نہیں کرتی تھیں۔ جو کہتی تھیں بہانگ دہل۔۔۔

اور انہوں نے ماریہ کے کردار کی نفی کر دی تھی۔

اس کی شخصیت کی نفی۔۔۔ وہ جو بہت قابل تھی۔

بہت اچھی پوسٹ پر کام کرتی تھی۔ اور اتنی اچھی تھی کہ ان کے بیٹے نے اس سے عشق کیا تھا۔

اور پھر یہ نہیں دیکھا کسی نے۔۔۔ وہ اللہ کو بھی بڑی پیاری تھی۔ جب ہی تو نوازی گئی۔ کچھ تو بات تھی ناں۔ جو حرف ہدایت دل میں اتر گیا۔ ذریعہ خواہ کوئی بھی رہا ہو۔

تو ماریہ بہت خاص تھی۔ اور اس کی ماریہ کی ذات بڑی منافع بخش تھی۔

وہ صاحب حیثیت تھی۔ مال دار تھی۔ (وہ افسر تھی اور میاں سے کچھ زیادہ کماتی تھی۔)

اور وہ صاحب اولاد تھی انمول منافع۔۔۔ مسافروں کے لیے لگائی گئی پانی کی سبیل جیسی۔۔۔ تو وہ عورت جس نے خدیجہ بانو کا گھر بھر دیا۔

ایسا منافع 'وہ۔۔۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے اور حیادار اور امانت دار بیوی۔۔۔ اچھی بہو۔۔۔ جس نے کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ چپ میں سکھ کو تلاشا۔

لیکن!

وہ جو ایک بار کسی کاغذ پر کاٹے کا نشان لگ جائے۔

تو یہ ایسی ہی نفی تھی۔

بڑا بھید تھا دونوں کے رشتے میں کھنچاؤ۔ سو طرح کی باتیں تھیں 'خیال تھے۔ کچھ وہ جو انہوں نے خود سوچے 'کچھ جن کی طرف ان کا دھیان مبذول کرایا گیا۔ کہنے والوں نے ماریہ کے مسلمان ہونے پر کبھی یقین کیا ہی نہیں۔

"اچھا پڑھ لیا ہو گا کلمہ۔۔۔ مگر وہ بات کہاں جو ایک۔۔"

"پتا تھا ناکہ مسلمان ہوئے بغیر شادی ہو نہیں سکتی بس اسی لیے۔۔۔"

"زبان سے کلمہ پڑھ لیا تو مسلمان ہو گئی۔ اب دل میں کسی کے کیا ہے یہ کس کو پتا۔۔۔ کفار مکہ بھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے تھے تو کوئی ان کے اسلام پر شک نہیں کرتا تھا۔"

انہوں نے اپنے دلائل سے ناقدین کا منہ توڑ دیا۔

ایسی مثالیں اور دلیلیں اور سوال۔۔۔ سب اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

مگر یہ جواب معاملہ بڑ گیا تھا۔ یہی تعلقات کی بحالی۔

یہاں وہ کسی دلیل کو سننے کو تیار نہیں تھیں۔ ان کے گھر کے دروازے ماریہ کے گھر والوں کے لیے سختی سے بند تھے۔ ان کا بیٹا بھی ان کی بات مان کر کبھی نہیں گیا۔ لیکن جب ماریہ گئی تو ایک روز میری اور میگی بھی چلی گئیں اور یہ ایک ایسا محاذ تھا۔ جس پر خدیجہ بانو نے پسپانہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ہمہ وقت تازہ

دم، خنجر بکف سپاہی کی طرح۔۔۔ ان کی توجہ کا مرکز چاروں بچے تھے اور بچے بھی دادی سے شدید محبت و انسیت رکھتے تھے مگر میری۔۔۔ دادی کی مہو۔۔۔

ان دونوں کے بیچ کچھ خصوصی رشتہ تھا۔ مہکی اپنی پڑھائی میں مگن اپنی ذات میں مگن بچی تھی جبکہ میرو۔۔۔ حساس اسے دادی سے محبت تھی۔ مگر اسے ماں سے بھی محبت تھی۔ شاید دادی سے بھی زیادہ مگر یہ چیز اس نے کبھی ظاہر نہیں کی۔

وہ اس ساری صورت حال کو ایک تیسری آنکھ سے دیکھتی تھی۔ اس سارے معاملے کے دو مرکزی کردار تھے۔ ایک خدیجہ بانو ایک ماریہ۔

مگر مہو تیسرا کردار کب بن گئی کسی کو پتا بھی نہ چلا۔

تیسرا کردار جو باقی دو پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ سوچتا تھا۔ محسوس کرتا تھا۔ اسے فکر تھی۔

اس کی مضبوط شخصیت کے پیچھے یہ کمزور پہلو تھا۔ دکھ تھا جس نے اسے اندر ہی اندر گھلایا تھا۔ اسی دکھ نے اسے بنایا بھی تھا۔ اس کی سوچ۔۔۔ اس کے عزائم اس کی شخصیت۔

ممی کی میری۔۔۔ دادی کی مہو۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔

اس کے حالات عام نہیں تھے۔۔۔ وہ خود بھی عام نہیں تھی۔

وہ چکی کے پاٹ میں دانے کی طرح پسی نہیں تھی۔ مگر کسی بچے کے ہاتھ چڑھی گیند کی طرح ادھر ادھر اچھلی ضرور تھی کبھی اس جانب کبھی اس جانب۔

خدیجہ بانو کو لگتا ان پر آزمائش آگئی۔ ماریہ کی اپنی مصیبت اور میری کی۔۔۔؟

☆ ☆ ☆

"بہت عقلمندانہ اور احسن اقدام ہوگا۔" مفتی عبدالرحمن چل چل کر ہانپ گئے تھے۔ بینچ پر بیٹھ گئے۔ ایک ہاتھ آگے آئے پیٹ پر ٹکا لیا، دوسرے سے داڑھی کو سہلانے لگے۔

"مناسب بلکہ بروقت کہوں گا۔ نکاح برائیوں کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتا ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے بہت برکت و خیر رکھی ہے اس رشتے میں۔"

"ہاں۔۔۔!" محی الدین سہگل ان کے سامنے کھڑے تھے۔ مفتی عبدالرحمن کے مثبت تبصرے نے ان کا دل خوش کردیا تھا۔

"اور سب سے زیادہ حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ۔۔۔" مفتی صاحب کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ ایک منٹ میں 62 قدم لیں اور جب تک پسینہ نہ آئے واک کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

"سمیع الدین نے سارے حق دے دیے اور معذرت مگر صاف گوئی سے کہوں تو مجھے اس سے اتنی تابع داری کی امید نہیں تھی کہ آنکھ بند کرکے سب کچھ تمہیں سونپ دیا۔ آج کے ماڈرن ازم میں لڑکے تو لڑکے لڑکیاں تک منہ پھاڑ کر اپنی پسند ناپسند بتاتے ہیں۔"

"معذرت کی کوئی بات نہیں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے بھی امید نہیں تھی۔ بلکہ مجھے تو خدشہ تھا وہ میری طرف سے تادیب و تنقید سن کر ہتھے سے ہی نہ اکھڑ جائے مگر یار اس نے تو مجھے حیران کردیا بلکہ بے حال کردیا۔ کہتا ہے جو بھی ہم پسند کریں۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ آپ کی بھابھی نے بعد میں بہت سے سوال پوچھ ڈالے۔ کیسی لڑکی ہو؟ گوری لمبی موٹی پڑھی لکھی۔۔۔ کوئی خاص شرط مگر اس نے اپنے برٹش اسٹائل میں شانے اچکا دیے۔

جو ہمیں بہتر لگے۔ اور پھر جب ہمارا زور بہت زیادہ بڑھا کہ کچھ تو بولے۔۔۔ تو معلوم ہے اس نے کیا کہا۔"

مفتی عبدالرحمن نے نظریں اٹھا کر دیکھا محی الدین کے پاس کچھ خاص بات تھی۔

"کیا کہا۔۔۔؟" مفتی صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

"اس نے کہا، جیسی بھی ہو بس کہیں سے بھی اس میں اسکارلٹ کی جھلک نہ ہو۔" محی الدین نے تیزی سے جملہ مکمل کیا۔ ان کی آواز سے خوشی و کامیابی جھلکتی تھی۔

مفتی صاحب نے لب بھینچ لیے۔ پھر نظر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ جہاں سے صبح کے پرندوں کا

ایک غول گزرا تھا۔ اور محی الدین جو اپنی اتنی بڑی کامیابی پر شاید مبارک باد چاہتے تھے۔ انہیں یہ خاموشی کھلنے لگی۔

"تم کچھ کہو گے نہیں مفتی عبیدالرحمن۔"

"الفاظ گم ہو جانے کے بارے میں تو سنا ہو گا۔ یا کبھی تجربہ ہوا ہو؟" انہوں نے الٹا سوال کر دیا اور محی الدین بری طرح چونکے۔ مفتی صاحب دل گرفتہ نظر آتے تھے۔ حالانکہ انہیں تو ان کی خوشی میں شریک ہونا چاہیے تھا۔

کتنی بڑی بات تھی۔ سمیع الدین نے کہا "وہ ماں جیسی نہ ہو۔" بالکل نہ ہو کبھی نہ ہو قطعی نہ ہو.... نہ نہ اور نہ۔

اف .... کتنی خوشی اور فخر سے دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ غیر متوقع لاٹری جیسا جملہ۔

مگر مفتی صاحب کے چہرے پر یہ کیسا غم تحریر ہو گیا تھا۔

"قیامت سے بڑی قیامت ہے مولانا کہ ایک بیٹا ماں کے لیے ایسے الفاظ ادا کرے۔" مفتی صاحب کا دل حقیقتاً "کانپ گیا تھا۔

"وہ اسی قابل ہے کہ...." محی الدین سہگل ایک پل کے سکوت کے بعد بہت تیزی سے بولے تھے۔ لہجے کا جارحانہ پن نمایاں تھا۔

"کون کس قابل ہے اس کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔"

"میں نے کچھ نہیں کہا۔ جو کچھ کہا اس کے بیٹے نے کہا۔" محی الدین سہگل جیسے لڑنے لگے تھے۔

"ہاں تو اسی چیز سے تو میں نے پناہ مانگی ہے۔ خدا کسی پر ایسا وقت نہ لائے۔"

"اس جیسی عورت کے ساتھ اس سے بھی برا ہونا چاہیے۔" محی الدین کا لہجہ زہر خند تھا۔

"اس سے زیادہ اب اور کیا برا کہ بیٹا ماں کے بارے میں...."

"ہاں تو کیا غلط کہا اس نے.... میں ہزاروں میل دور بیٹھا تھا وہ تو ہر پل اس کے ساتھ رہا ہے۔ اس سے زیادہ کون واقف ہو گا اس کے کرتوتوں سے۔ اس کی حرکتوں سے اور تم ہو کہ اس کے وکیل بن رہے ہو۔" محی الدین کے غصیلے لہجے میں غم گھل گیا۔

"میں کسی کا وکیل نہیں ہوں محی الدین!" مفتی صاحب بھی سنجیدگی کی حد پر پہنچ گئے ورنہ تو وہ انہیں بہت لاڈ سے مولانا پکارتے تھے نا۔

"اللہ کی عدالت میں وکالت نہیں چلتی۔ کیونکہ وہ ہر چیز کا خود گواہ ہے تمہاری بہو۔ کیا نام بتایا؟" وہ اٹکے۔

۔ محی الدین نے منہ پھیر لیا۔ وہ اپنی زبان گندی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسکارلٹ.... اس کا.... (چہرے کا بدنما نشان.... ان کے خاندان پر لگنے والا دھبہ.... ان کی نسل کی بدنمائی)

"خیر جو بھی۔" مفتی صاحب نے سر جھٹکا۔

"آج اس کے بارے میں جو کچھ تمہارا پوتا کہہ رہا ہے۔ اگر تم محسوس نہ کرو۔ اور ذہن پر زور دو تو کل کو ایسے ہی۔۔ یا اس سے کچھ ملتے جلتے جملے بدرالدین.... تمہارے بیٹے نے تمہارے بارے میں کہے تھے اور تم نے رو رو کر مجھے بتائے تھے۔"

"اوہ....!" محی الدین چونکے۔ پھر چہرے پر سخت استہزاء پھیل گیا۔

"تو اب تم مجھے طعنے مارو گے عبیدالرحمن!" ان کا لہجہ زہر آلود ہو گیا تھا۔

"نہیں...." مفتی صاحب نے تحمل سے سرہلایا۔

"طعنے مارنا میری عادت ہی نہیں۔ میں وہ کہنے لگا ہوں جو میں نے اس وقت کہا تھا اور آج بھی کہہ رہا ہوں۔ اس سب میں صرف تم قصوروار ہو۔ جو کچھ بدرالدین کے ساتھ ہوا اس کے لیے صرف تم ذمہ دار ہو۔ کل بھی۔ اور آج بھی۔

اور اب میں مزید کچھ نہیں بولوں گا۔ تم خود سوچو.... اور اگر مجھے غلط پاؤ تو گریبان پکڑ لینا.... میں کھڑا ہوں مگر میں جانتا ہوں اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

مفتی عبیدالرحمن کی آواز و لہجہ دوٹوک ہو گیا۔ مگر اس میں موجود غم و اندوہ مخفی نہیں تھا۔

اور محی الدین سہگل کے کندھے جھک گئے۔ سر بھی.... اور ہمت بھی۔

"سمیع الدین صرف ماں سے تو بے زار نہیں ہے۔ اسے باپ سے بھی کوئی دلچسپی نہ ہے۔ اولاد سے بڑھ کر بھی بھلا کوئی اثاثہ ہوتا ہے۔

اور میں اپنی طرف سے قیافے اور قیاس نہیں لگا رہا۔ میں وہی جانتا ہوں جو تم نے مجھے بتایا۔ اور وہ بھی اتفاقاً"۔"

مفتی صاحب یکدم خاموش ہو گئے۔ شاید اس وقت کو یاد کرنے لگے تھے۔ جب کئی سال پہلے وہ دونوں بہت سال اور اتفاقاً" ایک فلائٹ پر مل گئے تھے اور محی الدین، بدر الدین اور اسکارٹ سے مل کر لوٹے تھے۔ ان کا چہرہ داستان سناتا تھا۔

انہیں ایک کندھا درکار تھا۔ ایک سامع چاہیے تھا۔ جو سنے اور تسلی دے اور پھر انہوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ وہ جو دیکھ کر آئے تھے۔ اسکار اور بدر اور جو ہوش ربا باتیں سنی تھیں اور فلپ کے بارے میں.... وہ کیسے ان ہی کے گھر کے اندر.... ان کی ناک کے نیچے سے اونٹ نکال کر لے گیا۔ اور.... انہوں نے سب کہہ دیا اور مفتی عبید الرحمٰن نے اس وقت بھی ہاں میں ہاں نہ ملائی نہ تسلی نہ دلاسا اور بولے تو کیا؟ وہی جو آج کہا۔

"اس سب میں صرف تم قصور وار ہو۔ جو کچھ بدر الدین کے ساتھ ہوا اس کے لیے صرف تم ذمہ دار ہو۔"

"دوستی میں واعظ نہیں کرتے۔ نصیحت بھی دراڑ ڈال دیتی ہے۔ اور عیب گنوانا بھی سب سے بڑی خطا بن جاتی ہے مگر بدر الدین کی بربادی میں ہمیشہ سب سے بڑا ہاتھ آپ کا اور آپ کی زوجہ محترمہ کا ہے۔"

محی الدین نے چشمہ اتار کر اس کے شیشے صاف کیے۔ آج سورج کو نکلنے میں کیا تامل تھا۔ آخر صبح کیوں نہیں ہو رہی۔ یہ کیسی دھند ہے۔ یہ کیسا اندھیرا ہے۔

مفتی عبید الرحمٰن جن کی آواز پرملال تھی۔ پرجلال بھی.... ان کے جملوں میں غم انگیزی کا پہلو تھا تو فکر انگیزی بھی.... طنز کے نشتر تو نہیں تھے۔ مگر چبھن ویسی ہی۔

"اولاد کا ہو جانا نظام قدرت ہے محی الدین سہگل۔ مگر تربیت سے دنیا کا نظام چلتا ہے۔ ورنہ بیلوں کے تھان طویلے کا منظر ہوتی دنیا.... سدھانے سے تو جنگل کا خونخوار شیر بھی سر جھکا لیتا ہے۔ انسان تو پھر بھیجا ہی سیکھنے کے لیے گیا ہے۔

اور تربیت کرنے والوں میں ماں کا درجہ سب سے بلند ہے۔ اس کی ذمہ داریاں سب سے بڑھ کر.... مگر محی الدین بھول گئے۔

یہ فیضان نظر تھا یا مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

الزام تراشیوں کے بجائے اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ گریبان میں جھانکنا چاہیے۔"

انہوں نے ٹوپی کو اتار کر اسے جھاڑا اور دوبارہ سر پر جماتے ہوئے اپنی راہ لی۔ محی الدین ساکت کھڑے تھے۔

"اللہ سبحان و تعالیٰ فرماتا ہے۔ خصوصی طور پر ماؤں کے لیے۔ ورنہ باپ کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔

مگر میرے دوست.... ماں تو تلی اور بکری بھی بن جایا کرتی ہیں مگر روز حشر مواخذہ صرف انسان کا ہو گا۔ (صرف والدین کا ہو گا)

رخصت ہوتے ہوئے مفتی عبید الرحمٰن نے یوں ہی یاد آنے پر بڑے دکھی دل سے یہ آخری بات کہی تھی اور محی الدین پتھر کے مجسمے میں ڈھل گئے تھے۔ زمین نے ان کے قدموں کو جکڑ لیا تھا۔ بعض اوقات سارے بیان و فرمان فضول ہو جاتے ہیں اور فقط ایک جملہ حاصل کلام ہوتا ہے۔

سوال بھی، جواب بھی.... پھر اس کے بعد چاہے سارا لکھا پڑھا، دیکھا سنا فراموش کر دیا جائے۔ تو یہ آخری والی بات وہی بات تھی۔

✿ ✿ ✿

"ریلنگ پر ہاتھ سرکاتی، منہ اوپر کو اٹھا کر محتاط

قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی یہ صبغہ تھی۔ وہ دوپہر کی نیند سے شدید پیاس کے تقاضے پر اٹھی تھی۔ ارادہ یہی تھا۔ پانی پی کر دوبارہ سوئے گی مگر..... آواز.....

اوہ..... چھت پر آتے ہی اس کا گمان یقین میں بدل گیا۔ یہی اپنی حسنل..... حسن المآب بی بی.....

چھت کی چھوٹی جالی دار دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی حسنل کی گردن بائیں جانب ڈھلکی ہوئی تھی۔ نیم وا آنکھیں، ایک ہاتھ میں چھوٹا سا آئینہ تھا۔ جس میں وہ اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اٹھے گھٹنے اور جھکی گردن کے بیچ پاکٹ ریڈیو پھنسا تھا۔

صبغہ کے اندر حیرت اور پھر طیش کی شدید لہر ابھری۔ جب اس نے میوزک کی آواز سنی تھی کان تو تب ہی کھڑے ہو گئے تھے۔

ہو نا ہو یہ حسنل ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ نہیں بھی ہو سکتی۔ موہوم سی امید کی وجہ وہ عزت افزائی تھی۔ جو کل رات ہی صبغہ نے فرمائی تھی۔

جب رات کے پچھلے پہر وہ گہری نیند کی آغوش میں تھی۔ باغ، ہوا، اڑن کھٹولا..... اور بانسری کی مدھر آواز۔

اور تب ہی خواب کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ اوہ تو یہ خواب تھا۔

پھر آواز کہاں سے آ رہی تھی اور کہیں دور سے تو نہیں آ رہی تھی۔ بہت نزدیک سے جیسے کوئی کان میں منہ دے کر..... اوہ..... یہ آواز تو اس کے ساتھ کے پلنگ سے اٹھ رہی تھی۔ اس نے آواز کا منبع تلاش کر لیا اور جھٹکے سے حسنل کے اوپر تنی چادر جھپٹ لی۔

حسنل بری طرح گڑبڑائی۔ اس کے کان کے پاس پاکٹ ریڈیو پڑا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ صبغہ جھپٹتی اس نے ریڈیو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"یہ....." صبغہ نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"ہاں یہ ریڈیو۔"

"تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

"ماہ رو سے مانگا تھا۔ وہ میچ کمنٹری سننے کے لیے لائی تھی۔"

"اوہ..... تو اس وقت بھی ہو رہی ہے۔ کمنٹری۔" صبغہ نے ٹیوب لائٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔ حسنل نے بے ساختہ آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔

"بند کرو لائٹ" آنکھوں پہ پڑتی ہے۔"

"کر دوں گی۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو۔" صبغہ نے چبھتی نگاہوں سے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا جواب دوں بھلا..... پاگل ہو تم۔ رات کے تین بجے کون سا میچ ہوتا ہے بھلا۔"

اس کا انداز مذاق اڑاتا سا تھا۔ ریڈیو تکیے کے نیچے دبا کر وہ اپنا کھل جانے والا جوڑا کسنے لگی۔ شہد رنگ لچھوں کے کلائی پر بل کھاتے بل.....

"تو پھر.....؟" صبغہ کا انداز ہنوز وہی تھا۔

"پھر..... تم کیا تفتیشی افسر بن گئی ہو۔ گانے سن رہی تھی۔" اس نے لاپروا انداز اختیار کیا۔

"کتنی بری بات ہے حسنل..... نانا جان کو پتا چل گیا تو..... اور باقی کسی اور کو بھی۔"

"کیسے پتا چلے گا..... تم بتاؤ گی؟" وہ گہری نظر سے دیکھنے لگی۔

"جیسے مجھے پتا چل گیا' ویسے ہی ان کو بھی پتا لگ سکتا ہے۔" صبغہ شاید اسے ڈرانا چاہ رہی تھی۔

"ریڈیو کی آواز تو نہیں گئی۔ مگر تمہاری بحث سے ضرور سب کو پتا چل جائے گا۔" اس نے سخت نگاہوں سے دیکھا۔

صبغہ نے بے ساختہ لب بھینچے۔ بہن بچپن سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ اور طرح کا مزاج تھا۔ کٹا کٹا خفا خفا مگر کچھ عرصے سے بہت ہی دور لگنے لگی تھی۔

اس نے اٹھ کر ٹیوب لائٹ بند کر دی۔ حسنل پہلے ہی چت لیٹ چکی تھی۔ وہ زیر لب سونے کی دعا پڑھ رہی تھی۔ صبغہ نے تحمل سے انتظار کیا۔

اور سونے کی دعا اتنی لمبی تو نہیں ہوتی۔ نانا جان کہتے تھے "چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گردو پیش میں ایک حصار سا باندھ لینا چاہیے۔ اور اگر اپنے مرحومین کو بھی بخش دیا جائے تو بہت اچھا۔"

لیکن اتنی دیر تو اس میں بھی نہیں لگتی۔ صبغہ کی

نگاہیں اس پر ٹکی تھیں۔

حسنل نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اب وہ خود پر پھونک مار رہی تھی۔ تب ہی متفکر بیٹھی صبغہ پر نگاہ پڑی تو وہ کچھ سٹپٹائی۔ مگر صبغہ نے غور نہ کیا۔ اُسے کچھ کہنا تھا اس سے۔

"واپس دے کر آنا کل اسے... اور دوبارہ مت لانا۔"

"کیوں... دو چار گانے سن لینے سے کیا ہو جائے گا؟"

"بات گانوں کی نہیں ہے اس ماحول و تربیت کی ہے جس میں ان سب لغویات کی گنجائش نہیں۔"

"اب تم رات کے اس پہر مجھے تلقین کرو گی۔ اچھائی برائی کا فرق۔ مجھے تم سے اس وقت بحث نہیں کرنی۔" وہ پھولے منہ کے ساتھ دوبارہ تکیہ درست کرنے لگی۔

"اوکے، تم وقت طے کر لو ہم بحث کو یہیں سے کنٹی نیو کریں گے۔"

بہن تو وہ پھر اسی کی تھی نا اتنی آسانی سے ہار نہیں مان سکتی تھی۔

حسنل کے ابرو آپس میں مل گئے۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"وہی جو تم سننے کو تیار نہیں ہو۔ میں نے کہا ناں ہم پھر کسی وقت اس موضوع پر بات کریں گے۔" صبغہ کے لہجے میں قطعیت گھل گئی۔

اور اس بار حسنل بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ صبغہ نے تکیہ درست کیا اور سر تا پا چادر تان لی۔

اور اب اس وقت چھت پر ایک بار پھر حسنل کو اس ریڈیو کے ساتھ دیکھ کر اسے خیال آیا کہ دراصل یہ وہ وقت ہے جب اس سے اس موضوع پر بات کی جا سکتی ہے۔

"تم نے ماہ رو کو ریڈیو واپس نہیں کیا؟"

"کروں گی۔" حسنل کا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔

"لیا ہی کیوں تھا۔ تم تو مانگ کر چیز لینے والی کبھی نہیں تھیں۔ اب کیا ہو گیا۔" وہ واقعی حیران تھی اور

حسنل کو اس کے لہجے کی چبھن نے ہنسا دیا۔

"مانگوں گی کیوں... میں نے اسے خرید لیا ہے۔" اس کے انداز میں مالکانہ استحقاق و خوشی ابھر آئی۔

"خرید لیا ہے۔" حیرت کی زیادتی سے صبغہ کا چہرہ و آواز بگڑ گئی۔ "یہ ریڈیو؟"

"ہاں یہ ریڈیو۔" حسنل نے ریڈیو پر ایسی پیار کی نظر ڈالی اور شفقت سے ہاتھ پھیرا جیسے کبوتر ہو۔

"تمہیں اس کو خریدنے کی کیا ضرورت پڑ گئی حسنل؟"

"ضرورت!" حسنل چونکی ہوئی پھر سرسری۔ "یونہی گانے سننے کے لیے اور کس لیے لیتے ہیں ریڈیو"

"تم کب سے موسیقی کی اتنی رسیا ہو گئیں۔" صبغہ کی آواز بلند ہو گئی۔

"رسیا کا کیا مطلب ہے۔ میوزک تو سب ہی کو اچھا لگتا ہے۔ تم نے سنا نہیں موسیقی روح کی غذا ہوتی ہے۔"

"ہاں! سن رکھا ہے۔" صبغہ کے لہجے میں طنز کی آمیزش ہو گئی۔ "ہمارے جسم کی طرح ہماری روح بھی حرام کھانے کی عادی ہو گئی ہے۔ تم نے شاید یہ نہیں سنا۔"

صبغہ نے مفتی عبید الرحمٰن کے الفاظ دہرائے تھے اور سارے جواب سوچ کر بیٹھی حسنل کی بولتی بند ہو گئی۔ (ایسا منہ توڑ جواب... جس کے بعد گنجائش نہ رہے کسی بھی بات کی)

"اور یہ تم شیشہ لے کر کیا کر رہی تھیں۔" صبغہ کی نظریں دوسری قابل اعتراض چیز پر پڑیں۔ "موچنے سے بھنوؤں کے بال نوچ رہی ہو گی ناں۔ تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے امی نے، یہ بھی گناہ ہے اور پھر تمہیں ضرورت بھی کیا ہے حسنل۔ اللہ نے تمہیں کتنی خوب صورت بھنویں دی ہیں۔"

صبغہ کا پریشان لہجہ لجاجت آمیز ہو گیا۔ ادھر حسنل ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اور جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ ذرا سا اچھل کر دکھایا، کپڑے جھاڑے۔

"کہاں ہے میرے پاس موچنا۔ یہ لو ہے کہیں۔ نظر آرہا ہے۔ خوامخواہ میرے پیچھے پڑی ہو۔ کس نے میری ٹوہ میں رہنے کا کہا ہے۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ٹوہ میں رہنے کی۔ گہری نیند میں جب کانوں میں چوں چوں ہو گی تو آنکھ تو کھلے گی ناں۔"

"جاؤ جو جی میں آئے کرو۔ جا رہی ہوں میں۔ سارے الٹے کام تم ہی کو کرنے آتے ہیں۔ اللہ جانے کن ہواؤں میں ہو۔ سنو گانے اور دھنو سر تب پتا لگے گا جب قیامت کے دن اللہ پوچھے گا۔ ہنہ۔"

صبغہ کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ پیر پٹختی نیچے اتری۔ ارادہ شکایت لگانے کا تھا۔ مگر امی کا غصہ خراب تھا۔ وہ سارے گھر کو اکٹھا کر کے معاملہ سلجھانے لگ جاتیں۔ یا پھر منہ پر دوپٹا رکھ کر رونے دھونے لگتیں۔ (پتا تب بھی لگ جاتا سب کو)

اور پھر بدتمیز سی بہن تھی ناں... اوپر سے امی پیاری

حسنل نے اس کے چلے جانے کا یقین ہو جانے پر ایک بار پھر سابقہ حالت میں بیٹھ کر ریڈیو آن کر لیا۔ اسے معلوم تھا۔ صبغہ اسے دھمکا کر گئی ہے' کہے گی کسی سے کچھ بھی نہیں۔ آخر کو بہن ہے ناں...

لیکن حسنل تم کو محتاط رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو ریڈیو سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں کتنی بڑی خوشی ملی تھی نعمت غیر مترقبہ۔

کالج میں لڑکیوں سے سنا تھا۔ موسیٰ کے گانے بار بار بجتے ہیں اور اس کی آواز... لڑکیاں غش کھا کھا کر ایک دوسرے کے کندھوں پر گرتیں۔ اس روز کنسرٹ میں تو وہ بس اسے دیکھنے میں محو ہو گئی تھی۔ آواز پر تو دھیان ہی نہ گیا اور جب آواز سنی تو۔

اس کی آواز بھی بہت دلکش تھی۔ جب کنسرٹ میں وہ آڈینس کو ہے گرلرہا تھا اویسے..." کہتا تھا۔ اور اب جب اس نے اس کا گانا سنا۔ دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئیں۔ اس کے رخسار تپ گئے۔ سانس حلق میں آکر اٹک گئی تھی۔ اس کے پورے جسم کا درجہ حرارت بڑھ گیا تھا۔

ایک ایک لفظ امرت بن کر کانوں میں اتر رہا تھا۔ مسحور کرتی آواز۔ گانا ختم بھی ہو گیا مگر اس نے جنبش نہ کی۔ اسے لفظ لفظ ازبر ہو گیا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ اس کی آواز یا اس کے گانے دنیا سے نرالے یا خوب تھے۔ بہت اچھی آواز تھی اور گانوں کی شاعری و موسیقی بھی اتنی اچھی کہ وہ آتے ہی چھا گیا تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ حسنل اس سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔

اور اس کی یہ پسند عارضہ بن رہی تھی۔ اندھا جنون نابینا کی دوڑ... یا تو ٹھوکر کھائے گا یا کھائی میں جا گرے گا۔ امی کو خبر ہو جاتی بالفرض... کیا کرتیں' وہ پہلے تو بے یقینی سے ہی ابھر نہ پاتیں۔

گھر کی چار دیواری کے اندر' معاشرتی دند ہی حدود و قیود کے زیر اثر رہنے والی لڑکی سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی جس کا اپنا ایک جہان تھا۔ جس میں وہ پہلے ایک خیال ایک تصور کے ساتھ رہتی تھی۔ اور اب اسے ایک نام مل گیا تھا۔ وہ صبح و شام اسی کے ساتھ کرتی۔ آئینے میں خود کو دیکھتی تو گویا اس کی نگاہوں سے دیکھتی۔ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے تک وہ ساتھ رہتا۔

رات کو بستر میں جاتی تو لائٹ آف ہوتے ہی اس کا جہان روشن ہو جاتا پھر تصور کی دنیا سج جاتی۔ باتیں روٹھنا' منانا رونا اور ہنسنا۔

ایک آدھ بار صبغہ نے شانہ ہلا کر پوچھا۔

"تم سو رہی ہو یا ہنس رہی ہو حسنل؟"

تب وہ متبسم لہجے میں چادر ہٹائے بغیر جواب دیتی۔

"سو رہی تھی۔ بس وہ ماہ رو کی حرکتیں یاد آگئیں۔ یا اریبہ کی کوئی بات یا کالج کا فلاں قصہ۔" اور صبغہ سر ہلا دیتی۔

ہاں یہ عین ممکن تھا۔ وہ بڑی متوازن شخصیت کی مالک تھی۔ کچھ دینی رجحان کی طرف فطرتاً" مائل تھی کچھ گھر کے ماحول کا اثر تھا۔

اور اگر اسے پتا لگ جاتا یا اسے ٹیلی پیتھی آتی اور وہ حسنل کے دماغ میں جھانک کر اس شہر کو دیکھتی جو اس نے بسا رکھا تھا۔ اور جس کی وہ ملکہ تھی اور بادشاہ۔؟ تو صبغہ کے لیے اور باقی سب کے لیے بھی یہ یوں ہوتا جیسے ان سب نے حسنل کو رنگے ہاتھوں۔۔۔ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

اور پھر امی اس کے گال تھپڑوں سے لال کر دیتیں۔

اور نانا جان اسے گولی مار دیتے۔ پھر خود کو بھی۔

"اچھی تعلیم و تربیت سوچوں کو نکھارتی ہے۔ جس کی اس گھر میں کمی تو نہیں تھی۔ حسنل ہی تو اپنے گھر کو گھر نہیں علم و حکمت کا گہوارہ کہتی تھی۔

پھر ایسا کمال کا چور رستہ کہاں سے ڈھونڈا۔ اللہ رے اللہ اور صفائی نصف ایمان ہے۔ جسمانی اور۔۔۔ اور ذہنی بھی۔ خواہش ایک الگ چیز ہے۔ کسی کے بارے میں سوچا بھی جا سکتا ہے لیکن ایسا جنون اور ایسی اندھی خواہش۔۔۔ اور پھر حصول کے لیے وہ کوششیں جو حسنل کر رہی تھی۔ اتنے یقین و تڑپ سے تو لوگ اللہ کو ڈھونڈنے نکلتے ہیں اور وہ بندے کے لیے افسوس صد افسوس۔۔۔ شرف ہر ایک کے لیے نہیں ہوتا۔

جیسے پتھر کو موم کرنے کا ہنر آتا ہو۔ موم بنانا آتا ہو مگر کبھی شمع نہ بنائی ہو۔

جیسے کوزہ گر بے ڈھنگے برتن بنائے محض زعم میں لاپروائی میں۔۔۔ ہنر ضائع کرنے کے لیے ودیعت نہیں کیے جاتے۔

گویائی سب کو ملتی ہے مگر کچھ دشنام طرازی کرتے اور کچھ کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔

تو یہ تو پھر ظرف کی بات ہوئی کہ ہم اپنے اپنے ہنر کو کس طرح استعمال میں لاتے ہیں۔ خیر کے لیے۔۔۔ یا شر کے لیے۔

اور اللہ نے حسنل کو یقین کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔

اب اس کرم سے اسے کیسے فائدہ حاصل کرنا تھا۔ وہ فیصلہ کرتی مگر آثار تو کچھ اچھے نظر نہیں آتے تھے۔

"اللہ صرف لے کر نہیں آزماتا۔ دے کر بھی آزماتا ہے۔"

☆☆☆

تین چار گلاس پانی پی کر بھی صبغہ کو سکون نہ ملا۔ ٹہلتے ہوئے حسنل کی بابت ہی سوچ رہی تھی۔ وہ شروع ہی سے کٹی کٹی رہتی تھی مگر اب کچھ عرصے سے تو بہت ہی دور لگنے لگی تھی۔ تو سبب کیا ہو سکتا تھا۔ دوستیں اس کی وہی پرانی تھیں۔ وہ انہیں اچھی طرح جانتی تھیں۔

تو پھر وہ کیوں بدل رہی تھی۔ کس وجہ سے بھلا؟

نانا جان سے وہ ذکر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بڑے روشن خیال تھے۔ اور اگلے انسان کو گنجائش دیتے تھے۔ عوامل و وجوہات ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔

نانا جان کے علاوہ صبغہ کی سوچوں کا ایک ذریعہ کتب خانے کا فیض بھی تھا مگر پھر یہ کیسی کھٹک تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

دونوں نے کمرے کی دیواریں بانٹ رکھی تھیں۔

صبغہ کی طرف پروال کلاک اور کچھ سینریاں تھیں جبکہ حسنل نے وقتاً" فوقتاً" دوستوں کی جانب سے دیے جانے والے کارڈز کو بہت اہتمام سے دیوار پر آویزاں کر رکھا تھا۔ بہت ساری کی چین بھی ٹنگی تھیں۔ رنگین دھاگوں سے گندھی، موٹی چوٹی کیل سے لٹک رہی تھیں سرے پر ننھے گھنگھرو تھے جنہیں یوں ہی آتے جاتے چھیڑ دینا بھی ایک مشغلہ تھا۔

"امی مصلحتاً" چشم پوشی کرتیں۔ اصل غصہ صبغہ کو آتا جب وہ گہری نیند میں ہوتی تو حسنل شرارتاً" چوٹی کو ہلا دیتی۔ صبغہ چراغ پا ہو جاتی۔

گھر نہ ہوا مندر ہو گیا۔

مگر کتنے دن گزرے، یہ شرارت بھی نہیں ہوئی تھی۔ تو کیوں؟ سوال پھر وہیں آکر رک گیا تھا۔ دیوار سے ہٹی تو الماری تک آگئی۔ پٹ نیم وا تھا۔ ہاں کچھ دنوں سے وہ بدسلیقہ بھی ہو گئی تھی۔ اور لاپرواہ بھی۔

"پھر یہ کیا ہے؟" پٹ بند کرتے ہوئے کچھ اس کے قدموں میں گرا تھا۔ سیاہ تھیلی... اس نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ گانٹھ کھولتے ہوئے اتنی سخت... پر اس نے کھول ہی لی۔ اس کے چہرے پر سکون ابھرا۔ اگلی ہی ساعت میں اپنی چٹکیوں میں ایک جیکٹ شانوں سے پکڑ کر کھڑی تھی اور سخت ناسمجھی و حیرانی سے اسے دیکھتی تھی۔

یہ کیا تھا... کس کی تھی اور یہاں حسنل کی الماری میں... بلکہ صبغہ کے کمرے میں بھی کیوں؟

تھیلی میں کچھ اور بھی تھا۔ وہ اٹھانے کو جھکی ہی تھی۔ جب دھاڑ سے دروازہ کھلا۔ اس سے بڑی دھاڑ حسنل نے لگائی۔ وہ اس کے سر پر پہنچ کر جیکٹ جھپٹ چکی تھی۔

صبغہ بھونچکی رہ گئی۔

"تم نے میری الماری کھولی؟" اس کی صرف آنکھیں انگارہ نہیں ہوئی تھیں' لہجے میں بھی شعلوں کی سی لپک تھی۔ "تم میری الماری کی تلاشی لے رہی تھیں۔" اس نے صبغہ کی کلائی جکڑلی اور گرفت اتنی ہی سخت' جتنی سختی سے اس نے اپنے دانت پیسے تھے۔

"نہیں۔" ایک لحظے کی حیرت کے بعد صبغہ نے اپنی کلائی چھڑواتے ہوئے لب کھولے۔ "پٹ کھلا تھا۔ بند کرنے لگی تو یہ شاید نیچے گر گیا۔"

"تو اب تم جھوٹ بھی بولوگی۔" وہ مصر تھی۔ ادھر صبغہ نے جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑوالی اور سخت تاسف سے اس نشان کو دیکھا جو سخت گرفت کے باعث ہتھکڑی کی طرح کلائی پر اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ سرخ دائرہ۔

"میں کیوں لوں گی تلاشی... تمام معترضہ اشیاء تو تمہارے ہاتھ میں ہیں۔" اس کا اشارہ جیکٹ شاپر اور ریڈیو کی طرف تھا۔

"یا اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے اندر... پہلے تو نہیں دیکھا پر اب دیکھوں گی۔" صبغہ بھی بپھر گئی۔ اس نے پوری طاقت سے پٹ وا کر دیا۔

حسنل کے چہرے پر طیش کی لہر ابھری۔ پھر کسی خیال کے تحت معدوم ہو گئی۔ اندر کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ تھا اس کے ہاتھ میں تھا۔ موسیٰ کے گانے (ریڈیو)

موسیٰ کی جیکٹ اور شاپر میں موسیٰ کی تصویروں والے اخبار ور سائل۔

صبغہ نے حسنل کی بے فکر اجازت سے جان لیا۔ وہ بے سود کی محنت کرنی تلاشی کے نام پر۔

"میں امی کو بتاتی ہوں جاکر۔" حسنل کا دل ڈوبا مگر اس نے فوراً" خود پر قابو پایا۔ اسے خود کو نارمل رکھنا تھا۔

"شوق سے مگر کیا بتاؤ گی؟ ریڈیو امی کو معلوم ہے۔ مجھے ریڈیو ایک نہ ایک دن لینا ہی تھا۔ اور یہ جیکٹ... اریبہ کی ہے اور اس شاپر میں..."

"یہ بہت مہنگی برانڈڈ جیکٹ ہے حسن المآب! اریبہ کے پاس کہاں سے آئی؟" صبغہ کے چہرے پر جھوٹ پکڑنے پر شرم دلانے کا انداز ابھرا۔ حسنل گڑبڑائی مگر اس نے فوراً" قابو پایا۔

"اریبہ کی ہے "نہیں... یہ ماہ رو کی ہے۔" اسے اب صحیح بہانہ سوجھا۔

"تم نے اریبہ کا نام لیا تھا۔"

"تم ٹوکے بغیر سن لو تو نام بھی کلیئر ہو۔" اس نے ناراضی سے کہا۔

"اس روز کنسرٹ میں ماہ رو بھول آئی تھی۔ اریبہ نے اٹھالی۔ اب چھپائی ہوئی ہے۔ ماہ رو کے بھائی کی ہے۔ اس کی جیب ہلکی کروائیں گے کسی دن اسی لیے چھپا کر رکھی ہے اور تم..." اس کے لہجے میں جیسے صبغہ کی چھوٹی سوچ کے لیے تاسف اتر آیا۔

صبغہ کی آنکھوں سے تشکیک معدوم نہ ہوئی۔

ادھر حسنل نے جیکٹ اور شاپر لاپروائی سے بیڈ پر پھینکنے کے انداز میں ڈال دیا۔ (یہ اور بات ہے دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ مگر یہ ضروری تھا۔ اس کی لاپروائی ہی صبغہ کی پرواہ کا خاتمہ کرسکتی تھی اس وقت...)

"جاؤ، لے جاکر اس کو دے آؤ۔ بلکہ ماہ رو کے گھر دے آؤ۔ اس کی بھی فکر ختم ہو۔ اس وقت تک سکون سے ہے جب تک اس کے بھائی کو ضرورت نہ پڑی۔ جس دن اسے چاہیے ہوگی، سیدھا شک اسی پر جائے گا وہی چھپ کر اس کی چیزیں استعمال کرتی ہے۔"

اس کا لہجہ سرسری ہوگیا۔ گویا اس کی جانے بلا اور صبغہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھتی جاتی تھی۔ پھر اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

کہانی بہت اچھی تھی۔ مگر ضروری نہیں ہر اچھی کہانی سچی بھی ہو۔

اس نے بندھے ہاتھ کھولے اور کمرے سے نکل گئی۔

اس کے چلے جانے کے یقین پر حسنل تیزی سے اٹھی۔ اس نے متاع دل کو جان سے لگا کر... محفوظ مقام تک پہنچایا۔

"میں یاد رکھوں گی صبغہ پیاری! کہ تمہاری نظر ہے مجھ پر اب... شکریہ۔"

عصر کا وقت ہوگیا تھا۔ وہ غسل خانے میں گھس گئی۔

(باقی آئندہ ماہ)

Watch Us On YouTube

چہرے کے فالتو بالوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

چہرے کی جھریوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club



سمیرا عثمان گل



شکایت

اس کا بس چلتا تو وہ سارے نیوز چینل بند کروا دیتی' سخت چڑ تھی اسے ٹاک شوز سے۔ نہیں' نہیں اسے کسی اینکر پرسن' سیاست دان اور تبصرہ نگار سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اصل غصہ تو اسے عمر پر تھا' جو گھر آتے ہی نیوز چینل لگا کر بیٹھ جاتا تھا اور پھر رات گئے ہی خلاصی ہوتی تھی۔

خبری کیڑا۔

ابھی بھی وہ کچن میں روٹیاں بنانے گئی تھی۔ دونوں بچوں کو عمر کے حوالے کیا تھا' مگر وقفے وقفے سے دونوں کا بجتا باجا اسے کچن میں بھی سنائی دے رہا تھا اور ایک تو جب بچہ روتا ہے نا تو کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ ابھی ایک روٹی توے سے اتاری تھی اور کمرے میں چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ پہلے آنچ ہلکی کی پھر ہاتھ جھاڑ کر باہر آئی۔

آیان نے گلاس گرا کر توڑ دیا تھا اور ارفع نے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھول دیا تھا اور اب اسے سارے بیڈ پر چھڑک رہی تھی۔ عمر تھا کہ ٹی وی میں گم۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اب وہ آیان کو بیڈ سے نیچے نہیں اترنے دے رہا تھا' مگر پیچھے ارفع کیا کارنامہ سرانجام دے چکی تھی۔ وہ ہنوز لاعلم تھا۔ اس نے پہلے ارفع سے بوتل چھینی' پھر نیچے سے کانچ صاف کیے' ساتھ باآواز بلند بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

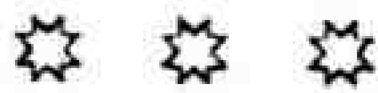
"عمر تم ذرا دیر کو بچوں کا خیال نہیں رکھ سکتے' بس ٹی وی چلانے اور تم۔" عمر نے ایک بار کانوں پہ ہاتھ رکھا اور پھر ٹی وی کی سمت متوجہ ہو گیا۔

"تمہاری تقریر سے اچھی ہے ان کی جھک جھک۔" کہا نہیں' دل میں سوچا۔

کھانے کے بعد بچوں کو سلا کر وہ پھر سے اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے۔

"اب تو چینل بدل دو' کوئی ڈراما ہی لگا دو۔" اب بھی وہ بولا نہیں تھا' بس سر ہلا کر نفی کا اشارہ کیا' شنزا کو اور تپ چڑھی' تھی' اس نے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا تھا۔

"ارے ٹی وی لگاؤ' ضروری خبر آ رہی ہے۔" وہ کہتا ہی رہا اس نے لیڈ ہی نکال دی اور باہر بچوں کے پاس آ کر سو گئی' اسے عمر کا رویہ تکلیف دیتا تھا' جس کے پاس اس کے لیے وقت ہی نہیں تھا' اس کا دل چاہ رہا تھا باتیں کرنے کو اور وہ تھا ہر بات پہ ضروری خبر۔ ضروری خبر۔ اس کا بس چلتا تو ٹی وی ہی توڑ دیتی۔



گرمی اپنے عروج پر تھی اور اس کی جیٹھانی میکے جانے کی تیاری کر رہی تھی' جسے دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ یعنی کہ ایک اور ذمہ داری' اب اس کا میاں ہر روز ان کے گھر سے کھانا کھائے گا' پہلے ہی چار ماہ بعد گھر آئی تھی۔ اور ڈیڑھ ماہ بعد پھر جا رہی تھی' واپسی کا جانے کیا ارادہ تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ اب گرمیاں گزار کر ہی واپس آئے گی' اسے اتنا غصہ آ رہا تھا' بلاوجہ ہی برتنوں کو پٹخے جا رہی تھی۔

"اب پھر یہ ہمارے سر پر مسلط ہو جائے گا۔" شام کو وہ عمر پہ چڑھ دوڑی۔

"بھائی ہے وہ میرا۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"تو بیوی میکے جاتے ہوئے اسے کیوں نہیں ساتھ لے جاتی' اب دن رات اس کی خاطریں الگ سے کرو۔ کوئی دو' چار روز کی بات ہو' پھر بھی خیر ہے مگر نہیں' ان کو شرم نہیں آئے گی۔ چار چار' چھ چھ مہینوں کے لیے بن بلائے مہمان بن جاتے ہیں۔" وہ بولے جا رہی

تھی اُسے اپنی ساری کھولن ساری بھڑاس اس پہ نکالنی تھی ہر صورت۔ اسے سب کہنا تھا حالانکہ اس کے دل میں ایسا کچھ نہیں تھا، مگر زبان سے ایسی ہی الٹی باتیں کیے جاتی تھی۔



"دوسرا تمہاری بہن کے دونوں بچے اسکول سے روز یہاں آجاتے ہیں۔ یہی محلہ ملا تھا ٹیوشن میں داخل کروانے کا۔" وہ روز سے اس بات پر بھی دماغ کھول رہا تھا۔

"آدھا گھنٹہ کھیل کر چلے جاتے ہیں تمہارا کیا جاتا ہے۔" وہ بس اتنا ہی بولتا تھا جتنا ضروری ہوتا تھا، اب بھی اس کے بولنے سے تنگ آکر گھر سے نکل گیا تھا۔

"ضرور بہن کے گھر گیا ہوگا، اپنے گھر میں تو دل لگتا

ہی نہیں 'کیا اسے نہیں معلوم کہ مجھے اور بچوں کو بھی اس کی ضرورت ہے۔" کھانا بنا کر کھانے تک وہ کڑھتی رہی' وہ رات دیر سے آیا تھا اور آتے ہی سو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میرے کپڑے استری کیے ہیں۔" کام سے آتے ہی وہ پوچھ رہا تھا' صبح کہہ کر بھی گیا تھا' لیکن شنزا کے ذہن سے بالکل ہی نکل گیا اور اب لائٹ بھی نہیں تھی' اسے لگا اب وہ اسے خوب سنائے گا' مگر وہ خاموشی سے جا کر کمرے میں لیٹ گیا تھا۔ لائٹ آنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ وہ اس کے لیے پانی کا گلاس لے کر آئی تھی۔

"یار! تمہیں گھر کے کاموں کا خیال کیوں نہیں ہوتا۔" وہ نرمی سے بولا تھا' مگر یہ الزام سن کر وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"تو کون کرتا ہے گھر کے کام' کیا مجھے ملازم رکھ کر دیے ہیں۔ صبح سے کام ہی تو کر رہی تھی' گھر کی صفائی' برتن صاف کیے' کپڑے دھوئے' کھانا بنایا اور سارا دن بچوں کو سنبھالا' ایک کام ذہن سے نکل گیا تو گھر کے کاموں کا طعنہ مل گیا۔"

"اچھا آگئی ہے لائٹ جاؤ جا کر پہلے سوٹ استری کرو۔" وہ اس کی تیز آواز پر بے زار سا ہوا اور شنزا اس کی بے زاری سے چڑ گئی۔

"ہاں جو خود کر آتے ہو آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی بس وہی کام ہے اور یہاں چوبیس گھنٹے لگے رہو' مگر کوئی نام ہی نہیں۔" بڑبڑاتے ہوئے اس نے سوٹ استری کیا تھا' پھر بچوں کو کھانا کھلانے بیٹھ گئی' ارفع تین سال کی تھی اور آیان ڈیڑھ سال کا' اوپر تلے کے دونوں بچے سارا دن ناک میں دم کیے رکھتے تھے' اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ بھلا وہ کیسے آرام کر سکتی تھی۔ "مگر یہ جب بھی بولیں گے ایک ہی بات کہ تم سارا دن کرتی کیا ہو۔" وہ ابھی تک بڑبڑا رہی تھی۔

نہا دھو کر اب وہ تازہ دم سا تھا۔ "کیا گھر آتے ہی شروع ہو جاتی ہو' کبھی تو بندہ آرام سے بھی بات کر لیتا ہے۔"

"پہلے موڈ خراب کرتے ہو' پھر آرام سے بات کرنے کی فرمائش بھی۔" وہ خفا سی کھانا لینے چلی گئی' اسے بیڈ روم میں ٹی وی کے آگے بیٹھ کر کھانے کی عادت تھی اور شنزا اس عادت سے ناک تک بے زار تھی۔

☆ ☆ ☆

"ثانیہ کا فون تھا' وہ آرہی ہے۔" عمر نے تو بڑے خوش گوار انداز میں اطلاع دی تھی لیکن شنزا کا اچھا خاصا مزاج بگڑ گیا۔ ایک اور مصیبت۔۔۔

"اتنی گرمی میں اسے آنے کی کیا ضرورت ہے۔" بس نہیں چل رہا تھا کہ فون کھڑکا کر آنے سے ہی منع کر دے یا پھر اتنا ہی بول دے' کہ بی بی ہفتہ دس دن کے لیے آنا ہے تو آجاؤ' مگر اس کی مصیبت یہ تھی کہ وہ مہینے سے پہلے واپس نہیں جاتی تھی اور مزاج اتنا نصیحت آموز اور نکتہ چیں کہ شنزا تنگ آجاتی تھی۔ اس پر مہمان نوازی الگ سے۔

خرچا اتنا اور جاتے ہوئے کپڑوں کی سوغات' جانے یہ روایت کس نے ایجاد کی تھی۔

"ایک تو مہینہ بھر مہمان نوازی کرو' پھر جوڑے بھی لے کر ساتھ بھیجو' سارے بجٹ کا بیڑا غرق۔۔۔" اور یہ خیالات جب عمر تک پہنچتے تو وہ بھی مورچہ باندھ لیتا۔

"کیوں نہیں آئے' کوئی اعتراض ہے' اس کے بھائی کا گھر ہے' سو بار آئے گی۔" وہ کہہ کر گھر سے ہی نکل گیا' ابھی وہ کتنے اچھے موڈ میں باہر صحن میں بیٹھے تھے۔

"تارے نکل آئے ہیں۔" بادلوں کو رستہ بدلتے دیکھ کر اس نے کہا تھا۔

"چاند سامنے ہو تو تارے نکل ہی آتے ہیں۔" وہ بھی بڑے موڈ میں تھی' عمر اس کی جانب دیکھتے ہوئے مدھم سا مسکرایا تھا اور پھر فون کی گھنٹی بجی تھی اور سارا منظر ہی بگڑ گیا تھا۔

"ایک تو اس کے بہن' بھائی کبھی ہمیں چین سے رہنے نہیں دیں گے۔"

❊ ❊ ❊

"ضروری تھا، تم اسے وہی سوٹ لے کر دیتے جو میں لے کر آئی تھی۔" ثانیہ بڑی بہن کے گھر گئی تھی، عمر ٹی وی دیکھ رہا تھا، وہ اس کے سر پہ لڑنے پہنچ گئی، ابھی کچھ دیر قبل وہ اسے شاپنگ کروا کے لایا تھا اور وہ رنگ کے فرق سے وہی سوٹ لے آئی تھی جو پچھلے ہفتے اس نے اپنے لیے خرید اتھا۔

"تو کیا ہوتا ہے، اس نے اپنے گھر میں پہننا ہے اور اس کا گھر تو دوسرے شہر میں ہے۔" وہ رسان سے بولا تھا۔ مگر شہزا کے بل کسی طور کم نہ ہوئے، اصل غصہ تو اسے سوٹ لے کر دینے کا تھا۔

"بچے کا جوتا نہیں تھا، وہاں سے خرید کر نہیں آسکتی تھی، پیمپر، دودھ کا ڈبا بھلا ساتھ لے کر آؤ۔ سارے خرچے ہمارے ہی ذمے ہیں۔" وہ پھر بول رہی تھی۔

"اور شہزا، تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔" اسے بھی غصہ آنے لگا۔

"مہنگائی اتنی ہے۔" اس نے یاد دلایا۔

"تو تمہیں کسی چیز کی کمی ہو رہی ہے۔"

"ہر چیز کی، ہر بات کی، ان کے لیے تمہارے پاس وقت ہے، ہمارے لیے نہیں، ان کے ساتھ اتنے خوش گفتار اور میں بولوں تو جواب نہیں دیتے اور اگر جواب دے بھی دو تو ہوں، ہاں سے زیادہ نہیں ہوتا۔"

"اچھا میرا دماغ نہ خراب کرو۔"

"دیکھا، میں بولوں تو دماغ خراب ہوتا ہے اور ان کے ساتھ دو گھنٹے سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔"

"ہاں تو وہ مہمان ہیں....."

"مہینے بھر کے مہمان....." وہ بیچ میں بولی تو عمر نے لب بھینچ لیے۔

"اور آپ کا موبائل کیوں مانگا تھا۔" اب اسے نیا مسئلہ یاد آیا تھا۔

"اس کا موبائل خراب ہے، اس لیے اور ویسے بھی میرا بے کار پڑا ہے۔" اس کا دل چاہ رہا تھا، شہزا کا منہ بند کروا دے۔

"ہر وقت بچوں کے ہاتھ میں رکھے گی تو ایسا ہی ہوگا، اتنے موبائل اس کے میاں نے باہر سے بھجوائے، ایک بھی مہینے سے زیادہ نہیں چلتا، اس کو موبائل دینے کا مطلب بس اپنا موبائل خراب کروانا ہے۔" اپنی جانب سے اس نے روکنا چاہا تھا۔

"تو ہو جائے خراب، لیکن اب اس نے مانگا ہے تو میں ضرور دوں گا۔" اس پر شہزا کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا تھا، وہ جتنا مرضی بول لے، ہاں اس کا موڈ ضرور خراب ہو جاتا تھا جو اس وقت بھی ہو چکا تھا۔

❊ ❊ ❊

"کل شام بڑی آپا بھی آئیں گی تو کھانے میں کچھ بنا لینا۔" وہ نائٹ کریم لگا رہی تھی، ہاتھ وہیں رک گئے۔

"پہلے کیا یہ کم تھے جو تم نے بڑی آپا کو بھی انوائیٹ کر لیا، اکیلی تھوڑی آئیں گی وہ..... ساتھ پانچ بچے بھی ہیں اور اگر دوسری والی کو فون کھڑ کائیں گی تو وہ بھی چار بچوں سمیت آن وارد ہوگی، اوپر سے اتنی گرمی ہے۔" اسے ابھی سے چکر آنے لگے تھے۔

"ایک تو تم کاموں سے اتنا گھبراتی کیوں ہو، ایک قورمہ ہی تو بنانا ہے تم نے، ہاں ساتھ کھیر بھی ہوگی، بریانی کو دم لگا لینا، روٹیاں اور کولڈ ڈرنکس بازار سے لے آؤں گا، سلاد، رائتہ وغیرہ تمہیں ثانیہ بنا دے گی۔" اس نے مینیو بھی سیٹ کر لیا تھا۔

"تمہاری بہن سے بنواؤں گی بریانی۔" گھورتے ہوئے بولی۔

"وہ مہمان ہے۔" بھرپور خفگی بھری تنبیہہ تھی۔

"یہ جو نندیں مہینہ بھر کے لیے مہمان بن کر آجاتی ہیں، ان کو احساس ہونا چاہیے کہ بھابھیاں اکیلی نہیں ہوتیں، ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہوتے ہیں جو رات بھر جگاتے ہیں، دن بھر ستاتے ہیں، اوپر سے ان کی نکتہ چینیاں اور اعتراضات الگ سہنے....."

"کبھی مہمان رحمت ہوتے تھے۔" وہ تاسف سے

بولا۔

"آج کل زحمت ہیں۔" اس نے سر جھٹک دیا۔

عمر نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کروٹ بدلی اور تکیہ کانوں پہ رکھ لیا' وہ سوچ رہا تھا۔ کبھی تو یہ لڑکی اس کی بات خوش دلی سے مان لیا کرے' ہربات پہ اعتراض' بحث اور بڑبڑاہٹیں۔

"بہت کوشش کرتی ہوں تم سے محبت کرنا چھوڑ دوں' لیکن پھر مجبور ہو جاتی ہوں' اس دل نے خوار کر کے رکھا ہوا ہے' کل تک تم وہ تھے جسے' مجھے دیکھے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ گھنٹوں کالج کے باہر کھڑے رہا کرتے تھے' مجھ سے بات کرنے کے لیے ترسا کرتے تھے' جسے میری آواز بہت پسند تھی' آج میں بات کرنا چاہتی ہوں اور تم ہر دفعہ ایسا ہی کرتے ہو۔" عمر کے اس انداز پر وہ کھول اٹھی تھی۔

گزر گیا وہ محبت کا زمانہ
ہو گئی شادی' تھک گیا دیوانہ

اس نے تکیے کے اندر سے ہی شعر پڑھا اور شزا

اس نے دو چار کشن اس پہ پٹخے اور چادر تان کر لیٹ گئی۔ اب اس کے گالوں پہ موٹے موٹے آنسو تھے۔

"میں جانتی ہوں تم مجھ سے بے زار ہو چکے ہو' اب میں تمہیں اچھی نہیں لگتی' ایسا لگتا ہے جیسے مجھ سے شادی کر کے پچھتا رہے ہو اور ہر صورت مجھ سے رہائی چاہتے ہو' گھر میں تمہارا دل نہیں لگتا' میرے لیے دو گھڑی کی تمہارے پاس فرصت نہیں' تمہاری پہلی ترجیح یہ نیوز چینل ہے اور دوسری تمہارے بہن بھائی' میری اب تمہاری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رہی۔"

"تم بھی تو ہر وقت میرے بہن بھائیوں کے خلاف بولتی رہتی ہو' اتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ ان کا بھی میرے اوپر حق ہے' مجھے خود سے دور کرنے والی تم خود ہو' ہر وقت شکایتیں ہی کرتی رہو گی تو میں ٹی وی اور بہن' بھائیوں میں ہی فرار ڈھونڈوں گا نا۔" وہ بھی اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

"میں نے کب تم سے کوئی شکایت کی ہے۔" وہ ٹکر ٹکر اس کی صورت تکنے لگی۔

"ہربات کہہ دینے کی نہیں ہوتی' کچھ باتیں دل میں ہی رکھ لینی چاہئیں' تمہارے لیے جو جیٹھ اور نندیں ہیں' وہ میرے بہن' بھائی ہیں اور تم ہر وقت ان کے خلاف بولتی ہو۔" وہ اس سے بہت بدگمان لگ رہا تھا۔

"مگر تم جانتے ہو میرے دل میں ایسا کچھ نہیں' میں تو محض... اب کیا میں... عمر تم جانتے ہو' مجھے زور سے بڑبڑانے کی عادت ہے' میں تو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر... اور کیا اب میں تم سے اپنی باتیں بھی شیئر نہ کروں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے وضاحت کرے' جس عادت کو وہ اتنا معمولی سمجھ رہی تھی' وہی ان کے مابین اس قدر فاصلوں کی وجہ ہو گی' اسے معلوم نہیں تھا۔

"ہاں اپنا بوجھ ہلکا کرتی ہو اور میرے دل کا بوجھ بڑھا دیتی ہو' میں تمہاری ہربات کو سنجیدہ لیتا ہوں اور بالفرض اگر میں تمہارے بہن' بھائیوں کو ہر وقت باتیں سناتا رہوں' ان کے خلاف بولتا رہوں تو کیا تم سن لو گی اور اگر سن بھی لو تو تمہارے دل میں میرے لیے ویسی دوستی اور محبت قائم رہ سکے گی؟ اور یہ کام اگر مستقل ہو تو... تم میرے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر اعتراض کرتی ہو' اگر کچھ لے کر دے دوں تو اعتراض' آ کر رہیں' اپنے گھر انوائیٹ کرلوں تو اعتراض' اگر ان کا کوئی کام کردوں تو شکایت... کیا ان کا میرے اوپر کوئی حق نہیں ہے۔ تم جب ان کے لیے اپنا دل بڑا کرو گی تو میرا دل خود بخود تمہارا قدر دان ہو جائے گا۔" وہ کہتا جا رہا تھا اور وہ حیران تھی کہ شکایتوں کا ڈھیر تو اس نے اکٹھا کر رکھا تھا' لیکن درحقیقت اصل شکایت تو عمر کو اس سے تھی' وہی شکایت جو سارے فساد کی جڑ تھی۔

ہاں وہ ٹھیک کہتا تھا' ہربات کہنے کی نہیں ہوتی' کچھ باتیں دل میں ہی رکھ لینی چاہئیں۔ وہ ذہن میں ایک بار پھر مینو سیٹ کر رہی تھی۔

کل کیا کیا کچھ بنانا تھا' قورمہ' بریانی' کھیر' ہاں غصہ تو اسے اب بھی آ رہا تھا۔ مگر اس بار اسے خاموش رہنا تھا' کیونکہ اس کی ساری شکایتوں کا حل اسی خاموشی میں پوشیدہ تھا۔





عفت سحر طاہر

دھنک کے رنگ

دادو جب سے آ کر لاؤنج میں بیٹھی تھیں تب سے عمر اور حسان بیٹھے ریسلنگ دیکھ رہے تھے۔ مار ریسلر کو پڑتی آہ' واہ اور ہاہ کی آوازیں ان دونوں ریسلنگ کے شیدائیوں کی نکلتیں۔ دادو نے پہلے تو اس بے ہودہ کھیل کو اچھی طرح ناک پر عینک جما کر دیکھا پھر ان سے پوچھ ہی لیا۔

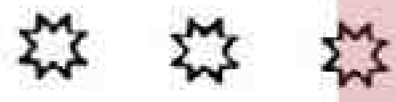
"یہ موئے کیوں ایک دوسرے کو مار مار کر ادھ موئے ہوئے جا رہے ہیں؟"

"بیلٹ کے لیے دادو.... بیلٹ کے لیے جان کی بازی لگا رہے ہیں۔" حسان نے ٹی وی اسکرین پر نظر جمائے جواب دیا۔

"تو موئے گھر سے پینٹ پہن کر آتے نا۔ نیکروں میں چلے آئے اور اب یہاں دوسروں سے پینٹ کے لیے دھینگا مشتی کر رہے ہیں۔" دادو کی قوت سماعت اب واقعی کمزور ہو چکی تھی اور آلۂ سماعت لگوانے کو وہ تیار نہ تھیں۔ ہر وقت گویا محرم کو مجرم بنانے پر تلی رہتیں۔ عمر نے تحمل سے اونچی آواز میں ان کو بتایا۔

"پینٹ کے لیے نہیں دادو! بیلٹ کے لیے لڑ رہے ہیں۔" دادو کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو ہو گئیں۔

"اوئی' اللہ کی مار ان پر.... جانگھیے پہن آ گئے۔ پینٹ تو کسی نے پہنی نہیں کم بخت بیلٹ کہاں باندھیں گے؟" لڑکے حق دق اور ہم چاروں پچھلے صوفے پر نیم دراز رسالے اور میگزین چھوڑ کر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

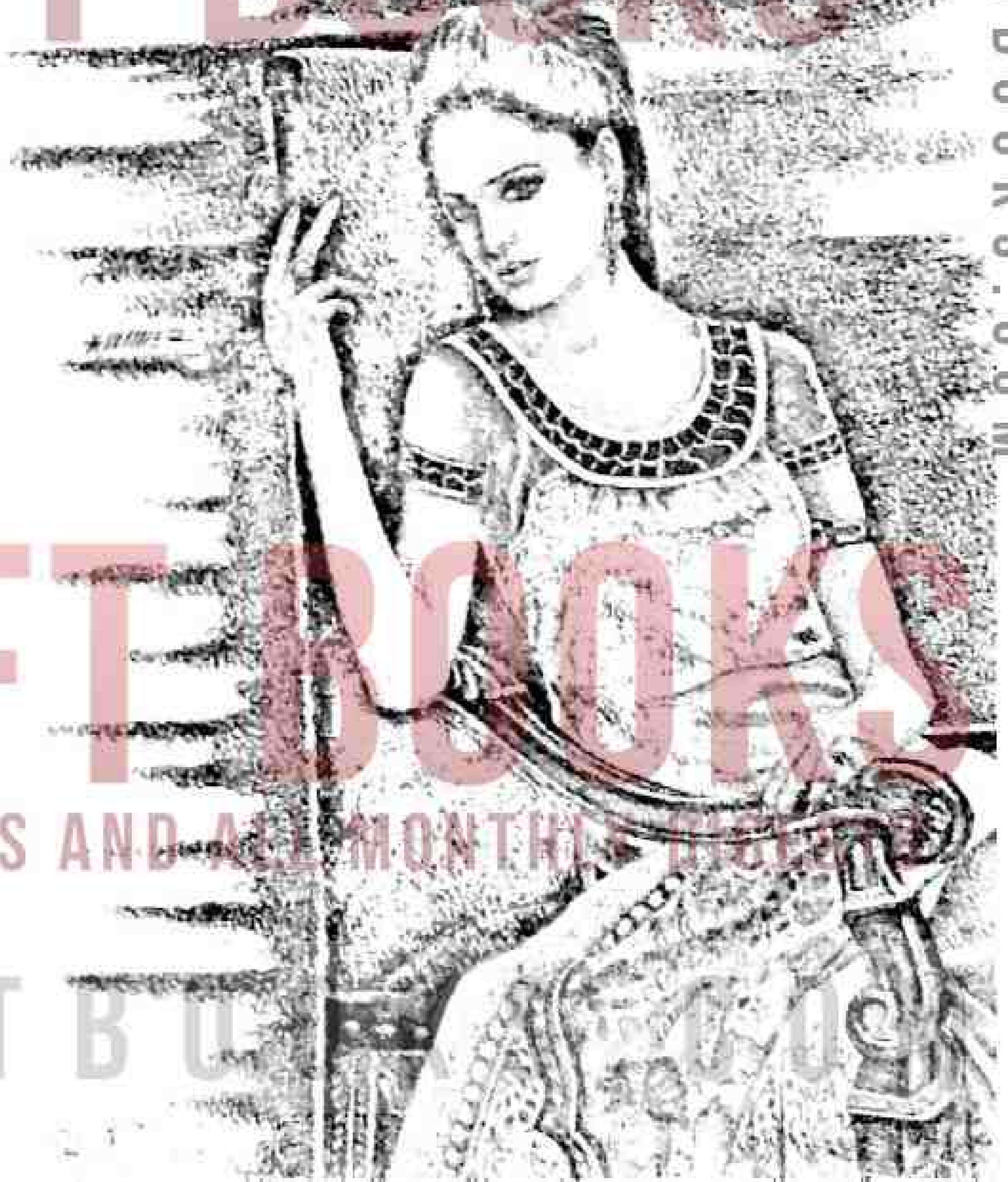


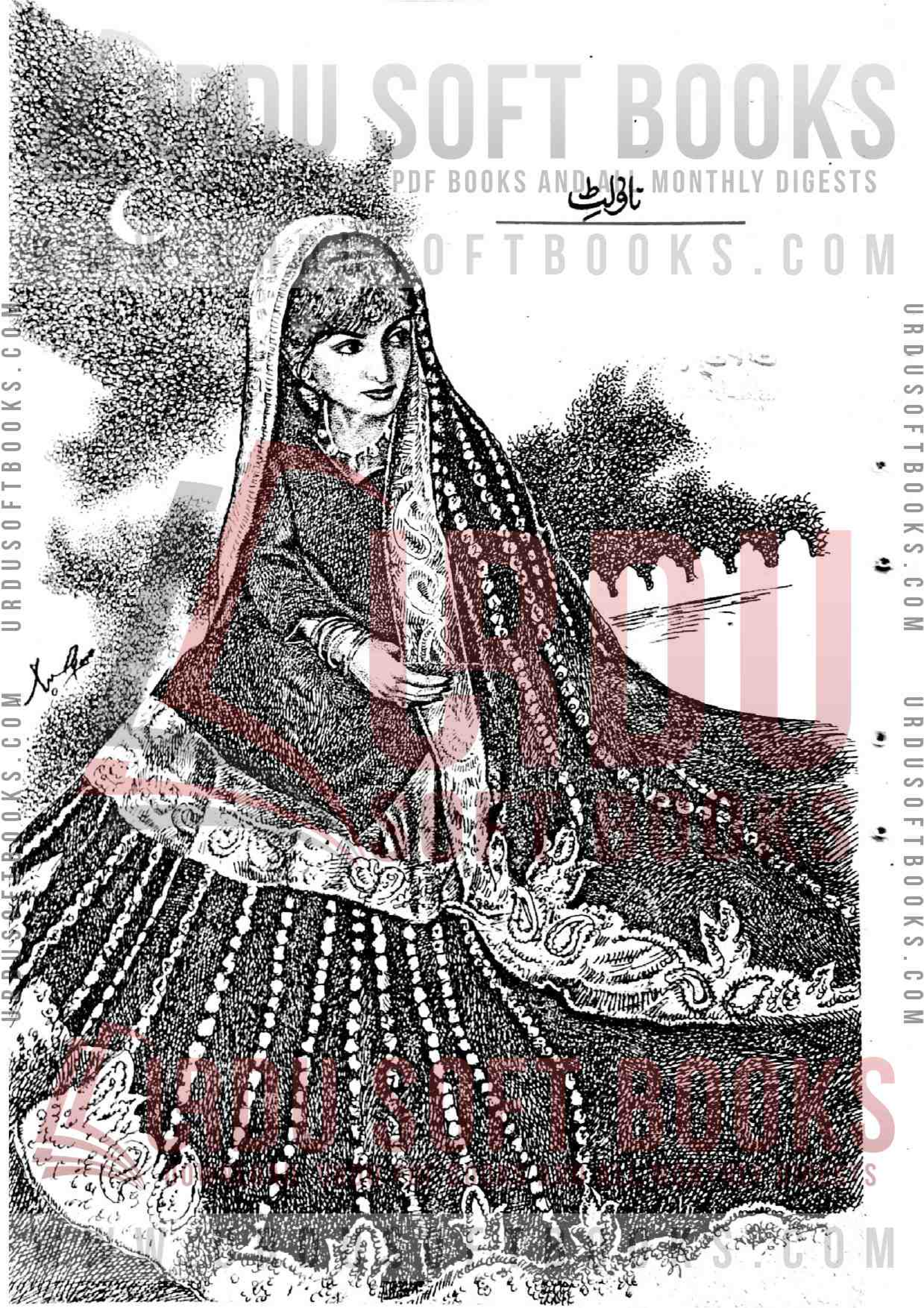
"تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے جب آپ کسی کو شدت سے پانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ نمونہ آگے سے اتنی ہی شدت کے ساتھ آپ کو نخرے دکھانا شروع کر دیتا ہے۔"

میرا دنیا سے دل اٹھا ہوا تھا جب میں نے صبح صبح فیس بک پر سے کسی منگیتر جلی کا اسٹیٹس پڑھ کر یہ بیان داغا' جواباً" میرے ساتھ لیٹی زرمینہ کا ہاتھ ٹھاہ سے میرے شانے پر پڑا۔

"خبردار جو میرے بھائی کو نمونہ کہا تو۔" اس کا ازمیرپٹ کے لیے کبھی کبھار اٹھنے والا پیار جاگا تھا مگر بندہ پوچھے اس میں دوسروں کا کندھا سینکنے والی کون سی بات ہے۔

"میں نے تحقیق کی بات کی ہے کمینی! تمہارے بھائی کا نام کس نے لیا۔" دانت پیس کر کہتے ہوئے میں




ناولٹ

نے پاؤں سے دھکیل کر اسے مزید بیڈ کے کنارے کیا تو وہ براماں کر بولی۔
"کیا مجھے نہیں پتا، تمہاری زندگی میں ایسا نمونہ کون ہے ؟"
فائقہ 'چڑیا اور مانو کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ زرمینہ نے منہ بنا لیا۔ اپنی غلطی کا جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا اسے۔
"اب بس بھی کردو روی! منگنی ہو گئی میو کے ساتھ۔ اب شادی بھی ہو جائے گی تو پھر رونا کس بات کا ہے ؟" کتاب کا صفحہ الٹتی ماہین نے چڑ کر کہا تو میں جذباتی ہونے لگی۔
ایک ہفتہ ہو گیا مجھے زکام میں مبتلا ہوئے، سارے گھریلو ٹوٹکے آزما لیے۔ اور تمہارے اکڑو، سنگ دل بلکہ بے دل بھائی نے ایک بار جو حال پوچھا ہو آکر۔"
زکام کی حالت میں تو میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو جایا کرتی تھی بقلم خود۔
"تو وہ کیا کرے۔ پاس بیٹھ کر تمہاری ناک پونچھتا رہے ؟" ماہین چشماٹو نے بے زاری سے کہا تو سب کے چھت پھاڑ قہقہے نے مجھے روہانسا کر دیا۔
میں نے کینہ توز نظروں سے ماہین کو گھورا جس کا ہونے والا منگیتر اس سے بات کرنے کو مرا جاتا تھا اور وہ فزکس کیمسٹری کی کتابوں میں گھسی رہتی۔
"ہاں جی۔۔۔ ادھر تو گنجے کو ناخن مل گئے نا۔" میں نے طنز کیا تھا۔
"تو تم بھی لگوالو۔۔۔ اب تو آرٹیفیشل نیلز کا زمانہ ہے۔" فائقہ نے مشورہ دیا۔
"کاش۔۔۔" میں نے آہ بھری اور زرمینہ سے ایک اور مکا کھایا۔
"تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہاری فیس بک فرینڈز بڑے اعلا مشورے دیتی ہیں۔" فائقہ کو یاد تھا۔
"ہاں نا قسم سے فیس بک پر ایک پوسٹ لگا دو بس۔ ایک سے ایک دانشور نکل آتا ہے مشورے دینے کے لیے مگر روبی کے معاملے میں تو سارے ہی فیل ہو گئے۔ آدھے کنوارے ہیں اور باقیوں کے والدین نے انہیں عشق کا موقع دیے بغیر شادی شدہ کر دیا۔" میں رونے کو تھی پھر بڑی حسرت سے کہا۔
"ہائے۔۔۔ کاش ہمارے والدین بھی ہمیں یہی سزا دے دیں۔ ان کو یہ خیال کیوں نہیں آتا۔"
"وہ اس لیے کہ سب میو سے محبت کرتے ہیں اور اسے سزا نہیں دینا چاہتے۔" فائقہ نے ہمدردی سے کہا اور مجھ سے جھانپڑ کھایا۔
"اپنی سزا بھگتو تم۔۔۔ ان ہی طنزیات کی وجہ سے الٹی تصویریں بنانے والے منگیتر اور اردو دان سسرال سے پالا پڑا ہے تمہارا۔" میں نے اسے ناخن دکھائے۔ مگر وہ کون سا دبنے والی تھی، چمک کر بولی۔
"تمہیں بھی چچی جان کی کوئی بد دعا ہی لگی ہو گی جو خاندان کا سب سے سڑیل بندہ تمہارے پلے پڑا ہے۔"
"چلو۔۔۔ ہینڈسم اور ڈیشنگ تو زیادہ ہے نا سب کے منگیتروں سے۔" مجھے اس بات کی رج کر طمانیت تھی۔
"اففف۔۔۔ تم لوگوں کی تو ڈائریکٹ شادیاں ہی ہونا چاہیے تھیں۔ خوامخواہ ہی دادو نے سر پہ بوجھ لاد رکھا ہے۔"
ماہین چشماٹو نے ناک چڑھا کر کہا تو ہم انگشت بدنداں اسے دیکھنے لگے۔ جس کی منگنی کا فنکشن اسی اتوار ہونا قرار پایا تھا اور وہ دن بدن نکھرتی ہماری جیلسی کا سامان کر رہی تھی چشماٹو تو ہم اب اسے عادتاً ہی کہتے ورنہ اس نے تو بات پکی ہونے سے پہلے ہی چشمہ اتار کر اسٹور کے کاٹھ کباڑ میں پھینک دیا اور مستقل لینس لگانے شروع کر دیے تھے۔ میں تڑپ کر حواس میں لوٹی۔
"اللہ کرے شادی کے دن تمہارا وزیراعظم سہرا پہن کر آئے اور جب سہرا اٹھے تو اندر سے واقعی نواز شریف ہی نکلے۔"
"آمین۔" فائقہ نے خضوع و خشوع سے کہہ کر

میرا ساتھ دیا تھا۔ ماہین ہاتھ سے لعنت کا اشارہ کرتی اٹھ گئی تب مجھے کچھ سکون کا سانس آیا۔

☆ ☆ ☆

فائقہ کے ساتھ کہیں جانا اتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے یہ مجھے فائقہ کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک پر جا کر پتا چلا۔ میں واپسی پر سخت بھنائی ہوئی تھی۔

"اس قدر نکمی اور نالائق ہے یہ فائقہ کی بچی کہ حد نہیں۔" میں نے کمرے میں آتے ہی بہ آواز بلند گل افشانی کرتے ہوئے سر سے دوپٹہ اتارا جوتے ادھر ادھر لڑھکائے۔ فائقہ بھی خوب تپی ہوئی میرے پیچھے تھی۔ سارے راستے ہم دونوں سوکنوں کی طرح لڑتی آئی تھیں۔

"اب کیا ہو گیا؟" زرمینہ نے کچھوے کی طرح کمبل میں سے سر نکالا۔

"ہونا کیا ہے... ڈاکٹر کے کلینک جا کر خود کی لغت کھول لی محترمہ نے" میں نے کینہ توز نظروں سے فائقہ کو دیکھا تو اس نے لڑاکا عورتوں کی طرح پسلیوں پر ہاتھ جما کر کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ جتنی زیادہ اور گاڑھی اردو بولوگی اتنی ہی رواں ہوگی۔"

"تو یہ تھوڑی کہا تھا کہ ڈاکٹر کے کلینک پر جا کر اردو گاڑھی کرنا شروع کر دو۔" میں نے دانت کچکچائے۔ دل تو چاہ رہا تھا آج اسے بھی چبا ہی ڈالوں۔

چڑیا نے خواتین ڈائجسٹ پر سے سر اٹھا کر ناگواری سے مجھے دیکھا اور تبصرہ کیا۔

"اب بتا بھی دو آپی! ہوا کیا ہے؟ ویسے تم جیسی رائٹرز ہی ہوتی ہیں جو تمہید ہی اتنی لمبی باندھتی ہیں کہ ریڈرز اکتا کر اگلی کہانی شروع کر دیتے ہیں۔"

ان دنوں چڑیا اور مانو پر ڈائجسٹ پڑھنے کا بھوت سوار تھا اور چڑیا تو امتل کو سنجیدگی سے ایک افسانہ بھیجنے کا سوچ بھی چکی تھی۔

"بے عزتی کر کے آئی ہے اتنے بڑے ڈاکٹر کی۔"

میرا تو صدمہ ہی کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

"کوئی نہیں اتنا بڑا تو نہیں تھا۔ چالیس سے کم ہی عمر تھی اس کی۔" فائقہ کو اعتراض ہوا تو میں نے سر تھام لیا۔

ہوا کچھ یوں کہ ہم کلینک پہنچیں تو ڈاکٹر سیٹ سے اٹھنے ہی والا تھا۔ اب پرانی محلے داری کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نے ہماری خاطر تھوڑا سا ٹائم نکال تو لیا۔ مگر مجھے میڈیسن لکھ کر دینے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے خشک لہجے میں مشورہ دینا بھی ضروری خیال کیا۔

"آئندہ اگر آنا ہو تو وقت پر آئیں ورنہ میں میڈیسن لکھ کر نہیں دوں گا۔"

"ہمیں آپ کی اوقات کا پتا ہوتا تو ہم اس وقت نہ آتے... ویسے آپ کی اوقات کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟"

فائقہ نے ایک دم سے پوچھ لیا تو جہاں میرے چہرے کا رنگ اڑا، وہیں ڈاکٹر صاحب تو سیٹ پر سے گویا اچھل ہی پڑے۔

"مطلب... ؟ مطلب کیا ہے آپ کی اس بات کا؟" بس غرانے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ ہمیں آپ کی اوقات کا پتا نہیں تھا اس لیے... ورنہ ہم کسی اور کلینک چلے جاتے ہے نا روی!" ڈاکٹر کو نمونیہ کے مریض کی طرح لرزہ بر اندام دیکھ کر گھبرا کر فائقہ نے مجھے ٹہوکا دیا۔

اتنی دیر تک میں سمجھ چکی تھی کہ فائقہ کی بچی اوقات کار کی جگہ ڈاکٹر صاحب کی اوقات کو للکار چکی ہے۔

"یہ آپ کی اوقات... آئی مین آپ کی ٹائمنگ کی بات کر رہی ہے ڈاکٹر صاحب۔" میں وضاحتاً کھکھیائی تب کہیں جا کر ڈاکٹر صاحب کا بی پی نارمل ہوا اور شوگر کنٹرول میں آئی۔

فائقہ کو کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے میں نے ان سب کو پورا واقعہ سنایا تو وہ پیٹ پکڑے ہنس ہنس کر بے حال ہو گئیں۔

"بہرحال... اب اس ڈاکٹر کے کلینک میں فائقہ کا

جانا بین ہو چکا۔ امید ہے کہ صبح تک وہ اس کی تصویریں کلینک میں لگوا دے گا کہ یہ بندی آئندہ رہتی زندگی تک اس کے کلینک کے اندر قدم رکھنے نہ پائے۔"

میں نے فائقہ کو مزید بتایا۔ تو وہ مجھے درفتنے منہ کا اشارہ کرتی زرمینہ کے ساتھ کمبل میں گھس گئی۔

رات گئے تک ہم پانچوں پرجوش انداز میں ماہین چشماٹو کی ہونے والی منگنی کی تقریب کے بارے میں ڈسکشن کرتی رہیں۔ جس کے لیے سب کی تیاریاں مکمل تھیں۔ تب ہی فائقہ نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر جمائے مجھے ٹہوکا دیا۔

"یہ لو.... عندلیب نواز رخصت ہو گئی سمیع بھائی کے ساتھ اور امبر مغل بھی پیاری ہونے والی ہے صوفی بھائی کو۔ مدیحہ چوہدری مدیحہ نوید بن چلی۔" اس نے میری فیس بک فرینڈز کی تازہ ترین رپورٹنگ مجھ تک پہنچائی تو میرا دل دکھ دکھ گیا۔

"ہائے.... کتنا پوچھا عندلیب کی بچی سے کہ پھپھو کا بیٹا کیسے ہاتھ کیا.... مگر نہ جی.... ایک بار بھی جو انہوں نے روبحا گل کو اپنا سیکریٹ بتایا ہو.... یہ گھنی میسنیاں خود سب لال لہنگے پہن کر رخصت ہوئی جا رہی ہیں۔ روبحا گل کی کسی کو فکر نہیں۔ ارے کوئی ایک ہی ٹپ دے دیتیں ہک ہاہ.... تو آج میں بھی میرو کے ساتھ رخصت ہونے کا اسٹیٹس لگا رہی ہوتی۔"

میری حسرتوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

آج ماہین کی منگنی کا فنکشن بٹ ہاؤس کے وسیع و عریض لان میں ہو رہا تھا۔ ہم سب کی تیاری ایک سے بڑھ کر ایک تھی' میری تو خاص طور پر۔ پتا نہیں کتنی بار میرو سے سامنا ہونا تھا آج۔ سیاہ سلکی بالوں کی اونچی سی پونی مجھے بہت پسند تھی۔ پنسل ہیل کا اسٹریپ بند کرتی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ماشاء اللہ.... تائی جان نے تو میری بلائیں لے ڈالیں بلکہ کچھ روپے وار کر کام والی کو دیے اور مجھ پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی تو مجھے اپنی مکمل خوب صورتی کا یقین ہو گیا۔ میں نے کمرے میں جا کر زرمینہ' فائقہ' چڑیا اور مانو کو اترا اترا کر سراسر ذاتی تعصب پر مبنی بیان دیا۔

"تم سب اپنی جھریوں اور لاف لائینز کو چھپانا چھوڑو۔ ان شکلوں پر اب رونق آنے سے رہی۔ وہاں مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔" ان چڑیلوں نے جو چیز ہاتھ لگی مجھے کھینچ ماری۔ تو مجھے وہاں سے بھاگتے ہی بنی۔ جل ککڑیاں۔

میں بڑی فلمی ہیروئن بنی' لہراتی بل کھاتی اسٹائل سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ کچھ گھیردار فراک کی طرف دھیان اور اوپر سے پہلی بار پہنی گئی پنسل ہیل' آخری دو سیڑھیاں باقی تھیں جب کوریڈور سے ازمیر کو اندر آتے دیکھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیوں کی طرف ہی آ رہا تھا۔ میرا دل دھڑ دھڑایا۔ نیوی بلیو امبرائیڈڈ ویسٹ کوٹ اور کرتا شلوار میں ملبوس بلند قامت گہری سیاہ آنکھوں والا ازمیر بٹ ہائے.... ایک لمحے میں سارے فلمی ٹکراؤ والے سین تازہ ہو گئے۔

اس نے بس اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور میرا پاؤں رپٹا.... میں نے فلمی سی آؤچ کے ساتھ ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ مگر اس نے شاید ایسی سچویشن والی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ میں توازن کھو کر اس کے قدموں میں گری تو وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

"تف ہے بھئی ایسی منگنی اور ایسے منگیتر پر۔"

میری ہائے وائے جاری تھی اور وہ....

"کس نے کہا تھا اتنا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر تیار ہونے کو.... یہ تو ہونا ہی تھا۔ اب اٹھ جاؤ کہ اب قیامت کے روز ہی اٹھو گی۔" وہ سر پر ناگہانی آفت کی طرح کھڑا ہو کر مجھے اٹھانے کے بجائے میری اونچی ہیل اور اونچی پونی پر طنز کر رہا تھا۔

"تم سے کس نے کہا تھا کہ مجھے گھور کر دیکھو۔ اتنا ہلکا خون ہے پہلے ہی فوراً" نظر لگ جاتی ہے مجھے"

میں نے کراہیں دبا کر اٹھتے ہوئے اسے جتایا تو اس کی آنکھیں پھیلیں۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔۔۔؟" جیسے حواس میں آ کر وہ غرایا۔

میں نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں تو اس نے دفعتاً گہری سانس بھر کر ادھر ادھر دیکھا۔

"تمہارے جیسی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی روبحا گل!" وہ سر جھٹک کر بولا۔ میرے تو دل کی کلی ہی کھل اٹھی۔

"تم بھی نا میرو۔۔۔ میری تعریف کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے۔" میں نے تو بڑے لاڈ سے ٹھنک کر کہا۔

اب اللہ جانے وہ پیر پٹختے ہوئے سیڑھیاں کیوں چڑھا۔

"ہونہہ۔۔۔" میں بھی سر جھٹکتی باہر لان میں چلی آئی' جہاں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

جلد ہی باقی سب بھی تیار ہو کر آ پہنچیں۔

فائقہ کے سسرال والے بھی آ گئے۔ وہی پرانے سے دادا اور آپا۔ ہاں ساتھ نیا نویلا عمران عباس بھی تھا۔

فائقہ نے دادا اور آپا کو آداب کہا۔

"آہا۔۔۔ میں تو یہاں قدم رنجہ فرماتے ہی اپنی دختر نیک اختر کو طلب کرنے والا تھا۔" دادا جان فائقہ سے مسرور ہو کر ملے تو فائقہ نے خفگی بھرے احتجاج سے ان کو دیکھا۔

"آپ تو کہتے تھے کہ مجھے دیکھ کر آپ کو بہت خوشی ہوا کرتی ہے۔۔۔ اب رنج ہونے لگا؟ اور میرا نام آپ پھر بھول گئے۔ نیک اختر کب سے ہو گئی میں۔۔۔ فائقہ نام ہے میرا۔" دادا جان ہکا بکا۔۔۔ آپا نے طنزیہ نظروں سے عمران عباس کو دیکھا۔ وہ خود بے چارہ فائقہ کی اردو کا زخم خوردہ تھا اب بھی نثار ہو رہا تھا اس کی باتوں پر۔

"بین السطور باتوں کو سمجھنے کا وصف پیدا کریں فائقہ بی۔۔۔" آپا بیگم نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا تو فائقہ لال پڑ گئی۔۔۔ انگلی مروڑتی دہری ہو کر منمنائی۔

"اففف۔۔۔ آپا! سب کے سامنے کیسی باتیں کر رہی ہیں، مجھے شرم آ رہی ہے۔"

مجھے زرمینہ کے دھموکے نے ہوش دلایا تو میں بزرگوں سے معذرت کرتی فائقہ کو اپنی طرف گھسیٹ لائی۔

"یہ کیا کمینی حرکت ہے، میرے سسرال والے مائنڈ کر رہے ہوں گے۔" وہ بازو میری گرفت سے چھڑاتے ہوئے ناگواری سے بولی تو زرمینہ نے دانت کچکچائے۔

"فی الحال تو وہ شکر کا کلمہ پڑھ رہے ہوں گے۔ تم تو صحیح معنوں میں ان کا بی پی بڑھانے والا آلہ ثابت ہو گی۔"

"جی نہیں ۔۔۔ ابھی آپا اتنی کھلی باتیں کر رہی تھیں، بہت فرینک ہیں وہ مجھ سے۔" وہ شرمائی۔

"اللہ ۔۔۔ اللہ وہ تم سے اپنے گھر کے لیے چشم و چراغ پیدا کرنے کا نہیں بلکہ تمہیں اپنے اندر کوئی کوالٹی پیدا کرنے کا کہہ رہی تھیں ڈفر ۔۔۔!" میں نے اسے گھورا۔

"ہاں ۔۔۔ میں سمجھی بھتیجے کا نام بھی سوچ لیا۔ واصف۔" اس نے آپا ہی کو دور ہی سے کینہ توز نظروں سے دیکھا پھر روہانسی ہو کر بولی۔ "یہ لوگ میرا نروس بریک ڈاؤن کروا کر ماریں گے۔ تم دیکھ لینا۔"

"اچھا اب دفع کرو اپنی ان کمینی حرکتوں کو اور یہ دیکھو کہ آج ہر نگاہ مجھ پر ہی جمی ہے۔" میں اٹھلائی۔ ملنے والوں میں سے ایک آنٹی تو واقعی مجھ پر فدا ہو رہی تھیں۔

"ہاں ۔۔۔ کارٹونز تو بچے بڑے دونوں ہی شوق سے دیکھتے ہیں۔" زرمینہ نے طنز کیا۔

"ہونہہ ۔۔۔ نند گلی کا گند ۔۔۔ جل ککڑی۔" اسے مسکرا کر دیکھتے میں نے دل ہی دل میں دانت پیس لیے کیونکہ ماحول لڑائی کے لیے بالکل بھی سازگار نہیں تھا۔

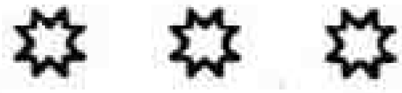
"میں تمہیں اس بک بک کا بہت اچھا جواب دے سکتی ہوں مگر چونکہ ۔۔۔ چونکہ اس محفل میں موجود تمام ماؤں کی نظریں مجھ پر لگی ہیں اس لیے میں اپنا امیج خراب نہیں کرنا چاہتی۔"

"ہاں ۔۔۔ ماؤں کی نظریں ۔۔۔ آپا کا کام شروع کر دیا ہے تم نے؟ اپنے بچے تمہارے سپرد کر کے کھانا کھائیں گی سب ان شاء اللہ۔"

"بس کر دو انٹرنیشنل کنواری بس ۔۔۔" میرا کشمیری خون جوش کھانے لگا۔ تو زرمینہ نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

"بعد میں پوچھوں گی۔"

منگنی کا فنکشن بہت اچھا گزرا۔ وزیر اعظم بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ اس کی اور ماہین کی جوڑی کمال کی تھی۔ وزیر اعظم کی بار بار ماہین کی طرف اٹھنے والی نگاہ کی وارفتگی ہم سب محسوس کر رہے تھے۔ باقی سب کا تو پتا نہیں مگر میرے ۔۔۔ دل میں کچھ کچھ ہونے لگا۔



"بھلا میرا کیا قصور تھا جو مجھے میو جیسا سڑیل اور ان رومینٹک منگیتر دیا گیا؟" فنکشن کے بعد اگلے ہی دن جب ہم ساری دادو کے پاس بیٹھی رشتہ داروں کے انداز و اطوار کو ڈسکس کر رہی تھیں تب میں نے دادو سے یہ احتجاجاً" پوچھ بھی لیا۔

"توبہ ۔۔۔ اللہ کی مار ۔۔۔ کیا بکواس کر رہی ہو؟" دادو کا تو مانو ایک دم سے پارہ ہائی ہو گیا۔ ہڈیوں میں دم نہ تھا ورنہ اچھل ہی پڑتیں۔

"ایک تو تجھ زمانے بھر کی نکمی اور نٹ پونجی کے پلو سے اپنا شہزادہ باندھ دیا۔ اوپر سے یہ نخرا دکھا رہی ہے۔ ارے واہ اسے کہتے ہیں 'جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنا۔'" انہوں نے بڑی بے دردی سے مجھے جھٹکا تو میں جو بڑے اطمینان سے بیڈ کے کنارے ان کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی لڑھک کر کارپٹ پر آ رہی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی چھڑی اٹھا کر باقاعدہ میرے بازو میں تلوار کی طرح چبھوئی۔ وہ چاروں میری درگت پر ہنس رہی تھیں اور فائقہ کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ میں بدک کر پیچھے ہٹی۔

"اوفوہ دادو ۔۔۔ اپنے پوتے کے بارے کچھ سن کر تو آپ فوراً ہلاکو خان کی پوتی بن جاتی ہیں۔ اور وہ جو صبح شام میرا نازک سا دل توڑ کر گناہ گار ہو رہا ہے اس کی آپ کو کوئی فکر نہیں۔" میں نے چھڑی کی پہنچ سے دور ہو کر اپنا بازو سہلایا۔

"آ لینے دو تمہارے باوا کو ۔۔۔ کوئلے منگواتی ہوں اس سے۔" دادو نے چشمے کے اوپر سے مجھے گھورا تو

میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

"دادو! باربی کیو کریں گی؟"

ہاں.... تمہاری زبان کا۔" وہ بچے کھچے دانتوں کو کچکچا کر بولیں تو میں نے بلا ارادہ ہی دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبا لیا۔ افففف.... یہ دادو بھی نا سخت ظالم خاتون تھیں۔ میں سخت غصے کے عالم میں وہاں سے نکلی تو پیچھے وہ ساری اونچی آواز میں گا کر میرے زخموں پر نمک چھڑک رہی تھیں۔

"دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے۔"

"ہونہہ....!" میں نے سر جھٹکا اور واقعی اپنی بے قدری پر میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔

"دنیا بھری پڑی تھی لڑکوں سے امی۔ آپ کو میرے لیے "از میریٹ دی سڑیل" ہی ملا تھا۔ اللہ نے شکل تھوڑی زیادہ اچھی دے دی ہے محترم کو۔ بس اسی کا غرور لے بیٹھا ہے اسے ورنہ تو میں مر کر بھی نہ مانتی اس رشتے کے لیے۔ آج بھی لڑکوں کی مائیں لپٹا لپٹا کر پیار کر رہی تھیں مجھے۔" میں سیدھی امی کے سر پر جا کر چلائی۔

ایک تو ویسے بھی بقول از میریٹ.... جب میرا منہ کھلتا ہے تو آنکھیں گویا بند ہو جاتی ہیں۔ دوسرے اس وقت یوں بھی آنسوؤں کی وجہ سے سب دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ دیکھا ہی نہیں کہ میرو کسی کام کی غرض سے امی کے پاس موجود تھا۔ ورنہ یہ تخریب کارانہ بیان میں بعد کے لیے اٹھا رکھتی۔ مگر دیتی ضرور۔ امی نے دانت کچکچائے' آنکھوں سے لاکھ اشارے کیے۔ خوامخواہ کھنکھار کر اپنے گلے میں خراشیں ڈال لیں۔ مگر میرا غصہ بات مکمل کر کے ہی ٹھنڈا ہوا اور ایسا ٹھنڈا ہوا کہ آنکھیں رگڑ کر صاف کرتے ہی صوفے کے بازو پر کہنی ٹکا کر بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے بیٹھا' میری ہی طرف متوجہ از میریٹ بھی نظر آنا شروع ہو گیا۔ کمرے میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

امی تو داماد کے سامنے شرمسار ہی اتنی تھیں کہ ان کی زبان گنگ ہو گئی.... اور میں....؟ میرا دل دھڑکنا بند ہونے لگا۔ حالت پتلی ہونے لگی' اتنی مشکل سے ملنے والا منگیتر ہاتھ سے نکلنے والا تھا۔

"اُف...." میری پیشانی تپ گئی۔ تب ہی دفعتاً وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا چچی جان! میں چلتا ہوں' بعد میں بات کریں گے۔" بہت معتدل لہجے میں کہہ کر وہ میری طرف گہری نگاہ ڈالتا باہر نکل گیا اور میں دل تھام کر امی کے بیڈ پر گر پڑی۔ اس قدر شکوہ بھری نگاہ.... امی کے دوہتھڑ کھا کر میں اچھل کر پرے ہٹی۔

"نالائق! نا ہنجار.... بیڑہ غرق کر ڈالا اپنا۔"

"اچھا۔ اس اکڑو کو کوئی نہیں سمجھائے گا جو سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔" باوجود پریشانی کے مجھے اعتراض ہوا تو میں اپنا شانہ سہلاتی منہ بسور کر بولی۔

"ارے تو کیا تجھے پاس بٹھا کر راگ درباری سناتا رہے.... الو کی دم نہ ہو تو.... کنجے کو ناخن دے دیے اللہ نے بھو کے جٹ کو پائی بھرا کٹورا مل گیا۔" امی نے تو طنزیات میں ماسٹرز کر رکھا تھا۔

"اوفوہ.... تو کبھی بندہ پیار دلار سے بھی بات کر لیتا ہے۔ یہ تو ہر وقت ہٹلر کا نیو ایڈیشن بن کر گھومتا رہتا ہے۔ بندہ اس سے بات کرنے سے پہلے دس دفعہ سوچتا ہے' کہیں ہاتھ ہی نہ گھما دے.... بندہ.... آہم.... میں یعنی روبحا گل۔"

"ارے الٹی کھوپڑی.... اس کا یہ احسان کیا کم ہے ہم پر کہ تم جیسی اول جلول کو اتنے آرام سے قبول کر لیا اس نے۔" امی بھی آخر کو روبحا گل کی امی تھیں' پٹاخ سے بولیں۔

"اوفوہ.... ایک تو ذرا سی بات کیا کر لو میرو کے بارے میں' پورا ہاؤس آپ کا دشمن ہو جاتا ہے.... اور میں اتنی بھی گئی گزری نہیں۔ کل فنکشن میں ہر آنٹی نے روک روک کر پوچھا۔ بیٹا آپ کا رشتہ طے تو نہیں ہوا ابھی۔" مجھے واقعی غصہ آیا یعنی کہ حد ہو گئی تھی۔ تو میں نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر سنا دیا۔ سال میری اور فور میں از میریٹ کی۔

"ہاں تو ہمدردی کے مارے پوچھ لیا کسی نے تو اس کو

بھی سن کر حیرت سے اٹیک ہی آتا ہو گا کہ اس ہونق لڑکی کی بھی منگنی ہو چکی ہے اور وہ بھی چاند جیسے لڑکے کے ساتھ۔" امی تو میرو کا دل دکھانے کا پورا پورا بدلہ مجھ سے لینے پر تلی ہوئی تھیں۔ میرا دل تو جل کر کوئلہ ہی ہو گیا۔

"ہونہہ... چاند... دور سے ہی اچھا لگتا ہے بس۔" میں نے بھی ڈھٹائی سے کہا۔ امی نے مجھے سخت نظروں سے گھورا پھر تلخی سے بولیں۔

"چلو اچھا ہی ہوا۔ مجھے ابھی سے تمہارے سنہری خیالات کا پتا چل گیا۔ ایویں ہم اس بچے کی زندگی برباد کر دیتے اپنے خوشی کے لیے۔ وہ خود بھی یہی بتانے آیا تھا کہ تمہارے لیے اسی آنٹی نے اپنے بیٹے کا رشتہ پوچھا ہے۔ جو کل تمہیں لپٹا لپٹا کر پیار کر رہی تھیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا اگر تم اس سے شادی کرنا چاہو تو..."

لو جی... ایک نہ دو پوری کی پوری بارہ گیندیں ایک دم سے امی نے میرے کورٹ میں ڈال دیں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ میرا تو سر ہی چکرا گیا تھا۔ مگر اب پچھتانے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئیں کھیت۔

☆ ☆ ☆

"ایسے تو تم اپنی منگنی تڑوا لو گی۔ ذرا دل میں اترنے کی کوشش کرو میرو کے۔" فائقہ کی جب سے خود کی "منگنی" ہوئی تھی وہ مجھے اچھے ہی مشورے دیتی تھی۔ کیونکہ اب اس کی میرو پر سے نظر ہٹ چکی تھی۔

"کیا کروں... سیڑھی لگا کر اتر جاؤں اس کے دل میں؟" میں بیزار تھی۔ لو بھلا... ایک دنیا شادی شدہ ہوئی جا رہی تھی اور میں روبحا گل، جس کی منگنی اس گھر میں سب سے پہلے ہوئی تھی، وہ ابھی تک منگیتر کے دل کے راستے کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے... یعنی کہ حد ہو گئی تھی۔ فائقہ نے کچھ سوچ کر چٹکی بجائی۔

"تم ایسا کرو کہ ویلن ٹائن ڈے ہے کل... میرو کو خوب صورت سے پھول گفٹ کر دو۔"

"اب کافروں کا دن مناؤں گی میں..." میں غرائی۔

"او بی بی... تم یہ دن نہ مناؤ اپنے منگیتر کو مناؤ بس۔" فائقہ نے میرے آگے ہاتھ جوڑے تب میں ذرا ٹھنڈی پڑی۔

غور کیا تو اس کا مشورہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ بھئی اب مجبوری تھی کہ میرو کو منانا تھا اور کل چودہ فروری تھی تو اس میں میرا کیا قصور؟ بڑی سوچ بچار اور مشوروں کے بعد بوبی کو اس کام کے لیے بلایا گیا۔

"کیوں باجی جی..." بوبی نے آنکھیں اور سر دائیں بائیں گھماتے طنز کیا۔ "چھتر پڑوانے ہیں مجھے آپ نے پولیس سے۔ آپ کو پتا نہیں کہ ویلن ٹائن ڈے پر عشق معشوقی والوں کی کیسی چھتر "پریڈ" ہوتی ہے اور میں تو ٹھہرا نازک مزاج... ایک ہی چھتر کھا کر آپ کا نام بتا دینا ہے کہ روبحا باجی نے بھیجا تھا پھول لینے۔"

اس کی بک بک نے سر میں درد کر دیا تو میں نے سو کا نوٹ "تقریباً" اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس نے نوٹ آنکھوں کے سامنے کر کے بغور دیکھا پھر دانت نکال کر پوچھا۔

"کتنے پھول چاہئیں؟" میں نے سکون کی سانس بھری۔ یہ مسئلہ تو حل ہو ہی جانے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز میں بے چینی سے صبح ہی سے گیٹ کے چکر لگانے لگی۔ مگر بوبی صاحب کا کہیں کوئی پتا نہ تھا۔

"جانے کہاں سو روپیہ اڑا کر عیاشی کر رہا ہے۔" میں نے کڑھ کر سوچتے ہوئے ——— بہ آواز بلند اظہار رائے بھی کر دیا۔

"ہاں... ہو سکتا ہے سو روپیہ لے کر وہ علینہ سینٹر چلا گیا ہو شاپنگ کے لیے۔" یہ طنز باہین چشمالو نے کتاب کا صفحہ الٹتے ہوئے کیا تھا۔ میں اندر سے کھسیانی ہوئی مگر بظاہر دانش مندی سے بولی۔

"جس کے پاس کچھ نہ ہو اس کے لیے سو روپیہ بھی کافی ہوتا ہے۔" تھوڑی دیر بعد بوبی منہ لٹکائے چلا

آیا۔ میں اڑتی ہوئی اس تک پہنچی۔

"مل گئے پھول... کہاں ہیں؟" میں نے اسے گھما کر آگے پیچھے دیکھا۔

"پھول تو کوئی نہیں ملے۔ آج تو حد ہی مک گئی روبیحا باجی! پورے شہر میں ایک بھی پھول نہیں بچا۔ سارے ہی بے وقوفوں کی طرح خریدے جا رہے ہیں۔" وہ مسکینیت سے بولا تو میں نے دانت کچکچائے۔

"میرے سو روپے کہاں ہیں؟"

"وہ تو جی کل ہی کھا لیے تھے اُس نے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ پھر مجھے جتایا۔ "آتا ہی کیا ہے جی ایک سو روپے میں... ریڑھی سے ایک درجن گول گپے... بس۔"

"اب جو بھی ہو... جیسے اور جہاں سے بھی ہو... کیونکہ تم اپنی فیس کھا چکے ہو اس لیے پھول تو تم ہی کو لا کر دینے ہوں گے۔"

مجھ پر اس کے شرم دلاؤ انداز کا خاک اثر ہوتا۔ میں تو خوش ہوئی کہ سو روپیہ خرچ کر کے وہ پھنس چکا تھا۔ وہ بے بسی سے سب کو دیکھنے لگا۔ مگر وہ سب اب کیا کر سکتی تھیں۔ مجبوراً" اسے جانا ہی پڑا۔

دوپہر ہونے کو آ گئی۔ مردوں کے گھر لوٹنے کا وقت ہونے والا تھا۔ کمرے سے گیٹ اور گیٹ سے کمرے تک چکر لگاتے میرا بی پی لو ہو گیا۔ تو میں چکر کھا کر زرمینہ پر گر گئی۔

"در فٹے منہ..." اس نے بدک کر کمبل منہ پر سے اتارا تھا۔

اب بس کر دو روبی... از میرٹ تمہاری قسمت میں ہی نہیں ہے شاید۔" فائقہ نے مجھے "چل منحوس" ٹائپ نظروں سے دیکھا تو میں گلوکوز کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ جو چڑیا نے جلدی سے لا کر مجھے تھمایا تھا۔ اسی وقت ڈور بیل بجی۔

"لو... میرو تو آ بھی گیا ہو گا۔" وہ استہزاء سے بولی تو میں جلدی سے دروازہ کھولنے بھاگی۔ توقع کے عین مطابق دروازے پر گھومتی آنکھیں لیے بوبی موجود تھا۔

"کیا بنا... گلاب ملے کہیں۔ بولو تم بولتے کیوں نہیں۔" میں نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے ہلا ڈالا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا۔

"آپ تو خود کش حملہ آور کی طرح وارد ہوتی ہیں روبیحا باجی۔" اس نے منہ بنایا۔

"جو میں پوچھ رہی ہوں، وہ بتاؤ... ورنہ ابھی کے ابھی میرے پورے ایک سو روپے واپس کرو۔" میں نے دانت پیس کر کہتے یوں چٹکی بجا کر سو روپے کہا جیسے خدانخواستہ ایک لاکھ روپے دے دیے ہوں۔

"تو مل گئے ہیں جی گلاب آپ کے... پورے شہر میں صرف ایک ہی دکان پر ملے ہیں۔ پر وہ آدمی بڑا کھڑوس ہے، کہتا ہے، ساتھ کسی بڑے کو لاؤ تب پھول دے گا۔ پانچ سو کا نوٹ بھی دکھایا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔"

"تو چلو نا... میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔" میں خوش ہو گئی، ساتھ ہی میری گدی کسی کے ہاتھ آ گئی۔ میں نے لرز کر دیکھا اور ڈھیلی پڑ گئی۔ پیچھے فائقہ اور زرمینہ موجود تھیں اور میری گردن زرمینہ کے ہاتھ میں تھی۔

"مل گئے پھول؟" فائقہ نے باچھیں پھیلائیں۔

"میں سوچ رہی تھی کہ میں بھی ممی کے لیے پھول لے ہی لوں۔"

"خبردار..." میں غرا کر جیسے اس پر جھپٹ پڑنے کو بولی۔ "وہ پھول صرف میں لوں گی۔ پورا سو روپیہ خرچ کیا ہے میں نے پورے شہر میں پھول ڈھونڈنے پر۔"

"پانچ سو۔" بوبی نے لقمہ دیا۔

"سو..." میں نے ایک بار پھر دہرایا۔

"نہیں پورے پانچ سو۔"

"ہیں؟ مگر میں نے تو تمہیں صرف سو روپے دیے تھے" میری آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔ دل تھم تھم کر دھڑکنے لگا تو وہ آنکھیں شرقاً" غرباً" گھماتے ہوئے چالاکی سے بولا۔

"تو جی پورے شہر میں جو رکشہ لے کر گھوما ہوں، اس پر تو کرایہ لگنا ہی تھا نا۔"

"الو کا..." میں نے دانت کچکچا کر اس کی گردن دبانے کی خواہش کو بہ مشکل دل ہی میں دبایا۔

"چلو بھئی... اب تو واقعی ان پھولوں پر تمہارا ہی حق ہے۔" فائقہ نے ہمدردانہ نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ میں آہ بھر کر رہ گئی۔

☆☆☆

ہم لوگوں نے کبھی لوکل کنوینس استعمال نہیں کی تھی' جہاں بھی جانا ہوتا گھر کی گاڑی میں کوئی ایک لڑکا ساتھ ہو لیتا۔ ورنہ ابو' چاچو زندہ باد۔ اب سڑک پر آکر رکشے کا انتظار کرنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ چنگ چی والے تو کافی تھے مگر آنکھوں دیکھے واقعہ نے ہم پر چنگ چی کی ہیبت طاری کردی۔ رکشے کے انتظار کے دوران چنگ چی والا کتنی ہی بار ہم سے سواری کا پوچھ چکا تھا۔ مگر ہم تینوں میں سے کوئی بھی اتنی بے پردہ سواری میں بیٹھنے کو راضی نہ تھا۔

"آپ کے نخرے ہیں بس۔ اتنی شاہی سواری ہے' جیٹ طیارہ سمجھیں اسے۔ گھوڑا تو نہیں جو ڈر رہی ہیں۔"... چنگ چی والے کا موڈ خراب ہوا تھا۔ اسی وقت ایک لڑکا گویا ہانپتا ہوا چنگ چی والے کے پاس آیا۔

"فیصل گیٹ جانا ہے؟"

"نہیں باؤ۔" اتنی دور نہیں جانا' واپسی پر خالی آنا پڑتا ہے ہمیں۔" وہ صفاچٹ انکار کرتے ہوئے بولا۔

"تم کرائے کی بات کرو' واپسی کا بھی دے دوں گا میں۔" لڑکے نے فراخ دلی سے کہا تو چنگ چی والے نے اسے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"لاؤ پھر تین سو روپے۔" اس لڑکے نے اسی وقت تین سو جیب میں سے نکال کر چنگ چی والے کے ہاتھ پر رکھ دیے تو اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ بھاگ کر موٹر سائیکل پر بیٹھا۔

"سواری کو لاؤ باؤ جی۔" وہ لڑکا سر ہلا کر ساتھ والی گلی میں گھس گیا۔ دو منٹ بعد وہ ایک وسیع و عریض طول و عرض والی عورت کے ساتھ واپس لوٹا تو ہم سب کے منہ بھی کھلے رہ گئے۔

چنگ چی والا بھی اس عورت کا حدود اربعہ دیکھ کر تذبذب کا شکار ہوا۔ مگر تین سو روپیہ نکالنے کو جی نہیں چاہا تو منہ سامنے کیے دل مضبوط کر کے بیٹھ گیا۔ اب مسئلہ اس عورت کا چنگ چی کی سیٹ پر بیٹھنے کا تھا۔

ہمارا رکشہ بھی مل گیا تو ہم تینوں رکشے میں گھس گئیں۔ بوبی اپنی سائیکل پر آگے تھا' رکشے والے کو راستہ بتانے کے لیے۔ باہر اس لڑکے نے بہ مشکل اس عورت کو چنگ چی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا تو بے تحاشا وزن پڑتے ساتھ ہی چنگ چی پیچھے کی طرف بیٹھ گیا۔ موٹر سائیکل کسی گھوڑے کی طرح اگلا ٹائر اٹھائے کھڑی ہو گئی بلکہ جیٹ طیارے کی طرح زوردار جھٹکے سے ڈرائیور اچھل کر سواریوں والی سیٹ پر آگرا۔ اور اب آنکھیں پٹپٹاتا ہوا ہونق سا صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمارا رکشہ زوں کر کے ان کے پاس سے گزر گیا۔ چنگ چی والے کی درگت پر ہم تینوں کی جو ہنسی شروع ہوئی تو پھولوں والی دکان تک پہنچنے تک نہیں رکی۔

چھوٹی سی پھولوں کی دکان پر واقعی پھول اور پھولوں کی پتیاں موجود تھیں۔ اور ایک چاچا جی ٹائپ بندہ اکتائی ہوئی شکل لیے وہاں موجود تھا۔ بوبی تو ادھر سے ہی رفوچکر ہو گیا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے جی۔ ابے نے گردن دبا لینی ہے میری۔ اب تو بس پھول ہی خریدنے ہیں۔ آپ خود خرید لیں۔" وہ میرا پانچ سو کا نوٹ مجھے تھما گیا تھا۔

"ہاں جی... کتنے فٹ کے حساب سے چاہئیں؟" چاچا جی نے اسی بیزار انداز میں پوچھا۔

"یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے ریسپشن کے لیے زمین پر بچھانے ہیں۔" زرمینہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"پانچ سو کے کافی ہوں گے... مگر ٹہنیوں کے ساتھ ہوں چاچا جی!" میں نے اونچی آواز میں کہتے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا مگر صرف پتیاں اور چھوٹے گلاب ہی موجود تھے۔ ٹہنی والا ایک بھی پھول نہ تھا۔

مجھے مایوسی ہوئی۔ کمینے ویلن ٹائن منانے والے۔ ایک بھی جو پھول کسی ضرورت مند کے لیے رہنے دیا ہو۔

"بس پانچ سو کے؟ ٹہنیوں والے پھول کون لیتا ہے ایسے موقع پر بیوقوفو!" چاچاجی نے ہمیں گھور کر دیکھا۔

اب مجبوری تھی۔ میرے پاس اور کوئی آپشن بھی نہ تھا۔ سو چاچاجی کو ہدایت کی۔

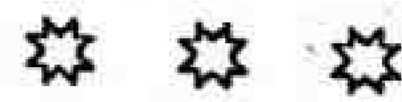
"پانچ سو کے کافی ہوں گے۔ پھول ثابت والے ڈالیے گا' پتیاں نہیں۔" چاچاجی نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"بی بی! تم بس یہ بتاؤ کہ میت کتنے فٹ کی ہے؟" اب کی بار تو ہم تینوں کی گھگھی بندھی اور رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"ج ... جی ... کک ... کیا مطلب؟" میرے تو سردی کے مارے ... یا شاید خوف کے مارے دانت بھی بجنے لگے۔

"بھئی اگر چھوٹا مردہ ہے تو پانچ سو کے پھول کافی ہوں گے مگر بڑی قبر کے لیے زیادہ لینے پڑیں گے۔ اب بتاؤ' کتنے فٹ کا بندہ ہے؟"

چاچاجی پروفیشنل انداز میں بولے تو مجھے گویا چھوٹا موٹا ہارٹ اٹیک آتے آتے بچا۔ ہم وہاں سے گویا اڑ کر بھاگے۔ سارے راستے زرمینہ اور فائقہ پیٹ پکڑے ہنستی رہیں اور میں ... جتنی گالیاں یاد تھیں' وہ سارے راستے بوبی کو دیتی آئی۔ بوبی کمینہ' ہمیں قبرستان کی قبروں کے لیے پھول بیچنے والے کی دوکان پر لے آیا تھا۔ کیونکہ یہی ایک جگہ تھی جہاں سے پھول آج بھی ختم نہ ہوئے۔ کیونکہ مردے ویلن ٹائن ڈے نہیں منایا کرتے۔



میرا تلملا تلملا کر برا حال تھا اور ان سب کا ہنس ہنس کر۔

"تم لوگ یہ نوٹ کرو کہ میں تو انکار کروں سو کروں ... وہ پہلے ہی مجھ سے چھٹکارا پانے کو تیار بیٹھا ہے۔"

میں نے درد بھرے انداز میں کہہ کر ان کی ہمدردی حاصل کرنی چاہی۔

"تو اچھا ہوا نا۔ تم نے بھی میرے بھائی کو کافی ہلکا لے رکھا تھا۔" زرمینہ میری قریب الختم منگنی سے کافی خوش تھی کمینی ... نند نہ ہو تو۔

"یہ لو آپی ... اس درِّ نایاب کی تصویر جس نے تمہارے لیے رشتہ بھیجا ہے اور جس کی اماں تمہیں فنکشن میں لپٹائے جارہی تھیں۔"

چڑیا نے اندر آتے ہی بڑے موڈ کے ساتھ تصویر میری طرف پھینکی اور زرمینہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے وفور اشتیاق سے تصویر اٹھا کر دیکھی تو دل مرسا گیا۔ سانولی رنگت' نارمل سے نقوش اور چھوٹی سی داڑھی۔ وہ سب تصویر پر ایسے لپکیں جیسے شادی میں لوگ کھانے کی طرف لپکتے ہیں۔ مگر تصویر دیکھ کر ان سب کو میری ذہنی حالت پر شک ہوا۔

"مٹن چھوڑ کر گھاس کھانے والی ہو تم رو بحاگل!"

یہ فائقہ کا تجزیہ تھا۔ مگر میں انتقام کی جس سیڑھی پر چڑھ چکی تھی۔ وہاں سے مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"اس میوے کے کڑوے کسیلے انداز سے تو بہتر ہے نا۔ خود پسند کیا ہے اس نے مجھے۔ ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھے گا مجھے۔"

میں اس صورت حال سے مطمئن تھی ذرا حوصلہ بھی بلند تھا کہ ابھی میری مارکیٹ ویلیو اتنی ڈاؤن نہیں ہوئی تھی کہ کوئی رشتہ ہی نہ ملتا۔

"آپی ... تم اس صوفی سے نکاح کروگی تو میں نہیں آؤں گی شادی میں۔" چڑیا نے صاف جواب دیا تھا۔

میں نے ہاتھ ہلا کر گویا مکھی اڑائی۔ مگر بات دادو کے کانوں تک پہنچی تو وہ حق دق رہ گئیں۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ہم دونوں ان کے طے کیے رشتے سے اس قدر عاجز آئے ہوئے ہیں۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گئیں مگر ان کی زیرک نگاہ معاملے کی سنگینی جانچ چکی تھی۔ اسی دوپہر تک دادو بستر پر پڑ گئیں۔

"ارے میں نہیں بچنے والی اب ..." کیا ہی بچے زمین پر لوٹنیاں لیتے ہوں گے جو دادو نے دل تھام کر بستر پر لے ڈالیں۔ ڈاکٹر کو گھر بلوایا کہ وہ خود اسپتال کو یہ شرف بخشنے کو تیار ہی نہ تھیں۔

"ہاں جی... حوصلہ پکڑیں ہمت کریں۔" تایا ابو، چچا جان اور ابو جی سخت پریشان تھے۔

"ارے کیا حوصلہ پکڑوں میں۔ تو سمجھو اگلے جہاں کا ٹکٹ پکڑنے والی ہوں اب!" انہوں نے دونوں ہاتھ مسلے جیسے ہاتھوں سے وقت نکلا جاتا ہو۔ میرو تو ان کا سب سے لاڈلا پوتا تھا۔ ان کی بات پر تڑپ تڑپ گیا۔

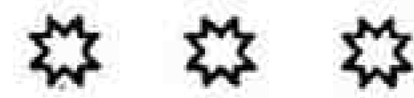
"کیسی باتیں کرتی ہیں دادو... ابھی تو آپ نے ساری خوشیاں دیکھنی ہیں ہماری۔" اب اس نے تو جس بھی انداز میں کہا ہو دادو تو اچھل کر اس سے لپٹ ہی گئیں۔

"ہک ہاہ... بس میری جان! میں تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتی تھی۔ اب میں بچ جاؤں گی اور ساری خوشیاں دیکھوں گی اپنے پوتوں اور پوتیوں کی۔" وہ خوشی سے نہال ہو گئیں اور سب خوش کہ ان کی طبیعت ذرا سنبھل گئی۔

"تو بس پھر طے ہو گیا اسی ہفتے روبحا کی شادی ہو گی۔" وہ بچوں کی سی خوشی سے بولیں تو سب نے بے یقینی سے ان کو دیکھا۔ وہ فوراً "دل پکڑ کر لیٹ گئیں۔

"اب تو یہی آخری حسرت گئی ہے زندگی کی۔"

لو جی کیا ہی مدھوبالا اور روجنتی مالا نے جذباتی ایکٹنگ کی ہو گی جو دادو نے کر ڈالی۔ گھر والے سب تو بس دادو کی اداکاریاں دیکھ کر انگشت بدنداں تھے اور میں عجیب سی گومگو کیفیت میں تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرو سڑیل سے چھٹکارا ملنے پر بھنگڑے ڈالوں یا اتنے ہینڈسم منگیتر کے چھن جانے پر غم مناؤں۔ اور اس صوفی صاحب کے ملنے پر کیا منانا تھا۔ وہ ابھی طے نہیں کیا تھا۔



اگلے دن جیسے ازمیروٹ کی شامت آ گئی۔

"میرو... خود جا کر روبحا کی پسند کی شاپنگ کراؤ اسے۔"

دادو نے تو قسم ہی کھائی تھی کہ میرو کو ہر آرڈر اب دل پر ہاتھ رکھ کر ہی دینا ہے (ایکٹنگ) وہ میرے آگے چلتا ہوا جا کر گاڑی میں بیٹھا اور زور سے دروازہ بند کیا۔ میں جل تو جلال تو کا ورد کرتی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بجائے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں لائٹ سے میک اپ میں تھی اس لیے مجھے کوئی فکر نہ ہوئی اور ویسے بھی وہ سڑیل اب کون سا میرا منگیتر رہا تھا مگر میک اپ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے اچھی طرح احساس ہو کہ کتنی خوب صورت لڑکی اس کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔

"یہ کیا پٹی پڑھائی ہے تم نے دادو کو؟" وہ دانت پیس کر مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ یعنی تمہارے خیال میں ان سے میں نے کہا ہے کہ مجھے اس دلدل میں دھکیل دیں؟" میں نے بھی اسے اکڑ کر دکھانا اپنا فرض خیال کیا۔

"ذرا یہ نادر خیالات دادو کے سامنے ظاہر کرتیں تو پتا چلتا ان کو بھی تمہاری فرماں برداری کا۔"

"تم بھی پوچھ پچھ کرنے کی یہ ہمت ان کے سامنے ہی کر لیتے تو پتا چلتا تمہیں۔" میں نے پٹاخ سے جواب دیا۔

"ہونہہ..." وہ رخ پھیر کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

اب ذرا بازار کا حال بھی سن لیجیے۔ جس جس لہنگے پر میں نے ہاتھ رکھا، میرو نے اسے ریجیکٹ کیا اور ساتھ ساتھ بے رحمانہ کمنٹس۔

"یہ کیسا کام ہے اس پر فضول سا۔ یہ تو کلر ہی اتنا ڈل ہے... اپنی شکل دیکھو یہ کلر پہن کر ڈراؤ گی سب کو... فش لہنگا تو بس اسمارٹ لڑکیوں پر اچھا لگتا ہے..."

جب اس نے مجھے ہر بوتیک میں پھرا پھرا کر پورے دس لہنگے یونہی ریجیکٹ کر دیے تو میرے صبر کے مگ گلاس لوٹے سب لبریز ہو گئے۔ میں شاپ کیپر اور کسٹمرز کا خیال کیے بغیر اس سے الجھ پڑی۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ دلہن کون بننے والا ہے؟ اور لہنگا تم اپنے لیے پسند کر رہے ہو یا میرے لیے؟" شاپ کیپر اور اس کے معاون لڑکے اپنی ہنسی

چھپانے لگے۔

ازمیر بٹ نے گھور کر مجھے دیکھا۔ مگر پھر کچھ مزید پیش گوئیاں نہیں کیں تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ جس نے زبان میں چپ رہنے کا آپشن بھی رکھا ہوا ہے۔ لیکن اب شام ہو چکی تھی اور مزید لینگے بھی نہیں بچے تھے۔ اور دل کی بات بتاؤں تو جن لہنگوں کو میرو نے ریجیکٹ کیا' ان میں سے کوئی بھی اب مجھے اتنا اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ لے ہی لیتی۔ بجھے دل سے اٹھ گئی۔ واپسی کا راستہ خاموشی سے کٹا' شاید ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے ناراض تھے۔

☆ ☆ ☆

شک کی زرد ٹہنی پر
پھول بدگمانی کے
اس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی
اجنبی سے لگتے ہیں

میں بستر پر آزردہ سی کیفیت میں اوندھی پڑی تھی۔

"اب تو دنیا کی رنگینیوں سے دل ہی اٹھ گیا ہے۔"

یہ میرا کچھ دیر پہلے دیا جانے والا ریمارک تھا۔ وہ ساری مجھے دفع دور کیے میری ہی شادی کے فنکشنز میں پہننے والے ڈریسز پر ڈسکشن کر رہی تھیں۔ اور مجھے ازمیر بٹ کی ٹینشن کھائے جا رہی تھی۔ مجھے رونا آنے لگا۔

"اف اللہ یعنی میں میرو کے منہ سے ایک بار بھی اعتراف محبت نہیں سنوں گی۔ نامراد ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی۔" میں اٹھ بیٹھی تو انہوں نے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"اعتراف ہوتا ہے محبت کا۔ یہاں تو بس انتقام کی آگ نظر آتی تھی میرو کی آنکھوں میں۔" فائقہ نے بے رحمی سے کہا۔

"یہ فرمائشیں اصولاً" اب تمہیں اپنے صوفی سے کرنی چاہئیں۔ میرا بھائی اب کون سا لو میرج کر رہا ہے تمہارے ساتھ جو وہ پیار بھرے رقعے بھیجتا رہے

تمہیں بک ہا۔ اس بے چارے کے تو اڑنے سے پہلے ہی پر کتر دیے گئے تھے۔ وہ تو شکر ہے قدرت نے دادو کی تیسری آنکھ کھول دی اور وہ قربانی سے بچ گیا۔"

زرمینہ کو افسوس کے ساتھ خوشی بھی تھی۔

ایک بھی بندی ایسی نہیں تھی جو میرا ساتھ دیتی۔ کمینیاں۔ آ لینے دو ذرا ان کی باری چن چن کر بدلے لوں گی۔ اسی وقت جب میں سنجیدگی سے خودکشی کرنے کا کوئی آسان سا طریقہ ڈھونڈ رہی تھی۔ تائی اماں ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپنگ بیگ تھامے چلی آئیں۔

"یہ دیکھو ذرا۔ کیسا ہے تمہارا لہنگا؟" انہوں نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ شاپنگ بیگ میری طرف بڑھایا تو میں نے بجھے دل سے بیگ تھام لیا۔

"کیا تھا اگر میرو اپنی پسند سے مجھے لہنگا لے دیتا۔ کتنی یادگار شادی بن جاتی میرے لیے۔" بے دلی سے میں نے بیڈ پر بیگ الٹا تو سرخ رنگ پورے ماحول پر چھا سا گیا۔ بہت خوب صورت کامدانی آف وائٹ شرٹ کامدانی سرخ لہنگا اور خوب صورت دوپٹہ۔ میری سانس پل بھر کو رکی۔

"واؤ۔ ماشاء اللہ بہت پیارا ہے۔ کون لایا؟ کس کی پسند کا ہے؟ ریڈ کلر کتنا نائس ہے نا۔ اور شرٹ کیسی اٹھ رہی ہے اس کے ساتھ۔" وہ سب رطب اللسان تھیں۔ اور تائی جان میرے کچھ کہنے کی منتظر تھیں۔

"بہت خوب صورت ہے تائی جان! بالکل ویسا جیسا میں نے اپنے لیے سوچا تھا۔"

تائی جان نے آگے بڑھ کر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما اور میری پیشانی چوم کر محبت بھرے نم لہجے میں بولیں۔

"یہ میرو لایا ہے تمہارے لیے اپنی پسند سے۔" ان سب کے منہ کھل گئے اور میں۔ میں تو بے یقین سی بیٹھی رہ گئی۔

میرو؟

وہ اکڑو بٹ' اجڈ' شرارہ ہٹلر کا نیو ایڈیشن۔ سپاٹ

بات پر دادا جان کی بندوق اتارنے والا۔ اس کے اندر یہ نرم جذبات کہاں سے آگئے۔

"کہہ رہا تھا، روبینا کو کسی بھی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔" تائی جان بولیں تو میرا چھوٹا دل اچھل اٹھا۔ وہ سب جل ککڑیاں کبھی گردن گھما کر مجھے دیکھتیں اور کبھی تائی جان کو۔ مجھے سچ میں مزہ آیا۔ "اب پتا چلا اس میرو کے بچے کو کیا کھویا ہے اس نے۔ ہونہہ!" میں لہنگا الٹ پلٹ کر دیکھتی اندر ہی اندر خوش ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

٭ ٭ ٭

"چلو تمہیں بھی شاپنگ کروادوں تمہارا تو اسپیشل ڈے ہو گا نا۔"

میں ان سب کے بازار جانے کے بعد تھوڑی دیر دادو کے ساتھ بیٹھی اور پھر آکر پچھلے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی جب ازمیر وہاں چلا آیا اور اس قدر دوستانہ انداز میں بولا کہ میں دنگ رہ گئی۔ رونا بھی آیا کہ اب ہی اتنا اچھا بننا تھا تم نے ازمیر بٹ؟ جب میں اس صوفی سوپ اور صوفی ککنگ آئل... میرا مطلب ہے اصفہان کے رشتے کو قبول کر چکی تھی۔ میں یونہی سر اٹھا کر اسے دیکھے گئی تو وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"کیا ہے... ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

ہائے... اس کا ہلکا سا تبسم بھی کیا قیامت تھا۔ مرد ہنستے ہوئے کم ہی خوبرو لگا کرتے ہیں... اور میرو تو ریکارڈ ٹائم ہی ہنسا ہو گا چند بار... مگر آج میرے لیے شاید پہلی بار۔

میرا دل تیزی سے احساس زیاں سے بھرنے لگا تو نمی آنکھوں تک آگئی۔ وہ متفکر سا میرے پاس قدرے فاصلے پر اس سیڑھی پر بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا... لہنگا پسند نہیں آیا؟" وہ اس قدر پریشانی سے پوچھ رہا تھا کہ مجھے اپنے کیے پر رونا آنے لگا۔

"تیرا ککھ نہ رہوے صوفی، کس چرخ کو پسند کر لیا میں نے۔" اب تو ہاتھ ملنے کا وقت بھی نکل چکا تھا۔

"کیا تم پہلے اتنے اچھے نہیں ہو سکتے تھے میرو؟"

میں نے رو کر پوچھا تو وہ متحیر سا مجھے دیکھے گیا۔ اس بیچارے کو کیا خبر تھی کہ میں اس کے لیے رو رہی ہوں۔

"چلو دیر آید درست آید... اب تو اچھا بن گیا ناں۔" اس نے مجھے بہلایا تو میرا دل دکھ گیا۔

"اب کیا فائدہ... اب تو میری شادی ہونے والی ہے۔" میں درد بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

"تو شادی کے لیے اچھا شوہر نہیں چاہیے ہوتا کیا؟" وہ الجھا۔

"اب کیا فائدہ میرو... جب... جب..." مجھ سے باقی کا فقرہ مکمل ہی نہ ہوا اور میں روتی ہوئی تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

"جب؟ جب کیا؟" میرو نے پیچھے سے تحیر بھری اونچی آواز میں پوچھا تھا۔ مگر جو جان بوجھ کر اندھا بنے، اس کا دارو کیا؟

٭ ٭ ٭

میں کچن میں کھڑی اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ ساری رات سوچ سوچ اور رو رو کر اب سر میں درد ہو رہا تھا۔ تب ہی ازمیر وہاں چلا آیا اور آتے ہی اسٹول گھسیٹ کر چھوٹی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اب میری طرف دھیان کیا تو چونکا۔

"تم کیوں ناشتا بنا رہی ہو؟ باقی سب کہاں ہیں؟ ان میں سے کسی کو کہتیں بلکہ زری کو کہتیں وہ تمہارا ناشتا بناتی۔"

وہ بڑی اپنائیت سے بولا تو میرا بچوں کی طرح زور سے رونے کو دل کیا۔ بلکہ ساتھ ایڑیاں رگڑنے کا بھی، شاید میرو واپس مل جائے؟ (مگر فی الحال تو خود کو سمجھانا تھا) وہ جو اس رشتے سے اکتایا اور بے زار پھرتا تھا۔ اس کے سامنے ہار ماننا میری انا کو گوارا نہ تھا۔ تو اسی لیے ہلکے پھلکے طنز سے بولی۔

"ہاں... وہ تو میرا ہی ناشتا بنا دیتی۔"

"ہاہاہا... اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میرے حوالے سے تو وہ تمہیں بہت پسند کرتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ تو میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اب وہ

باتیں تو قصۂ پارینہ ہوئیں۔ اب تو میں اصفہان عدیل کی ہونے والی تھی۔

"اگر چائے ہے تو اپنے ہاتھ سے بنی ایک کپ یادگار چائے ہی پلادو پھر ہم یاد کیا کریں گے اس چائے کے کپ کو۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے اپنے مگ میں سے اس کے لیے آدھی چائے کپ میں ڈالی اور اس کے مقابل اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"تھینکس..." اس نے کہتے ہوئے گھونٹ بھرا۔

"ہم... واہ..." گھونٹ بھر کر وہ جیسے سانس اندر کھینچتے ہوئے، بہت مسحور ہوا تھا۔

"تم چائے بناتی ہو تو پورا گھر مہک جاتا ہے روی۔" میں اس کی بات اور انداز تخاطب پر لڑکھڑا کر اسٹول پر سے پھسلتے پھسلتے بچی۔

"پتا ہے، جب دادو نے میری اور تمہاری زبردستی منگنی کروا دی... بلکہ اچانک۔" وہ کپ کے گولڈن کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے جیسے اس دن میں لوٹ گیا تھا۔ میں نے دکھی سی آہ بھری۔ بھلا وہ بھی کوئی بھولنے والی بات تھی۔

"تم نے نوٹس نہیں کیا کہ میں نے کوئی بھی اعتراض نہیں کیا تھا؟" اس نے اچانک میری طرف دیکھا تو میں جو بغور اسے دیکھتے ہوئے توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں کے نرم سے تاثر کو دیکھ کر سن رہ گئی۔

"کیوں...؟" میرے منہ سے بے اختیار پھسلا تو وہ ہلکا سا مسکرایا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر نرمی سے بولا۔

"کیونکہ مجھے کوئی اعتراض ہی نہیں تھا۔"

زن... تیز رفتار ٹرین میرے وجود پر سے گزری تھی۔ وہ چائے کا آخری گھونٹ بھرتا اٹھ گیا۔

"تمہارا ایک سوٹ تھا، ریڈ اینڈ آف وائٹ کنٹراسٹ کا۔ وہ تم پر بہت خوب صورت لگتا تھا۔ اسی لیے میں نے تمہارے لہنگے کا کلر اپنی مرضی سے لیا ہے۔ میں تمہیں اس روز بہت خوب صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس کے لب و لہجے میں زمانوں کی محبت بولتی تھی۔ میں نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا مگر میری ڈبڈبائی آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں نے میرے اس کے بیچ جو دیوار کھڑی کر دی تھی۔ اس نے مجھے یہ آخری دیدار نہ کرنے دیا اور وہ اپنے ملبوس کی خوشبو وہیں میرے اردگرد چھوڑ کر چلا گیا۔

"اف..." میں گہرے صدمے کا شکار وہیں بت بنی بیٹھی رہ گئی۔ تو وہ شروع ہی سے مجھ سے محبت کرتا تھا... اور میں اظہار محبت کی متمنی اس قدر جلد باز نکلی کہ ہر رشتہ کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا۔ یہ سمجھے بنا کہ ہر بات اور جذبے کے اظہار کا وقت ہوا کرتا ہے۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرتے میٹھی چائے کو نمکین کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

بابل کا یہ گھر گوری
کچھ دن کا ٹھکانہ ہے
بن کے دلہن اک دن
تو نے صوفی کو ڈرانا ہے

زرمینہ کے گانے پر سب کی ہنسی چھوٹی اور میرا رونا... تب وہ ساری بوکھلائیں۔

"ہاہ... کیا ہو گیا روی؟ کیوں اتنی دل برداشتہ ہو رہی ہو۔ تم تو لکی ہو یار اپنی پسند سے شادی کر رہی ہو۔" زرمینہ کی نرم دلی عود کر آئی۔

"بکواس مت... تم تو تھیں ہی میری دشمن، میری سابقہ نند، نگلی کا گند... تم منع نہیں کر سکتی تھیں مجھے اس غلط قدم سے۔" میں اس پر غرائی تو اس کے نرم جذبات اڑتے بھی وقت نہ لگا۔ اس نے بھی آستینیں موڑیں۔

"تیرا بیڑا تر جائے روحا گل... خود ہی تو میرے ہیرے جیسے بھائی کو ٹھکرا کر وہ کنکر چنا تم نے اور اب الزام ہم پر۔"

"اندھے کو کیا پتا ہیرا ہے یا کنکر..." میں نے آہ

بھری۔

"اور ان دنوں میرو جتنا اچھا بن گیا ہے' ایسا پچھلی قسطوں میں بھی رہتا تو کیا میں بے وقوف تھی جو اس اصفہان عرف صوفی کو کنگ آئل کو منہ لگاتی۔"

"اوہ..." ان سب کی معنی خیز سے اوہ نے میرے آنسو خشک کردیے۔

"اہم... یہ واقعہ کہاں پیش آیا بائی داوے؟"

فائقہ نے کھنکھار کر بظاہر سرسری پوچھا۔

"کون سا واقعہ؟"

"یہی... ازمیربٹ کے اچھا بننے والا؟" اس نے آنکھیں نچائیں۔

"اب کیا فائدہ... جب دل ہی بجھ گیا ہے۔" میں ستر کی دہائی کی ہیروئین بنی۔

"تم سے جان چھوٹ گئی اب تو اچھا بننا ہی تھا اس نے شکرانے کے طور پر۔" زرمینہ نے سچ بول کر ایک چماٹ کھایا مجھ سے۔ مگر سچ یہی تھا کہ جیسا بھی تھا' اس دل کا مکین ازمیربٹ ہی تھا۔ فیس بک والیاں اب بھلا اس غداری پر مجھے کبھی معاف کریں گی؟ جن کی خواہش تھی کہ چینی سستی ہو نہ ہو میرو کی شادی روبحا گل ہی سے ہو۔

"آہ... ان سب کو کتنا شوق تھا رومانٹک سے ازمیربٹ کو دیکھنے کا... اور خواتین ڈائجسٹ کی ریڈرز بھلا کیا کیا نہ تنقید کریں گی مجھ پر کہ اب جبکہ وہ رومانٹک ہونے لگا تھا تو روبحا گل نے دل کہیں اور لگا لیا۔ صوفی جیسا ہیرو کس کو پسند آتا بھلا۔

اور پھر وہ دن آہی گیا جب مجھے بٹ ہاؤس سے رخصت ہونا تھا۔

"زرمینہ! میرے تمام کپڑے جن پر تم دل للچاتی رہتی تھیں' وہ تم لے لینا... اور میری جیولری فائقہ کو دے دینا۔ اس نے بھی بڑی نظر لگائی ہے میری چیزوں کو اور میری ہیئر پنز ماہین چشماٹو کو دینا بلکہ چھبو چھبو کر دینا اس کی بڑی نظر تھی ان پر۔" میری وصیت ابھی جاری تھی جب اندر آتی چڑیا اکتا کر بولی۔

"بس کرو آپی! گھر سے رخصت ہو رہی ہو۔ دنیا سے نہیں جو سب وصیت میں بانٹ کر جا رہی ہو۔ قاضی صاحب آرہے ہیں۔ اب شریف بچی بن کر بیٹھ جاؤ۔" میرے تو وجود پر لرزہ طاری ہو گیا۔

انف... تو اب یقینی جدائی ہو رہی تھی میرو سے...

"روبحا گل بنت احمد حسن۔ آپ کو بعوض ایک لاکھ روپے حق مہر کے ازمیربٹ کے نکاح میں دیا جاتا ہے' آپ کو قبول ہے؟"

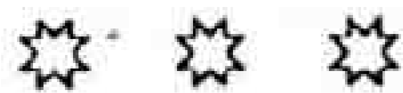
قاضی صاحب کی آواز نے پٹاخ سے میری بھنچی آنکھیں کھول دیں۔ میں نے باقاعدہ گھونگھٹ ہٹا کر قاضی صاحب کا منہ دیکھا۔ بہرے ہوئے تو نہیں؟ مجھے فکر ہوئی۔ کہیں میرا نکاح ہی مکروہ نہ کروادیں۔ قاضی صاحب اپنا اس قدر عمیق نظری سے جائزہ لینے جانے پر سٹپٹا سے گئے۔

"نام تو ٹھیک سے پڑھیں قاضی صاحب!" میں منمنائی۔ گھر والے تو میری ہمت پر انگشت بدنداں تھے' ٹوکتے کیا خاک۔

"بی بی! یہی نام لکھا ہوا ہے دولہے کا۔ ازمیربٹ۔" قاضی صاحب نے اپنی قابلیت پر شک کیے جانے کو مائنڈ کرتے ہوئے رجسٹر میرے آگے کھسکایا۔ میرو کا نام سنہری حروف میں لکھا دیکھ کر میں نے فوری طور پر باچھیں پھیلا کر تین بار قبول ہے کہا اور جب سب مجھے اپریل فول بنا کر خوش ہو رہی تھیں' میں نے اشارے سے زرمینہ اور فائقہ کو بلایا۔

"کیسا رہا... اپریل فول؟" انہوں نے دانت نکوس کر پوچھا۔

"ڈکینیو! میرے ایک بھی جوڑے یا جیولری کو ہاتھ لگایا تو ہاتھ توڑ دوں گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے دانت پیسے تو وہ بے ہوش ہونے والی ہو گئیں۔



ازمیربٹ کمرے میں آیا تو کمرہ تازہ گلاب کے پھولوں سے مہک رہا تھا۔ میرا دل تھم تھم کر دھڑکنے لگا اور ساتھ خواتین ڈائجسٹ کی ریڈرز کا بھی۔ وہ میرے سامنے آ بیٹھا۔

"ہم... تو روبیحا گل شرماتی بھی ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔ میری تو ہمت بھی نہ ہوئی کہ ایک نظر دیکھ ہی لوں کہ دولہا بن کر وہ کیسا ڈیشنگ اور سمیشنگ لگ رہا ہے۔ اس نے جیب ٹٹول کر ایک چھوٹا سا بکس نکالا۔

"یہ تمہارا منہ دکھائی کا گفٹ... خالص میری چوائس۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تو میں شرما سی گئی۔

میں نے اپنا ہاتھ کھینچا تو میرو نے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اٹھ جاؤ روبیحا کی بچی، میرے لیپ ٹاپ کے اوپر گری ہوئی ہو۔ سونا مرنا ہے تو اپنے بستر پر جا کر سوؤ بھی اور مرو بھی۔" فائقہ مجھے جھنجھوڑ رہی تھی اور میرا ہاتھ تھام کر کھینچ رہی تھی۔

میری آنکھ پٹاخ سے کھل گئی۔ میں نے آنکھیں مل کر ادھر ادھر دیکھا۔ نہ وہ گلابوں سے مہکتا ماحول... نہ کوئی سیج اور نہ ازمیرٹ تو کیا یہ خواب تھا؟ مجھے بے یقینی ہوئی۔

"کمینی! بیڑا تر جائے تمہارا... دو منٹ ٹھہر جاتیں تو کیا ہو جاتا۔ ہائے مجھے اپنی رونمائی کا تحفہ تو دیکھ لینے دیتیں۔ میرو دے رہا تھا۔" مجھے رونا آنے لگا۔

"لایا ہے وہ تحفہ آج پکانے کے لیے..." فائقہ نے منہ بگاڑا تو میرے آنسو تھم گئے۔

"کدو شریف..." میں بے اختیار بولی۔

"اس بار ساتھ میں ٹنڈے بدمعاش بھی ہیں۔" فائقہ ہنسی۔

مگر میرا دل... اُف، ہائے... مگر یہ صوفی کون تھا؟ میں نے لیپ ٹاپ آن کیا... سامنے ہی امبر گل کی شادی مبارک کی پوسٹ... سفیان بھائی عرف صوفی... جنہیں خواتین شعاع گروپ کے ممبرز صوفے کے نام سے چھیڑتے تھے تو یہی پوسٹ ناچتی رہی رات بھر ذہن میں خواب کی صورت۔

"یہ لو رخصت ہو گئی امبر گل صوفی کے ساتھ۔ کاش ساڈا وی کوئی صوفی ہوندا۔" میں نے حسرت سے کہا تو فائقہ نے تحیر سے مجھے دیکھا۔

"ازمیرٹ کیوں نہ ہو نا...؟"

ہونہہ... ازمیرٹ تو صرف خواب ہی میں دولہا بنے گا میرا۔ ایک یہ صوفی ہے، بیاہ کر بھی لے گیا تو پھر بس صوفی جو نام ہے اعتماد کا۔" میں نے حسرت سے امبر اور سفیان کی شادی کی الوداعی پوسٹ کو دیکھا اور لیپ ٹاپ بند کر کے کدو شریف اور ٹنڈے بدمعاش پکانے کے لیے اٹھ گئی۔

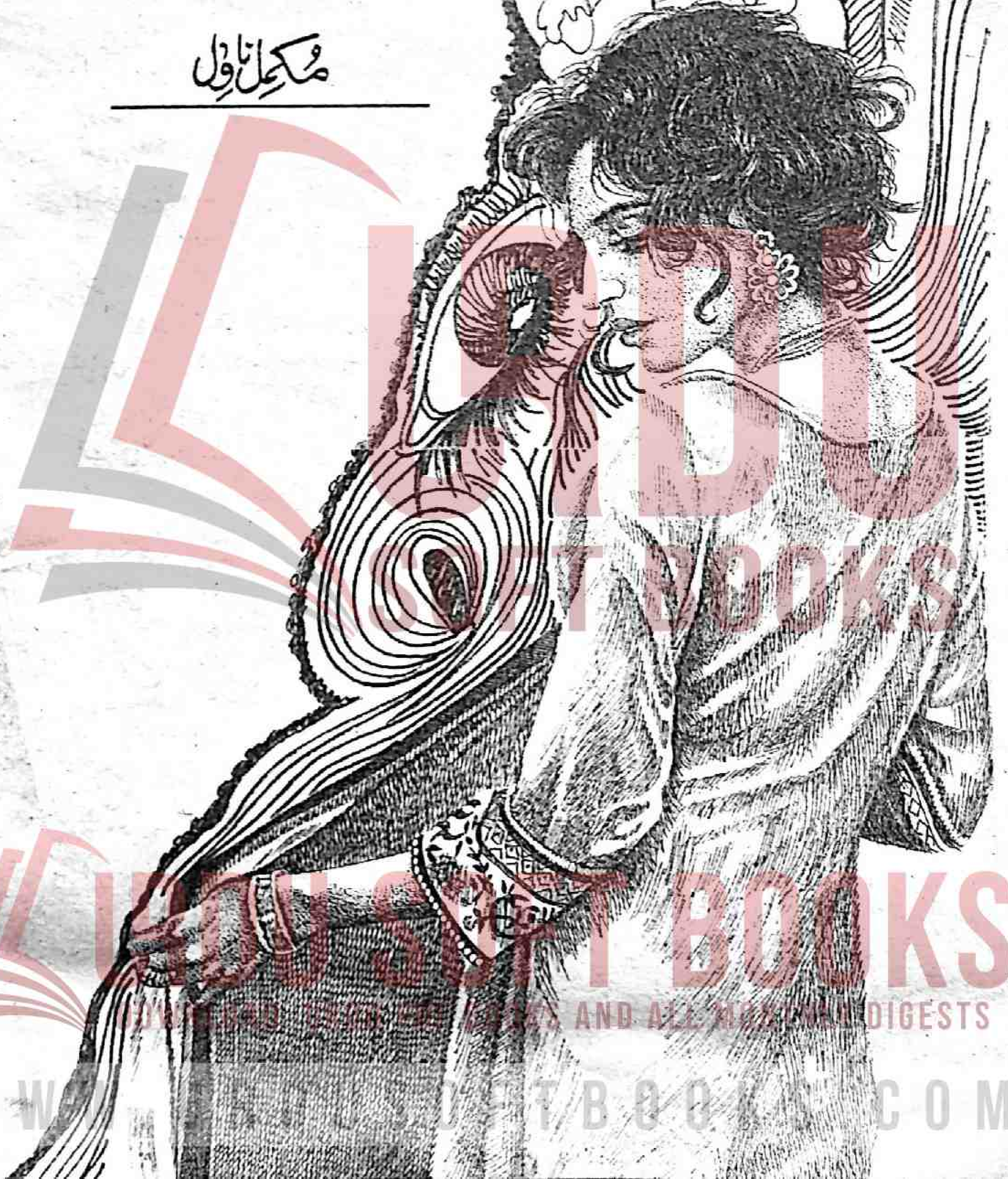
تو قارئین! روبیحا گل ابھی بھی کنواری ہے اور ازمیرٹ شاید صرف خواب میں ہی سیدھا ہو سکتا ہے۔ آپ کے پاس کوئی ٹپ ہو تو فیس بک پر آئیے نا پلیز... مشورے دیں گی تو ثواب دارین حاصل ہوگا۔



نعیمہ ناز

ادا فروش

مکمل ناول



"تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے شادی کرو گے؟" اس خوب صورت سے چہرے پہ سراسیمگی بھی تھی اور امید بھی۔

"وعدے توڑنے کے لیے کیے جاتے ہیں' وفا کرنے کے لیے نہیں۔" وہ ستم گر استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ انوشہ کا ڈوبتا ہوا دل بالکل ہی پاتال سے لگ گیا۔

"تم نے وعدہ نبھانے کا عہد بھی کیا تھا۔"

وہ اسے یاد دلا رہی تھی' مگر جاذب کمال کچھ بھولا ہی کب تھا جو یاد دلانے کی ضرورت پڑتی' وہ تو اپنی باتوں اور وعدوں کو فراموش کر رہا تھا۔ ان سے مکر رہا تھا اور مکرنے والوں کو کچھ بھی یاد دلانا ایسا ہی ہے جیسے جاگتے ہوئے کو جگایا جائے' جو جان بوجھ کے آنکھیں بند کیے ہوئے ہو۔ جاذب کمال نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔

"ضروری نہیں ہر عہد کی پاس داری کی جائے چند قدم کی ہم سفری میں لوگ ایسے وعدے اور عہد کرتے ہیں۔ وہ وقتی جذباتیت ہوتی ہے۔ رات جاتی ہے تو بات بھی چلی جاتی ہے۔"

انوشے کو آج پہلی بار جاذب کمال کا چہرہ بلکہ پورا وجود گھناؤنا اور اتنا مکروہ لگا۔

"کبھی رات چلی جاتی ہے مگر بات نہیں جاتی' وہیں ٹھہر جاتی ہے تو جاذب کمال! رات گئی' مگر بات نہیں گئی۔" انوشے نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"کیا مطلب؟" جاذب کمال نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ رہی وہ بات' جو اس رات بلکہ تمہاری اور میری کئی راتوں کا ثمر ہے۔" انوشہ اسے اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے آئی اور سوئی ہوئی دو ڈھائی سال کی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کون ہے؟" اس کا چونکنا اور بوکھلانا فطری تھا۔

"تمہاری بیٹی۔" انوشہ نے بظاہر بڑے اطمینان سے جواب دیا مگر اندر ہی اندر اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور شاید اسی کی طرح اس کا دل جاذب کمال کے قدموں تلے چرمر ہونے کو تھا۔

"کیا بکواس ہے یہ؟" ایئر کنڈیشن کی خنک فضا میں بھی اس کے ماتھے پہ پسینہ چمکنے لگا۔



"بکواس نہیں ہے' اولاد ہے تمہاری؟"
"کون جانے۔" جاذب کمال نے کمال ہوشیاری سے خود کو سنبھال کر بے نیازی سے کندھے اُچکائے۔
"اتنے سنگ دل نہ بنو جاذب! اللہ سے ڈرو۔" انوشہ نے بے اختیار ہو کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔
جاذب کمال نے پہلے تو حیران ہو کر اسے دیکھا پھر بڑے آرام سے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کالر چھڑایا اور مسکرانے لگا۔
"اللہ سے ڈروں' میں؟ میں تو جو بھی گناہ کرتا ہوں' انہیں اپنے ہی سر رکھتا ہوں' دوسرے کے ذمے نہیں ڈالتا۔"
"یہ تمہارا ہی گناہ ہے' تمہارا۔" وہ بے بسی سے حلق کے بل چلائی۔ آنسو اس کے شفاف گالوں پہ بہہ رہے تھے۔
"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ خدا کی قسم' سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے تمہاری باتوں پہ یقین کر لیا تھا۔ تمہارے محبت کے دعوؤں کو سچ سمجھ لیا تھا۔ محبت کی تھی میں نے تم سے' انتظار کر رہی تھی اب تک تمہارا' تمہارے سوا کوئی اور مرد میری زندگی نہیں آیا۔ یقین کرو میرا۔"
انوشہ زاروقطار روتی ہوئی گھٹنوں کے بل فرش پر گر گئی۔
"بلاوجہ کا ایموشنل ڈراما کری ایٹ کر رہی ہو تم' محبت' شادی' بچہ' کیا ہے یہ سب؟ پرسوں اکیسویں صدی شروع ہو رہی ہے' تم انیس سو ساٹھ کی جذباتی ہیروئن بنی' ایک سے بڑھ کر ایک ایموشنل ڈائیلاگ جھاڑ رہی ہو۔" جاذب کمال جی بھر کر بدمزہ ہو رہا تھا۔
"تم کیوں آئے تھے یہاں' کیوں آئے ہو مجھے دوبارہ برباد کرنے کے لیے۔" انوشہ بے حد کرب کے عالم میں پھر چیخی۔
"ایک منٹ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرایا اور اطمینان سے کہنے لگا۔ "پہلی بات تو یہ کہ تمہاری اگلی پچھلی کسی بھی سو کالڈ قسم کی بربادی میں کم از کم میرا کوئی ہاتھ نہیں' تم جس پیشے سے منسلک ہو' وہی کافی ہے تمہاری ہر قسم کی بربادی کے لیے اور دوسری بات یہ کہ میں یہاں کچھ اچھا وقت گزارنے آیا تھا تمہارے ساتھ' پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے نیو ایئر بلکہ میلینیم کا استقبال تمہارے ساتھ کرتا' مگر تم تو۔۔۔"
جاذب کمال نے تاسف سے اسے دیکھا جو یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے جیسے اس کی آنکھوں میں جنون اتر آیا۔ وہ جاذب کمال کے آگے سیدھی کھڑی ہو گئی' تن کر۔
"تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔ اس بچی کو اپنا نام دینا ہوگا۔" وہ درخواست نہیں کر رہی تھی' حکم دے رہی تھی۔
"پاگل مت بنو۔" جاذب کمال کے لہجے میں سختی در آئی۔
"ویسے تو میری شادی پچھلے سال ہو گئی ہے' لیکن اگر نہیں بھی ہوتی' تب بھی تم جیسی سے شادی کیوں کرتا میں؟ عشق بھی ہو جاتا نا' تب بھی نہیں کر سکتا تھا' میرا باپ اپنے گھر' جائیداد اور بزنس سے لات مار کر باہر نکال دیتا مجھے۔ جو میں بالکل بھی افورڈ نہیں کر سکتا۔"
جاذب کمال نے بہت سکون اور اطمینان سے اسے جوتے مارے تھے اور اب وہ اپنی ٹائی ٹھیک کر رہا تھا۔ شرٹ کے بٹن لگا کر ٹائی ٹھیک کر کے اس نے کوٹ پر سے نادیدہ گرد — جھاڑی اور پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔
"یہاں آنا میری بے وقوفی تھی اور کچھ نہیں۔"
"تمہیں اپنی بچی کی بھی کوئی پروا نہیں؟" انوشہ بے یقینی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔
"میرا بچہ دو ماہ بعد اس دنیا میں آنے والا ہے' مجھے اس کی پروا ہے اور رہی اس بچی کی بات' تو کس نے کہا تھا پیدا کرنے کو۔" وہ سنگ دلی سے بولتا ہوا چلا گیا۔
انوشہ کسی مردے کی طرح زمین پر گر پڑی۔

٭ ٭ ٭

ریمپ پر رنگ و روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ آنکھوں کو خیرہ کردینے والا حسن و جمال اور مبہوت کردینے والی اداؤں کے ساتھ ایک کے بعد ایک شاہکار آرہا تھا۔ تالیوں کا سلسلہ تھمنے میں نہیں آرہا تھا۔ لوگ ہاتھوں میں اسمارٹ فونز بلند کیے ایک کے بعد ایک ہر ماڈل کو اپنے سیل فون میں قید کررہے تھے۔

پھر وہ آئی۔ سیاہ لہنگے پر نقرئی کام' بے حد نفیس اور خوب صورت تھا' بنا آستین کی زرد قمیص' جھلملا رہی تھی جس کا پیچھے کا گلا آدھی کمر کو نمایاں کررہا تھا' نقرئی کرن لگا دوپٹا اس انداز سے سر پر تھا کہ آگے اور پیچھے کا جسم بھی نمایاں تھا۔ وہ مایوں کا جوڑا پہن کر آئی تھی۔ متوالی چال چل کر اپنی صراحی دار گردن کو اکڑا کر اور نمایاں کیا' اک نشیلی نگاہ حاضرین کی طرف ڈالی اور مسکرا کر مڑ گئی۔

''یار! یہ کیا شے ہے؟'' آریان نے جھک کر اپنے دائیں طرف بیٹھے زین ملک کے کان میں سرگوشی کی۔

''نیا پیس ہے' شائنہ۔'' زین کی ساری توجہ ریمپ پر تھی مگر اس کے مختصر جواب پر آریان کی تسلی نہیں ہوئی۔

''کہاں سے آئی ہے یار' مجھے تو لگتا ہے تہلکہ مچادے گی۔'' اس کے جانے کے بعد آریان کو سارا منظر سونا سونا لگ رہا تھا۔

''یہ لڑکی یہی سوچ کر آئی ہے مگر ہر ایک کا یہ خواب پورا نہیں ہوتا بیٹے' اس فیلڈ میں بہت کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ محنت بھی قسمت بھی' جان بھی ایمان بھی۔'' زین نے دھیمی آواز میں جواب دیا تھا۔

''یار! یہ تو قیامت تھی۔'' آریان ابھی تک جانے کس خمار میں کھویا ہوا تھا۔

''اپنا گنوار پن اپنے گھر چھوڑ کر آیا کرو' اس فیلڈ میں ایک سے بڑھ کر ایک چہرہ اور پرسنالٹی نظر آتی ہے۔ کس کس پہ دل و جان لٹاتے رہوگے۔ پروفیشنل بنو' عاشق بننے کی کوشش مت کرو۔'' زین ملک نے انتہائی سنجیدگی اور خلوص سے اسے جھاڑا تھا' وہ اپنا سا منہ لے کر بیٹھ گیا۔

٭ ٭ ٭

میک اپ اتارتے ہوئے اس کے کانوں میں کتنے ہی لوگوں کے تعریفی اور توصیفی جملے گونج رہے تھے۔

تین سال تک دھکے کھانے اور بے حد جدوجہد کرنے کے بعد اب جاکر اسے چانس ملنا شروع ہوا تو دنوں میں وہ شہرت کی بلندیوں پہ چڑھنے لگی تھی۔ ریمپ پہ ماڈلنگ کرتے کرتے اسے ایک مشہور بسکٹ کا اشتہار مل گیا تھا اور دو اشتہاری کمپنیوں کے ساتھ بھی معاہدے کرلیے تھے۔

چہرے پہ لگا کلینزنگ ملک اس نے ٹشو پیپر سے صاف کرکے اسے قریب رکھے ڈسٹ بن میں پھینکا۔

اپنی جدوجہد کے دنوں میں جب اسے ہر دروازہ بند ملا تھا اور وہ روزانہ ناکامی کو اپنے ساتھ لیے گھر واپس آتی تھی تو بستر پر کروٹیں بدلتے' وہ سوچتی تھی کہ کاش سنڈریلا کی طرح اسے بھی کوئی مہربان پری مل جائے اور اس کی ساری مشکلات آسان ہوجائیں مگر پری اتنی آسانی سے تو نہیں ملتی۔ اس سے پہلے اسے جواد زیدی ملا تھا۔ فیشن انڈسٹری کا ایک بہت معروف نام' وہ فیشن فوٹو گرافر تھا' اس نے بہت سے نئے چہرے ماڈلنگ کی دنیا میں متعارف کرائے تھے جو اس وقت شہرت کے آسمان پر ستارے بن کر دمک رہے تھے۔

شائنہ نے بڑی مشکل اور وقت کے بعد اس تک رسائی حاصل کی تھی۔

''ماڈلنگ میں نام کمانا چاہتی ہو؟'' وہ ہاتھ میں پکڑے بال پوائنٹ کو میز پر گول گول گھمار رہا تھا۔

''ہاں!''

''ہوں!'' جواد زیدی نے اسے بغور دیکھا۔ ''خوب صورت ہو مگر اس فیلڈ میں محض بیوٹی کا ہونا کافی نہیں۔ خوب صورت ہونا اہم نہیں ہے' خوب

صورت نظر آنا اہم ہے۔ اپنا آپ نمایاں کرنے کا فن آنا چاہیے' اسٹائل ہونا چاہیے' ادا ہونی چاہیے' کوئی بات ہونی چاہیے بندے میں۔"

"یہ سب ہے مجھ میں۔" شائنہ نے قدرے بے زاری سے اس بڑبولے کو دیکھا۔

"نہیں ہے بی بی۔" اس نے ذرا جھک کر کہا۔ "اگر ہوتی تو اس وقت تم میرے پاس ہیلپ کے لیے نہیں، ایک کلائنٹ کی حیثیت سے آئی ہوتیں۔"

"اچھا!" شائنہ نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ "پھر؟ کیا کرنا پڑے گا مجھے۔"

"سیکھنا پڑے گا سب کچھ' ماڈلنگ کو لوگ آسان سمجھتے ہیں۔ یہ اداکاری سے بڑھ کر مشکل پرفارمنس ہوتی ہے۔ ایک ایک قدم ایک ایک جنبش' ایک ایک سانس' بیلنس نہ ہو تو سارا تاثر ختم اور کیریئر بھی ختم۔" اس نے اب اپنی ریوالونگ چیئر پر جھولنا شروع کر دیا تھا۔

"میں ہر ایک کو سکھانے اور پروموٹ کرنے کی آفر نہیں کرتا' جس میں کچھ بات نظر آتی ہے' اسے ہی چانس دیتا ہوں۔"

شائنہ خاموشی سے اسے دیکھ بھی رہی تھی اور سن بھی رہی تھی۔ اسے سوال کرنے کی یا کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑ رہی تھی' وہ خود ہی ہر بات کی وضاحت کرتا جا رہا تھا۔

"تم کچھ کہو گی نہیں؟" وہ جھولتے جھولتے رکا۔

"آپ کہتے رہیے' میں سن رہی ہوں۔" شائنہ مسکرائی۔

"بات یہ ہے بی بی! کہ مفت میں کوئی بھی چیریٹی نہیں کرتا' خدمت خلق کے لیے پاکستان میں بہت سے ادارے اور لوگ موجود ہیں۔ میں تو اپنے کام کی فیس لیتا ہوں۔ تمہیں اور تمہارے کیریئر کو آسمان کی بلندیوں پہ پہنچانا میری ذمہ داری ہو گی مگر تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔"

"کیا ہے اس کی قیمت؟"

"ہر لڑکی جانتی ہے جو اس فیلڈ میں آتی ہے۔" جواد زیدی دلکشی سے مسکرایا۔

"میں سوچ کر جواب دوں گی۔" شائنہ نے اپنے سامنے رکھا کولڈ ڈرنک کا گلاس اٹھایا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

"ٹیک یور ٹائم۔" جواد کی مسکراہٹ اور خوش خلقی بدستور قائم تھی۔

شائنہ نے صوفی سے یہ معاملہ ڈسکس کیا' وہ اس کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتی تھی۔ وہ فیشن ڈیزائنر تھی۔ اس کا بھی جدوجہد کا دور چل رہا تھا۔

"نو نو' یہ شخص ہے تو ٹیلنٹڈ مگر انتہائی چیپ' تم اس کے چکر میں نہ پڑو۔"

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا نا' سب کچھ ہے میرے پاس' بیوٹی بھی ٹیلنٹ بھی مگر چانس نہیں مل رہا۔" شائنہ بہت زیادہ نہیں مگر تھوڑی سی فکر مند ضرور ہو گئی تھی۔

"تم ماریا علی سے ملیں؟" وہ فریش جوس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔

"ہاں ملی تھی۔" شائنہ پاؤں اوپر کر کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ گھٹنے جوڑ کر ان پر اپنی تھوڑی ٹکالی۔

"پھر؟"

"اس نے ٹرخا دیا۔ کہہ رہی تھی' سکس منتھس ویٹ کرو پھر آنا میرے پاس۔"

"ہاں وہ آسٹریلیا جا رہی ہے' تین چار ماہ کے لیے۔" صوفی نے اطلاع دی۔

"میری بلا سے بھاڑ میں جائے' میرا کام تو نہیں کیا نا!" شائنہ نے منہ بنایا۔

"بات سنو۔" صوفی نے کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھا۔ "تم اچھی انگلش بول لیتی ہو مگر اپنا ایکسینٹ کچھ اور بہتر کرو۔ اس میں جو ایسٹرن ٹچ ہے' اسے ویسٹرن کرو اور شاہانہ حسین کے پاس چلی جاؤ۔ امبر خالد کی تھوڑی سی منتیں کر لینا' وہ تمہاری میٹنگ ارینج کروا دے گی اس کے ساتھ۔" صوفی نے سوچ سمجھ کر اسے مشورہ دیا تھا۔

"سنا ہے بہت سٹرل مزاج عورت ہے وہ۔"

"ہاں' ہے تو سہی۔" صوفی نے تائید میں سر ہلایا۔ "مگر وہ ٹیلنٹ کی قدر دان ہے' اگر تمہارے اندر اسے کچھ نظر آیا تو آگے بڑھا دے گی تمہیں۔"

اس نے صوفی کے مشورے پہ عمل کیا۔ پہلے تو چار ماہ تک اس نے فیضان صدیقی کی شاگردی اختیار کی۔ وہ پڑوسی تھا۔ برابر والے فلیٹ میں رہتا تھا اور ایک کال سینٹر میں کام کرتا تھا۔ اس نے امریکہ' برطانیہ صرف فلموں اور تصویروں میں ہی دیکھا تھا مگر اس کی انگریزی اور لب و لہجہ سن کر کوئی بھی دھوکا کھا لیتا کہ وہ ضرور پیدائشی امریکی یا برطانوی ہے اور وہیں عمر گزار کر آیا ہے۔ فیضان نے اس پہ محنت کی اور اس سے ڈبل محنت خود شائنہ نے اپنے پر کی۔ چار ماہ بعد فیضان نے اس سے کہا۔

"اور اب جب تم ایک ٹاپ ماڈل بن جاؤ گی اور تمہارے انٹرویوز نیوز پیپرز اور میگزینز میں چھپنا شروع ہوں گے تو تم بڑے آرام سے دعوا کر سکتی ہو کہ تم نیویارک یا مانچسٹر کے فلاں علاقے میں پیدا ہوئی تھی' وہیں پلی بڑھیں پھر پاکستان آئیں۔ تمہارا ایکسپینٹ اتنا زبردست ہو گیا ہے' کسی کو اتنا سا بھی ڈاؤٹ (شبہ) نہیں ہو گا۔"

"رئیلی!" شائنہ نے ایک ادا سے اسے مسکرا کر دیکھا۔

"پھر' سوچ لوں شہر کا نام؟"

"بالکل ابھی سے سوچ کر رکھ لو۔" وہ ہنسا تھا

اس کی محنت رنگ لائی تھی یا قسمت کا تارہ چمکا تھا' شاہانہ حسین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور یوں پکڑا کہ ملک کے مختلف شہروں میں ہونے والے فیشن شوز کے بعد اسے دبئی میں ہونے والے ایک بہت بڑے ایونٹ میں ریمپ تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ یہیں سے اس کی زندگی نے بھی پلٹا کھایا اور قسمت نے بھی' پتا نہیں دماغ نے بھی یہیں سے پلٹا کھایا تھا یا وہ پہلے سے ہی ایسی تھی۔

وسیع و عریض میک اپ روم میں کچھ ماڈلز تیار ہو گئی تھیں اور کچھ ابھی آئینوں کے سامنے بیٹھی' میک اپ کروا رہی تھیں۔ نواز بخش عرف این بی شائنہ کے چہرے پر اپنی مہارت اور مشاقی کے ساتھ میک اپ کے رنگ بکھیر رہا تھا۔ اس نے جو لپ اسٹک اٹھائی تو شائنہ بول پڑی۔

"بہت ہی اوڈ کلر لگ رہا ہے۔ لک خراب نہ ہو جائے۔" آج وہ پیرس میں تھی بہت ہی اسپیشل پروگرام اور اہم پرفارمنس تھی۔ اسے بہت فکر ہو رہی تھی' اس لیے اضطراری حالت میں بول پڑی ورنہ تو وہ بہت ماہر میک اپ مین تھا۔

"بے بی!" این بی مسکرا دیا۔

ماڈل بیس سال کی ہو یا چالیس سال کی' سب کو بے بی' بے بی کر تا رہتا تھا۔ بڑا بے ضرر سا بندہ تھا۔ سب ہی اس سے خوش رہتے تھے۔

"تم تو اتنی خوب صورت ہو کہ بغیر میک اپ کے بھی اسٹیج پر چلی جاؤ تو لوگ دیوانے ہو جائیں۔"

"بناؤ مت۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں' یہ تو میں نے آج تمہارا میک اپ کیا ہے نا اس میں یہ لپ اسٹک چار چاند لگا دے گی' تم دیکھنا تو سہی۔"

لپ اسٹک لگانے سے پہلے وہ ایک تنقیدی نگاہ شائنہ کے چہرے پہ ڈال رہا تھا کہ فاریہ گل تیز تیز چلتی وہاں آئی اور اپنے مخصوص تحکمانہ لہجے میں مخاطب ہوئی۔

"این بی! آج کیسا میک اپ کیا ہے تم نے' ایک بھی سیلفی اچھی نہیں آ رہی' آئی ایم ناٹ سیٹسفائیڈ' کچھ کرو یار۔" وہ این بی کا بازو پکڑ کر دو قدم دور اپنے ساتھ لے گئی اور خود ایک خالی اسٹول پہ ٹک کر آئینے میں پھر اپنا جائزہ لینے لگی۔

"دیکھو ذرا' دیکھنے میں تو ٹھیک لگ رہا ہے مگر عکس (تصویریں) اتنی عجیب سی کیوں آ رہی ہیں۔"

"ریلیکس بے بی' اتنی پریشان رہو گی تو اسکن پہ بہت جلد لائنز پڑ جائیں گی۔ میں ذرا شائنہ بے بی کو فارغ کر دوں پھر آپ کو دیکھتا ہوں۔" این بی نرمی سے کہہ کر شائنہ کی طرف مڑا مگر فاریہ گل کو بہت جلدی

تھی۔

"اسے چھوڑو یار، تم پہلے میرا میک اپ ٹھیک کردو۔" وہ جھنجلائی۔

شائنہ انتہائی کوفت میں مبتلا تھی۔ ٹیڑھی نظروں سے اس نے انتہائی مغرور اور نخریلی فاریہ گل کی طرف دیکھا جسے وہ دل ہی دل میں یا بے تکلف حلقہ احباب میں بڈھی سپر ماڈل کے نام سے پکارتی تھی۔ بلا مبالغہ پچھلے بیس سال سے فاریہ گل ملک کی سپر ماڈل ہونے کی مستقل دعوے دار تھی مگر شائنہ کو وہ ایک سپر ڈیمیپ لگتی تھی۔

این بی بے چارا بے بس سا فاریہ گل کی طرف مڑا تھا۔

"گیوی اونلی ون منٹ بے بی!"

"ناٹ آسکینڈ آلسو، کم آن، ہری اپ۔" وہ محض ایک مشہور اور کامیاب سپر ماڈل ہی نہیں بلکہ بے حد اثرو رسوخ کی مالک سپر ماڈل تھی، وہ اہم تھی بھی اور اسے اہم بننا آتا بھی تھا۔ اس وقت نخوت سے این بی کو حکم دیتے ہوئے اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ شائنہ کو چھوڑ کر اس کے پاس آئے گا۔

شائنہ نے ایک کٹیلی نظر اس پر ڈالی اور چبا چبا کر بولی۔ "فاریہ میم، آپ کا میک اپ بالکل ٹھیک کیا ہے این بی نے، دراصل آپ اوور ایج ہوگئی ہیں، اس لیے آپ کو یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ آپ کو چاہیے کہ اب اپنے ماڈلنگ کے کیریئر کو گڈ بائے کہیں اور کوئی بیوٹی سیلون یا بوتیک کھول لیں۔"

میک اپ روم میں اس وقت پندرہ سے زائد افراد موجود تھے۔ پانچ ماڈلز تو اسی کی لائن میں بیٹھیں، دوسرے میک اپ آرٹسٹوں سے تیار ہو رہی تھیں۔ سب کی آنکھیں پھٹ گئیں اور منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

فاریہ کو پہلے تو اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا کہ اس نے کیا سنا ہے اور جب یقین آیا تو وہ جیسے جلتے توے پہ کھڑی ہوگئی تھی، اس نے فصیح و بلیغ انگریزی میں شائنہ کے پرخچے اڑانے شروع کردیے۔ دھواں دھار انگریزی گالیاں اس کے منہ سے نکل رہی تھیں، شائنہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے بھی جواب دینا شروع کیا تو ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔ آن کی آن میں میک اپ روم لوگوں سے بھر گیا۔ منتظمین اور ذمہ داران دونوں کو الگ الگ ٹھنڈا کرنے میں مصروف تھے مگر کسی نے دونوں کی ویڈیو اپ لوڈ کرکے فیس بک پر ڈال دی تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہونے والی اسٹیج پرفارمنس سے پہلے ہی دونوں مزید مشہور ہوگئیں۔

اسی وقت شائنہ نے اپنے ٹوئیٹر اکاؤنٹ پہ ٹوئٹ کیا۔

"میں جس دنیا میں رہتی ہوں وہ ایک بازار ہے جہاں ہر شے بکتی ہے۔ فن، صلاحیت، دماغ، زبان، لفظ، خیال، سب کچھ بکاؤ ہے، ہم میں سے ہر شخص دکان دار ہے، مجھ سے آج کہا گیا کہ میں جسم فروش ہوں، میں بتانا چاہتی ہوں کہ اس بازار میں، میں ایک ادا فروش ہوں۔"

اس کے متنازعہ ٹوئٹس اکثر ہی شوبز کی دنیا میں کبھی چھوٹے کبھی بڑے دھماکے کرتے رہتے تھے مگر اس ٹوئیٹ نے بہت سے افراد کو مصروف کردیا تھا۔ کوئی اس کی مخالفت میں جوابی ٹوئٹ کر رہا تھا۔ کوئی اس کی تائید میں لکھ رہا تھا۔

فاریہ گل کو یہ ٹوئٹ سنی ابراہیم نے دکھائی تھی۔

"اسے سستی شہرت حاصل کرنے کا کریز ہے۔" فاریہ گل نے اپنے مخصوص نخوت زدہ لہجے میں اپنے بال جھٹکتے ہوئے سنی ابراہیم کو جواب دیا۔

"ویسے ہم ذرا ڈیپ لی سوچیں تو یہ بات ٹھیک نہیں لگتی کیا؟" سنی کچھ سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" فاریہ گل نے جیسے کرنٹ کھا کر اسے دیکھا۔ "یو مین ہم کوئی بکاؤ چیز ہیں؟ ہاؤ چیپ یو آر تھنکنگ۔"

"اس نے بکنے والا نہیں، بیچنے والا کہا ہے خود کو بلکہ شاید ہم سب کو۔"

سنی نے اس کی طرف دیکھا جو سگریٹ پینٹ اور گہرے رنگ کی شرٹ میں ملبوس اپنے نئے ہیئر

اسٹائل اور چال ہی میں کی گئی بیوٹی ٹریٹمنٹ کے بعد اچھی خاصی ــــ لگ رہی تھی۔ پندرہ سال کی شادی اور دو بچوں کے بعد آج بھی وہ جوان العمر نظر آتی تھی۔

"بہت تیز بھاگ رہی ہے یہ ' دیکھ لینا ایسی ٹھوکر کھائے گی کہ منہ کے بل زمین پہ گرے گی۔" فاریہ نے بے حد تنفر سے تبصرہ کیا۔

"اور اس کی باتوں کا مطلب وطلب کچھ نہیں ہوتا۔ لوگوں کی اور میڈیا کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایسی حرکتیں اور باتیں کرتی ہے۔"

شہریار کی کال تھی اور یہ وہ واحد نام اور نمبر تھا جسے وہ پہلی گھنٹی پر ہی ریسیو کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس بار اس نے پہلی ہی گھنٹی پر کال اٹینڈ کرلی۔

"تم کیا بیٹھی میری کال کا انتظار کررہی تھیں؟"

"مجھے اچھا نہیں لگتا تمہیں انتظار کروانا' اس لیے پہلی بیل پر ہی اٹینڈ کرلیتی ہوں۔" شائنہ نے اسے جواب دیا۔

"کیا کررہی ہو؟"

"آرام' ایک مہینے کے شوٹ سے تھک کر آئی ہوں۔" اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ وہ پرسوں ہی دبئی سے واپس آئی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ' ثانیہ شیخ اور سعد آفریدی کے درمیان سچ مچ کچھ ہے یا محض گوسپ ہے؟"

"صحافی تم ہو اور خبر میں بتاؤں تمہیں؟" شائنہ کی آواز میں شوخی تھی۔

"میں جلدی میں ہوں یار' فٹافٹ بتاؤ۔"

"ایک شرط پہ۔" شائنہ نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔

"شادی کے سوا ہر شرط منظور ہے۔" شہریار نے فوراً" جواب دیا۔ شائنہ ہنس پڑی۔

"اپنی دوستی اور دوست کو اتنی بڑی آزمائش میں نہیں ڈال رہی میں' بس ایک ڈنر کا سوال ہے بابا۔"

"ڈبل تم دینا' میں تو بالکل قلاش ہورہا ہوں آج کل۔ اب جلدی سے بتادو جو میں نے پوچھا تھا۔ ثانیہ اور سعد...."

"دونوں نے ایک دوسرے کو انگیج منٹ رنگ پہنادی ہیں اور اب اپنی انگیج منٹ کا ہنی مون منانے روم گئے ہیں۔"

"ان کی فلم کی شوٹنگ ہے وہاں۔" شہریار نے تصحیح کی۔

"ہاں' ہاں' وہی۔" شائنہ نے آواز میں لاپروائی کے رنگ بھرے۔

"پھر تم آج مل رہے ہو ڈنر پہ؟"

"آج نہیں' آج نور کا برتھ ڈے ہے' وہ سیلیبریٹ کرنا ہے ورنہ تو وہ مجھے کچا کھا جائے گی۔ کل ایک دوست کا ولیمہ ہے۔ پرسوں فری ہوں میں۔"

"مجھے پتا ہوتا ناتو خبر بھی پرسوں ہی سناتی ڈنر ٹیبل پہ بیٹھ کر۔" شائنہ جیسے تلملا گئی تھی۔

"میں کچھ اور نام دے رہا ہوں' پرسوں تک ان کی خبریں نکال کرر کھو' ڈنر ٹیبل پہ سنادینا۔" شہریار اس کی تلملاہٹ سے محظوظ ہوا تھا۔

"جاؤ' جاکر اپنی ملکہ نور جہاں کا دماغ چاٹو۔" شائنہ نے خفا ہونے کا ناٹک کیا اور فون بند کردیا۔

شہریار سے اس کی ملاقات تین سال قبل ہوئی تھی' جب وہ کیریئر کی ابتدا کر کے ابھی شہرت اور مقبولیت کی سیڑھیاں چڑھنا ہی شروع ہوئی تھی۔ شہریار شوبز صحافت کا ایک مستند نام تھا۔ شائنہ کا پہلا اور مفصل انٹرویو اس نے ہی لیا تھا۔ اس کے بعد بھی شائنہ کی اس سے مختلف مواقع پر ملاقاتیں ہوئیں' اور ہوتی رہیں' شائنہ کو پتا نہیں کیوں وہ اچھا لگتا تھا۔ اس نے دو سال پہلے بڑی صاف گوئی سے یہ بات شہریار کو بتائی تھی۔

"ویسے تو مجھے دنیا کے سارے مردوں سے نفرت ہے مگر تم اچھے لگے ہو مجھے۔ دوستی کرو گے مجھ سے؟"

"اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ تمہارا دوست بن کر میں تمہاری جھوٹی یا غیر ضروری تعریفیں اپنے میگزین میں چھاپوں گا تو یہ خوش فہمی اپنے دل و دماغ سے نکال دو۔" شہریار نے صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔

شائنہ اس کا جواب سن کر مسکرادی۔

"مجھے اپنی تعریف لکھوانی ہوئی تو اور دوسرے لوگ

موجود ہیں لکھنے کے لیے، تمہیں زحمت نہیں دوں گی۔ اب بتاؤ، بنو گے میرے فرینڈ؟" اس کی سوالیہ نگاہیں شہریار پہ ٹکی تھیں۔

"دوستی تک ہی محدود رہنا، میں آل ریڈی انگیج ہوں۔"

"ارے واہ! تم ٹشن دکھا رہے ہو، تم کیا سمجھے، میں مر مٹی ہوں تم پہ۔ دوست بنا کے پہلے ڈارلنگ پھر ہسبینڈ بناؤں گی تمہیں؟" شائنہ کا موڈ آف ہو گیا۔

شہریار اس کے ناراض چہرے کو دیکھتا رہا پھر ہنس دیا۔ "چلو آج سے ہماری دوستی پکی۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری دوستی۔" وہ بدستور غصے میں تھی مگر یہیں سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔

وہ شہریار سے اپنے دل میں آنے والی ہر بات، ہر خیال شیئر کر لیتی تھی۔



سفید حریری لبادہ اس کے پیروں کو چھوتا ہوا، ہلکورے کھا رہا تھا، کہیں کہیں اس میں سفید ریشم سے ہی بیل بوٹے بنے ہوئے تھے لباس کی طرح اس نے اپنے سنگھار کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ صراحی دار سپید مرمریں گردن کسی بھی زیور سے خالی تھی۔ کانوں میں البتہ سچے موتیوں کے آویزے لٹکے ہوئے تھے۔ رات کی پارٹی کی مناسبت سے بیوٹیشن نے اس کا ایک دیدہ زیب ہیئر اسٹائل بنا کر بہت خوب صورت میک اپ کر دیا تھا۔ ہاتھ میں سچے موتیوں کا بریسلیٹ تھا جس کے موتیوں کی لڑیاں نیچے لٹک رہی تھیں۔

بڑی دیر سے وہ ادھر سے ادھر لوگوں سے ملاقاتیں اور ہیلو ہائی کرتی پھر رہی تھی۔ شہر کے ایک ممتاز صنعت کار نے اپنے ایک بہت بڑے ہاؤسنگ پروجیکٹ کی کامیابی کی خوشی میں یہ پارٹی دی تھی۔

شائنہ کی نگاہیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں اسے پتا چلا تھا کہ آج کی تقریب میں وہ بھی آیا ہے۔ یا شاید آئے گا؟ شائنہ کی نگاہیں تھک کر مایوس ہو گئیں۔ وہ بیٹھنے کے ارادے سے قریبی میز کی طرف جا رہی تھی کہ مسز خان مل گئیں۔

"ہائے جانی، ہاؤ آر یو؟" وہ بڑے تپاک سے ملیں۔

"فائن، آپ کیسی ہیں مسز خان؟" شائنہ نے مصنوعی گرم جوشی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

"میں تو اچھی ہوں، تم اتنی سمپل کیوں ہو آج، اینی ویز، لکنگ پریٹی۔" اپنے مخصوص تیز تیز لہجے میں بولتے ہوئے انہوں نے دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں سے اس کا گال چھوا۔

"تھینکس۔"

"او ہاں، تمہاری نئی ویڈیو دیکھی تھی میں نے، بڑی اچھی کیمسٹری لگ رہی ہے تمہارے اور معیز کے بیچ، کوئی خاص بات تو نہیں ہے نا؟" آخری جملہ انہوں نے جھک کر بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا۔

"کہاں مسز خان!" شائنہ نے منہ لٹکایا۔ "ہمیں تو جو بھی ملتا ہے 'انگیج' ہی ملتا ہے۔"

"ڈونٹ وری، تمہاری خوابوں کا شہزادہ بہت جلد ملے گا تمہیں۔" انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ گئیں۔ مگر شائنہ کی دوسری سمت دیکھتی نظریں اس جگہ سے آگے نہ بڑھ سکیں جہاں وہ لوگوں کے ساتھ کھڑا خوش گپیاں کر رہا تھا۔

"آج آر یا پار!" شائنہ نے کئی ماہ پہلے پچھلی بار کی ملاقات کے بعد یہ تہیہ کر لیا تھا۔

وہ موقع کی منتظر تھی جو آج اسے مل ہی گیا۔

"ہیلو!" شائنہ خود کو سنبھالتے ہوئے پراعتماد انداز میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"ہیلو، کیسی ہو؟" وہ پہچان گیا تھا، پہلے نہ بھی ملا ہوتا تب بھی جان لیتا آخر کو وہ ایک سیلبریٹی تھی۔

"تو فائنلی آپ پاکستان میں ہیں۔"

"فار سم ویک۔" اس نے خالص امریکن انداز میں کندھے اچکائے۔ پچھلے اٹھارہ بیس سالوں سے مستقل امریکہ میں رہتے ہوئے اس کے انداز و اطوار وہیں کی نمائندگی کرنے لگے تھے۔

"تم کیا کر رہی ہو؟ آج کل۔" اس کی چاکلیٹ





White Rose®
Hair Removal
with Skin Whitening Agent
& Aloe Vera
Extracts
Now!
Available
80gm Tube
جلد اتنی سوفٹ جیسے۔۔۔وائٹ روز!
QRS

براؤن آنکھیں شائنہ پر جمی تھیں۔
"تلاش۔"
"کس کی؟" سوال بے ساختہ تھا۔
"آپ کی۔"
"میری؟" اس نے سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں پلکیں جھپکائیں۔
"ایک سیلفی لے لوں۔" شائنہ اس کے پہلو میں آکھڑی ہوئی اور ایک سیلفی لی۔
"آپ نے ایک بات پہ غور کیا جاذب صاحب!" اسے سیلفی دکھاتے ہوئے شائنہ کہہ رہی تھی۔
"آپ میں اور مجھ میں کتنی مشابہت ہے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔
جاذب کمال نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ افتخار درانی آگیا۔
"جاذب' کہاں ہو یار؟" دونوں بڑے تپاک سے گلے ملے۔
"میں ابھی ملتا ہوں تم سے۔" جاذب نے اسے ٹالا۔
"او شیور' انجوائے۔" وہ مسکراتا ہوا چل دیا۔
"کیا کہہ رہی تھیں تم۔" جاذب کمال نے آنکھیں سکیڑ کر اسے یوں غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔
"میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ میری شکل میرے باپ سے بہت ملتی ہے' آپ کو دیکھا تو یقین آگیا۔ ذرا دیکھیے تو اس تصویر میں ہم دونوں بالکل باپ بیٹی لگ رہے ہیں۔" شائنہ نے اپنے جدید اسمارٹ فون کی اسکرین میں قید سیلفی اس کی نظروں کے سامنے کی۔
"کیا بکواس ہے یہ؟" جاذب کمال کی آواز دھیمی تھی مگر آنکھوں سے غیض و غضب کے شرارے شائنہ تک بہ آسانی پہنچ رہے تھے۔
"میں نے تو سوچا تھا کہ آپ یہ جان کر کہ میں آپ کی بیٹی ہوں' مجھے گلے لگائیں گے مگر آپ تو غصہ کرنے لگے۔" شائنہ نے جیسے مایوس ہو کر اس کی نظروں کے سامنے سے اپنا موبائل ہٹالیا۔
"کون ہو تم اور اس بکواس کا کیا مقصد ہے؟"
جاذب کمال تھوڑا سا اب پریشان ضرور ہوگیا تھا۔
"میرا نام شائنہ ہے۔ میری ماں کا نام انوشہ تھا۔ انہوں نے بتایا تھا مجھے کہ آپ الل ٹپ سی مگر میرے فادر ہیں۔" شائنہ کے لہجے اور چہرے کا اطمینان قابل دید تھا۔
"ویسے آپ چاہیں تو ڈی۔ این۔ اے ٹیسٹ کرواسکتے ہیں۔" جاذب کمال کی خاموشی پہ شائنہ نے کہا۔
"ہائے شانو!" مشہور میل ماڈل ہنی خرم آکر اس سے گلے ملا۔ "ہیلو سر!" ہنی خرم نے جاذب کمال سے مصافحہ کیا۔
"ہائے ہنی!" شائنہ نے بے حد خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
"امپورٹنٹ میٹنگ چل رہی ہے یار۔"
"میرے ساتھ بھی کرنا' میں ویٹ کررہا ہوں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بول کر مسکراتا ہوا چل دیا۔
"اگر تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہو تو فضول ہے۔ کوئی بھی ایسی کوشش تمہیں بہت مہنگی پڑے گی' میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔" جاذب کمال نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
"کیسے؟" شائنہ نے ایک بے حد محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
"میری فیملی میں کوئی بھی تمہارا یقین نہیں کرے گا۔ لوگ تمہارے عجیب و غریب ٹوئٹس پڑھنے کے عادی ہیں۔ میں ثابت کردوں گا کہ تم دولت اور شہرت کے لیے یہ سب کررہی ہو۔ میں تو یہاں رہتا بھی نہیں ہوں' جہاں رہتا ہوں اور بزنس کرتا ہوں' وہاں اس قسم کی باتوں کی کوئی ویلیو نہیں ہے۔" جاذب کمال نے بولتے بولتے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ "ایسی باتوں سے تمہارے کیریئر کو اور تمہاری پرسنالٹی کو ہی نقصان پہنچے گا۔"
شائنہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔
"لوگ یہ سوال بھی تو کرسکتے ہیں کہ میں دولت اور

شہرت کے لیے یہ سب کیوں کروں گی' یہ دونوں آل ریڈی میرے پاس بہت زیادہ ہیں۔"

"دولت اور شہرت جتنی بھی ہو' کبھی زیادہ نہیں ہوتی' کافی نہیں ہوتی انسان کے لیے ان کی طلب اور خواہش ہمیشہ بڑھتی ہی رہتی ہے۔ میں پروف کردوں گا کہ تم ان دونوں چیزوں کی بھوکی ہو اور تمہاری حرص اور ہوس ایک معزز اور عزت دار انسان کی زندگی تباہ کررہی ہے۔" جاذب کمال برسوں پہلے جس بچی کو اپنانے سے انکار کرکے ٹھوکر مار آیا تھا۔ اسے آج کیسے قبول کرلیتا۔

"میری ماں نے دو باتیں کہی تھیں تمہارے بارے میں۔" شائنہ کی آنکھوں سے آگ نکلنے لگی وہ آپ سے تم پر آگئی۔

"اچھا' کیا کہا تھا' اس بے وقوف عورت نے میرے بارے میں؟" جاذب کمال نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہی کہ تم انتہائی خود غرض' کمینے اور سفاک ہو۔" شائنہ کے لفظ لفظ سے نفرت کا زہر ٹپک رہا تھا۔

"ٹھیک کہا تھا' میں ایسا ہی ہوں اور اگر تم اپنی اوقات سے باہر نکلیں تو تمہیں بھی ایسا ہی بن کر دکھاؤں گا۔" سفاکی سے بولتے بولتے وہ ایک دم مسکرایا۔

"ناؤ چل' اینڈ انجوائے دا پارٹی۔" اس کے قریب سے وہ گزرتا چلا گیا۔ اس پر ایک نگاہ بھی ڈالے بغیر۔

☆ ☆ ☆

"ہم ایک منافق معاشرے میں رہتے ہیں' ہمارے عیاش عزت دار' جانوروں کی طرح اپنے "کارنامے" ادھر اُدھر چھوڑ کر چل دیتے ہیں' مگر ان معززین پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ دولت کے پہاڑ برے کو بھی ڈھانپ لیتے ہیں اور اس کی برائیوں کو بھی۔"

پچھلے دو گھنٹوں سے گاڑی سڑکوں پہ دوڑا دوڑا کر تینوں کا حشر نشر ہونے والا تھا۔ شائنہ کا' شہریار کا اور گاڑی کا بھی۔

"مجھے کھانا کھلانے لے جا رہی ہو یا جان سے مارنے؟" بہت دیر سے خاموش بیٹھے شہریار نے لب کشائی کی۔

"دل تو کبھی چاہ رہا ہے کہ دنیا کے سارے مردوں کو قتل کردوں۔" شائنہ نے آگے نکلنے والی ایک گاڑی کو اوورٹیک کیا۔

"اس کے لیے تمہارا زندہ رہنا ضروری ہے۔" شہریار نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"میرا زندہ رہنے کو بھی دل نہیں کررہا۔" وہ بہت تیز رفتاری سے اپنی کار سڑک پہ یوں دوڑا رہی تھی جیسے کار کے نیچے تارکول کی سڑک نہیں بلکہ جاذب کمال کا وجود ہو' جس کے وہ پرخچے اڑا رہی ہو۔

"مگر مجھے تو زندہ رہنے دو۔" شہریار کے احتجاج پر بھی رفتار ہلکی نہیں ہوئی۔

"اپنی جان کی بہت فکر ہے؟ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے تھے' کچھ بول نہیں سکتے تھے۔" شائنہ کا غصہ کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔

"بولنے کی ضرورت شاید تمہیں ہے' میں تو صرف سامع ہوں۔"

"پوچھ نہیں سکتے' کیا بات ہے؟" اس نے پھر تیزی سے ایک موڑ کاٹا۔

"تم کہیں ٹھہرو تو میں کچھ پوچھوں۔" شہریار اب جھنجلا اٹھا۔

شائنہ نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ ایک دھچکے سے کار رک گئی۔

"اف!" شہریار نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔

"میری زندگی بھی اس سفر کی طرح ہے' تیز رفتار' ایک کے بعد ایک موڑ' رکنا تو دور کی بات' سانس لینے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ پتا نہیں کب کوئی ٹھہراؤ' کوئی پڑاؤ آئے گا اس سفر میں۔" شائنہ اسٹیئرنگ پر سر رکھے بڑبڑا رہی تھی۔

"شائنہ! کیا ہوا؟" شہریار اب کچھ کچھ پریشان ہوچلا تھا۔

''شہریار!'' شائنہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں، کسی صحرا کی طرح خشک اور ویران۔
''تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟''
''مطلب؟'' شہریار نے چونک کر اسے دیکھا۔
''میں کوئی شنگا گو وو گا گو میں پیدا نہیں ہوئی۔''
''اوہ!'' شہریار نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا پھر ونڈ اسکرین کے باہر دیکھنے لگا۔ جہاں سیاہ اندھیرے کا راج تھا۔
''سچ بتاؤ، تمہیں پتا تھا نا؟''
''ہاں!''
''اور کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟''
''تمہاری ماں کا نام انوشہ تھا۔'' شہریار کی نظریں بدستور ونڈ اسکرین کے باہر جمی تھیں۔
''اور باپ؟ میرے باپ کا نام معلوم ہے تمہیں؟'' شائنہ کو اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔
''نہیں، بس اتنا معلوم ہے کہ کوئی امیر زادہ تھا، خدا جانے اب کہاں ہوگا۔'' شہریار کا لہجہ سپاٹ اور آواز جذبات سے عاری تھی۔
''تم باخبر ہو تمہارے اور بھی کسی بھائی کو خبر ہوگی۔'' شائنہ نے کسی احساس کے تحت چونک کر اس سے سوال کیا تھا۔
''میں پہلے جس انگلش میگزین کے لیے کام کرتا تھا، وہیں میرا ایک دوست ہے۔ ہمارے حلقے میں وہ کھوجی کے نام سے مشہور ہے۔ اسی نے یہ خبر مجھ سے شیئر کی تھی۔''
''اور تم نے؟''
''میں نے کسی سے شیئر نہیں کی۔''
''تم نے کوشش نہیں کی جاننے کی کہ میرا باپ کون ہے؟''
''اونہوں!'' شہریار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے بھلا کیا انٹرسٹ ہو سکتا ہے اس بات میں؟ یہ ان خبروں میں سے ہے جنہیں میں اپنے دماغ کے ڈسٹ بن میں ڈال دیتا ہوں۔''
''مگر میں تو اس بات کو کسی بھی ڈسٹ بن میں ڈال کر الگ نہیں ہو سکتی۔'' شائنہ نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔
''تمہاری بات اور ہے، تمہارا وجود تمہارے احساسات اس سے جڑے ہوئے ہیں۔'' شہریار غیر جذباتی ہو کر بول رہا تھا۔
''جاذب کمال۔۔۔ اس کمینے کا نام جاذب کمال ہے اور اس سے نہ میرا وجود جڑا ہے نہ احساسات، اس سے میرا بس ایک رشتہ ہے، نفرت کا رشتہ۔ اسی نفرت کے سہارے میں اسے پوری دنیا میں ذلیل کر کے رکھ دوں گی، کہیں کا نہیں چھوڑوں گی۔'' شائنہ کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔
''جاذب کمال۔۔۔؟'' شہریار اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔
''یہ تو امریکہ میں رہتا ہے اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ، یہاں اس کے والد اور بھائی بزنس ٹائیکون بنے ہوئے ہیں۔''
''جاذب کمال امریکہ میں ہو یا افریقہ میں، یا دنیا کے کسی کونے میں، اس کی بربادی اور ذلت میرا مشن ہے۔''
''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' شہریار نے اسے جھڑکا۔
وہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
''تمہیں معلوم ہے اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا، کیا کہا مجھے۔'' شائنہ کی آنکھوں میں صدمے کی واضح تحریر تھی۔ اب جاذب کمال کے ساتھ اپنی ملاقات کا احوال بتا رہی تھی شہریار کو۔
''تم نے کیا سوچ کر اس کے سامنے یہ فلمی انٹری دی تھی؟ کیا وہ گلے سے لگا تا تمہیں؟ اس نے وہی کیا جس کی اس جیسے انسان سے توقع تھی۔''
''تم اس ذلیل شخص کی وکالت کر رہے ہو؟'' شائنہ غم و غصے سے پھٹ پڑی۔
''میں اس کی وکالت نہیں کر رہا، تمہیں حماقت سے روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

"کون سی حماقت؟ کیا سچ بولنا حماقت ہے؟ جھوٹے اور مکار انسان کو آئینہ دکھانا حماقت ہے؟" شائنہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

"سچ ہمارے ہاتھ کا لالی پاپ نہیں ہوتا' جب چاہیں اسے چوس لیں ہاتھ خراب ہونے لگیں تو پھینک دیں اور کسی دوسرے کو آئینہ اس وقت دکھایا جاتا ہے جب ہمارا اپنا چہرہ شفاف ہو۔" شہریار اسے سمجھا رہا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" وہ الجھ گئی۔

"شائنہ! سچ یہ ہے کہ جاذب کمال اور انوشہ دونوں کے درمیان باہمی رضامندی سے ایک سودا ہوا تھا۔ اب یہ اس لڑکی کی محبت تھی یا بے وقوفی' جو تمہارے دنیا میں آنے کا سبب بنی' یہ ہے پورا سچ۔ یہ سچ جاذب کمال کا چہرہ ایسے داغ دار نہیں کر سکتا' جیسے تم سوچ رہی ہو۔"

"اس نے محبت کا دعوا کیا تھا' شادی کا وعدہ کیا تھا' اس لیے میری ماں نے۔"

"وعدے اور دل توڑنے پر' دعوے سے مکرنے پہ دنیا کی کسی عدالت میں مقدمہ نہیں چلتا۔ جب تک کہ کوئی دستاویز نہ ہو۔ ثبوت نہ ہو۔"

"کچھ بھی ہو' میں اس کمینے کو نہیں چھوڑوں گی۔" احساس بے بسی سے شائنہ کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں مگر وہ بڑی مہارت سے آنسوؤں کو اندر ہی اندر دل میں اتار رہی تھی۔

"مت چھوڑو مگر یاد رکھنا کہ پھر تمہاری ماں کو بھی کوئی نہیں چھوڑے گا۔ تمہاری باری تو بعد میں آئے گی' پہلے تمہاری ماں کے متعلق ہر طرح کی باتیں ہوں گی۔ جاذب کمال پرخچے اڑائے گا ان کے۔ اگر تمہیں اپنی مری ہوئی ماں کو رسوا کرنا ہے تو کرو' جو دل چاہے۔" شہریار انتہائی سنجیدگی سے بول کر خاموش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

صوفے پہ کشن سر کے نیچے رکھے وہ انتہائی کاہلی سے لیٹی ہوئی تھی۔ اگلے چند مہینے بے حد مصروف گزرنے والے تھے۔ فارغ وقت کو غنیمت جان کر وہ دل بھر کے آرام کر رہی تھی اور سستی اور کاہلی کے سارے ریکارڈ توڑ رہی تھی۔ ریموٹ ہاتھ میں لیے چینل بدل بدل کر بھی تنگ آ گئی تو موبائل ہاتھ میں لے لیا۔

دوسری گھنٹی پر ہی فون اٹھا لیا گیا۔ شائنہ شروع ہو گئی۔

"کمال ہو تم' جب سے تمہاری انگیجمنٹ ہوئی ہے' تم تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے ہو۔"

"ابھی تو آدھا غائب ہوا ہوں۔ شادی ہو گئی تو پورا ہی غائب ہو جاؤں گا۔ عادت ڈال لو ابھی سے۔" دوسری طرف سے فوراً ہی جواب ملا تھا۔

"ڈال لوں گی عادت' دوستی ہی تو ہے' کوئی عشق تھوڑی ہے تم سے۔"

"آج پتا چلا' خوب صورتی کے ساتھ ساتھ عقل بھی رکھتی ہو' گڈ۔"

"ایک بات بتانی تھی تمہیں۔" شائنہ مسکراتے ہوئے کام کی بات پر آ گئی۔ "ابرار حسن نے فلم کی آفر کی ہے مجھے۔"

"تمہیں آفر کی ہے؟" شہریار چونکا "ابرار نے تو ماریہ اور عماد کے بارے میں اناؤنس کیا تھا کہ انہیں سائن کر رہا ہے۔"

"ہاں مگر اب وہ مجھے سائن کر رہا ہے' ابرار کی فلم کی سب سے زیادہ ضرورت مجھے ہے' میں نے ان دونوں سے یہ فلم چھین لی ہے۔" شائنہ بڑے فخر سے اپنا کارنامہ بتا رہی تھی۔

"دونوں سے کیا مطلب' کیا ہیرو بھی بدل گیا؟"

"بالکل ذیشان صدیقی کے سوا میرا ہیرو کون ہو سکتا ہے۔"

"تم نے سفارش کی تھی ذیشان کے لیے؟"

"سفارش نہیں شرط رکھی تھی' ذیشان ہیرو ہو گا تو میں کام کروں گی۔"

"یہ لڑکا بے وقوف بنا رہا ہے تمہیں' استعمال کر رہا ہے اپنا کیریئر بنانے کے لیے۔ پتا نہیں تمہاری عقل کہاں چلی گئی ہے گھاس چرنے۔" شہریار جھنجلا گیا۔

"تمہارے اندر کا صحافی ہر ایک کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے' میری نظر سے دیکھو تو پتا چلے۔"

"مجھے سب پتا ہے اس کے بارے میں' تم بھی اپنی آنکھیں کھول لو ذرا۔"

"تمہارے علاوہ ایک ہی تو پیارا بندہ ملا ہے مجھے' جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ورنہ تو پوری دنیا جانوروں سے بھری ہوئی ہے۔" شائنہ اپنے یقین کو بت بنا کر اپنے دل میں سجا بیٹھی تھی۔

"دوست ہونے کے ناطے سمجھا رہا تھا' آگے تمہاری مرضی ہے۔" شہریار خاموش ہو گیا۔

"اچھا میری کال آرہی ہے' میں تم سے بعد میں بات کروں گی' او کے بائے۔"

ذیشان کی کال آرہی تھی۔ شائنہ نے کال اٹینڈ کی۔ وہ باتیں کم کر رہی تھی۔ خواب زیادہ دیکھ رہی تھی۔ آج کل جاذب کمال کے دکھ کو اس نے ایک طرف سرکا دیا تھا۔

ابرار حسن کی فلم شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ وہ لوکیشن دیکھنے اٹلی' تھائی لینڈ ماریشس' اور مالدیپ کے دورے پر نکلا ہوا تھا۔ شائنہ کو ایک دوسری فلم میں آئٹم سانگ کرنا تھا' وہ اس میں مصروف تھی' اس کے ساتھ ساتھ بالی ووڈ میں بھی کام کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سفید رنگ کا جھلملاتا ایوننگ گاؤن پہنے' ایوارڈ تقریب سے پہلے وہ ریڈ کارپٹ پر ذیشان صدیقی کے ہمراہ موجود تھی۔

"تو شائنہ جی! اس بار بھی ہوپ فل ہیں ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے۔" مائیک اس کے سامنے کر کے اس سے سوال کیا جا رہا تھا۔

شائنہ کے خوب صورت چہرے پہ ایک دلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔

"میرے علاوہ اور کون ہے یہاں؟" اپنے کندھے اچکا کر اس نے جس لہجے میں یہ مختصر جواب دیا تھا' اس میں اعتماد کے ساتھ ساتھ غرور بھی تھا۔

"اور ہمیشہ کی طرح ذیشان صدیقی بھی شائنہ کے ہمراہ ہیں۔ کیا کہیں گے۔ ذیشان اس بارے میں۔۔۔" مائیک اس بار ذیشان کے سامنے تھا۔ شائنہ کے بازو میں اپنا بازو ڈالے ذیشان صدیقی مسکرایا۔

"میں یہی کہوں گا کہ ہم ان فیوچر بھی آپ کو ایک ساتھ نظر آئیں گے۔"

ذیشان کافی خوش شکل اور مہذب لب و لہجے کا مالک تھا۔ شکل و صورت' صلاحیت' اعتماد' سبھی کچھ تھا اس میں' بس شاید قسمت میں کہیں کمی تھی کہ وہ اس طرح کلک نہیں کر پایا۔ جیسی اس سے توقع کی جا رہی تھی۔ مگر جب سے ابرار حسن کی فلم اس نے شائنہ کے ساتھ سائن کی تھی۔ لوگوں کے ساتھ ساتھ اسے بھی امید تھی کہ اب اس کے کیریر کو آسمان تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

"ان فیوچر بھی ایک ساتھ نظر آئیں گے کہاں؟ فلموں میں۔۔۔ ڈراموں میں کمرشلز میں یا لائف میں۔۔۔؟" اگلا سوال بڑا لہک کر پوچھا گیا تھا۔

ذیشان نے ایک بے حد خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ پہلے اپنے پہلو میں کھڑی شائنہ کو دیکھا' پھر کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کھنکھارا۔

"ہم دونوں فلموں' ڈراموں اور کمرشلز میں ایک ساتھ نظر آئیں یا نہ آئیں' مگر لائف میں ضرور ایک ساتھ نظر آئیں گے۔" یہ کہہ کر ذیشان ایک لمحے کو رکا۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل شائنہ کے سامنے بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ "میں اپنی آخری سانس بھی تمہیں دیکھتے ہوئے لینا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس وقت تک میری ساتھی بنو گی؟" اس نے انگریزی میں یہ فقرہ کہا تھا۔

شائنہ نے حیران ہو کر پہلے اسے دیکھا' پھر مسکرا کر

اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ذیشان نے اپنی جیب سے ایک انگوٹھی نکالی اور اسے پہنادی۔

آن کی آن میں تمام ٹی وی چینلز پر بریکنگ نیوز آگئی۔ ذیشان نے اپنی اور شائنہ کی ایک سیلفی لے کر واٹس ایپ پہ لگادی "اس پوسٹ کے ساتھ....

"پارٹنر فار ایور...."

رات میں ہونے والی ایوارڈز کی تقریب میں لوگوں کے لیے موضوع گفتگو یہی دونوں تھے' شائنہ کی زندگی کا سب سے اہم اور یادگار دن تھا۔

اسی وقت کسی اور نے بھی اپنے موبائل پر یہ سب دیکھا اور ایک زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

"شائنہ بی بی! یہ تمہاری آخری پرواز ہے' جتنی اونچی اڑان بھرنی ہے بھرلو' پھر اس کے بعد تمہارے پر کٹ جانے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

ذیشان کا ساتھ اس کے لیے خوشیاں ہی نہیں کامیابیاں بھی لایا تھا۔ ایک مشہور شیمپو کی برانڈ ایمبیسڈر بننے جارہی تھی وہ۔ کامیابیاں' خوشیاں جیسے بہار کے پھول بن کر اس پر برس رہی تھیں۔ ان گنت' بے شمار' ان رنگ برنگ پھولوں کی بارش نے اس کا تن من یوں بھگوڈالا تھا کہ وہ ہر طرف سے معطر ہوگئی تھی۔ اندر سے بھی باہر سے بھی....

ابرار حسن کی فلم کی شوٹنگ' اگلے ہفتے سے شروع تھی۔ سارا پیپر ورک ہوچکا تھا۔ لوکیشنز کا انتخاب ہوچکا تھا۔ مناظر اور خاص طور پر نغمات کی پکچرائزیشن کے لیے ذیشان اور شائنہ کے خصوصی اور بہت مہنگے ملبوسات تیار ہوچکے تھے۔

☆ ☆ ☆

شائنہ ابھی ابھی جم سے لوٹی تھی۔ شاور لے کر فریش ہوئی تھی کہ شہریار کی کال آگئی۔

"کہاں ہو تم؟"

"میں ناراض ہوں تم سے۔" شائنہ کی آواز میں خفگی در آئی۔

"مجھ سے کیا گستاخی ہوگئی آپ کی شان میں؟"

"بکواس مت کرو' ساری دنیا نے میری انگیجمنٹ کی مبارک باد دی ہے مجھے' سوائے تمہارے۔"

"ساری دنیا کی کافی ہے' تمہارے لیے' میری مبارک باد کی کیا ضرورت ہے۔"

"شہریار...." شائنہ کی آواز بوجھل ہوگئی۔

"تم جانتے ہو' تم میرے لیے کیا ویلیو رکھتے ہو' ساری دنیا ایک طرف' تم ایک طرف۔ میں جانتی ہوں' پوری دنیا میں' تمہارے سوا ـــــ میرا مخلص اور کوئی نہیں ذیشان بھی نہیں۔"

"دوست کہتی ہو' سمجھتی بھی ہو مگر میری باتوں پہ یقین نہیں رکھتیں۔" شہریار سنجیدہ ہوکر بول رہا تھا۔ "میں تمہاری زندگی پہ اور تمہارے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہونا چاہتا' ہو بھی نہیں سکتا' صرف تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ جلد بازی میں ڈی سیشن مت لو' کچھ عرصہ ٹھہر جاؤ' کچھ پرکھ تو لیتیں اسے۔"

"بس سچویشن ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی' مجھے لگا کہ اگر میں نے یہ موقع مس کردیا تو شاید.... شاید تتلی کے رنگ میرے ہاتھوں پہ دوبارہ نہ ٹھہریں۔" شائنہ کی آواز میں عجیب سی یاسیت تھی۔ شہریار جو کچھ اور کہنے کا ارادہ کررہا تھا' خاموش ہوگیا' پھر چند لمحوں بعد بولا تو اس کی آواز میں بشاشت تھی۔

"چلو.... جانے دو' جو ہوگیا' سو ہوگیا' میں تمہیں مبارک باد دوں یا نہ دوں' میری دعائیں تو ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔"

"اچھا.... کیا دعائیں دی ہیں تم نے مجھے؟"

"ہمیشہ مسکراتے رہنے کی' خوش رہنے کی' تمہاری من چاہی مرادیں اور کامیابیاں ملیں تمہیں۔" شہریار شروع ہوگیا۔

"مجھے لگتا ہے تمہاری ساری دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔ کبھی میں سوچتی ہوں کہ پتا نہیں اللہ تعالیٰ کو مجھ گناہ گار کی کیا بات پسند آئی جو اتنا اچھا ساتھی اور دوست مجھے دیا۔" شدت جذبات سے شائنہ کی آنکھیں اور آواز دونوں بھیگ رہی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے فلم میں تم ٹھیک ٹھاک ایکٹنگ کرلوگی۔" شہریار نے جان بوجھ کے اسے چھیڑا۔

"بکو مت۔۔۔" شائنہ بے اختیار مسکرادی۔

"یہ بتاؤ، تمہاری وہ نور جہاں کیسی ہے؟ ایک پروگرام کرتے ہوئے دیکھا تھا اسے۔" شائنہ نے ایک معروف چینل کا نام لیا۔

"ہاں۔۔۔ کئی ہفتے ہوگئے ہیں اسے چینل جوائن کیے ہوئے۔ اپنا پروگرام ابھی شروع کیا ہے۔" شہریار نے جواب دیا۔

"میں تو صرف خود کو خوب صورت سمجھتی تھی، کل پروگرام میں تمہاری نور جہاں کو دیکھا تو پتا چلا، دنیا میں میرے جیسے خوب صورت لوگ اور بھی موجود ہیں۔" شائنہ کی آواز سے شوخی جھلک رہی تھی، شہریار بے ساختہ ہنس پڑا۔

"اچھا ہوا، اونٹ پہاڑ کے نیچے آگیا۔ اب پتا چلا، میں اپنی منگیتر سے کیوں اتنی محبت کرتا ہوں۔"

"خوب صورتی پہ مرتے ہو اس کی؟" شائنہ نے عجیب سے لہجے میں عجیب سا سوال کیا تھا۔ شہریار سوال سن کر خاموش ہوگیا، پھر کچھ دیر بعد کہنے لگا۔

"میرے نزدیک حسن اتنی بڑی دلیل نہیں کہ محبت کے لیے کافی ہو جائے۔"

"پھر۔۔۔ محبت کے لیے کیا دلیل ہوتی ہے جو کافی ہو جاتی ہے؟" شائنہ کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"محبت بذات خود ایک دلیل ہے، جب یہ ہو جاتی ہے تو اس کے آگے پھر کوئی اور دلیل کام نہیں کرتی۔" شہریار سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ شائنہ مسکرادی۔

"کبھی کبھی تمہاری باتیں بہت گہری اور مشکل ہوتی ہیں۔"

"محبت کوئی آسان عمل نہیں، اس لیے اس پر جو بات ہوگی مشکل ہی ہوگی۔" شہریار نے گمبھیر لہجے میں بولتے ہوئے موضوع بدلا۔

"چھوڑو ان محبت کے فلسفوں کو اور بھی کام ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً" کھانا کھانا اور پھر قیلولہ کرنا، آہ، ترس گیا ہوں آرام کے چند لمحات کو، سچ، کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے میں مشین بن گیا ہوں۔"

"تم بھی تو چوبیس گھنٹے بس لوگوں کے اور خبروں کے پیچھے لگے رہتے ہو۔ کچھ دن کا آف لے کر ریسٹ کرلو۔" شائنہ نے ہمدردی سے مشورہ دیا۔

"آف لے لوں؟ ریسٹ کرلوں؟ کیا باتیں کر رہی ہو؟" شہریار جیسے کراہا تھا۔

"سانس لینے کا، آف تو لے سکتا ہوں، اپنی فیلڈ سے آف نہیں لے سکتا۔"

"تو پھر رو کیوں رہے ہو؟ جاؤ جو دل چاہے کرو۔" شائنہ بلاوجہ چڑ گئی۔

"ٹھیک ہے، تمہارے اس مشورے پہ عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اوکے، خدا حافظ۔"

"گڈ بائے۔" شائنہ نے فون آف کردیا۔



ذیشان کے دوست نے ذیشان اور شائنہ کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ دونوں میاں، بیوی بلا کے ہنس مکھ اور اتنے ہی باتونی، شائنہ کو وہ دونوں بہت اچھے لگے تھے۔

"آپ دونوں کا کپل بہت پیارا ہے، آئی وش کہ میرے اور ذیشان کے درمیان بھی ایسی ہی محبت اور انڈر اسٹینڈنگ ہو۔" شائنہ نے اپنی عادت کے مطابق فوراً" اپنے جذبات کا اظہار بھی کردیا۔

"کیا خبر اس سے زیادہ محبت اور اس سے اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہمارے بیچ میں ہو۔" ذیشان نے اس کی طرف جھک کر کہا۔

"اچھا بھئی یہ بتاؤ کافی کون پیے گا اور آئس کریم کون کھائے گا؟"

"ہم دونوں ہی آئس کریم لوور ہیں۔" ذیشان نے کہا تو شائنہ مسکرادی۔

"تم کیوں مسکرائیں؟" نمیرا نے اس کے مسکرانے پہ بے ساختہ سوال کیا۔

"دراصل ہم دونوں پہلی بار جب ملے تھے تو ہمارے درمیان آئس کریم پر ہی جھگڑا ہوا تھا۔" شائنہ مسکراتے ہوئے بتانے لگی۔

"ویری اسٹرینج۔" ارمان قہقہہ مار کر ہنسا۔

"یعنی تم دونوں کی محبت جھگڑے سے شروع ہوئی تھی؟"

"وہ جھگڑا نہیں تھا' وہ بھی شاید محبت ہی تھی' بس ہمیں اس کا احساس بعد میں ہوا تھا۔" ذیشان اس جھگڑے کی روداد سنانے لگا۔ جو کافی دلچسپ تھی۔ آئس کریم کھاتے کھاتے' باتیں کرتے کرتے' بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔

"مجھے تمہارا دوست اور اس کی بیوی بہت اچھے لگے۔" واپسی پر شائنہ نے ایک بار پھر ذیشان سے دونوں میاں' بیوی کی تعریف کی۔

"خیریت تو ہے' میں نے تین سال کی فرینڈشپ میں کبھی اس کی اتنی تعریف نہیں کی' جتنی تم نے تین گھنٹے میں کردی ہے۔" ذیشان کا لہجہ معمولی سا سہی' مگر تیکھا تھا۔

"بس پتا نہیں کیا بات ہے۔ جب سے تمہارے ساتھ رشتے میں بندھی ہوں' ہر کپل کے درمیان محبت اور انڈراسٹینڈنگ کو جج کرتی رہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"یونہی۔" شائنہ اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔

"میں سوچتی ہوں کہ آفٹر میرج ہمارے درمیان کیسا رشتہ ہوگا؟"

"جیسا اب ہے' اس سے کہیں زیادہ گہرا اور مضبوط۔" ذیشان کا لہجہ اور نگاہیں آنے والی بہار کے نقیب بنی ہوئی تھیں۔

"تم مجھے ہمیشہ اتنا ہی چاہو گے۔" کھوئے کھوئے لہجے میں سوال کرتی وہ نہ جانے کیا تسلی چاہ رہی تھی۔

"آج سے زیادہ کل' کل سے زیادہ پرسوں' پرسوں سے زیادہ ترسوں' ہر دن میرا پیار ملٹی پلائی ہو کر بڑھتا ہی رہے گا۔"

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں کبھی کسی کی محبت میں مبتلا ہو جاؤں گی۔"

"سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔ میں اپنا کیریئر بنانے آیا تھا۔ مگر تم نے تو زندگی بنا دی میری۔" ذیشان بڑی مہارت سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولتا بھی جا رہا تھا۔

انتہائی پوش علاقے میں بنے ہوئے ماڈرن اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں ذیشان نے اپنی ہنڈا اکارڈ روکی۔

"اوکے' بائے۔" شائنہ دروازہ کھول کر اتر آئی۔

"کافی نہیں پلاؤ گی؟"

"بہت بری کافی بناتی ہوں۔" شائنہ ہنسی۔

"میں بہت اچھی کافی بناتا ہوں' کہو تو بنا کے بھی پلا دوں گا اور سکھا بھی دوں گا۔" ذیشان بھی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

"چلو آجاؤ' ویسے میں نے تمہارے ہاتھ کی کافی پی ہے۔ اتنی کوئی خاص بھی نہیں تھی۔" شائنہ نے لفٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"جب ہمارے درمیان رشتہ بھی تو خاص نہیں تھا۔ اب اس خاص رشتے اور خاص تعلق کا ذائقہ بھی میری کافی میں شامل ہوگا۔"

"دیکھتے ہیں۔" لفٹ میں اس کے ساتھ داخل ہوتے ہوئے شائنہ پھر ہنسی تھی۔



بنا دوپٹے کے اسکن کلر کی کرتی میں ملبوس' بال سادہ سے انداز میں سمیٹ کر پونی میں قید اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے ٹاپس' اپنے وسیع و عریض بنگلے کے کشادہ ٹیرس پر بیٹھی وہ موبائل پہ مصروف تھی۔

"آئی تھنک' دس از دا ٹائم۔"

"ہاں زیادہ لیٹ نہیں کرو' بس ہفتہ دس دن میں فنش کرو معاملے کو۔" چند سیکنڈ دوسری طرف کی بات سن کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"دیکھ لو' تمہیں یہ لگ رہا تھا کہ وہ اتنی آسانی اور اتنے آرام سے میرے پھیلائے جال میں دانہ چگنے

"دراصل ہم دونوں پہلی بار جب ملے تھے تو ہمارے درمیان آئس کریم پر ہی جھگڑا ہوا تھا۔" شائنہ مسکراتے ہوئے بتانے لگی۔

"ویری اسٹرینج۔۔۔" ارمان قہقہہ مار کر ہنسا۔

"یعنی تم دونوں کی محبت جھگڑے سے شروع ہوئی تھی؟"

"وہ جھگڑا نہیں تھا' وہ بھی شاید محبت ہی تھی' بس ہمیں اس کا احساس بعد میں ہوا تھا۔" ذیشان اس جھگڑے کی روداد سنانے لگا۔ جو کافی دلچسپ تھی۔ آئس کریم کھاتے کھاتے' باتیں کرتے کرتے' بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔

"مجھے تمہارا دوست اور اس کی بیوی بہت اچھے لگے۔" واپسی پر شائنہ نے ایک بار پھر ذیشان سے دونوں میاں' بیوی کی تعریف کی۔

"خیریت تو ہے' میں نے تین سال کی فرینڈشپ میں کبھی اس کی اتنی تعریف نہیں کی' جتنی تم نے تین گھنٹے میں کردی ہے۔" ذیشان کا لہجہ معمولی سا سہی' مگر تیکھا تھا۔

"بس پتا نہیں کیا بات ہے۔ جب سے تمہارے ساتھ رشتے میں بندھی ہوں' ہر کپل کے درمیان محبت اور انڈراسٹینڈنگ کو جج کرتی رہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"یونہی۔۔۔" شائنہ اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔

"میں سوچتی ہوں کہ آفٹر میرج ہمارے درمیان کیسا رشتہ ہوگا؟"

"جیسا اب ہے' اس سے کہیں زیادہ گہرا اور مضبوط۔" ذیشان کا لہجہ اور نگاہیں آنے والی بہار کے نقیب بنی ہوئی تھیں۔

"تم مجھے ہمیشہ اتنا ہی چاہو گے۔" کھوئے کھوئے لہجے میں سوال کرتی وہ نہ جانے کیا تسلی چاہ رہی تھی۔

"آج سے زیادہ کل' کل سے زیادہ پرسوں' پرسوں سے زیادہ ترسوں' ہر دن میرا پیار ملٹی پلائی ہوکر بڑھتا ہی رہے گا۔"

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں کبھی کسی کی محبت میں مبتلا ہوجاؤں گی۔"

"سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔ میں اپنا کیریر بنانے آیا تھا۔ مگر تم نے تو زندگی بنادی میری۔" ذیشان بڑی مہارت سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولتا بھی جارہا تھا۔

انتہائی پوش علاقے میں بنے ہوئے ماڈرن اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں ذیشان نے اپنی ہنڈا اکارڈ روکی۔

"او کے' بائے۔۔۔" شائنہ دروازہ کھول کر اتر آئی۔

"کافی نہیں پلاؤ گی؟"

"بہت بری کافی بناتی ہوں۔" شائنہ ہنسی۔

"میں بہت اچھی کافی بناتا ہوں' کہو تو بنا کے بھی پلا دوں گا اور سکھا بھی دوں گا۔" ذیشان بھی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

"چلو آجاؤ' ویسے میں نے تمہارے ہاتھ کی کافی پی ہے۔ اتنی کوئی خاص بھی نہیں تھی۔" شائنہ نے لفٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"جب ہمارے درمیان رشتہ بھی تو خاص نہیں تھا۔ اب اس خاص رشتے اور خاص تعلق کا ذائقہ بھی میری کافی میں شامل ہوگا۔"

"دیکھتے ہیں۔" لفٹ میں اس کے ساتھ داخل ہوتے ہوئے شائنہ پھر ہنسی تھی۔



بنا دوپٹے کے اسکن کلر کی کرتی میں ملبوس' بال سادہ سے انداز میں سمیٹ کر پونی میں قید اور کانوں میں چھوٹے چھوٹے ٹاپس' اپنے وسیع و عریض بنگلے کے کشادہ ٹیرس پر بیٹھی وہ موبائل پہ مصروف تھی۔

"آئی تھنک' دس از واٹائم۔"

"ہاں زیادہ لیٹ نہیں کرو' بس ہفتہ دس دن میں فنش کرو معاملے کو۔" چند سیکنڈ دوسری طرف کی بات سن کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"دیکھ لو' تمہیں یہ لگ رہا تھا کہ وہ اتنی آسانی اور اتنے آرام سے میرے پھیلائے جال میں دانہ چگنے

نہیں آئے گی' مگر سب کچھ میری توقع سے بھی زیادہ آسان اور جلدی ہو گیا۔"
کچھ دیر مسکرا مسکرا کر وہ دوسری طرف کی بات سنتی رہی' پھر گیا ہوئی۔
"ڈارلنگ' سمندر میں عموماً" اچھے پیراک ہی ڈوبتے ہیں' جنہیں سوئمنگ نہیں آتی' وہ سمندر میں اترتے ہی نہیں۔ اسے اپنے اوپر بہت زعم تھا۔ بہت شوق تھا اپنی اوقات سے آگے بڑھ کر گہرے سمندر میں اترنے کا۔ اب ایسی جگہ ڈوبے گی جہاں سے لاش بھی نہیں ملے گی۔" اس کا ایک ایک لفظ نفرت کے زہر میں بجھا ہوا تھا۔
"تھینک یو ہنی' تم نے جو منہ کچھ ۔۔ میرے لیے کیا۔" اس نے چہک کر کہا۔
"او کے' بائے۔۔۔"
"پرندے کے پر کاٹنے کا وقت قریب آگیا ہے۔" فون آف کرتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

☆ ☆ ☆

ماریشس کے خوب صورت مقامات پر ایک گانا شوٹ کرکے' کچھ مناظر کی شوٹنگ اسٹوڈیو میں سیٹس پر ہونی تھی۔ پورا یونٹ لاہور میں تھا۔ شائنہ کراچی آگئی تھی۔ شوٹنگ دو دن بعد تھی۔
"ابرار! میں کل لاہور آؤں گی۔" شائنہ نے فون پہ اسے بتا دیا تھا۔
"ایز یو لائیک بے بی' آئی وانٹ یو اون مائی سیٹ' اون ٹائم۔"
"ڈونٹ وری' آئی ول اون ٹائم۔" شائنہ نے یقین دہانی کرا کر فون آف کر دیا۔
پھر وہ ذیشان کو کال کرنے لگی۔
رات گہری ہو چکی تھی۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ پھر بھی اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ فیس بک پر وہ کب سے ایک ہی فیملی کو سرچ کر رہی تھی۔ ویسے تو آئے دن کرتی تھی' مگر آج اسے دو گھنٹے ہو گئے تھے اور ایک کے بعد ایک تصاویر وہ دیکھتی ہی جارہی تھی' ایک بار' دوبار'

بار بار دیکھ رہی تھی' جاذب کمال کی فیملی فوٹوز' اس کی بیٹی کی حال ہی میں انگیجمنٹ ہوئی تھی۔ اس کا داماد باسکٹ بال کا ابھرتا ہوا کھلاڑی تھا۔ بیٹی اور بیوی کے پیجز الگ تھے۔ جہاں انہوں نے بہت سے یادگار فیملی ایونٹس کی پکس لگائی ہوئی تھیں۔ جاذب کمال ایک کامیاب بزنس مین ہی نہیں' ایک کامیاب فیملی مین بھی تھا۔ وہ ایک اچھا شوہر اور بہترین باپ تھا۔ ہر موقع پر اپنی فیملی کے ساتھ ساتھ۔۔۔۔
شائنہ جب بھی جاذب کمال کو سوشل میڈیا پہ وزٹ کرتی' ہر بار نئے سرے سے دکھ کی ندی میں ڈوبتی ابھرتی۔
"کیا تھا جو یہ شخص میرا باپ بن کر میرے ساتھ ہوتا۔"
وہ خود ترسی کا شکار تھی' اپنی محرومیوں کے بارے میں سوچتی رہتی اور پھر اسے خود پر ترس آنے کے ساتھ ساتھ ساری دنیا پر غصہ آتا۔ ایک ایک کرکے اسے ہر ایک پہ غصہ آتا۔ اس دنیا پر' دنیا کے لوگوں پر' یہاں کے نظام پر' منافقت پر' جاذب کمال پر اور پھر اپنی ماں پر۔۔۔۔
ایک روز ایسی ہی خود ترسی اور غصے کے جذبات میں گھر کر اس نے جاذب کمال کو فون کیا۔
"تمہارا دماغ درست نہیں ہوا اب تک؟" شائنہ کا نام سن کر وہ انتہائی درشت لہجے میں بولا تھا۔
"نہیں۔۔۔۔"
"آخر تم چاہتی کیا ہو؟" وہ جھلا اٹھا۔
"تم میری ماں کے ساتھ اپنا نکاح ڈکلیئر کرو اور مجھے اپنی بیٹی تسلیم کرو۔" شائنہ کے بس دو ہی مطالبات تھے۔
"پاگل ہو گئی ہو تم' میں نے کوئی نکاح وکاح نہیں کیا تھا' تمہاری ماں کے ساتھ۔۔۔۔" جاذب کمال غرایا۔ "مجھے نہ تمہاری ماں سے کوئی محبت تھی' نہ تم سے کوئی لگاؤ ہے' میں صرف اپنی بیوی اور بیٹی کو چاہتا ہوں اور بس' اگر آئندہ تم نے مجھ سے کوئی کانٹیکٹ کرنے کی یا بات کرنے کی کوشش کی تو تمہارے حق میں اچھا نہیں

ہو گا۔"

جاذب کمال کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس کے فون آف کرنے کے بعد شائنہ نے اپنا بے حد قیمتی موبائل اٹھا کر دیوار سے دے مارا تھا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر تک غم و غصے میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ سوچتی رہی، کھولتی رہی، جلتی رہی، کلستی رہی۔

"اچھا تو تمہارے حق میں نہیں ہو گا جاذب کمال! تمہیں برباد نہیں کیا تو میں بھی تمہاری اولاد نہیں۔" اس روز اسی غم و غصے کے عالم میں اس نے خود سے عہد کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا سنہری بیگ تیار ایک طرف رکھا تھا۔ وہ نہا کر کپڑے تبدیل کر چکی تھی۔ اب تیار ہونے جا رہی تھی، فلائٹ دو گھنٹے بعد تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی وہ بالوں میں ڈرائی لگا رہی تھی، جب شہریار کی کال آئی۔ "کیا کر رہی ہو؟"

"تیار ہو رہی ہوں۔ دو گھنٹے بعد لاہور کی فلائٹ ہے میری۔"

"آخری بار تمہاری بات کب ہوئی تھی ابرار سے؟" شہریار کا لہجہ کافی محتاط لگ رہا تھا۔

"کل بات ہوئی تھی کیوں؟ خیریت تو ہے؟" شائنہ چونکی۔

"فیس بک پر تمہاری فلم کے پیج کے مطابق، اس فلم کی ہیروئن اب الوینہ ہے۔" شہریار نے ایک ابھرتی ہوئی اداکارہ اور ماڈل کا نام لیا۔

"مذاق کر رہے ہو؟" شائنہ کو اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ابرار حسن نے ٹوئیٹ کیا ہے کہ تمہارے نان پروفیشنل ایٹی ٹیوٹ کی وجہ سے اس نے اس فلم سے تمہیں کٹ کر دیا ہے اور الوینہ کو سائن کر لیا ہے۔"

"کیا بکواس ہے یہ شہری، میں ابھی تم سے بات کرتی ہوں۔" شائنہ نے جلدی جلدی فیس بک پہ اپنی فلم کا پیج نکالا، اور پھر اس کے بعد ابرار حسن کی ٹوئیٹ۔

شہریار مذاق نہیں کر رہا تھا، وہ ایسے مذاق کرتا بھی نہیں تھا، پھر یہ مذاق کس نے کیا ہے میرے ساتھ؟ شائنہ سن ہو گئی۔

اس نے ابرار حسن کو کال ملائی اور پھر اگلے ایک گھنٹے تک وہ پاگلوں کی طرح اس کے نمبر ٹرائی کرتی رہی مگر وہ مسلسل بند جا رہا تھا۔

"تم سمجھتے کیا ہو خود کو ابرار حسن، تمہیں اپنے کیے کا حساب دینا ہو گا۔" وہ غیض و غضب سے دیوانی ہو رہی تھی۔ اس نے شہریار کو فون کیا۔

"شہریار! میں لاہور جا رہی ہوں؟"

"کیوں؟" وہ چونکا۔

"ابرار حسن سے حساب کتاب کرنے۔" اس کے لہجے میں غصے کی جو آگ تھی، وہ با آسانی شہریار تک پہنچ گئی۔

"دیکھو، غصے میں کوئی قدم مت اٹھاؤ، میں آ رہا ہوں، بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں نا۔"

"تم تو ہو ہی نہیں درمیان میں، تم کیا بات کرو گے مجھ سے، سمجھاؤ گے بس اور میں اس وقت کوئی نصیحت سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" اپنی ازلی صاف گوئی سے بولتے ہوئے شائنہ نے فون بند کر دیا۔

ایئر پورٹ سے سیدھی وہ پی سی گئی، وہاں اس کے نام سے کمرہ بک تھا۔

"میڈم! وہ بکنگ تو کینسل ہو گئی ہے۔" ریسپشن پہ موجود لڑکی نے معذرت خواہانہ لہجے میں اسے بتایا۔ "آپ چاہیں تو میں دوسرا بک کر دوں آپ کے لیے؟" وہ لڑکی بڑی خوش اخلاقی سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

شائنہ ابرار حسن کو کال کر رہی تھی۔

"جسٹ آمنٹ۔" شائنہ لابی میں موجود صوفوں پر میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

بیل جا رہی تھی اور بالآخر پانچویں گھنٹی پر اس کا فون ریسیو ہو گیا۔

"ہیلو!" ابرار کی آواز سن کر اس کا دل چاہا فون سے ہی نکال کر اس کی گردن مروڑ دے۔

"آپ کہاں ہیں ابرار صاحب؟" شائنہ کا لہجہ بڑا زہریلا تھا۔

"میں تو لاہور میں ہوں پی سی میں۔"

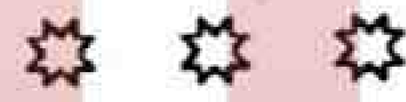
"اوہ۔۔۔" شائنہ نے ایک گہری سانس لی۔ "تو صرف میرے روم کی بکنگ کینسل ہوئی ہے۔ باقی سب کچھ وہی ہے؟"

"ایک منٹ، کہاں ہو تم؟" ابرار حسن نے چونک کر سوال کیا۔

"اپنا روم نمبر بتاؤ، بات کرنی ہے مجھے۔" شائنہ سب ادب آداب فراموش کر کے بول رہی تھی۔

"اوکے، بات تو مجھے بھی کرنی ہی تھی تم سے، چلو یہاں سہی، آجاؤ۔"

اس نے اپنا روم نمبر بتایا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ابرار حسن کے کمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ شائنہ بے دھڑک اندر داخل ہوگئی اور اندر کا منظر دیکھ کر ایک لمحے کو وہ ساکت کھڑی رہ گئی۔



کچھ دیر بعد جب وہ ہوٹل سے باہر آرہی تھی تو پارکنگ میں اسے ذیشان مل گیا۔

"میں تمہارا ہی ویٹ کر رہا تھا۔" وہ شائنہ کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"سامنے سے ہٹو۔" وہ غرائی۔

"ڈارلنگ، میں سوری کر چکا ہوں، ایک بار پھر سوری کرتا ہوں، دیکھو جیسے آل ان فئیر ان لو اینڈ وار، ایسے ہی کیریر بنانے میں بھی سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا، اپنا کیریر بنانے کے لیے کیا۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا۔

"کیا ہم آئندہ کے لیے اچھے دوست نہیں بن سکتے؟"

شائنہ نے ایک نظر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی قوت برداشت اور ضبط اب جواب دے گیا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور چٹاخ کے ساتھ ہی ایک زوردار تھپڑ ذیشان کے گال پر ثبت ہوگیا۔

"تم دوستی کے تو کیا میری نفرت کے قابل بھی نہیں ہو۔" شائنہ غم و غصے سے بری طرح کانپ رہی تھی۔

اسے نہیں یاد وہ کس طرح اور کتنے گھنٹوں بعد واپس اپنے گھر پہنچی تھی۔ فون اس نے بند کیا ہوا تھا۔ اپنے فلیٹ میں بیٹھی وہ خالی خالی نظروں سے ایک ایک شے کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ زندگی ہے، یہ محبت ہے، یہ لوگ ہیں، سب کچھ ناقابل اعتبار، بے بھروسا۔" جسم کے ساتھ ساتھ جیسے اس کا دماغ بھی مفلوج ہو رہا تھا۔

"زندگی ہمیں ایک صلیب پر لٹکا دیتی ہے اور لمحے لمحے مرنے کے لیے چھوڑ دیتی ہے مگر میں لمحہ لمحہ نہیں مروں گی، مرنا ہی ٹھہرا تو لمحہ کیوں، فاسٹ کیوں نہیں۔" بے اختیاری کے عالم میں وہ اٹھی اور دراز سے خواب آور گولیوں کی بوتل نکالی۔ وہ اس وقت بالکل خالی الذہن تھی۔ وہ دیکھ تو رہی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے مگر وہ یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ کیوں کر رہی ہے۔ چند لمحے وہ اس بوتل کو دیکھتی رہی، پھر اسے کھول کر پوری بوتل اپنے حلق میں انڈیل لی۔ گولیاں کچھ منہ میں موجود تھیں، کچھ حلق میں پھنس رہی تھیں۔ اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور غٹاغٹ چڑھا گئی۔

دروازے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ شائنہ نے ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا، وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے دروازہ کھولنا چاہیے یا نہیں مگر گھنٹی تھی کہ متواتر بجے ہی چلی جا رہی تھی۔ ڈگمگاتے قدموں سے وہ دروازے کی طرف بڑھی اور اسے کھول دیا۔

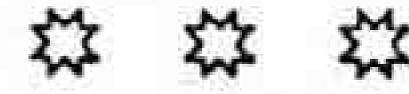
شہریار اندر آگیا۔

"کیا کرتی پھر رہی ہو تم؟ تمہاری اور ذیشان کی چند گھنٹے پہلے کی ویڈیو انٹرنیٹ پر وائرل ہوگئی ہے۔ آخر ایسا کیا ہوگیا تم دونوں کے درمیان اور تم نے اپنا فون کیوں آف کیا ہوا ہے؟ کب سے پاگلوں کی طرح تمہیں ٹرائی کر رہا ہوں۔" شہریار اندر آتے ہی شروع ہوگیا۔ وہ ناراض بھی لگ رہا تھا اور غصے میں بھی۔

"اب بھی کوائٹ کوئین بن کر کھڑی رہوگی، کچھ تو

بولو۔" اسے وہیں دروازے پاس ایستادہ دیکھ کر وہ اور جھنجلایا۔

شائنہ کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور آنکھیں دھندلا رہی تھیں، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا گلا دبوچ رکھا ہے۔ سانس لینے میں بڑی دقت ہو رہی تھی اسے۔ "شہریار!" بڑی مشکل سے اس کے لبوں سے نکلا۔ "مجھے بچالو۔" وہ وہیں دروازے کے پاس گر پڑی۔



زیشان کو تھپڑ مارنے کی ویڈیو جانے کس نے وہاں پارکنگ میں بنائی تھی اور اسے اپ لوڈ بھی کر دیا تھا۔ ابھی۔ یہ سنسنی خیز ویڈیو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی کہ ایک اور بریکنگ نیوز آگئی۔ ہر چینل سب سے پہلے خبر بریک کرنے کا دعویٰ کرتے ہوئے چنگھاڑ رہا تھا۔

"مشہور و معروف ماڈل اور اداکارہ شائنہ کی مبینہ خودکشی کی کوشش، وہ تشویش ناک حالت میں ایک نجی ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔"

شہریار دونوں ہاتھوں سے سر تھامے کرسی پر بیٹھا تھا۔ شائنہ کو اس نجی کلینک میں لائے اسے پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس کے پاس ایک کے بعد ایک کالز آنے لگی، صحافی حضرات، رپورٹرز، چینلز، اخبارات ہر کوئی اس سے خبر لینے کا منتظر تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ خبر کون لیک کر سکتا ہے۔

انتظار جان لیوا تھا۔ مگر بس میں اور کچھ تھا نہیں، وہ انتظار کرتا رہا اسی عالم میں نور جہاں کا فون آگیا۔

"کیا خبر ہے؟" اس کے لہجے میں لاپروائی کا رنگ نمایاں تھا۔ شہریار کے دل کو جیسے چوٹ پہنچی تھی۔

"ٹی وی پہ دیکھ لو، نیٹ پر بھی مل جائے گی نیوز آف دی ڈے۔" شہریار نے چاہا تو نہیں تھا، پھر بھی طنز کا رنگ جملے میں آ ہی گیا۔

"شائنہ کا کیا حال ہے؟" اس نے شہریار کے طنز کو نہ جانے کیسے نظر انداز کر کے شائنہ کے بارے میں پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں معلوم، ڈاکٹر اندر ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے اس نے سوسائیڈ اٹیمپ کیوں کی؟ کیا زیشان سے اپنے بریک اپ کی وجہ سے؟" نور جہاں کو بھی اپنے پروگرام کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا تھا تو آج شائنہ ہی سہی۔

"میں ابھی تھوڑی دیر میں ایک پریس کانفرنس کر کے سب کچھ کلیئر کر دوں گا، ویٹ کرو۔"

"خودکشی کی کوشش اس نے کی، صفائی تم پیش کر گئے۔ بہت خوب!" نور جہاں نے اس کے کیے گئے طنز کا بدلہ لے ہی لیا۔

"تمہاری تسلی اور اطلاع کے لیے بتا دوں کہ یہ خودکشی کا کیس نہیں ہے۔"

"جھوٹ بول رہے ہو، تم اسے بچانا چاہتے ہو۔" نور جہاں سالوں سے اس کے ساتھ تھی۔ اس کے مزاج اور لہجے کے سارے رنگ پہچانتی تھی، جھوٹے بھی اور سچے بھی۔۔۔۔

"یہ تم نے سچ کہا، میں واقعی جھوٹ بول رہا ہوں اور کچھ کہنا ہے تمہیں؟" شہریار کوشش کے باوجود اپنے لہجے کی تلخی پہ قابو نہیں پا سکا۔

"ٹھیک ہے، جب تمہارا موڈ اچھا ہوگا، تب بات کر لوں گی۔" نور جہاں نے فون بند کر دیا۔

شہریار فون بند کر کے پھر سے انتظار کے جلتے توے پہ بیٹھ گیا۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کے نمائندے ایک ایک کر کے وہاں پہنچ رہے تھے۔ سب کو ایک چٹ پٹے معاملے کی ایک مزے دار خبر چاہیے تھی، جس سے وہ اپنی ریٹنگ اور ویورشپ میں اضافہ کر سکیں۔ شہریار نے پریس کانفرنس کا کہہ کر پھر اپنا منہ بند کر لیا تھا۔

ڈاکٹر صائمہ جہانگیر جیسے ہی نمودار ہوئیں، سب کے سب اپنے اپنے مائیک اور موبائل اٹھا کر ان کی طرف بھاگے۔ مختلف سوالات نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

"شائنہ اب بہتر ہیں، فوڈ پوائزننگ کا کیس تھا، خدا کا

شکر ہے کہ وہ بچ گئی ہیں۔" ڈاکٹر صائمہ نے مختصر بات کرکے بات ختم کی۔

"مگر ڈاکٹر صاحبہ! نیوز تھی کہ مس شائنہ نے سوسائیڈ اٹیمپٹ کی ہے؟" سب کے سب ایک اسی سوال کو مختلف انداز سے پوچھ رہے تھے۔

"خبریں ڈھونڈنے والے، چلانے والے اور سنانے والے آپ لوگ ہی ہیں۔ بغیر تصدیق کے خبر پھیلانے سے یہی ہوتا ہے کہ سچ چھپ جاتا ہے، جھوٹ پھیل جاتا ہے۔ جو سچ تھا وہ آپ سب کو بتا دیا۔ اب اسے پھیلانا اور پہلے والے جھوٹ کا ڈینائے کرنا آپ کا کام ہے۔" ڈاکٹر صائمہ نے انتہائی سنجیدگی اور بردباری سے جواب دیا تھا۔

"ہم شائنہ سے کب مل سکتے ہیں؟"

"ایٹ لیسٹ آفٹر ٹوئنٹی فور آورز اگر پیشنٹ کی طرف سے بھی پرمیشن ہوئی تو....."

"تھینک یو ڈاکٹر!" وہ سب اپنا تام جھام سنبھال کر باہر بھاگے تھے۔ جہاں شہریار اپنی پریس کانفرنس شروع کر رہا تھا۔

"میں نے آج شام شائنہ کو فون کیا، تاکہ اس کے اور زیشان کے بریک اپ کے بارے میں جان سکوں، شائنہ نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں عنقریب ایک پریس کانفرنس کرکے سارے معاملے کلیئر کرے گی۔ زیشان کے بارے میں بھی اور ابرار حسن کی فلم کے حوالے سے بھی....."

شہریار چند لمحے رکا۔

"پھر وہ مجھے بتانے لگی کہ اسے اپنی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، اس نے کچھ دیر پہلے کچھ نگٹس اور انرجی ڈرنکس کھانے میں استعمال کیے تھے۔ اسے اپنے پیٹ میں بہت تکلیف محسوس ہو رہی تھی اور وومیٹنگ بھی.....

میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنا مین ڈور ان لاکڈ رکھے، میں ایمبولینس لے کر آرہا ہوں۔ میں وہاں پہنچا تو وہ بے ہوش پڑی تھی۔ میں یہاں لے آیا۔ یہاں ڈاکٹرز نے ابھی اسے چیک ہی کر رہے تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ ادھر ہمارے چینلز اور انٹرنیٹ پر اس کی سوسائیڈ اٹیمپ کی خبریں آنے لگیں۔"

شہریار نے رک کر ایک گہری سانس لی۔

"ڈاکٹر صائمہ کو آپ سب نے سن لیا، جو کچھ میں بتا رہا ہوں وہ آپ کے سامنے ہے۔ مزید خبروں اور معاملات کے لیے شائنہ کے صحت یاب ہونے کا انتظار کریں۔"

"سب کو معلوم ہے کہ شائنہ اپنے فلمی کیریر اور زیشان سے ریلیشن کے معاملے میں بہت کریزی تھی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ دونوں ہی کھو دینے پر اس نے جان بوجھ کے وہ زہریلی اشیا کھائی ہوں۔" ایک رپورٹر دور کی کوڑی لایا تھا۔

شہریار نے اسے گھور کے دیکھا، پھر ملائمت سے جواب دیا۔

"شائنہ کسی بھی معاملے میں کتنی ہی کریزی کیوں نہ ہو، جہاں تک میں اسے جانتا ہوں وہ ہر شخص اور ہر چیز کے مقابلے میں زندگی سے سب سے زیادہ پیار کرتی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اپنی زندگی سے یوں ہاتھ دھونے کی کوشش کرے گی۔"

چند سوالات کے جواب کے بعد اس نے پریس کانفرنس ختم کر دی۔

"تھینکس ٹو ہیلپ می ڈاکٹر!" ڈاکٹر صائمہ کے کمرے میں بیٹھا وہ ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

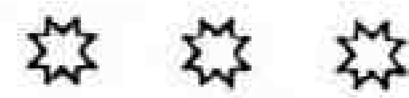
ڈاکٹر صائمہ نے ایک نظر اس کا سنجیدہ چہرا دیکھا، پھر بولیں۔

"میرے معاملے میں جو مدد تم نے میری کی تھی، اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔"

"آپ نے ابھی نرس سے بات کی؟"

"ہاں تمہارا اندازہ ٹھیک تھا، یہ خبر اسی نے لیک آؤٹ کی تھی۔ اس نے اپنی دوست کو بتائی تھی۔ دوست نے اسے نیٹ پر بھی ڈال دیا اور چینلز کو بھی بتا دیا۔ میڈیا نے صرف یہ کنفرم کیا کہ وہ واقعی یہاں اس حالت میں ہے، انہوں نے اسے بریکنگ نیوز بنا کر چلانا شروع کر دیا۔ اپنی ویز میں نے اس کی ٹھیک ٹھاک

کلاس لے کر ریزائن کا مطالبہ کر دیا ہے۔"
"شائنہ سے مل سکتا ہوں؟"
"نہیں، ابھی نہیں، ابھی وہ مینٹلی اور فزیکلی دونوں طرح سے ڈسٹرب ہے، تمہارا یا کسی کا بھی ملنا ٹھیک نہیں ہے۔"
"دیکھ سکتا ہوں۔" شہریار نے اگلا سوال کیا۔
"ہاں، دیکھ لو۔ چلو، میں لے چلتی ہوں۔" ڈاکٹر صائمہ اسے اپنے ساتھ لے کر باہر آگئیں۔



ڈسچارج ہو کر وہ اپنے فلیٹ میں آگئی تھی مگر ٹھیک وہ ابھی بھی نہیں تھی۔ گھنٹوں بیٹھی خلاؤں میں دیکھ کر جانے کیا کھوجتی رہتی۔ صحافیوں نے ناک میں دم کیا ہوا تھا، مگر وہ فی الحال کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتی تھی، ہاں اپنے ٹوئٹر اکاؤنٹ پر اس نے یہ خبر ضرور شیئر کی تھی کہ وہ اگلے ہفتے پریس کانفرنس کر کے سارے حقائق سے پردہ اٹھائے گی۔

شہریار تقریباً "روزانہ" اس سے ملنے آرہا تھا۔ مگر اس نے ابھی تک شائنہ سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ بس ایک اچھے دوست کی طرح اس کا خیال رکھ رہا تھا، اس کے اندر کا صحافی خاموش بیٹھا تھا۔
"تم پوچھو گے نہیں، میں نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا؟" شائنہ خود ہی سوال کر بیٹھی۔
"اتنا بڑا قدم اٹھانے کے لیے کوئی جواز، کوئی دلیل، کوئی وجہ نہ تو کافی ہوتی ہے، نہ قابل قبول۔۔۔" شہریار نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔
"میں اس روز جب ابرار حسن کے روم میں گئی تو وہاں ابرار کے ساتھ ذیشان اور فاریہ گل موجود تھے۔ وہ وہاں اپنی جیت کا جشن منا رہی تھی۔" شائنہ اس کی سنجیدگی سے بے نیاز دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔
"فاریہ گل ویسے ہی مجھ سے خار کھاتی ہے۔ ابرار کے خلاف بھی میں نے چند ایک بار باتیں کی تھیں، یہ لوگ بھی میرے خلاف بولتے تھے، مگر میں نے تو اپنی جنگ کو زبانی کلامی رکھا ہوا تھا۔ فاریہ گل نے مجھے نیچا دکھانے کے لیے، ذلیل کرنے کے لیے پوری پلاننگ سے کام کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں منہ پھٹ ہوں۔ بہت سوں کے لیے بہت بری ہوں۔ اس فیلڈ میں میرے دوستوں سے زیادہ میرے دشمن ہیں۔ مگر میں نے کبھی کسی کے خلاف سازشیں تو نہیں کیں۔" اس نے اپنی خالی خالی نظروں سے شہریار کو دیکھا اور بتانے لگی۔



وہ کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوئی تو فاریہ گل، ذیشان اور ابرار وہاں موجود تھے۔ شائنہ کو ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔
"آؤ بے بی شائنہ! پتا نہیں کب بڑی ہو گی تم، اتنے آرام سے میرے بچھائے ہوئے جال میں آگئیں کہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔" فاریہ گل بڑی زہریلی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس سے مخاطب تھی۔
"آئی ایم سوری شائنہ! میری فلم کی فنانسر فاریہ گل ہیں، مجھے یہ فلم ہر حال میں بنانی ہی ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ فلم کی ہیروئن تم ہو یا الوینہ۔۔۔" ابرار حسن نے بغیر کسی تمہید کے اعتراف کیا۔
"تمہیں ہر حال میں یہ فلم چاہیے، اس لیے تم اس گھٹیا عورت کے اشاروں پر ناچنے لگے۔" شائنہ نے اپنے لہجے اور لفظوں میں زہر بھرا اور ابرار حسن کے سامنے اگل دیا۔
"تمہاری یہی باتیں اور ایسا رویہ کسی کو تمہارے قریب نہیں آنے دیتا۔ تمہارا دوست نہیں بننے دیتا۔" ابرار حسن اپنے بارے میں شائنہ کے الفاظ سن کر غصے سے سرخ ہو گیا۔
"سچ بولنے والوں کا لہجہ اور الفاظ تم جیسے منافق اور جھوٹے لوگوں کو ہمیشہ برے ہی لگتے ہیں۔" شائنہ کا بس نہیں چل رہا تھا وہ ان لوگوں کا حشر نشر کر دے۔
"تم تو دعوا کرتی تھیں کہ دنیا کے سارے مردوں سے نفرت کرتی ہو۔ پھر ذیشان کے معاملے میں تمہاری عقل کو کیا ہوا؟" فاریہ گل بدستور طنز کے تیر برسا رہی

تھی۔ "اتنی کمزور نفرت تھی' محبت کے دو بول سن کر پھسل گئیں؟ ویسے ذیشان کافی اچھا ایکٹر ہے۔ اپنی فلم میں چانس دینے کا وعدہ کر کے غلط نہیں کیا میں نے۔"
فاریہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔
"تم نے ثابت کر دیا کہ میں مردوں سے جو نفرت کرتی ہوں' وہ ٹھیک ہی کرتی ہوں۔" شائنہ' ذیشان کی طرف مڑ کر غرائی تھی۔
"دیکھو' پہلے تم میری بات سن لو' پھر میرے بارے میں کچھ کہنا۔" ذیشان اسے اچانک یہاں دیکھ کر کچھ کنفیوز ہو گیا تھا۔ شاید وہ کچھ عرصہ اور اسے بے وقوف بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔
"بھاڑ میں جاؤ تم سب۔" شائنہ نے اپنا مخصوص اور مرغوب فقرہ دہرایا۔
"اور تم۔" شائنہ فاریہ سے مخاطب ہوئی۔
"اب تم بھی اپنے دن گن گن کر رکھ لو' زیادہ نہیں بچے۔"
"اچھا!" فاریہ گل نے اس کی دھمکی سے محظوظ ہو کر زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ "جان سے مارو گی مجھے؟"
"جان سے نہیں ماروں گی' جیتے جی ماروں گی۔"
شائنہ نے ایک زہریلی نگاہ اس پر اور باقیوں پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔
"اس سب کا یہ مطلب ہے کہ تم سوسائیڈ کر لو' ان لوگوں کو تم بہادر بن کر دھمکی دے کر آئیں اور یہاں بزدل بن کر اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لینے لگیں۔"
شہریار نے بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔
"میں اوپر سے بہت بولڈ اور بہادر بنتی ہوں' مگر مجھے لگتا ہے میں اندر سے بہت بزدل ہوں۔" شائنہ نے اس کے سامنے وہ اعتراف کیا جو وہ شاید اپنے آپ سے بھی نہ کرتی۔
"جانتا ہوں۔" شہریار نے ایک گہری سانس لی۔
"تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو' سمجھتے ہو' شاید میں بھی خود کو اتنی اچھی طرح نہیں سمجھ سکی۔"
"او نہوں۔" شہریار نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہر شخص اپنے آپ کو اچھی طرح جانتا ہے' بس ہر انسان اپنی ہر بات کا اقرار کرتا ہے نہ اعتراف۔"
"میں تم سے اپنی ہر بات' ہر فیلنگ شیئر کرتی ہوں' مگر ایک بات بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک احساس ایسا ہے جو میں کوشش کروں بھی تو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ مگر میں کچھ بتانے کی کوشش ضرور کروں گی۔"
"کیسا احساس؟" شہریار کو اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے لگے' بلکہ ناقابل بیان سے۔
"اس وقت۔" شائنہ نے بولنا شروع کیا۔ "اس وقت جب میں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کرنے کی کوشش کی تھی۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے جب مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری گردن کو کسی نے اپنے زبردست شکنجے میں لیا ہوا ہے اور میری دھڑکن ڈوب رہی تھی۔ اس وقت مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ ناقابل بیان سا' دہشت کے عالم میں' میں سوچ رہی تھی کہ میں مرنے والی ہوں' میں خود سے سوال کر رہی تھی کہ کیا یہ سب ختم ہونے والا ہے۔ میرے لیے' یہ دنیا' اس کی رنگینیاں' دولت اور شہرت کے وہ زمانے جو میں نے اپنے لیے تخلیق کیے تھے' ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھوٹنے والے ہیں؟ میرا یہ خوب صورت چہرہ' یہ جسم' مٹی میں ملنے والا ہے؟ بس چند لمحوں میں اتنے سارے خیالات میرے ذہن میں یوں گزرے جیسے کوئی تیز رفتار ٹرین انتہائی تیزی کے ساتھ گزر جاتی ہے۔ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں زندگی سے کتنی محبت کرتی ہوں' کتنی طلبگار ہوں اس کی' مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ میں مرنا نہیں چاہتی' بالکل بھی خواہش مند نہیں تھی میں موت کی۔ اسی وقت میں نے دل سے اللہ سے دعا کی تھی میں نے اللہ سے کہا "اے اللہ مجھے معاف کر دے' مجھے بچا لے مجھے موت وہ قبول ہے جو تیری طرف سے آئے' خود اپنے ہاتھوں سے میں اپنی جان لینا نہیں چاہتی۔"
شہریار حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا پھر کہنے لگا۔
"اب مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے میں تمہیں واقعی

پوری طرح نہیں جانتا۔"
"شاید ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی ایسا خفیہ گوشہ ہوتا ہے 'جہاں دوسرے لوگ تو کیا' انسان بذات خود بھی نہیں پہنچتا سوائے کسی خاص موقعے یا وقت کے۔" شائنہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔
"تم آج مجھے حیران کر رہی ہو۔" شہریار اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔
"ویسے تم اس دن کیا سوچ کر آئے تھے میرے پاس؛ تم یہ بھی تو سوچ سکتے تھے کہ میں تو لاہور میں ہوں۔"
"اللہ کو تمہاری دعا جو قبول کرنی تھی' اسی لیے میرے دل میں خیال ڈال دیا یہاں آنے کا۔" شہریار مسکرایا۔
"دراصل ذیشان کو تھپڑ مارنے کی تمہاری ویڈیو نیٹ پر دیکھی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کئی بار تمہارا نمبر ٹرائی کیا مگر فون بند جا رہا تھا۔ مجھے بس یونہی خیال آیا کہ تمہیں گھر پر چیک کرلوں' ہو سکتا ہے تم واپس آگئی ہو۔"
"تمہیں تو خوشی ہوئی ہوگی 'ذیشان کے بارے میں تمہارا اندازہ بالکل درست نکلا۔" شائنہ کے لبوں پہ جو مسکراہٹ تھی وہ بڑی پھیکی سی' بے جان سی تھی۔
"میں دل سے چاہتا تھا کہ ذیشان کے بارے میں میرا اندازہ 'میری سوچ میری رائے سب کچھ غلط ثابت ہو' مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا' تمہیں دکھ پہنچانے والی کسی بات سے مجھے کبھی خوشی نہیں ہو سکتی۔"
"اور تم نے جھوٹ کیوں بولا میری سوسائیڈ کے بارے میں؟"
"تمہیں بچانے کے لیے' پولیس کیس جو بنتا وہ الگ اور لوگوں کو ایک ٹاپک اور مل جاتا۔ باتیں بنانے کے لیے۔" شہریار نے سادہ سا جواب دیا تھا۔
"لوگوں کو ٹاپک تو اب میں دوں گی بات کرنے کے لیے۔"
"خدا کے واسطے۔" شہریار نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے "اب کوئی نیا ایڈونچر کرنے نہ بیٹھ جانا۔"
"تم کیوں ڈر رہے ہو؟" شائنہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔
"اوہ شٹ!" شہریار نے اچانک ہی اپنے سر پہ ہاتھ مارا تھا۔
"کیا ہوا؟"
"یار!" شہریار خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔
"نور کو ڈنر پہ لے جانا تھا آج اور میں اتنا لیٹ ہو چکا ہوں کہ اس نے غصے کے مارے فون کر کے بھی یاددہانی نہیں کروائی۔"
اچھا میں جا رہا ہوں 'تم پلیز میڈیسن ٹائم پر لے لینا' اپنا خیال رکھنا اور پلیز پلیز کوئی نیا خناس من میں سمائے تو عمل کرنے سے پہلے مجھ سے ضرور شیئر کر لینا۔"
شہریار اپنا موبائل اور گاڑی کی چابیاں جیب میں ٹھونس رہا تھا۔ خدا حافظ کر کے وہ دروازے کی طرف لپکا تو شائنہ نے اسے پکارا۔
"ایک بات سنو۔"
"ہاں!" اس نے بمشکل خود کو بریک لگایا۔
"نور کو میری طرف سے تھینک یو کہہ دینا گیٹ ویل سون کارڈ اور پھول بھجوانے کے لیے۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا بائے۔"
"بائے۔" شائنہ نے زیرلب کہا۔

☆ ☆ ☆

شہریار نے فلیٹ سے نکلتے ہی نور کا نمبر ملایا تھا۔ کاریڈور سے لفٹ 'لفٹ سے بیسمنٹ جہاں پارکنگ تھی' وہاں تک پہنچنے میں دو چار منٹ تھے اس کے پاس کہ نور سے بات کرلیتا' گاڑی چلاتے ہوئے وہ موبائل پہ بات نہیں کرتا تھا۔
بیل جا رہی تھی 'کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد بالآخر اس کا فون ریسیو ہو ہی گیا۔
"ہیلو نور!" نور کی ہیلو کے جواب میں شہریار شروع ہو گیا۔ "آر یو ریڈی فار ڈنر' آئی ایم جسٹ کمنگ۔"
"فون کرنے سے پہلے ٹائم دیکھ لیتے' یہ ڈنر پہ جانے کا نہیں 'ڈنر سے واپس آنے کا ٹائم ہے۔" نور نے جلے

بھنے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"آئی ایم سوری، میں بزی تھا، ٹائم کا بالکل پتا ہی نہیں چلا۔" شہریار نے سہولت سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ وہ اس وقت لفٹ سے اتر کر اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

"آج کل تو تمہاری مصروفیت ایک ہی ہے، ساری دنیا کو معلوم ہے تم کہاں ہوتے ہو، مجھے بھی معلوم تھا، میں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" نور کا ایک ایک لفظ طنز میں بھیگا ہوا چابک تھا جو شہریار کو بہت شدت سے لگا تھا۔

کار کا لاکڈ دروازہ کھولنے کے لیے جیب میں چابی ٹٹولتا شہریار کا ہاتھ بالکل ساکت ہو گیا۔

"تمہیں جو شکوے شکایات کرنے ہیں، مجھ سے کرو، کسی اور کو بیچ میں کیوں لا رہی ہو۔" شہریار نے بہت کوشش سے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ کسی بھی سختی اور طنز سے پاک۔

"میں بیچ میں نہیں لائی اسے، وہ آگئی ہے ہمارے درمیان، وہ سائیکو، دوریاں پیدا کر رہی ہے ہمارے درمیان، چھین رہی ہے تمہیں، مجھ سے۔" نور کے ضبط صبر اور برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ وہ پھٹ پڑی۔ شہریار تو جیسے سن کھڑا تھا اس کی بات سن کر۔

"نور! یہ تم ہو؟" شہریار کے اعصاب صدمے سے شل تھے۔ "تم ایسی تو نہ تھیں!" وہ بمشکل بول رہا تھا۔

"تم بھی تو ایسے نہیں تھے، پہلے تمہیں میری چھوٹی چھوٹی باتیں اور معاملات بھی یاد رہتے تھے، میری ذرا سی تکلیف پہ تم تڑپ اٹھتے تھے، میری اتنی سی پریشانی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بنا لیتے تھے، اور اب؟" نور کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"اب تو تمہیں مجھ سے بات کرنا بھی یاد نہیں رہتا، مجھے فون کرنا بھول گئے ہو تم، باتیں کرنا بھول گئے ہو تم۔ مجھ سے محبت کرنا بھول گئے ہو تم۔" نور کی آواز بھرا گئی تھی۔ شہریار کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"ہم دونوں میڈیا پرسن ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ لوگوں کے لیے بہت آسان ہوتا ہے۔ رائی کا پہاڑ بنانا۔ پر سے کوا بنانا اور بات کا بتنگڑ بنانا اور اس سے بھی زیادہ آسان ہوتا ہے کہ رائی نہ ہو، پر نہ ہو، بات نہ ہو تب بھی پہاڑ بھی بن جاتا ہے کوا بھی اور بتنگڑ بھی۔ تم کس لیے پریشان ہو رہی ہو، شائنہ میری دوست ہے۔ تم میری محبت ہو، تم اور وہ ایک نہیں ہو۔ نہ ہی ہو سکتے ہو، پھر تم نے کیسے سوچ لیا یہ سب اور کیسے کہہ دیا، کیا ہمارے درمیان جو اعتبار کا رشتہ تھا وہ ختم ہو گیا؟"

شہریار بہت نرم اور دھیمے لہجے میں سمجھا رہا تھا اسے۔

"کبھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے شہری تم بہت بدل گئے ہو۔"

"میں تو وہی ہوں، تمہاری سوچ بدل گئی ہے بس۔"

"تم سچ مچ مجھ سے محبت کرتے ہو نا؟" نور نے ناک سڑ سڑ کر کے تصدیق چاہی۔

"اف یہ لڑکیاں؟" شہریار نے کراہ کر اپنا سر پکڑ لیا۔ اتنی دیر کے لیکچر کے بعد بھی پرنالہ وہیں گر رہا تھا۔

"میں ایسا کرتا ہوں کہ محبت کے اعتراف نامے کی اپنی ویڈیو بنا کر اپنے فیس بک پیج پر لگا دیتا ہوں ٹھیک ہے؟"

"مجھ سے پیار کرتے ہو تو مجھے یقین دلاؤ۔ ساری دنیا کو یقین دلا کر کیا کرنا ہے۔"

"آہ!" شہریار زچ ہو گیا۔ "پھر کیا کروں جو تمہیں میری محبت پہ اور میری سچائی پر یقین آجائے۔"

"شائنہ سے دوستی چھوڑ دو، اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، تم نے کوئی ٹھیکہ نہیں لیا ہوا اسے اور اس کی زندگی کو سدھارنے کا۔" نور کے لہجے میں اب نخوت آگئی۔

"پھر وہی۔" شہریار جھلا گیا۔ "تمہیں شائنہ سے کیا پرابلم ہے؟"

"تمہیں شائنہ کو چھوڑنے میں کیا پرابلم ہے؟" نور نے اسی کے لہجے میں کہا۔

"اچھا کل ہم ڈنر پہ ملتے ہیں پھر بات کرتے ہیں۔" شہریار کو اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ فون پر پوری رات بھی اسے سمجھاتا رہے گا تو نہیں سمجھا سکے گا۔ اس لیے

اس نے مصالحتی لہجہ اپنایا۔
"ٹھیک ہے مگر میں تمہیں کال کر کے ریمائنڈ نہیں کراؤں گی، تمہیں خود ہی یاد رکھنا ہے اور خود ہی لینے آنا ہے مجھے۔"
"ٹھیک ہے بابا! ہر شرط منظور ہے اور کچھ؟"
"کچھ نہیں، بس اپنا خیال رکھنا۔"
"یہ کام تمہارا ہے میرا نہیں۔" شہریار نے اسے جواب دیا۔
"میں پارکنگ میں کھڑا ہوا ہوں کب سے، اب نکلوں؟"
"اوکے خدا حافظ!"

اگلی رات کا وہ ڈنر، ڈنر کم شہریار کے لیے ایک اعصابی امتحان زیادہ تھا۔ وہ محبت کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے سے قاصر ہے۔
نور پیازی رنگ کا جدید تراش خراش کا لباس پہنے ہوئے تھی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں اپنے خوب صورت سلکی بال، آڑی مانگ نکال کر کھلے چھوڑے ہوئے تھے، وہ اچھی خاصی حسین تھی اور اسے اپنے حسن کو چار چاند لگانا بھی آتا تھا۔
"کافی خوب صورت لگ رہی ہو آج!" شہریار نے تعریف کا پانسہ پھینکا۔
"خوب صورتی وہ ہے جو کسی کی نظروں میں محبت بن کر سمائے، ورنہ تو ان گنت خوب صورت دنیا میں بھرے پڑے ہیں۔ مارلن منرو، بہت خوب صورت تھی، لیڈی ڈیانا بھی، مینا کماری اور پروین بابی بھی۔ حسن محض ایک سراب ہے، ایک دھوکا اور بس۔" نور بہت سنجیدہ تھی۔
"میری محبت کو بھی سراب اور دھوکا سمجھتی ہو؟"
شہریار بھی سنجیدہ ہو گیا۔
"پہلے نہیں سمجھتی تھی۔"
"اب سمجھتی ہو؟"
نور نے کچھ نہیں کہا۔ بس اپنی شکوہ کناں نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکالیں اور اپنی پلیٹ کو گھورنے لگی جس میں موجود کھانا جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔
"نور! میں آخری بار وضاحت کر رہا ہوں کہ میرے دل اور زندگی میں تمہاری جو اہمیت اور مقام ہے وہ شائنہ سے کہیں زیادہ اہم ہے۔"
"تم شادی کے ذکر کو بھی ٹالنے لگے ہو۔" نور کے شکوے ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔
"بتاؤ کب کرنی ہے شادی، جو دن کہو گی، اسی دن سہرا باندھ کر آجاؤں گا۔"
"گھوڑے کا ذکر نہیں کیا تم نے؟" نور کے چہرے پہ بالآخر مسکراہٹ آہی گئی۔
"گھوڑا، ہاتھی، اونٹ جو تمہیں اچھا لگے، اسی پر بیٹھ کر آجاؤں گا۔" شہریار نے اس کا مسکراتا چہرہ دیکھا۔
"کتنے عرصے بعد تم نے پہلے کی طرح بات کی ہے۔" نور نے اپنی پلیٹ سے کھانا شروع کیا۔
"شادی کے بعد روزانہ ایسے ہی بات کیا کروں گا۔" شہریار نے رومانس جھاڑنے کی کوشش کی۔
"جو عادت ابھی نہیں ہے، شادی کے بعد کیسے پڑے گی۔" نور نے جتاتی ہوئی ایک نظر اس پر ڈالی اور اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"اف!" شہریار اپنے سر پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔



رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی شائنہ حسب معمول جاگ رہی تھی اور لیپ ٹاپ لے کر بیٹھی تھی۔ اسے کچھ باتیں کرنی تھیں۔ سو سب سے پہلے اس نے جاذب کمال کو مخاطب کیا تھا۔
"اگر تم، صرف میرے سامنے ہی مجھے اپنی بیٹی تسلیم کر لیتے، ایک بار گلے لگا لیتے۔ صرف ایک بار مجھے بیٹی کہہ دیتے تو شاید آج میں دنیا کے سامنے تمہیں کٹہرے میں کھڑا نہیں کرتی۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ میں جو تمہارے بہکے ہوئے لمحات کا ثمر ہوں، جو اپنی شناخت اور تکمیل کے لیے دربدر ہوں، اپنا آپ منوانے کے لیے میں کہاں سے کہاں آگئی۔ میرا کیا

قصور ہے؟ تم جیسے مردوں کی عیاشیوں کی سزا عورتوں کو ہی کیوں بھگتنی پڑتی ہے اور میں اکیلے سزا کیوں کاٹوں' اب تمہیں بھی میرے ساتھ اس سزا میں شریک ہونا پڑے گا اور فاریہ گل' ابرار حسن اور ذیشان تم تینوں کے لیے ایک تحفہ ہے میرے پاس' تم تینوں نے جو باتیں کی تھیں مجھ سے' وہ ساری باتیں میں لوگوں سے شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ جب لوگ یہ ریکارڈنگ سنیں گے تو انہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ فلم کی شوٹنگ شروع ہونے کے بعد مجھے فلم سے کیوں آؤٹ کیا گیا اور ذیشان کے ساتھ میرا کیا معاملہ تھا تو سب لوگوں کو اپنے سوالات کے جوابات اس ریکارڈنگ سے مل جائیں گے۔"

شائنہ نے یہ سب کچھ اپنے فیس بک پیج پر ہی نہیں ڈالا بلکہ واٹس اپ سمیت نیٹ کی دنیا میں ہر جگہ اسے شیئر کیا۔

چند گھنٹوں میں سب کچھ وائرل ہو گیا' دنیا کے ہر کونے میں پہنچ گیا' ایک بھونچال تھا جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہر کوئی اپنے اپنے انداز سے اس پر تبصرہ کر رہا تھا۔

جاذب کمال نے محض ایک مختصر ٹوئٹ کی تھی کہ وہ ہتک عزت کے دعوے کے ساتھ شائنہ کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے اور وہ اس حق کو بہت جلد استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

فاریہ گل' ابرار حسن اور ذیشان نے اپنی اپنی جگہ ایک ہی موقف اپنایا کہ یہ آڈیو فیک (جعلی) ہے' فاریہ گل نے ٹوئٹ کیا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ شائنہ میری پرسنالٹی' فیم اور کیریئر سے اتنی جیلس کیوں ہے؟ شروع سے ہی' جب سے وہ اس فیلڈ میں آئی ہے' عجیب و غریب باتیں اور حرکتیں کرتی رہی ہے' اسے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کا خبط ہے جس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے' جاذب کمال اسکینڈل اور یہ آڈیو اسکینڈل اس کی تازہ مثالیں ہیں۔ بہرحال لوگ سچ اور جھوٹ کو پرکھنا جانتے ہیں اور میں بہت جلد اپنے وکیل سے رابطہ کر کے عدالت سے رجوع کروں گی۔"

ذیشان نے اپنی ٹوئیٹ میں شائنہ کو ایک سائیکو کیس قرار دیا اور کہا کہ اس کی انہی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے وہ اس سے بریک اپ پر مجبور ہوا تھا۔

ابرار حسن نے بھی آڈیو کو جعلی قرار دیتے ہوئے کہا چونکہ اس نے شائنہ کو اپنی فلم سے کٹ کیا ہے۔ اس لیے بدلہ لینے کے لیے وہ اس طرح کی گھٹیا حرکتیں کر رہی ہے۔ اس نے بھی اس معاملے کو عدالت میں لے جانے کی دھمکی یا عندیہ دیا۔

"کیا ملا یہ سب کر کے؟" شہریار تھکا تھکا سا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"کچھ ملے یا نہ ملے' آئی ڈونٹ کیئر۔" شائنہ نے چہرے پہ پتھروں کی سی سختی تھی۔ "مجھے سچ بتانا تھا دنیا کو' وہ میں نے بتا دیا۔"

"سچ؟ بہت آسان لگتا ہے نا یہ لفظ بولنے میں' مگر اسے اپنانا؟ پہاڑ خود پہ لادنے کے مترادف ہے' تم آخر جانتی کیا ہو سچ کے بارے میں' کیا سمجھتی ہو اس لفظ کو' اس کی حقیقت کو۔" شہریار غصے میں پھٹ پڑا۔

"تم نے سچ کو کلہاڑا بنا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دوسروں پہ برسانے کے ساتھ ساتھ خود پر بھی چلا لیا؟ تم اس ہتھیار سے دوسروں کو تو کیا نقصان پہنچاؤ گی مگر سب سے زیادہ تمہیں ہی نقصان پہنچے گا۔"

شہریار چند لمحے خاموش رہ کر خود پہ قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

"سچ درانتی کی طرح ہوتا ہے۔ بہت آرام سے' بہت احتیاط سے اسے استعمال کرنا پڑتا ہے اور جو اس درانتی کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ موسم کی سختی اس کا مقدر ہوتی ہے' اوپر آگ برساتا سورج' نیچے تپتی ہوئی زمین' سب کچھ سہنا پڑتا ہے' سچ بولنے والے کے لیے زہر کا پیالہ مقدر ہوتا ہے۔ کبھی صلیب پر مصلوب ہونا۔ تم نے سچ بول دیا' اب مشکلات کا سامنا کر لو گی؟ بولو؟" وہ شائنہ پر برس پڑا تھا۔ جو اسے حیرانی سے تک رہی تھی۔

"تم اتنا غصہ کیوں ہو رہے ہو شہریار! اپنا کیا دھرا

میں خود ہی بھگت لوں گی، تم سے تو کوئی ہیلپ نہیں مانگ رہی میں۔" آخر میں شائنہ کی آواز میں تلخی آ گئی تھی۔

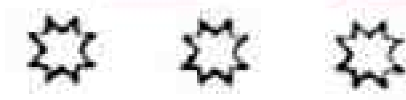
"فضول بک بک مت کرو۔" شہریار نے اسے گھور کر دیکھا۔

"جن لوگوں کو تم چیلنج کر چکی ہو، وہ کوئی ٹٹ پونجیے معمولی افراد نہیں ہیں۔ تمہاری زندگی حرام کر دیں گے یہ لوگ، تمہیں اور تمہارے کیریئر دونوں کو تباہ کر دیں گے، ہاتھی اور شیر کا شکار کرتے ہیں تو تیکنیک اور عقل بھی استعمال کرتے ہیں، ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ۔ یہ نہیں کہ بندوق ہاتھ میں اٹھا کر شیر کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں۔"

بول بول کر شہریار کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

"ان تینوں سے تو مجھے بدلہ لینا ہی ہے۔ رہی بات جاذب کمال کی، تو سیدھی بات یہ ہے کہ مجھے پل پل اپنے بے شناخت ہونے کا احساس سانپ بن کر ڈستا رہتا ہے، بہت زہر پھیل گیا ہے میرے اندر۔ میں چاہتی ہوں اس زہر کی اذیت ناک تکلیف جاذب کمال بھی برداشت کرے۔"

شائنہ کی آواز دھیمی مگر لہجہ مضبوط تھا۔ شہریار نے ایک نظر اسے دیکھا اور تاسف سے سر ہلانے لگا، وہ ہمیشہ ہی اسے سمجھانے میں ناکام رہتا تھا۔



میڈیا کو پیٹ بھرنے کے لیے روانہ ہی کافی مرچ مسالا مل رہا تھا۔ ہر روز شائنہ اور اس کے حامیوں کی طرف سے مختلف ٹوئٹس آتے اور پھر مخالفت میں جوابی ٹوئٹس، ایک جنگ تھی جو سوشل میڈیا پہ لڑی جا رہی تھی۔ شائنہ پرعزم تھی، بڑی بہادری سے مقابلہ کر رہی تھی۔

میڈیا حقیقت کی تہہ تک پہنچنے اور سچ کی تلاش میں مصروف و مگن تھا۔ جاذب کمال کے حوالے سے تو کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی تھی مگر صحافی حضرات لاہور کے پی سی ضرور پہنچ گئے تھے۔ یہ بات تو کنفرم ہو چکی تھی کہ شائنہ کی پیش کردہ آڈیو میں جو وقت اور دن ہے، اسی دن اور اسی وقت میں یہ تینوں ہوٹل میں موجود تھے۔ اس کے گواہ بہت تھے پھر کچھ لوگوں نے اس دن ہوٹل میں موجود فاریہ اور ذیشان کے فینز ہونے کی حیثیت سے ان کے ساتھ سیلفی بنوائی تھیں، وہ بھی منظر عام پر آ گئیں۔

فاریہ اور ذیشان نے مؤقف اختیار کیا کہ ہاں ہم وہاں تھے اس دن، اسی بات کا فائدہ اٹھا کر یہ جعلی آڈیو بیان ہمارے خلاف پھیلایا گیا ہے۔

شائنہ نے ان ہی دنوں میں ایک روز جاذب کمال سے کانٹیکٹ کیا۔

"تمہاری بیوی نے اب تک تم سے طلاق کا مطالبہ نہیں کیا اور تمہاری بیٹی تمہارے منہ پہ تھوک کے نہیں گئی؟" شائنہ مسکرا کر اس سے سوال کر رہی تھی۔

"یہی خواب دیکھتے دیکھتے ایک دن دنیا سے رخصت ہو جاؤ گی۔" جاذب کمال کا لہجہ بڑا زہریلا تھا۔

"میں تو تمہاری طرف سے مقدمے کا انتظار کر رہی تھی۔" شائنہ نے ایک اور تیر چلایا۔

"ویسے تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ میری بیوی اور بیٹی اس کرائسس میں میرے ساتھ ہیں۔ اور بہت جلد تم اکیلی ہونے والی ہو۔ یہ جو چند ایک لوگ تمہارے ساتھ ہیں، یہ بھی ساتھ چھوڑ جائیں گے پھر تم میری طرف سے قائم کردہ مقدمہ لڑنا اکیلے۔" جاذب کمال نے اس کا جواب سنے بغیر فون آف کر دیا تھا۔

"جاذب کمال! میں اکیلی ہی کافی ہوں تمہاری تباہی کے لیے، چاہے میرے ساتھ کوئی ہو یا نہ ہو۔" شائنہ کے چہرے کے عضلات تن کر سخت ہو رہے تھے۔

حالات و واقعات نے اچانک ہی پلٹا کھا کر ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ شائنہ اور اس کی ماں کے خلاف سوشل میڈیا پہ جیسے ایک باقاعدہ مہم چل پڑی تھی۔ دونوں کی کردار کشی کے لیے ایسے ایسے الفاظ اور القابات استعمال کیے جا رہے تھے کہ ایک روز شائنہ

پھٹ پڑی اس نے ٹوٹ کیا۔
"سب کچھ عورت ہی ہوتی ہے' بدکردار بھی' ـــــــ طوائف بھی' مرد کچھ نہیں ہوتا؟ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے مگر سارے الزامات اور القابات فقط ایک ہی ہاتھ کے لیے؟ ہمارے معاشرے کی منافقت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ برے مرد کے لیے ڈکشنری میں بھی کوئی لفظ نہیں' زیادہ سے زیادہ اسے تماش بین اور عیاش کہہ دیا جاتا ہے۔ اور ان القابات کا سہرا بھی عورت ہی کے سر ہے' وہ تماشا کرتی ہے تو مرد تماش بین بن جاتا ہے۔ وہ بری ہوتی ہے تو مرد عیاش بن جاتا ہے۔ وہ دن کب آئے گا جب بدکردار مرد کو بھی اتنی ہی حقارت اور ذلت سے نوازا جائے گا جتنا کہ عورت کو نوازا جاتا ہے۔"
"شائنہ! بس کرو۔" شہریار اس کے پاس آیا تھا۔
"میں آگ میں جل رہی ہوں شہریار! جب تک پانی نہیں پڑے گا' مجھے سکون نہیں ملے گا۔" شائنہ دہکتا ہوا آتش فشاں بنی ہوئی تھی۔
"میری ماں کے لیے کیا کیا کچھ کہہ رہا ہے' میں پاگل ہو جاؤں گی شہریار!" شائنہ اس کے سامنے تڑپ رہی تھی۔
"وہ اتنی بری نہیں تھیں' میں سولہ سال کی تھی جب انہیں برین ہیمبرج ہوا تھا۔ جاذب کمال کے بعد ان کی زندگی میں کوئی نہیں آیا' انہوں نے جو محبت اس شخص کی ساتھ کی' اس کی پاس داری میں پھر ساری عمر گزاری' لوگ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے کچھ بھی کہیں' میں اپنے لیے برداشت کرلوں گی مگر...؟"
شائنہ آج پہلی بار اس کے سامنے زاروقطار رو رہی تھی۔
"میں اپنی ماں کے مرنے پہ بھی اتنا نہیں روئی تھی جتنا اب مجھے رونا آرہا ہے۔"
شہریار کی آنکھوں میں اس کے لیے کرب اتر آیا۔
"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ پنڈورا بکس مت کھولو' تمہیں اتنی گالیاں نہیں ملیں گی جتنی..." شہریار بولتے بولتے رک گیا۔

"تم جذبات میں آکر ہر قدم اٹھاتی ہو' بغیر سوچے سمجھے' اب یہ بتاؤ کہ تمہارے رونے سے کیا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا؟"
"میں نے اپنی مری ہوئی ماں کو رسوا کر ڈالا' میں بہت بری ہوں' بہت بری' میں کیا کروں شہریار' بتاؤ نا میں کیا کروں؟" آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو وہ شہریار کی طرف اٹھائے بچوں کی طرح اس سے سوال کر رہی تھی۔
"پہلے یہ رونا بند کرو' تمہارا رونا مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔" شہریار نے ایک گہری سانس لے کر ایک نظر اسے دیکھا۔ پتا نہیں وہ کب سے کتنا رو چکی تھی کہ شدتِ گریہ سے اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔
"تم کچھ عرصے کے لیے کہیں چلی جاؤ' ریسٹ کرو' اپنی لائف کے بارے میں سوچو' آگے کی کچھ اچھی پلاننگ کرو' ان سب معاملات سے بالکل دور الگ ہو جاؤ۔" شہریار اسے مشورہ دے رہا تھا۔
"اور یہ لوگ' جاذب کمال' فاریہ' ذیشان' ابرار' ان کی تو جیت ہو گئی پھر کیا سچ کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے؟" شائنہ نے بھیگی ہوئی آواز میں اس سے سوال کیا۔
"شائنہ' ہر سچ ایسا نہیں ہوتا کہ منظر عام پہ لایا جائے' سچ کی بھی اقسام ہوتی ہیں' کچھ سچ سورج کی طرح' پھول کی طرح ہوتے ہیں جن کی روشنی کو اور خوشبو کو ضرور ہی پھیلنا چاہیے۔ حق اور سچ کو دنیا کے سامنے لانے والوں کا بڑا درجہ ہے مگر کچھ سچ ایسے ہوتے ہیں جیسے قالین کے نیچے چھپی غلاظت' لوگ جب تک انجان ہوں' اس پر بیٹھ جاتے ہیں' تم نے قالین اٹھا کر پھینک دیا۔ وہ قالین جو تمہاری ذات پر پڑا ہوا تھا' اب لوگ ناک پر رومال رکھ کر قریب سے گزریں گے۔ تم نے سچ بولنے کے زعم میں خود کو عریاں کر ڈالا' اپنے عیبوں کو' برائیوں کو خامیوں کو سچ کے پردے میں لپیٹ کر اچھالنا' سامان رسوائی ہے اور کچھ نہیں۔" شہریار بولتے بولتے خاموش ہو کر ایک

نظر شائنہ پر ڈالی جس کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

"تمہیں میری باتیں بہت کڑوی، بہت بری لگیں گی مگر یہ بھی سچ ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، اسی لیے میں نے تمہاری طرح بے دھڑک ہو کر سچ کا ہتھیار اٹھالیا۔"

"میں نے کیا کرڈالا اپنے ساتھ؟" شائنہ کی آواز کسی سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

شائنہ کے خلاف کمپین میں کچھ ٹی وی اینکرز اور ان کے پروگرامز بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہ لوگ جو معاشرے میں سچائی اور اچھائی کے علمبردار تھے اور شائنہ جیسی برائیوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے حامی تھے۔ نور بھی اسی مہم کا حصہ تھی۔ یکے بعد دیگرے اس کے دو پروگرامز شائنہ کے خلاف چلے تھے۔ ایسے پروگرامز جن میں باقاعدہ شائنہ کے ماضی اور حال کو ثبوتوں اور گواہوں کے ساتھ زیر بحث لایا گیا تھا۔

"تمہارے پروگرامز قابل دید تھے اور ریسرچ قابل تعریف۔" شہریار نور کے پاس پہنچا ہوا تھا۔

"اس طنز کا شکریہ، ویسے آپ سے یہی امید تھی۔" نور نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"مگر مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" شہریار پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے بیٹھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔

"میرا کام سچ کی کھوج کرنا ہے، جو کچھ دکھایا اور بتایا سب سچ تھا۔" نور نے تیز لہجے میں کہا۔

"تمہیں صرف اس لیے برا لگ رہا ہے کہ وہ سچ شائنہ کے خلاف تھا۔" نور نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"مجھے صرف اس لیے برا لگ رہا ہے کہ جو سچ بولا گیا۔ وہ ادھورا تھا۔ تم جیسے لوگ سچ کو ہتھیار بنا کر اس کا رخ دوسرے کی طرف کردیتے ہیں۔ پھر چاہے اس ہتھیار سے دوسرے کا حال جو بھی ہو۔" شہریار نے اس سے نظریں نہیں چرائی تھیں۔ وہ بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" نور کا لہجہ بدستور تیز تھا۔

"تم نے شائنہ کے بارے میں پورا سچ دنیا کو بتایا اور یہ نہیں بتایا کہ اس سچ کو بتانے کے لیے تمہارے اکاؤنٹ میں کتنی بڑی رقم ڈالی گئی ہے۔"

"تم میری جاسوسی کر رہے تھے؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتی نور کی نظریں جھک گئیں۔

"صحافت کا دوسرا نام شاید جاسوسی ہی ہے۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم بھی بکاؤ ہو سکتی ہو۔"

"اسٹاپ اٹ شہریار!" نور کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔

"سچ بولنے کا شوق ہے تو سچ سننے کی بھی ہمت رکھو۔ قلم کی اگر حرمت ہوتی ہے تو لفظوں کی بھی آبرو ہوتی ہے، ہمارے لکھے اور کہے ایک ایک لفظ کی جب ہم اس طرح قیمت وصول کرتے ہیں جس طرح تم نے کی ہے تو ہم پھر لفظ فروش بن جاتے ہیں۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہے شائنہ کہ ہم سب بازار میں بیٹھے کچھ نہ کچھ بیچ رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تمہارے ہاتھ صاف ہیں مگر تم بھی لفظ فروش نکلیں۔"

شہریار کی آنکھوں میں یکایک نفرت اور آواز میں اجنبیت اتر آئی تھی جسے محسوس کر کے نور سہم گئی۔

"میں نے جو کچھ کیا اپنے اور تمہارے برائٹ فیوچر کے لیے کیا۔" اس کی آواز یوں کانپ گئی جیسے لٹیرے اس کے سامنے کھڑے اس کی زندگی کی سب سے قیمتی متاع اس سے چھین رہے ہوں۔

"نہیں نور! یہ سب بے فائدہ اور فضول باتیں ہیں اب، تم نے اپنے لفظوں کا سودا کیا، اس کی بڑی بھاری قیمت تمہیں چکانی پڑے گی، میں اور میری محبت دونوں کو نامراد کردیا تم نے۔"

شہریار مڑ کر چلا تو اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ پتا نہیں نور نے پیچھے سے اسے پکارا تھا یا نہیں، اس کے اندر طوفان بپا تھا۔ اتنا شور تھا کہ باہر کی

آواز سنائی — نہیں دی' اپنے ہی دل کی کرچیوں پہ قدم قدم چلتا وہ وہاں سے پلٹ آیا۔

☼ ☼ ☼

کاہلی سے آنکھیں موندے وہ اپنے بستر میں پڑا تھا۔ موبائل کی گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔

"ہیلو!" شہریار نے موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو شہریار! تم کہاں ہو' نہ فون کیا نہ آئے۔" شائنہ کی آواز میں بہت بے چینی تھی' شہریار ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔

"مصروفیت بہت تھی' جلدی چکر لگاؤں گا۔"

"آج آجاؤ۔" آواز میں جیسے منّت تھی۔ التجا تھی۔

"آج؟ آں۔۔۔ اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔"

"میں ویٹ کروں گی' آنا ضرور۔"

"او کے!" فون بند کر کے وہ کتنی ہی دیر خاموش لیٹا سوچتا رہا۔

محبت سے دست بردار ہونا آسان نہیں ہوتا' محبت کو اس کے دل کو اور وجود کو کسی نے دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ ٹھیک ہے وقت کے ساتھ ساتھ اسے سنبھل جانا تھا۔ مگر ابھی تو بکھر گیا تھا۔ بھری بہار میں' اس کی محبت کے پھولوں پہ خزاں چھا گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ شائنہ کے فلیٹ میں موجود اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا۔

"کیوں یاد کیا جا رہا تھا مجھے۔" شہریار نے اپنے لہجے میں بشاشت لانے کی کوشش کی۔ پتا نہیں کامیاب ہوا یا ناکام۔

"تم اتنے دنوں سے نہ آئے نہ کانٹیکٹ کیا' مجھے بڑی فکر ہو رہی تھی۔" شائنہ کے اس کے سامنے جوس کا گلاس رکھا۔

"مصروفیت تھی اسی لیے نہیں آسکا۔" شہریار نے لاپروائی کا رنگ اپنے لہجے میں بھرا اور جوس کا گلاس اٹھا لیا۔

"شہری!" شائنہ کی آواز میں جھجک تھی۔ "تمہارے اور نور کے بیچ کیا ہوا ہے؟"

جوس کا گھونٹ شہریار کے حلق میں پھنسنے لگا اس نے ایک نظر ارد گرد ڈالی پھر شائنہ پر۔

"بریک اپ۔" اتنی لمبی کہانی کا بڑا مختصر جواب دیا تھا اس نے۔

"بریک اپ!" شائنہ نے حیرت سے اس کا جواب دہرایا۔

"ہوں۔"

"میں نے نور کے فیس بک پیج پر تم دونوں کی انگیجمنٹ کی تصویریں دیکھی تھیں' وہ اب وہاں نہیں ہیں۔ تمہاری کوئی بھی تصویر نہیں ہے نور کے پیج پر' اس لیے پوچھ لیا میں نے۔" شائنہ پتا نہیں کیوں اس سے شرمندہ ہو رہی تھی۔

شہریار خاموشی سے جوس کے گھونٹ لے رہا تھا۔ وہ اس موضوع پر نہ کچھ کہنا چاہتا تھا' نہ سننا چاہتا تھا۔

"بس مجھے ایک بات بتا دو' اس کی وجہ میں تو نہیں ہوں نا؟" شائنہ بہت مضطرب لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"نہیں' اس کی وجہ تم نہیں ہو۔"

"تم اداس ہو اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے ساری دنیا اداس ہو گئی ہو۔" شائنہ اسے فکر مند نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں اداس نہیں ہوں یار! شکل اور ایکسپریشن ہی ایسے ہیں۔" شہریار دھیرے سے مسکرایا تھا۔

"تم سناؤ اپنی۔"

"میں۔۔۔!" شائنہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"میں اپنے کیے کی اور اپنے کہے کی قیمتیں چکا رہی ہوں۔ میرے سارے ایگریمنٹ جو مختلف اداروں اور کمپنیوں اور لوگوں کے ساتھ تھے۔ سب ختم ہو گئے۔ میری مارکیٹ ویلیو بہت گر گئی ہے۔ میں بھی بہت اونچائی سے گری ہوں نا۔" اس نے بے دردی سے اپنا لب کچلا۔

"فکر رہتا ہے کیا' مجھے اب ایسا لگتا ہے کہ جس کیریئر

کے لیے جن چیزوں کے لیے میں کریزی تھی اب ان سب کی ویلیو میرے لیے صفر ہو گئی ہے۔ سب کچھ فضول لگتا ہے بے معنی' یہ دنیا' لوگ' معاملات اپنا آپ سب کچھ بے کار ہے بس۔"

"تم تو فلسفی ٹائپ کچھ بن گئی ہو۔" شہریار دھیرے سے مسکرایا۔

"تم کچھ عرصے کے لیے کہیں چلی جاؤ' کچھ نہ کرو صرف آرام کرو۔"

"جہاں بھی جاؤں گی' تم مجھ سے ملنے آؤ گے؟"

"یہ تو بڑا مشکل سوال ہے۔" شہریار نے پہلو بچانا چاہا۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں' کم از کم تم تو یہاں میرے قریب ہو۔"

"میں اب چلوں۔" شہریار اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

"کب آؤ گے دوبارہ۔"

"جب تم بلاؤ۔"

"اچھا!" شائنہ یوں مسکرائی کہ چہرے پہ خوشی کے رنگ بھی چھلک اٹھے۔

☆ ☆ ☆

"میدان جنگ میں اکیلی کھڑی سوچ رہی ہوں کہ کتنی بے حقیقت اور بے فائدہ چیزوں کے لیے ہم لڑائیاں شروع کرتے ہیں۔ مجھے اب جنگ چاہیے نہ صلح' کچھ بھی نہیں' بس ایک سکون میں لپٹی تنہائی۔"

شائنہ کی طرف سے بپا کیا ہوا ہنگامہ اب کچھ ماند پڑنے لگا تھا۔ لوگوں کی دلچسپی اور توجہ اور دوسرے معاملات نے حاصل کرلی تھی۔ پھر شائنہ کی طرف سے توپوں کے دہانے خاموش ہوئے تو آہستہ آہستہ ہنگامہ سرد پڑنے لگا۔

شائنہ اپنے لیے ایک نئی دنیا دریافت کرنے میں مگن تھی۔ یہ دنیا اس کی پہلی دنیا سے بہت الگ تھی۔

"میں نے اپنے ساتھ بہت برا کیا ہے شہری' میں اب کیا کروں' میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہیں۔۔۔ میں پتا نہیں کیا کیا سوچنے لگ گئی ہوں۔" شائنہ فون پہ شہریار سے کہہ رہی تھی۔

"کیا سوچنے لگی ہو؟"

"میں سوچتی ہوں کہ میری ماں دنیا سے چلی گئی مگر اپنا دل اور اپنی روح میرے اندر چھوڑ گئی' وہ دل جسے محبت کی طلب تھی' وہ روح جو کسی ہم دم و ہمراز کی تلاش میں تھی۔" شائنہ بولتے بولتے رکی۔

"ہم عورتیں ایسی کیوں ہوتی ہیں؟"

"کیسی؟"

"ہم ہمیشہ یہ کیوں چاہتی ہیں کہ ہم کسی کو چاہیں اور کوئی ہمیں؟ محبت کی طلب کیا ہماری فطرت میں شامل ہے؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا' میں کیا سوچ رہی ہوں اور کیوں سوچ رہی ہوں' کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ کاش میں ایک عام سی لڑکی ہوتی' میری چھوٹی چھوٹی خواہشیں ہوتیں مگر وہ پوری ہو جاتیں۔"

"تم سن رہے ہو نا میری بات۔" شائنہ کی مضطرب آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میں سن رہا ہوں سب۔"

"کل ملو گے؟"

"آجاؤں گا۔" شہریار کی باتیں بہت مختصر سی ہو گئی تھیں۔

اگلے روز شہریار وہاں پہنچا تو وہ اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

"تم اتنا چپ چپ کیوں رہنے لگے ہو؟" شائنہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"کبھی خاموش بھی رہنا چاہیے۔ اچھی چیز ہے۔"

"شہری! میں نے خود کو بالکل ہی ختم کرڈالا تباہ کرڈالا۔ ہے نا؟"

"تم ہمیشہ شدت پسند ہو کر سوچتی ہو' پہلے بھی اور اب بھی' انسان کے پاس سب کچھ ختم ہو جائے پھر بھی اس کے پاس مستقبل ہوتا ہے۔ جو باقی ہوتا ہے اس کے لیے۔" شہریار اسے اکثر یونہی سمجھاتا رہتا تھا۔

"میں نے اپنے فیوچر کے لیے بھی بہت سے خواب دیکھے تھے۔ بہت پلاننگز کی تھیں' میرے سارے خواب ختم ہو گئے ہیں۔ میں نے وہ سب

خواب ختم کر دیے ہیں۔"

"نئے خواب دیکھ لو' نئی پلاننگ کر لو۔" شہریار نے ایک نظر اس پر ڈالی جو اب پہلے سے بہت مختلف لگنے لگی تھی۔ اپنی آرائش و زیبائش پر کوئی خاص توجہ نہیں تھی اس کی' اکثر اس کا حلیہ سادہ سا ہی ہوتا تھا۔

"پچھتاووں میں گھرے رہنے سے انسان آگے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا' خود کو گلٹ سے باہر نکالو۔"

"میں کوشش کر رہی ہوں یہ سب کرنے کی اور میں نئے خواب بھی دیکھنے لگی ہوں مگر۔" وہ ایک لمحے کو رکی۔ "کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جو اکیلے نہیں دیکھے جاتے۔" اس نے جو نظر شہریار پر ڈالی تھی۔ اس میں بہت کچھ تھا' کچھ آس' التجا اور کچھ خوف۔

"ایسے خواب دیکھنے ہی نہیں چاہئیں' جنہیں پورا کرنے کے لیے کوئی ساتھ نہ ہو۔" شہریار نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا' شائنہ کا دل کسی تکلیف سے کرلایا تھا۔

"کیا تم اب بھی نور کو چاہتے ہو؟"

"محبت شروع تو شاید آسانی سے ہو جاتی ہے مگر اتنے آرام سے ختم نہیں ہوتی ہے' زہر کا گھونٹ بھرنا ہے یہ' جان نکل جاتی ہے۔" شہریار کے چہرے پہ کرب کا سایہ پھیل گیا۔

شائنہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ شہریار کی خاموشی' اداسی جیسے اسے کھائے جا رہی تھی۔ اسے کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے شہریار کی تکلیف اور کرب اس کے اندر سرائیت کر گیا ہے اور وہ اس تکلیف کو اس اذیت کو محسوس کر رہی ہے۔

"تم لوٹ کیوں نہیں جاتے اس کے پاس' معاملات حل بھی تو ہو سکتے ہیں' جھگڑے نمٹائے بھی تو جا سکتے ہیں۔" شائنہ نے آج پہلی بار اتنا کھل کر اس موضوع پر اس سے کچھ کہا تھا۔

"تمہارا کیا انٹرسٹ ہے اس میں؟ کیوں کہہ رہی ہو یہ سب؟" شہریار نے بے مروتی کی انتہا کر دی تھی' کبھی کبھی وہ ایسے ہی تلخ ہو جاتا تھا۔ شائنہ مسکرا کر ٹال جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ مسکرا کر رہ گئی۔

"میں صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں پہلے جیسا شہری' ہر وقت ہنسنے مسکرانے والا۔"

"جب وقت ایک جیسا نہیں رہتا تو انسان ایک جیسا کیسے رہ سکتا ہے۔ ہنستے مسکراتے بہت عرصہ گزارا' اب ذرا خاموش اور اداس رہ کر بھی دیکھنا چاہیے۔" شہریار یوں مسکرایا تھا جیسے اپنی خاموشی اور اداسی کو چڑا رہا ہو۔

"اپنی تکلیف کو خود پہ مسلط کیوں کر رہے ہو' کوئی تو راستہ ہو گا' ڈھونڈ نکالو۔" شائنہ اسے خلوص دل سے مشورہ دے رہی تھی۔

"جب مانگوں تب مشورہ دینا' یوں اپنے مشورے ضائع نہ کرو۔" شہریار پھر اکھڑا اکھڑا اور اجنبی بن گیا۔

"اچھا!" شائنہ نے ایک گہری سانس لی۔ "آئی ایم سوری' آئندہ کچھ نہیں کہوں گی۔" اس کے لب و لہجے میں ناراضی تھی نہ لفظوں میں' بس وہ سادہ سے لہجے میں بول رہی تھی۔

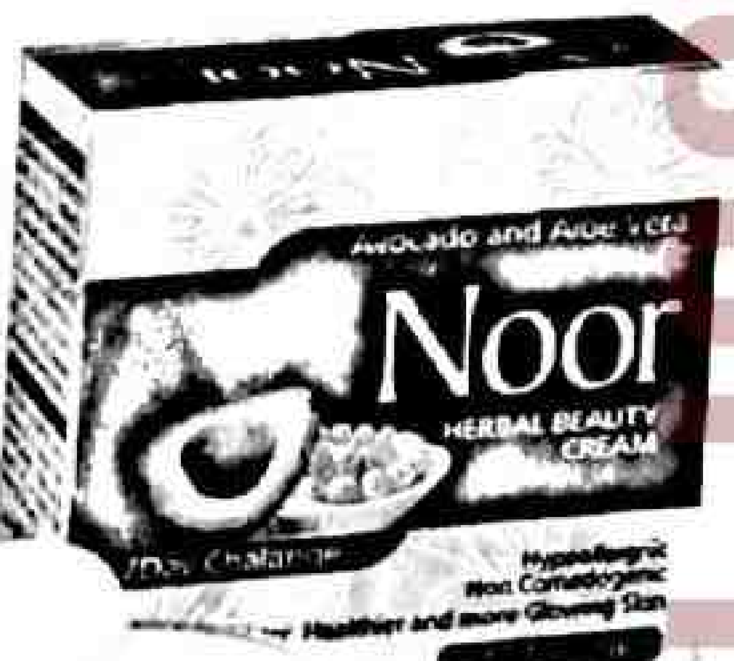
"تم سمجھتی نہیں ہو شائنہ۔" شہریار تھکے تھکے لہجے میں بولا تھا۔ "میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ ہے ہی نہیں' میں اپنے دل کو مار کر زندگی گزار سکتا ہوں مگر اپنے ضمیر کو مار کر زندگی نہیں گزار سکتا' میں مردے سے بھی بدتر ہو جاؤں گا۔" شہریار چند لمحوں کے لیے رکا۔

"اور جہاں تک محبت کی بات ہے تو نئی چوٹ ہے' کچھ عرصے تک تو تکلیف محسوس ہو گی پھر زخم بھی بھر جائے گا۔ ہم بھی سنبھل ہی جائیں گے۔"

"کبھی میرا شدت سے دل چاہتا ہے کہ وقت پیچھے کی طرف پلٹ جائے اس وقت کی طرف جب میں نے اس دلدل میں قدم نہیں رکھے تھے۔"

"اس دلدل نے تمہیں اتنا تباہ نہیں کیا جتنا تم نے خود اپنی تباہی کا سامان کیا ہے' رہی بات وقت کی تو وہ پیچھے کی طرف پلٹ نہیں سکتا مگر تم اسے آگے سے پکڑ سکتی ہو۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو' میں خود کو سمیٹنا چاہتی ہوں مگر


Avocado and Aloe Vera
Noor
HERBAL BEAUTY CREAM
7 Day Challenge


Noor
HERBAL
FACE WASH


Noor



سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔" شائنہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"اس معاملے میں تو میرا حال بھی تمہارے جیسا ہی ہے' میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔" شہریار کے لبوں پہ ایک تلخ مسکراہٹ تھی پھر وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔

"اب میں چلوں' گھر جاؤں گا پھر امی کو لے کر اسپتال جانا ہے آج ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے ان کا۔"

☆ ☆ ☆

امی اسپتال کے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے کچھ ضروری ٹیسٹ ہوئے تھے۔ جگر کا مسئلہ تھا' زیادہ سنگین معاملہ نہیں تھا' معمولی سا عارضہ تھا' احتیاطاً ڈاکٹر نے ایک دو دن کے لیے ایڈمٹ کر لیا تھا۔

"کیا بات ہے' کیا ہوا ہے مجھے؟" وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوا آپ کو' بس ایک معمولی سی پرابلم ہے۔ یہاں ایک دو دن رہیں گی تو پرہیز بھی ہو جائے گا اور میڈیسن بھی وقت پر لے لیں گی گھر پہ تو یہ دونوں کام ہی ناممکنات میں سے ہیں۔" شہریار نے انہیں شکایتی نظروں سے دیکھا تھا۔ "آپ بالکل بھی کیئر نہیں کرتیں اپنی۔"

"سارا دن اکیلی گھر میں پڑی رہتی ہوں۔ کیا خاک کیئر کروں اپنی؟ تم تو آدھی رات میں گھر میں گھستے ہو' میں اکیلی در و دیوار کو گھورتی رہتی ہوں' میرا دل نہیں چاہتا دوائیاں کھانے کو اور پرہیز کرنے کو۔" امی اس کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

"سوچا تھا بہو گھر آجائے گی ایک سے دو ہو جائیں گے' دل بہل جائے گا' بات کرنے کو تو کوئی ملے گا تم نے وہ آسرا بھی ختم کر دیا۔ نہ کچھ بتاتے ہو نہ بولتے ہو۔ مجھے بھی منع کر رکھا ہے' کہیں دوسری جگہ بھی کوئی لڑکی نہ دیکھوں' میری سمجھ سے باہر ہے' تم آخر چاہتے کیا ہو؟ یہ جو میں بیمار ہوئی ہوں نا' تمہاری وجہ سے ہوئی ہوں۔" انہوں نے ناراض نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا۔

شہریار مسکرا کر آگے بڑھا اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں پھر اس ٹاپک پر بھی بات کر لیں گے۔"

"کر دی نا' مجھے ٹالنے والی بات۔" انہوں نے چمک کر کہا پھر اچانک انہیں کچھ خیال آیا۔

"شہری! مجھے سچ سچ بتاؤ' کہیں تم اس لڑکی کے چکر میں تو نہیں ہو؟ تم سے جب بھی میں نے پوچھا' تم نے یہی کہا کہ وہ صرف ایک دوست ہے اور بس۔" امی پریشان ہو کر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"ہر کوئی یہی کہہ رہا ہے کہ تم نے شائنہ کی وجہ سے اپنی منگنی ختم کی ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی! میں جو بات آپ سے پہلے کہتا تھا' اب بھی وہی کہتا ہوں۔ وہ صرف اور صرف ایک دوست ہے اور بس۔" شہریار نے ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہوئے انہیں یقین دلایا۔

"پھر شادی کے لیے ہامی کیوں نہیں بھرتا' کہیں اور مرضی ہے تو بتا دے مجھے۔" امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی کے ابھی اسے سہرا پہنا کر بارات لے جائیں اور دلہن رخصت کرا کر لے آئیں۔

"مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں امی' پھر آپ جیسا کہیں گی ویسا ہی کروں گا۔"

"جیتا رہے میرا بچہ' مجھے معلوم تھا کہ تو میرا مان ضرور رکھے گا۔" امی اس کی ذرا سی فرماں برداری پر ہی نہال ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

آج بہت عرصے بعد وہ شائنہ کے ساتھ لنچ پر آیا تھا۔ وہ بھی اس کی فرمائش پر ساحل سمندر پہ واقع ریسٹورنٹ میں سی فوڈ کھاتے ہوئے وہ سمندر بھی دیکھ رہے تھے' جہاں ساحل پہ بہت تھوڑے سے لوگ تھے۔ بھری دوپہر میں سمندر کی لہریں بھی اکیلے ہی

ساحل کے ساتھ سر پٹخ رہی تھیں۔
کھانا کھا کر شائنہ کی خواہش پر وہ اس کے ساتھ ساحل پر آگیا۔
نرم نرم ریت پیروں کے نیچے سے یوں سرک رہی تھی جیسے ان کے ہاتھوں کی مٹھی سے ان کے خواب پھسلے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ خالی ہوگئے تھے۔
شائنہ ایک بڑے سے پتھر پر ٹک گئی اور خاموشی سے سمندر دیکھتی رہی لہروں کا شور ان کی دیوانگی۔
"شہری ایک بات کہوں تم سے؟" بہت دیر تک خاموش رہنے اور سمندر کو دیکھتے رہنے کے بعد شائنہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر اسے مخاطب کیا تھا۔
"مت کہو۔" کچھ دیر بعد شہریار نے جواب دیا تھا۔
"تمہیں معلوم ہے میں کیا کہنے والی ہوں؟"
"ہاں!" شہریار نے ایک گہری سانس لی۔ ہر سرکش اور تندو تیز لہران کے قدموں تک آکر سر پٹختی اور ختم ہو جاتی۔
"ایسی بات نہ کہو جس کے جواب میں میرے پاس شرمندگی اور افسوس کے سوا کچھ نہ ہو۔"
شہریار کی نظریں بھی سامنے سمندر پر ہی تھیں لامتناہی پھیلا ہوا سمندر ان گنت رازوں کا امین آج ایک راز اور اس کے سینے میں محفوظ ہونے جا رہا تھا۔
"شرمندہ تو مانگنے والا ہوتا ہے۔ تمہیں کیوں شرمندگی ہوگی؟" شائنہ نے سوال کیا۔
"جب انسان چاہتے ہوئے بھی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی کی خالی جھولی نہ بھر سکے تو اس کے لیے یہ ندامت اور افسوس کا مقام ہی ہوتا ہے۔"
"زندگی کے دریا میں کیا میرے لیے خوشی کی چند بوندیں بھی نہیں۔" شائنہ کے لہجے میں عجیب سی حسرت اور پیاس تھی۔
"تم اپنا سفر جاری رکھو ہو سکتا ہے آگے کہیں پورا دریا ہی تمہارے لیے ہو۔" شہریار کی تسلی سن کر وہ ہنس پڑی دیوانوں جیسی ہنسی۔
پھر اس نے ایسی نگاہوں سے شہریار کو دیکھا جیسے آخری بار اسے اپنی آنکھوں میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔
"تم ایویں تسلیاں دے دے کر میرا دل بڑھاتے رہتے ہو۔" وہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کر رہی تھی جو نہ جانے ہنسی کی شدت سے آئے تھے یا...
"اس سے زیادہ کچھ تمہارے لیے کر نہیں سکتا اس لیے یہ ہی سہی۔" شہریار کی آواز میں یاسیت ہلکورے لے رہی تھی۔
"چلیں؟" وہ اچانک ہی کھڑی ہوگئی۔ اپنی زندگی کے سارے فیصلے اس نے یونہی تو کیے تھے اچانک فوراً۔
"چلو۔" شہریار بھی کھڑا ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

کچن سے ہاٹ پاٹ لا کر اس نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھا چٹنی اچار سلاد پہلے ہی لا کر رکھ چکا تھا پانی بھی موجود تھا۔
"امی آجائیں۔" ہاتھ دھو کر وہ اپنی کرسی سنبھالنے لگا آج بڑے عرصے بعد اس نے امی سے فرمائش کر کے بیسن کے پراٹھے بنوائے تھے وہ تو منتظر رہتی تھیں کہ شہریار کوئی فرمائش کرے اور وہ دل و جان سے اسے پورا کریں۔ آج بڑی لگن اور محنت سے انہوں نے بیٹے کی فرمائش پوری کی تھی۔
"امی حضور! جلدی آجائیں۔" شہریار آواز امی کو لگا رہا تھا اور نظریں اپنے موبائل اسکرین پر تھیں وہ میسیجز چیک کر رہا تھا۔
"ارے بھئی اس کو کم از کم کھانے کے وقت تو الگ رکھ دیا کرو۔ موبائل نہ ہوا انسان کا ہمزاد ہوگیا سوتے جاگتے کھاتے پیتے ہنستے روتے ہر وقت ساتھ ساتھ۔"
امی اس کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر غصہ کرنے لگیں۔
"کھانا تو ٹھیک سے کھا لیا کرو۔"
"بس امی ایک منٹ" اس نے جلدی جلدی آخری میسیج پڑھ کر کچھ فالتو چیزیں ڈیلیٹ کیں اور موبائل

میز پہ ایک طرف رکھ کر ہاٹ پاٹ سے پراٹھا نکالنے لگا۔ پلیٹ میں چٹنی ڈالی 'اچار' سلاد پورے اہتمام سے کھانا کھانے کے لیے وہ تیار تھا 'پہلا لقمہ توڑ کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ موبائل مخصوص ٹون میں بج اٹھا پھر میسج آیا تھا۔

''خدا کی مار اس کھلونے پر اور لوگوں پر 'چین نہیں ہے 'کھانا بھی سکون سے نہیں کھانے دیتے۔'' امی بڑبڑانے لگیں۔

''خبردار شہری! اسے مجھے دو میں کمرے میں رکھ کر آتی ہوں 'کھاتے وقت تم بالکل بھی اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔''

''اچھا نا 'نہیں لگا رہا ہاتھ 'آپ بیٹھی تو ہیں سامنے پولیس وومن بن کر دیکھیے 'میں صرف اور صرف کھانا کھا رہا ہوں۔'' شہریار نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دہانی کرائی اور رغبت سے کھانا کھانے لگا۔

میسجز کا سلسلہ رکا نہیں تھا 'ایک کے بعد ایک' ذرا سی دیر میں کئی میسجز آچکے تھے 'شہریار نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے۔

''امی پلیز! اب تو دیکھنے دیں کیا پتا کوئی ضروری بات ہو۔'' شہریار نے منت کرنے کے انداز میں ان کی طرف موبائل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''پہلے کھانا کھاؤ 'کہیں بھاگا نہیں جا رہا موبائل 'بعد میں دیکھ لینا۔''

''اچھا!'' ناکام ہو کر وہ دوبارہ اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اگلی بار میسج کی نہیں بلکہ رنگ ٹون بج رہی تھی اس کے موبائل میں۔

''یہ لو۔'' امی نے جھلا کر فون اس کے آگے سرکایا۔

''احمر کالنگ'' کے الفاظ اسکرین پر چمک رہے تھے 'وہ اس کا کولیگ اور دوست تھا۔

شہریار موبائل اٹھا کر کان سے لگانے کے بجائے 'اسپیکر کھول کر بات کرنے لگا۔

''ہیلو!''

''ہیلو شہریار!'' احمر ہیلو کر کے چند ثانیوں کے لیے خاموش ہو گیا پھر بولا ''آئی ایم سوری یار! آئی ہیو آ سیڈ نیوز۔''

''خیریت؟'' شہریار چونکا 'ہاتھ میں پکڑا نوالہ اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

''شائنہ کو برین ہیمبرج ہوا تھا اس کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ کچھ دیر پہلے۔''



یاد نہیں 'لاتعداد تحاریر لکھ چکا ہوں مگر یہ تحریر لکھتے ہوئے آج دل کی حالت کچھ سوا ہے 'شائنہ کے لیے یہ تحریر ایک صحافی کی نہیں بلکہ دوست کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں 'ایک ایسا دوست جو چاہتے ہوئے بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر پایا۔

اس کے لیے مجھے جون ایلیا کا یہ شعر بہت شدت سے یاد آتا ہے۔

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

پتا نہیں 'اپنی تباہی کا کتنا ملال تھا اسے۔ تھا بھی یا نہیں مگر میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم میں سے کتنوں کو یہ ملال ہو گا یا ہونا چاہیے۔ وہ عجیب تھی اس نے اپنی تباہی کا سامان کیا۔ ہم وہ عجیب ہیں جو دوسرے کی تباہی کا سامان کرتے ہیں۔ ہم وہ عجیب ہیں جو گالی کا جواب گولی سے کم میں نہیں دیتے۔ کوئی ہمارے خلاف زبان سے وار کرے تو ہم اس کے خلاف سازشوں کے پورے پورے محل کھڑے کر لیتے ہیں۔ ہم اتنے پست ہیں کہ برے کام کے نتیجے کو تو بہت گھناؤنا سمجھتے ہیں مگر اس برائی کا ارتکاب کرنے والے کو برا نہیں سمجھتے۔ اگر وہ دولت کے پہاڑ پہ بیٹھا ہو تو ہمارے بھی سر آنکھوں پہ بیٹھ جاتا ہے۔ ہم اتنے دوغلے 'اتنے منافق کیوں ہیں؟ کب تک رہیں گے؟

ہم شائنہ کو سراہتے رہے 'اس کی بے باکی اور حق گوئی کی تعریفیں کرتے رہے اور جیسے ہی اس نے اپنا سب سے بڑا سچ ہم سب کے ساتھ شیئر کیا۔ وہ اچانک ہمارے نزدیک معتوب ہو گئی۔ ہم اپنی مرضی کا سچ سننے

ساحل کے ساتھ سر پٹخ رہی تھیں۔

کھانا کھا کر شائنہ کی خواہش پر وہ اس کے ساتھ ساحل پر آگیا۔

نرم نرم ریت پیروں کے نیچے سے یوں سرک رہی تھی جیسے ان کے ہاتھوں کی مٹھی سے ان کے خواب پھسلے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ خالی ہوگئے تھے۔

شائنہ ایک بڑے سے پتھر پر ٹک گئی اور خاموشی سے سمندر دیکھتی رہی لہروں کا شور ان کی دیوانگی۔

"شہری' ایک بات کہوں تم سے؟" بہت دیر تک خاموش رہنے اور سمندر کو دیکھتے رہنے کے بعد شائنہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر اسے مخاطب کیا تھا۔

"مت کہو۔" کچھ دیر بعد شہریار نے جواب دیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے' میں کیا کہنے والی ہوں؟"

"ہاں!" شہریار نے ایک گہری سانس لی۔ ہر سرکش اور تندو تیز لہر ان کے قدموں تک آکر سر پٹختی اور ختم ہو جاتی۔

"ایسی بات نہ کہو' جس کے جواب میں میرے پاس شرمندگی اور افسوس کے سوا کچھ نہ ہو۔"

شہریار کی نظریں بھی سامنے سمندر پر ہی تھیں' لامتناہی پھیلا ہوا سمندر' ان گنت رازوں کا امین' آج ایک راز اور اس کے سینے میں محفوظ ہونے جا رہا تھا۔

"شرمندہ تو مانگنے والا ہوتا ہے۔ تمہیں کیوں شرمندگی ہوگی؟" شائنہ نے سوال کیا۔

"جب انسان چاہتے ہوئے بھی' سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی کی خالی جھولی نہ بھر سکے تو اس کے لیے یہ ندامت اور افسوس کا مقام ہی ہوتا ہے۔"

"زندگی کے دریا میں کیا میرے لیے خوشی کی چند بوندیں بھی نہیں۔" شائنہ کے لہجے میں عجیب سی حسرت اور پیاس تھی۔

"تم اپنا سفر جاری رکھو' ہو سکتا ہے آگے کہیں پورا دریا ہی تمہارے لیے ہو۔" شہریار کی تسلی سن کر وہ ہنس پڑی' دیوانوں جیسی ہنسی۔

پھر اس نے ایسی نگاہوں سے شہریار کو دیکھا جیسے آخری بار اسے اپنی آنکھوں میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔

"تم ایویں تسلیاں دے دے کر میرا دل بڑھاتے رہتے ہو۔" وہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کر رہی تھی جو نہ جانے ہنسی کی شدت سے آئے تھے یا...

"اس سے زیادہ کچھ تمہارے لیے کر نہیں سکتا اس لیے یہ ہی سہی۔" شہریار کی آواز میں یاسیت ہلکورے لے رہی تھی۔

"چلیں؟" وہ اچانک ہی کھڑی ہو گئی۔ اپنی زندگی کے سارے فیصلے اس نے یونہی تو کیے تھے اچانک فوراً۔

"چلو۔" شہریار بھی کھڑا ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

کچن سے ہاٹ پاٹ لا کر اس نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھا چٹنی' اچار' سلاد پہلے ہی لا کر رکھ چکا تھا۔ پانی بھی موجود تھا۔

"امی آجائیں۔" ہاتھ دھو کر وہ اپنی کرسی سنبھالنے لگا' آج بڑے عرصے بعد اس نے امی سے فرمائش کر کے بیسن کے پراٹھے بنوائے تھے' وہ تو منتظر رہتی تھیں کہ شہریار کوئی فرمائش کرے اور وہ دل و جان سے اسے پورا کریں۔ آج بڑی لگن اور محنت سے انہوں نے بیٹے کی فرمائش پوری کی تھی۔

"امی حضور! جلدی آجائیں۔" شہریار آواز امی کو لگا رہا تھا اور نظریں اپنے موبائل اسکرین پر تھیں وہ میسیجز چیک کر رہا تھا۔

"ارے بھئی اس کو کم از کم کھانے کے وقت تو الگ رکھ دیا کرو۔ موبائل نہ ہوا انسان کا ہم زاد ہو گیا' سوتے جاگتے' کھاتے پیتے' ہنستے روتے ہر وقت ساتھ ساتھ۔"

امی اس کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر غصہ کرنے لگیں۔

"کھانا تو ٹھیک سے کھا لیا کرو۔"

"بس امی ایک منٹ" اس نے جلدی جلدی آخری میسیج پڑھ کر کچھ فالتو چیزیں ڈیلیٹ کیں اور موبائل

میز پہ ایک طرف رکھ کر ہاٹ پاٹ سے پراٹھا نکالنے لگا۔ پلیٹ میں چٹنی ڈالی' اچار' سلاد پورے اہتمام سے کھانا کھانے کے لیے وہ تیار تھا' پہلا لقمہ توڑ کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ موبائل مخصوص ٹون میں بج اٹھا پھر میسج آیا تھا۔

"خدا کی مار اس کھلونے پر اور لوگوں پر' چین نہیں ہے' کھانا بھی سکون سے نہیں کھانے دیتے۔" امی بڑبڑانے لگیں۔

"خبردار شہری! اسے مجھے دو میں کمرے میں رکھ کر آتی ہوں' کھاتے وقت تم بالکل بھی اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔"

"اچھا نا' نہیں لگا رہا ہاتھ' آپ بیٹھی تو ہیں سامنے پولیس وومن بن کر دیکھیے' میں صرف اور صرف کھانا کھا رہا ہوں۔" شہریار نے مسکراتے ہوئے انہیں یقین دہانی کرائی اور رغبت سے کھانا کھانے لگا۔

میسجز کا سلسلہ رکا نہیں تھا' ایک کے بعد ایک' ذرا سی دیر میں کئی میسجز آچکے تھے' شہریار نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے۔

"امی پلیز! اب تو دیکھنے دیں کیا پتا کوئی ضروری بات ہو۔" شہریار نے منت کرنے کے انداز میں ان کی طرف موبائل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"پہلے کھانا کھاؤ' کہیں بھاگا نہیں جا رہا موبائل' بعد میں دیکھ لینا۔"

"اچھا!" ناکام ہو کر وہ دوبارہ اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اگلی بار میسج کی نہیں بلکہ رنگ ٹون بج رہی تھی اس کے موبائل میں۔

"یہ لو۔" امی نے جھلا کر فون اس کے آگے سرکایا۔

"احمر کالنگ" کے الفاظ اسکرین پر چمک رہے تھے' وہ اس کا کولیگ اور دوست تھا۔

شہریار موبائل اٹھا کر کان سے لگانے کے بجائے' اسپیکر کھول کر بات کرنے لگا۔

"ہیلو!"

"ہیلو شہریار!" احمر ہیلو کر کے چند ثانیوں کے لیے خاموش ہو گیا پھر بولا "آئی ایم سوری یار! آئی ہیو آ سیڈ نیوز۔"

"خیریت؟" شہریار چونکا' ہاتھ میں پکڑا نوالہ اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"شائنہ کو برین ہیمبرج ہوا تھا اس کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ کچھ دیر پہلے۔"

☆ ☆ ☆

یاد نہیں' لاتعداد تحاریر لکھ چکا ہوں مگر یہ تحریر لکھتے ہوئے آج دل کی حالت کچھ سوا ہے' شائنہ کے لیے یہ تحریر ایک صحافی کی نہیں بلکہ دوست کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں' ایک ایسا دوست جو چاہتے ہوئے بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر پایا۔

اس کے لیے مجھے جون ایلیا کا یہ شعر بہت شدت سے یاد آتا ہے۔

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

پتا نہیں' اپنی تباہی کا کتنا ملال تھا اسے۔ تھا بھی یا نہیں مگر میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم میں سے کتنوں کو یہ ملال ہو گا یا ہونا چاہیے۔ وہ عجیب تھی اس نے اپنی تباہی کا سامان کیا۔ ہم وہ عجیب ہیں جو دوسرے کی تباہی کا سامان کرتے ہیں۔ ہم وہ عجیب ہیں جو گالی کا جواب گولی سے کم میں نہیں دیتے۔ کوئی ہمارے خلاف زبان سے وار کرے تو ہم اس کے خلاف سازشوں کے پورے پورے محل کھڑے کر لیتے ہیں۔ ہم اتنے پست ہیں کہ برے کام کے نتیجے کو تو بہت گھناؤنا سمجھتے ہیں مگر اس برائی کا ارتکاب کرنے والے کو برا نہیں سمجھتے۔ اگر وہ دولت کے پہاڑ پہ بیٹھا ہو تو ہمارے بھی سر آنکھوں پہ بیٹھ جاتا ہے۔ ہم اتنے دوغلے' اتنے منافق کیوں ہیں؟ کب تک رہیں گے؟

ہم شائنہ کو سراہتے رہے اس کی بے باکی اور حق گوئی کی تعریفیں کرتے رہے اور جیسے ہی اس نے اپنا سب سے بڑا سچ ہم سب کے ساتھ شیئر کیا۔ وہ اچانک ہمارے نزدیک معتوب ہو گئی۔ ہم اپنی مرضی کا سچ سننے

Watch Us On

YouTube

چہرے کے فالتو بالوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

چہرے کی جھُریوں کا

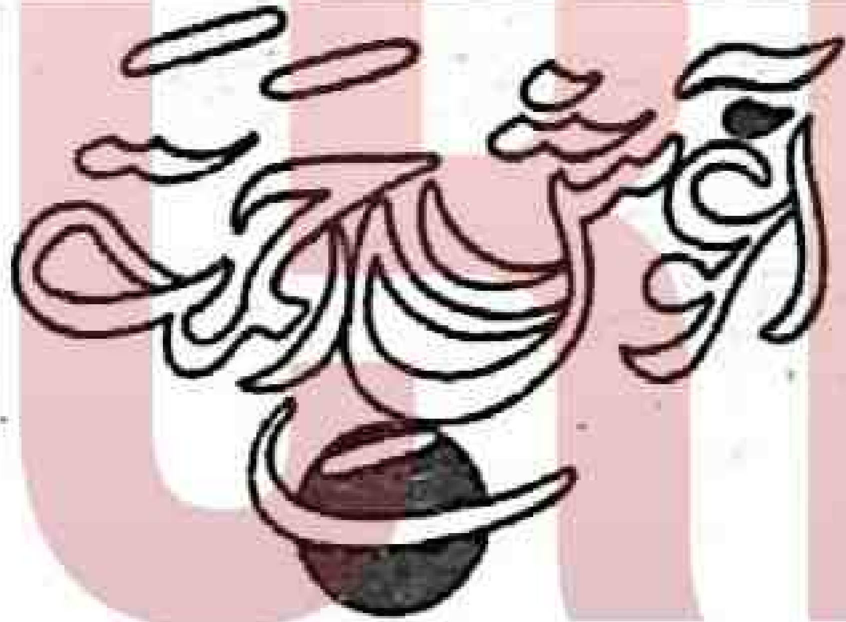
بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

افراح سکندر خان



گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے جیسے ہی ہم عمارت میں داخل ہوئے' میری نظر میدان میں کھیلتے بچوں پر پڑی۔ میرا دل جذبات سے بھر گیا.... جذبات .... محرومی کے' خوشی کے اور کچھ پالینے کے.... آج ان میں سے ہی کوئی بچہ میرا ہونے جارہا تھا۔

شادی کے دس سال تک جس لمحے کا میں نے بہت بے صبری سے انتظار کیا تھا' وہ لمحہ میرا ہونے جارہا تھا۔

ہم جس روش پہ چل رہے تھے اس کے دونوں طرف گھاس تھی۔ روش کے اختتام پر دائیں جانب آفس تھا اور بائیں جانب ہاسٹل نما عمارت تھی۔ دونوں کے درمیان میدان تھا جس میں بچے کھیل رہے تھے۔ بچوں کے دور ہونے کے باعث میں انہیں دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ مگر میرا دھیان بچوں ہی کی طرف تھا کہ منصور نے مجھے دائیں جانب مڑنے کا اشارہ کیا۔

"آپ لوگ چائے کے ساتھ کیا لینا پسند کریں گے۔" مسز چودھری نے پوچھا۔

"کچھ نہیں...." اس سے پہلے کہ منصور کوئی جواب دیتے میں جھٹ سے بولی۔ مسز چودھری زیر لب مسکرائیں۔

"ایک تو یہ مسز منصور! کہ آپ لوگ ذاکر صاحب کے حوالے سے آئے ہیں' دوسرا یہ کہ کچھ امور ہیں جن کی بابت بات کرنا چاہوں گی میں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ یہ کوئی سرکاری' نیم سرکاری ادارہ تو ہے نہیں۔ ٹرسٹ کا ادارہ ہے۔ جو ذاکر صاحب اور ان کے دو بھائی چلا رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ساتھ کچھ کاغذات میز پر رکھے۔

"عموماً" جو لوگ ہمارے ہاں سے بچے ایڈاپٹ کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ماہانہ رقم بھجوا دیتے ہیں اور بچوں سے یہاں آکر مل جاتے ہیں۔ ہم بچے گھر لے جانے کی اجازت نہیں دیتے' حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔"

"جی مسز چودھری میں جانتا ہوں.... ذاکر انکل میرے چچا ہیں۔ بچپن سے جانتے ہیں مجھے... اسی لیے اجازت دی ہے انہوں نے کہ ہم بچہ گھر لے جاسکتے ہیں۔"

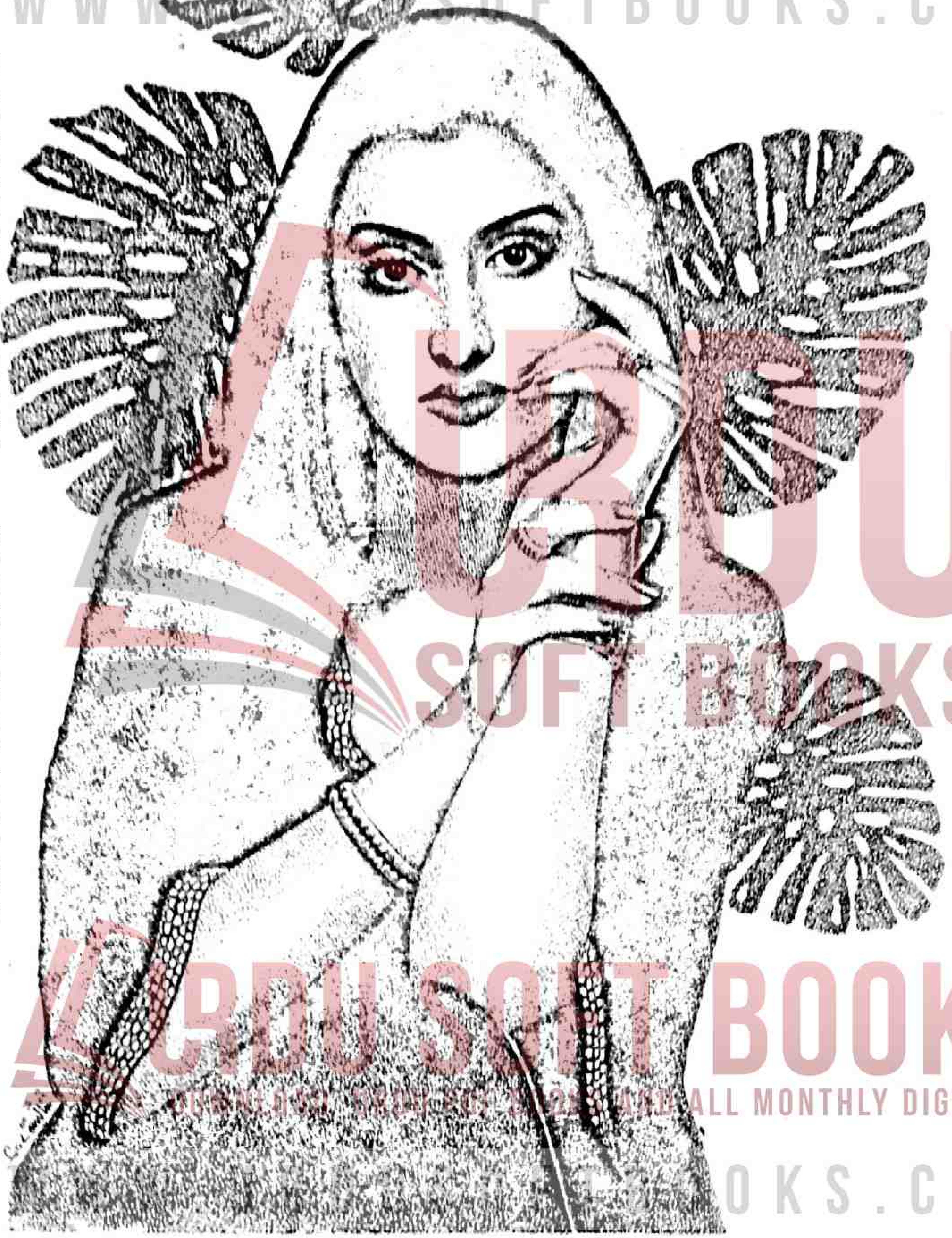
"جی.... ! یہ دیکھیں' یہ کچھ پیپرز ہیں ایڈاپٹیشن کے۔ ان میں کچھ شرائط کا اضافہ کروایا ہے میں نے کیونکہ یہ بچے میری ذمہ داری ہیں۔ اور میں امید رکھتی ہوں کہ آپ لوگ نہ صرف ان شرائط کو بغور پڑھیں گے بلکہ ان پر عمل بھی کریں گے۔" ملازم چائے رکھ کے جاچکا تھا اور میں بے دلی سے چائے پی رہی تھی۔ مجھے ان دونوں کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"چلیں مسز منصور...." مجھے پتا بھی نہیں چلا اور مسز چودھری اور منصور کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"ہاں.... ہاں...." میں نے جلدی سے کپ میز پر رکھا اور خوشی خوشی کھڑی ہوگئی۔

ایک بڑا سا ہال تھا جس میں بچے جمع تھے۔ یہ شاید ان کا چائے کا وقت تھا۔ پانچ چھ عورتیں بچوں کو کنٹرول کر رہی تھیں۔ گو کہ سب بچے پیارے اور صاف ستھرے تھے اور تمیز سے بیٹھے تھے مگر ایک بچے پر میری نظر ٹھہر گئی۔ نہ جانے اس کی عمر کیا تھی؟ چپس اور سینڈوچ پلاسٹک کے کانٹے سے کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو تین بار کوشش کرتا پھر کہیں جا کر چپس

ناولٹ



کانٹے میں پھنستا اور وہ منہ تک لے جاتا۔ پھر جب تک پہلا ٹکڑا ختم نہ ہو جاتا تب تک دوسرے کو کانٹے میں پھنسانے کی کوشش نہ کرتا۔ ساتھ بیٹھی بچی اس کے منہ پہ لگی کیچپ صاف کر دیتی۔

اب وہ بچہ پھر کانٹے میں چپس پھنسا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو پکڑ کر چپس پھنسانے میں اس کی مدد کی۔

"آنٹی یہ خود کھانا سیکھ رہا ہے۔" ساتھ بیٹھی بچی کو شاید یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ میں اتنی خوش تھی کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"ابراہیم... ساتھ بیٹھی بچی فوراً" بولی۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے منصور کو دیکھا' وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ "منصور... ہمارا ابراہیم..." اور میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کوئی جذباتی حرکت کرتی' مسز چوہدری نے مجھے سنبھالا اور ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئیں۔

"مسز چودھری! ہمیں یہ بچہ پسند ہے۔ ہم پیپر ورک کر لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے منصور صاحب! آج پیپر ورک کر لیتے ہیں اور پرسوں آپ بچہ لے جائیے گا۔"

"پرسوں کیوں...؟" ہم دونوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کیونکہ ہم نے بچوں کو کبھی نہیں بتایا کہ لوگ ایڈاپٹ کرنے آرہے ہیں۔ اگر بتا دیں تو بچے کانشس ہو جاتے ہیں۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔ ابھی پیپر ورک کر لیتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' منصور مجھے دیکھتے ہوئے بولے جو چپ رہنے کا اشارہ تھا۔

✡ ✡ ✡

"منصور! یہ دیکھیں میں آج مارکیٹ گئی تھی اور ابراہیم کے بیڈ کے لیے نیلی اور سبز بیڈ شیٹس لائی ہوں... میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ ذرا بڑا بچہ ہی گود لیتا ہے اسی لیے ٹوڈلر بیڈ پہلے موجود تھا۔ نرسری روم میں اور یہ کھلونے دیکھیں۔ میں نے بلاکس لیے ہیں۔ ویسے وہاں لیگوز بھی تھے۔"

منصور نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مستطیل کمرے کے ایک جانب بیڈ تھا جس کے ساتھ والی دیوار پر ایک لیمپ اسٹیکر لگا تھا اور لیمپ کی جگہ حقیقی لیمپ نصب تھا۔ بیڈ کے پچھلی دیوار پر درخت کا اسٹیکر تھا جس پر بندر لٹک رہے تھے۔ شکر وہ بندر حقیقی نہیں تھے اسٹیکر کا حصہ تھے۔ کمرے کے دوسری جانب ایک راکنگ چیئر اور میچنگ اسٹول تھا جس کے سیدھے ہاتھ پر ایک چھوٹی الماری تھی جس کے اوپر کی شلف پر دو بچوں کی کہانیوں کی کتابیں تھیں اور نیچے کے دو شیلفوں پر کھلونے تھے جو کہ ابھی لائے گئے تھے۔ اسی طرف کی دیوار کے آخر پر الماری تھی جس میں کپڑے ابراہیم کے آنے کے بعد ہی خریدے جاتے تھے۔

"سپر پرفیکٹ ہے... ابراہیم کو بہت پسند آئے گا سب۔"

"واقعی...!" شازمین کے چہرے پر حقیقی مسرت کی چمک اور بڑھ گئی۔ اور منصور کو یہ چمکتی مسکراہٹ بہت عزیز تھی۔

✡ ✡ ✡

اگلے دن ہم جب ابراہیم کو لینے پہنچے تو ایک بری خبر ہماری منتظر تھی۔ مسز چوہدری پریشان تھیں۔ "مسٹر اینڈ مسز منصور' بات یہ ہے کہ یہ بچہ ابراہیم اور اس کی بہن دو سال پہلے ہمارے پاس آئے تھے۔ ان کے والدین کی کار حادثے میں موت کے بعد ان کے چچا ان کو یہاں چھوڑ گئے تھے کیونکہ ان کے کسی رشتہ دار کے گھر میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی... لیکن۔"

"لیکن یہ کہ اب ان کے رشتہ داروں کی محبت جاگ گئی ہے۔" میں حسب معمول جذباتی ہو چکی تھی۔

"نہیں مسز منصور! مسئلہ یہ ہے کہ اس بچے کی بڑی بہن اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" منصور کی چپ بھی ٹوٹ گئی۔

"مطلب یہ کہ صفا چھ سال کی تھی اور ابراہیم ایک سال کا تھا جب یہاں آئے تھے۔ تب سے آج تک صفا ابراہیم کا بھائی نہیں بلکہ بیٹے کی طرح خیال رکھتی ہے۔ بعض دفعہ تو ہم سب حیران ہو جاتے ہیں کہ آٹھ سال کی بچی میں کہاں سے اتنی سمجھ داری آگئی ہے۔ ابراہیم کا پورا شیڈول اس نے ترتیب دے رکھا ہے۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ عملے کی کسی خاتون کو بھی اس کے پاس نہیں پھٹکنے دیتی۔ دو دن کا وقت بھی میں نے اسی لیے مانگا تھا کہ صفا کو راضی کرلوں گی مگر وہ راضی نہیں ہے۔"

"یعنی آٹھ سال کی بچی راضی نہیں ہے۔" میرا پارہ ہائی ہوتا جارہا تھا۔

"جی۔۔۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ لوگ ابراہیم کو ویسے ہی ایڈاپٹ کریں جیسے یہاں باقی لوگوں نے کیے ہیں۔"

"یعنی ہم اسے گھر نہ لے کر جائیں۔" منصور کے تاثرات بھی برہم تھے۔ "یہ سب آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا مسز چوہدری۔"

"میں شرمندہ ہوں۔" مسز چودھری نے سر جھکا لیا۔

"آپ ایک آٹھ سال کی بچی سے کیسے بلیک میل ہو سکتی ہیں؟" میرا غصہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔

"اس نے کل رات ابراہیم کو لے کر بھاگنے کی کوشش کی ہے۔" اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی منصور نے میرا ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور فون پر نمبر ملانے لگے۔

"السلام علیکم ذاکر انکل۔۔۔! کیسے ہیں آپ۔ آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔۔۔ جی۔۔۔ جی بچے کے بارے میں۔۔۔ اچھا مسز چودھری نے بتایا ہے آپ کو۔۔۔ تھوڑی دیر بعد۔۔۔ چلیے ٹھیک ہے۔" کہہ کر فون رکھ دیا۔

"وہ کہہ رہے ہیں کہ مسز چوہدری نے بتایا ہے انہیں۔ اور یہ کہ ہم کوئی دوسرا بچہ دیکھ لیں۔" منصور نے اٹکتے اٹکتے مجھے بتایا۔

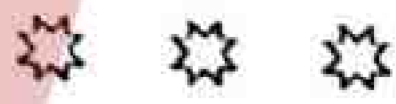
"کیا مطلب کوئی دوسرا بچہ دیکھ لیں؟؟"

"مسٹر اینڈ مسز منصور آپ لوگ کچھ وقت لیں سوچنے کے لیے میں تب تک ایک راؤنڈ لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر مسز چودھری کمرے سے چلی گئیں۔

منصور نے بڑی دقت سے مجھے راضی کیا۔ خیر آدھے گھنٹے کے بعد ہم پھر اسی ہال میں موجود تھے لیکن اب یہاں ابراہیم نہیں تھا۔ منصور نے ایک دو بچوں کی طرف اشارہ بھی کیا لیکن میرا دل ابراہیم میں ہی اٹکا تھا۔

"چلو اس بار میں خود ہی بچہ پسند کرلیتا ہوں۔"

"پھر خود ہی پال لیے گا۔ مجھ سے توقع نہ رکھیے گا۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آگئی۔



شام کے وقت میں ذاکر انکل کے روبرو بیٹھی تھی۔

"پلیز انکل! مسز چودھری سے کہتے تاکہ وہ ابراہیم کو مجھے دے دیں۔"

"بیٹا یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں ہے انکل۔۔۔؟"

"کیونکہ میں دونوں بہن بھائی کو الگ نہیں کر سکتا۔" ذاکر انکل کا اطمینان قابل دید تھا۔

"انکل وہ آکر مل سکتی ہے ابراہیم سے۔۔۔"

"شاز مین کوئی دوسرا بچہ دیکھ لو۔"

"لیکن مجھے وہی پسند ہے۔" میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آخر اس بچے میں ایسی کیا بات ہے شاز مین!"

"انکل! اس کے ٹیبل مینرز۔۔۔ اس کے اندر ایک کلاس ہے جو باقی بچوں میں نہیں ہے۔" ابراہیم کی شکل میری نظروں کے سامنے آگئی۔

"شاز مین بیٹا! ہم بچہ گود لے رہی ہو یا بہو ڈھونڈ رہی

ہو۔"

"کیا مطلب انکل۔۔۔؟"

"مطلب یہ کہ جب سے یہ قصہ شروع ہوا ہے تمہاری ڈیمانڈز ہی نہیں ختم ہو رہیں۔ بچہ نوزائیدہ نہ ہو' شیر خوار نہ ہو' کالا نہ ہو' بدتمیز نہ ہو۔ اب ٹیبل مینرز بھی۔۔۔"

"تو انکل' یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا ہے نا۔ اب کالا بچہ جو ہو گا وہ تو مجھے اور منصور کو میچ ہی نہیں کرے گا۔"

اپنی دھن میں مگن میں انکل کے طنز کو سمجھ ہی نہ سکی۔

"بیٹا بڑی ہو جاؤ اب۔" یہ کہہ کر انکل اپنے کمرے کی جانب چلے گئے۔ یعنی مذاکرات ناکام ہوئے۔

گھر پہنچی تو منصور ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ "آپ ٹی وی دیکھ رہے ہیں اور میری جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"کیوں؟ نہیں مانے نا انکل۔" منصور پہلے ہی سے جانتے تھے اسی لیے میرے ساتھ نہیں گئے تھے۔

"شازمین! ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے کافی ہیں۔ مجھے کوئی بچہ نہیں چاہیے۔ مجھے صرف تمہاری خوشی چاہیے۔"

"اور میری خوشی بچہ ہے۔" میں پھر سے جذباتی ہو گئی۔

"بند کرو یہ بچہ نامہ اور اپنی کمیوں کا سوگ کمرے میں جا کر مناؤ۔ تنگ آگیا ہوں میں۔۔۔ کبھی دوسری شادی تو کبھی بچے کی کل کل سے۔" وہ ریموٹ پٹخ کر چلے گئے میرے رونے میں مزید روانی آگئی۔



ہفتہ بھر سے ایک سوگواریت گھر پر چھائی تھی۔ اس دن کے بعد سے میں نے بچے کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ لیکن جو دو دن میں نے ابراہیم کے انتظار میں گزارے تھے' وہ بھولتے ہی نہ تھے۔ دل سے اسے اپنا بنا لیا تھا میں نے۔ یہ وہی معاملہ ہوا تھا کہ برسوں کے پیاسے کو پانی دکھا کر چھین لیا جائے۔ ایک شام میں ٹی وی کے آگے بیٹھی خالی خالی نظروں سے چلتی پھرتی تصویریں دیکھ رہی تھی کہ ملازمہ نے ذاکر انکل کے آنے کی اطلاع دی۔

"السلام علیکم انکل۔۔۔!"

"وعلیکم السلام۔۔۔ میری بچی اداس لگ رہی ہے۔" میں خاموش رہی۔

"پھر کیا طے کیا تم دونوں نے بچے کے بارے میں؟"

"منصور نے کہا ہے اب کوئی ذکر نہ ہو بچے کا۔"

"تم سے یہ کہا ہے اس گدھے نے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور رونے لگی۔

"دو دن پہلے آیا تھا میرے پاس' کہہ رہا تھا میری شازمین بہت دکھی ہے' کچھ کریں انکل۔" میں نے انکل کو دیکھا کہیں مذاق نہ کر رہے ہوں۔

"ایک حل بتایا ہے میں نے اسے لیکن دو دن لگے ہیں اسے منانے میں' ابھی بھی کہہ رہا ہے کہ شازمین نہیں مانے گی۔"

"یہی کہ دوسرا بچہ ایڈاپٹ کر لوں۔"

"نہیں' میں نے اس سے کہا ہے کہ ابراہیم کو ہی ایڈاپٹ کرو۔"

"کیا واقعی۔۔۔؟" خوشی کے مارے میں نے انکل کی بات بھی پوری نہیں ہونے دی۔

"پہلے انکل کی بات تو سن لو۔۔۔" منصور نہ جانے کب میرے پیچھے آکھڑے ہوئے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور میں نے ان دونوں کو۔

"بات یہ ہے بیٹا کہ ہم چھ بہن بھائی تھے۔ ہمارے ماں باپ کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ یہ قصہ تو تم نے بہت بار سن رکھا ہے کہ کس طرح ہمارے رشتہ داروں نے ہمیں بانٹ لیا۔ خالا' ماموں' چچا' تایا' ایک ایک بچے کو ساتھ لے گئے۔ لیکن یہ تمہیں کسی نے نہیں بتایا ہو گا کہ ہم نے اپنا بچپن کیسا گزارا۔" انکل کچھ دیر سانس لینے کو رکے اور میں اس تمہید کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"میرے' بہن بھائی مجھ سے چھین لیے گئے اور تایا

کے بچے کبھی میرے بہن' بھائی بن نہ سکے۔ جس طرح طوفان کے بعد چڑیا کا گھونسلہ تنکا تنکا بکھر جاتا ہے اسی طرح ہم بہن' بھائی بھی بکھر گئے۔ عید' شب برات پر ہم ملتے تھے مگر جو گھر بکھر گیا تھا وہ کبھی جڑ نہ سکا۔ بابا کے گھر جیسے تیسے گزر ہی گئی۔ خالد میری تائی کا بھانجا تھا۔ وہاں اس سے دوستی ہوئی تھی۔ وہ گواہ ہے میرے شب و روز کا' خیر جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو پتا چلا کہ ہم سب بہن بھائی اس تکلیف سے دوچار تھے۔ ماں' باپ اللہ نے اپنے پاس بلا لیے اور بہن' بھائی دنیا نے لے لیے۔ پانچ سال پہلے یہ ادارہ میں نے اور میرے بھائیوں نے مل کر شروع کیا تھا کہ کوئی بہن' بھائی جدا نہ ہوں۔ اسی لیے ہم بچے گھر نہیں لے جانے دیتے۔ اور تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر تم نے ابراہیم کو ایڈاپٹ کرنا ہے تو اس کی بہن کو بھی کرلو۔"

"کیا... ؟ کیا اس کی بہن کو بھی۔" مجھے شاک سا لگا پتا نہیں ایک بچہ بھی مجھ سے سنبھلتا یا نہیں کجا دو بچے۔

"آٹھ سال کی بچی تو کافی بڑی ہوتی ہے۔"

"دیکھا انکل! میں نے کہا تھا نا شازمین نہیں مانے گی۔ اس سے ایک بچہ بمشکل سنبھلتا' دو تو دور کی بات ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ کہ میں بچے نہیں سنبھال سکتی۔" میں چمک کر بولی۔ یہ تو میرے اندر کی بات تھی انہیں کیسے پتا چلی؟

"میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہیں شوق تو بہت ہے بچے کا پر تجربہ نہیں ہے۔"

"رہنے دو منصور! شازمین کی جو نیچر ہے یہ نہیں کر پائے گی۔" ذاکر انکل نے بھی نفی میں سر ہلایا۔

"کیا ہوا میری نیچر کو انکل؟"

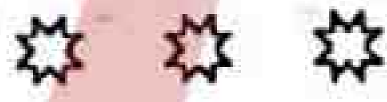
"تم ذرا لاابالی ہو ابھی۔"

"انکل! آپ سب لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ اللہ پاک نے مجھے اس لیے بچے نہیں دیے کیونکہ میں اس قابل ہی نہیں ہوں۔"

"نہیں' یہ بات نہیں ہے بیٹا!" انکل ذاکر جز بز ہو گئے کیونکہ میرے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔ "اگر اللہ مجھے بچے دے دیتا تب بھی میری نیچر یہی رہنی تھی جواب ہے۔"

"بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کی طبیعت میں ٹھہراؤ آجاتا ہے بیٹا' منصور ٹھیک کہتا ہے ہم کوئی دوسرا بچہ دیکھ لو یا رہنے دو۔"

"رہنے دوں؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور آپ دونوں کو میں ابراہیم اور اس کی بہن کو پال کر بلکہ ایک اچھی ماں بن کر دکھاؤں گی۔" میں جذبات میں بہہ کر بہت بڑا فیصلہ کر بیٹھی تھی۔ کاش میں اس وقت ذاکر انکل کو منصور کو آنکھ مارتے دیکھ لیتی تو کبھی اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتی۔



"جی... جی مما... ٹھیک ہے... یہ لیں شازمین سے بات کریں۔" میں بچوں کا کمرہ نئے سرے سے درست کر رہی تھی کیونکہ صفا میڈم ایک ہفتے کی کوششوں کے بعد بالآخر ایڈاپٹ ہونے کے لیے مان گئی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم نے اسے نہیں بلکہ اس نے ہمیں ایڈاپٹ کیا ہے۔ ساری شہ ذاکر انکل کی دی ہوئی تھی۔ وہ جو کہہ رہی تھی وہ مان رہے تھے۔ خیر اب صفا کے لیے بھی فرنیچر آچکا تھا جسے سیٹ کرتے ہوئے ابراہیم کے کمرے کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا اور میرا دل خراب ہو رہا تھا کیونکہ صفا جذبات میں لیے گئے فیصلے کا نتیجہ تھی...

"یہ لیں مما! بات کریں۔" منصور کی والدہ کا فون تھا۔

"اسلام علیکم ممانی۔ کیسی ہیں آپ..."

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ کیسی جا رہی ہیں تیاریاں بچوں کے استقبال کی۔"

"ٹھیک جا رہی ہیں۔ صفا کا سامان سیٹ کر رہی ہوں۔"

"دیکھنا شازمین! بچوں کو سب بہت پسند آئے گا۔ میں اور خالد بہت خوش ہیں تمہارے لیے۔ چلو اب میرے منصور کے گھر بھی رونق ہوگی ورنہ تو... خیر چھوڑو۔ اب اس بات کو سر پہ سوار نہ کرنا کہ دو بچے ہیں کیسے ہینڈل کروں گی وغیرہ وغیرہ۔"

"اف! سب کتنا جانتے ہیں مجھے۔" میں نے جل کر سوچا۔

"صبا ذرا فارغ ہوجائے تو پھر میں پاکستان آؤں گی۔ مل کر سنبھال لیں گے سب۔"

صبا بھابھی کے ہاں تیسرے بچے کی پیدائش ہونے والی تھی۔ وہ میری جٹھانی تھیں اور میرے ساس سسر دبئی میں ان ہی کے ساتھ رہتے تھے

"یہ لو اپنے ماموں سے بات کرو۔"

"کیسی ہو شازمین...."

"میں ٹھیک ہوں ماموں! آپ کیسے ہیں۔" منصور میرے ماموں زاد تھے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ اللہ تمہارے اور منصور کے حق میں اس فیصلے کو بہترین بنائے.... آمین۔ اس بات کی مجھے زیادہ خوشی ہے کہ دو بہن بھائی کو اڈاپٹ کیا ہے ورنہ کچھ سال بعد تمہیں خود ابراہیم کے لیے بہن یا بھائی کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اب اچھا ہے کہ رحمت اور نعمت ایک ساتھ گھر میں آرہے ہیں۔ تمہارا خاندان مکمل ہو جائے گا۔" یہ واقعتاً" مثبت پہلو تھا۔

"یہ تو ہے ماموں۔ اب آپ لوگ بھی جلدی آئیے گا۔ اپنے پوتا پوتی سے ملنے۔"

"ہاں ضرور۔ اب تم اپنا کام ختم کرو۔ کل بچوں سے بھی بات کریں گے۔ اللہ حافظ۔"

"جی ٹھیک ہے اللہ حافظ۔"

☆ ☆ ☆

اگلے دن کا سورج خوش بختی کی شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ ہم بخیر و عافیت گھر آگئے تھے۔ بچوں کی دادا، دادی سے بات کرادی تھی۔ میرے والدین حیات نہیں تھے۔ دونوں بچے ذرا لیے دیے سے تھے۔ لیکن سب ٹھیک رہا تھا۔ میں ابراہیم کو پاکر بہت خوش تھی۔ اسے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرنا چاہ رہی تھی مگر وہ شرما رہا تھا اور مزید صفا کے ساتھ چمٹ رہا تھا۔ صفا بھی دبک کر بیٹھی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ کوئی بلا خدشہ قسم کی بچی ہوگی تو ایسا نہیں تھا۔ کافی سلجھی ہوئی لگ رہی تھی۔ زیادہ بات بھی نہیں کررہی تھی۔ بس جو ہم پوچھتے اس کا جواب دے رہی تھی۔ میں نے ان کا کمرہ دکھایا تو ابراہیم کو اپنا کمرا اور کھلونے بہت پسند آئے تھے۔ صفا کو بھی سب اچھا لگا تھا۔ اس نے مسکرا کر شکریہ انکل آنٹی کہا۔

رات کے کھانے پر میں نے زیادہ تر بچوں کی پسند کی چیزیں ہی بنوائی تھیں۔ ابراہیم کو پزا بہت پسند آیا تھا لیکن وہ شرما رہا تھا۔

"آپ اور لوگے؟" میں نے پوچھا تو پہلے اس نے ہاں میں سر ہلایا لیکن صفا کی طرف دیکھا تو اس نے اسے آنکھیں دکھائیں تو اس نے فوراً" نو کہہ دیا۔ میں نے پھر بھی اس کی پلیٹ میں پزا ڈال دیا تو وہ بہت خوش ہوا۔

"تھینک یو آنٹی...."

"ابراہیم یہ ماما ہیں آپ کی۔" اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی صفا نے ابراہیم کو آہستہ سے بتایا۔

"آپ میری ماما ہیں۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔ اس کے لہجے کی حسرت نے مجھے پگھلا دیا۔

"جی میری جان۔" میں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"ماما..." ابراہیم نے اپنی توتلی زبان میں جب مجھے ماما کہا میں تو نہال ہی ہوگئی۔

"یہ لو میری جان!" میں نے ایک اور ٹکڑا اس کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

"صفا بیٹا! آپ بھی لو نا۔ یہ لو اسپگھٹی لو...."

صفا خود کچھ نہیں لے رہی تھی۔ منصور اس کی پلیٹ میں وقتاً" فوقتاً" کچھ نہ کچھ ڈال رہے تھے جبکہ میں ابراہیم میں مگن تھی۔

"شکریہ انکل۔" منصور نے اس کے سر پر ہاتھ

پھیرا۔

"آنٹی! ہم نو بجے سو جاتے ہیں۔" کھانا جیسے ہی ختم ہوا۔ صفا نے مجھے مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے، پہلے آئس کریم کھا لیتے ہیں۔ نورین آئس کریم لا رہی ہے۔" "لیکن ہم رات کو آئس کریم نہیں کھاتے۔"

"ٹھیک ہے، آپ مت کھانا' ابراہیم کھا لے گا۔" میں نے ابراہیم کا ماتھا چومتے ہوئے کہا اور اس نے زور دشور سے سر ہلایا کہ وہ تو کھائے گا۔ اب اس کی جھجک ذرا ختم ہو رہی تھی۔

"ابراہیم کو تو خاص طور پر نہیں دینی' یہ بانپو ہو جاتا ہے۔ پھر سوتا نہیں ہے۔" اب یہ نئی بات تھی میرے لیے۔

"ایک سکوپ کھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔" نورین سے پیالا لے کر میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے آئس کریم کھلائی جبکہ صفا نے نہیں کھائی وہ ابراہیم کو دیکھ رہی تھی۔ اس دوران منصور نے اس سے اس کی پسند ناپسند وغیرہ جیسے سوال کیے۔

"صبح اسکول بھی جانا ہے؟" صفا کو کل کی فکر لاحق ہوئی۔

"بیٹا! ہم آپ کا اسکول بدل رہے ہیں۔ کل جا کر ایڈمیشن کروا دیں گے پھر آپ اسکول چلے جانا۔"

"نئے اسکول کیوں۔۔۔؟"

"کیونکہ وہ اسکول گورنمنٹ اسکول ہے۔ ہم آپ کو اچھے والے اسکول میں داخل کروائیں گے۔" ابراہیم کا منہ صاف کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"لیکن وہ اسکول بہت اچھا ہے۔ میں اسی اسکول میں جاؤں گی۔" عجیب حاکمیت بھرا لہجہ تھا۔ "آپ میرا اسکول نہیں بدلوا سکتے۔" اب کی بار واضح بدتمیزی سے کہا گیا تھا۔

"کیوں نہیں بدلوا سکتے ہم۔" مجھے بھی غصہ آگیا یہ لڑکی اب اپنی اصلیت پہ آئی تھی۔

"ایک منٹ ایک منٹ۔۔۔" منصور نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کچھ کہنے سے روکا۔

"صفا! اگر آپ نہیں چاہتیں تو ٹھیک ہے' آپ پچھلے اسکول ہی چلی جانا' منصور' ررر۔۔۔" اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ مزید بولے۔

"لیکن اس گھر میں روٹین سیٹ ہونے میں دن لگیں گے۔ اس لیے آپ پرسوں سے چلی جانا۔" صفا نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے لیکن پھر سر ہلا کر رہ گئی۔ جبکہ میں غصے سے منصور کو دیکھ رہی تھی جس کی انہیں مطلق پروا نہیں تھی۔ گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔

"چلو ابراہیم' آپ کا بیڈ ٹائم شروع ہو گیا ہے۔" صفا کے کہنے کی دیر تھی ابراہیم جھٹ سے میری گود سے اترا اور صفا کے پاس جا کر اس کی انگلی پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا سارا غصہ بھی رفوچکر ہو گیا کہ مجھے تو ابراہیم کا بیڈ ٹائم سیٹ کرنا تھا۔

"ہاں ہاں' چلو بچوں' اوپر کمرے میں چلتے ہیں۔ صفا بیٹا' آپ لوگوں کے سلیپنگ سوٹ کہاں ہیں؟" کمرے میں پہلے سے موجود ان کے سوٹ کیس کو کھولتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"آنٹی! ہمارے تو کوئی سلیپنگ سوٹ نہیں ہیں۔"

"ہم' مم مم۔۔۔" خیر میں نے نسبتاً" ہلکے سوٹ نکال کر بیڈ پر رکھے کیونکہ اس وقت دونوں بچوں نے کافی اچھے سوٹ پہن رکھے تھے جو کہ نئے لگ رہے تھے جیسے آج ہی خریدے گئے ہوں۔

"آؤ ابراہیم! پہلے آپ کو نہلاؤں پھر صفا آپ نہا لینا۔" میں نے ابراہیم کو گود میں اٹھا کر باتھ روم کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ صفا آگے آکر کھڑی ہو گئی۔

"ابراہیم رات کو نہائے تو بیمار ہو جاتا ہے۔"

"صفا بیٹا' نہانے سے کوئی بیمار نہیں ہوتا۔" میں نے ضبط سے کہا۔

"آپ نے آئس کریم بھی کھلائی ہے اسے اور اب نہلانے بھی لگی ہیں اسے نزلہ ہو جائے گا۔"

"نہیں ہوتا کچھ۔" دس منٹ بعد میں ابراہیم کو

لے کر باہر آگئی جبکہ وہ ابھی بھی پانی میں کھیلنا چاہ رہا تھا۔
ابراہیم کو پانی میں کھیلنا بہت پسند ہے 'یہ مجھے ابھی پتا چلا تھا اور میں منصور کو بتانے کے لیے بے تاب تھی۔ لیکن پہلے ان بچوں کو سلانا تھا۔

"جاؤ صفا اب آپ نہالو۔" میں نے کہانی کی کتاب اٹھاتے ہوئے کہا اور راکنگ چیئر پر آکر بیٹھ گئی جو کہ اب کمرے کے کونے میں رکھی گئی تھی۔ نورین فیڈر میں گرم دودھ لا چکی تھی۔ اب ابراہیم میری گود میں بیٹھا دودھ پی رہا تھا اور میں اسے کہانی سنا رہی تھی جبکہ ابراہیم سونے کے بجائے پرجوش ہو رہا تھا اور اس کی ساری توجہ کھلونوں کی طرف تھی۔

"ماما ٹوائے۔۔۔"

"میری جان! ٹوائے سے صبح کھیلیں گے ابھی سونا ہے۔" صفا نہائے بغیر واپس آچکی تھی اور اب میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے میری بات نہیں مانی تھی میں نے نظر انداز کیا لیکن اب وہ مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "کیوں نہیں سو رہا نا۔۔۔"

"صفا آپ سو جاؤ۔" لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے بھی نظر انداز کیا۔ ابراہیم قابو ہی نہیں آرہا تھا۔ ایک گھنٹے سے میں اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ کھیلنا چاہ رہا تھا۔ نورین بھی اپنے کوارٹر میں جا چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے دوبارہ بلاتی صفا تیز لہجے میں بولی۔

"ابراہیم۔۔۔" بلاکس میں مگن ابراہیم سہم گیا اور فوراً" نارمل بھی ہو گیا۔

"ادھر آؤ۔"

"ٹوائز۔" وہ منمنایا۔

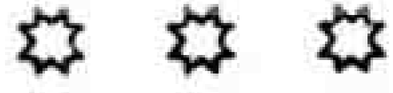
"صفا! آپ سو جاؤ۔ ابراہیم کو میں سُلا دوں گی۔" میں بھی سخت لہجے میں بولی۔

"آپ سو جائیں" آنٹی ابراہیم کو میں سُلا دیتی ہوں۔" اور اس نے ابراہیم کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر لٹا دیا۔

"ابراہیم لیٹ جاؤ ورنہ جن بابا آجائے گا۔ جلدی جلدی آنکھیں بند کرو شمسہ آنٹی جن بابا کو لے کر آرہی ہیں۔" میرے دیکھتے ہی دیکھتے ابراہیم نے زور سے آنکھیں میچ لیں اور ساتھ لیٹی صفا کو پکڑ لیا۔

"آنٹی آپ لائٹ بند کر کے چلی جائیں۔"

"آپ۔۔۔ اپنے بیڈ پہ جا کر لیٹو صفا۔۔۔" لیکن اب صفا۔۔۔ ہو ہاہاہا۔۔۔ ہو ہاہاہا۔۔۔ کی آوازیں نکل رہی تھی۔ ایک دم سے لائٹ بھی بند ہو گئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ منصور تھے اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔



"شازمین اٹھو۔۔۔ میں نے مندی مندی آنکھیں کھول کر دیکھا منصور مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔

"آپ اتنی جلدی آگئے آج۔" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے گھڑی اٹھا کر وقت دیکھا۔

"آٹھ۔۔۔ میں تو ابھی گیا ہی نہیں۔"

"کیوں نورین نہیں آئی کیا؟"

"آئی ہے ناشتہ بھی کر لیا ہے اور بچے بھی اٹھ گئے ہیں۔"

"بچے۔۔۔ اتنی جلد۔۔۔"

"ہاں اور ابراہیم کو نزلہ ہو رہا ہے۔" میں جو دوبارہ سونے والی تھی فوراً" اٹھ گئی۔ اور بچوں کے کمرے کی طرف بھاگی۔

"بچے نیچے ہیں لاؤنج میں۔" اب میرا رخ سیڑھیوں کی جانب تھا۔

"آچھوں۔۔۔ آچھوں۔۔۔ "ابراہیم۔۔۔" اس سے پہلے کہ میں ابراہیم کو پکڑتی۔ صفا نے ابراہیم کے گرد بازوؤں کا حصار بنا دیا۔

"آپ نے میرے بھائی کو بیمار کر دیا ہے۔"

"میں نے۔۔۔؟"

"صفا بیٹا' بچے بیمار ہو جاتے ہیں۔ کوئی بات نہیں ہے۔"

"انکل میں نے آنٹی کو کہا تھا کہ آئس کریم نہ کھلائیں اور رات کو نہ نہلائیں مگر انہوں نے کوئی بات نہیں سنی اور میرے بھائی کو بیمار کر دیا۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

"ہمیں واپس جانا ہے۔" اس مطالبے پر تو میں واقعی بوکھلا گئی۔

"صفا میری جان، آئی ایم سوری۔" میں صفا کے ساتھ بیٹھ گئی اور ابراہیم کو اٹھالیا۔ منصور نے اس کے آنسو صاف کیے۔

"آپ کی ماما کو آہستہ آہستہ سب پتا چل جائے گا۔" یہ کہہ کر اسے گلے سے لگالیا۔ اب وہ تھوڑی بہتر ہوگئی۔

"میرے بھائی کو کچھ ہو، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"بیٹا وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ بخار نہیں ہے اسے، ابھی چیک تو کیا ہے آپ کے سامنے۔ کوئی بات نہیں، ابراہیم تو بہادر بچہ ہے۔" میں نے ٹشو سے اس کی ناک صاف کی۔

"ماما۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بازو میرے گرد حمائل کردیے۔

"میرے سر میں ہائی ہو رہی ہے۔"

"کیا۔؟" صفا نے اس کا سر دبانا شروع کردیا۔

"اوہ۔۔۔ صفا بیٹا آپ نے ناشتا کیا۔" میرے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نورین۔۔۔ صفا اور ابراہیم کا ناشتہ لگاؤ۔"

"آپ لوگ ناشتہ کرلو پہلے پھر فضل سیرپ لے آئے گا تو ابراہیم کو پلا دیں گے۔" میری بات کے جواب میں وہ انکار کرنے والی تھی۔ منصور کی بات سن کر ناشتہ کرنے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"منصور آپ جائیں، آپ کو دیر ہو رہی ہے۔"

"تم سنبھال لو گی اکیلے؟"

"ہاں جی کرلوں گی۔ نورین بھی تو ہے۔ ہم کرلیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" منصور کو تسلی ہوگئی۔

"میں شام کو جلدی آجاؤں گا پھر بچوں کی شاپنگ کے لیے چلیں گے۔" میں جو سمجھ رہی تھی کہ منصور کو یاد دلانا پڑے گا ، نہیں خود یاد تھا۔ میں نے مسکرا کر انہیں اللہ حافظ کہا۔

☆ ☆ ☆

شام میں منصور کے آنے سے پہلے ہی ابراہیم ٹھیک ہو چکا تھا۔ ابراہیم بہت حد تک میرے ساتھ گھل مل چکا تھا مگر صفا بہت تکلف برت رہی تھی۔ جب منصور گھر میں داخل ہوئے تو میں اور ابراہیم لان میں کھیل رہے تھے۔ منصور نے ابراہیم کو گود میں اٹھا لیا۔

"صفا کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہے۔"

"وہاں کیا کر رہی ہے؟"

"کتابیں کھولے بیٹھی ہے۔" میں نے پھولے سانس کے ساتھ بتایا۔

"شاپنگ کر سکتی ہو یا تھک گئی ہو۔"

"شاپنگ کو انکار کر سکتی ہوں کیا میں؟" میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

"آپ چائے پئیں تب تک میں بچوں کو تیار کرتی ہوں۔ نورین، صاحب کے لیے چائے لاؤ۔"

پندرہ منٹ بعد ہم سب گھر سے نکل رہے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے کپڑے لیے۔ صفا بالکل نہیں بول رہی تھی۔ ابراہیم نے اگر کچھ لینا بھی چاہا تو صفا نے گھوری دکھادی تھی چنانچہ اب وہ خاموش تھا۔ لیکن میں پھر بھی اس کی رائے پوچھ رہی تھی۔

"صفا آؤ ہم وہاں کپڑے دیکھتے ہیں۔" منصور اسے لے کر دوسری دکان میں چلے گئے۔

"یہ فراک پسند ہے آپ کو؟"

"آپ کو اچھا لگ رہا ہے تو ٹھیک ہے۔"

"اب ایسی بات ہے تو میں آپ کو ایک سیکرٹ بتاؤں۔ مجھے اور آپ کی آنٹی کو کپڑے خریدنے نہیں آتے۔" منصور نے بے چارہ سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو آپ اپنے کپڑے کیسے خریدتے ہیں؟" آگے بھی صفا تھی۔

"اپنے تو آتے ہیں لیکن بچوں کے نہیں آتے نا۔ اس لیے تو آپ کو ساتھ لائے ہیں لیکن آپ تو کچھ بتا

ہی نہیں رہی ہو۔"
"وہ تو میں اس لیے نہیں کچھ کہہ رہی کہ کہیں آپ ہمیں لالچی نہ سمجھیں۔" اور اس سمجھ داری پر منصور نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔
"لالچی تو سب بچے ہوتے ہیں۔"
لیکن ہم نہیں ہیں۔ ماما کہتی تھیں کہ دوسروں کے گھر جا کر لالچ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بدتمیزی ہوتی ہے۔"
"لیکن آپ تو اپنے گھر میں ہو اور میری بیٹی ہو۔"
اس بات پہ اس نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔
"اوکے' آپ لالچی نہیں ہو لیکن آپ اچھی بچی ہو اور اچھے بچے دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ ہے نا؟"
"جی۔" اس نے ہاں میں سرہلایا۔
"تو پھر آپ میری مدد کرو گی۔"
"کپڑے خریدنے ہیں نا۔"
ہاں کپڑے خریدنے ہیں کیوں کہ اگر ہم نے کپڑے نہیں خریدے تو ذاکر انکل ہمیں گندے پیرنٹس سمجھیں گے۔ آپ چاہتی ہو وہ مجھے اور آپ کی آنٹی کو گندا سمجھیں۔"
"نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلایا۔
"چلو پھر مجھے بتاؤ کہ آپ کو کیا کیا لینا ہے۔"
"اوکے۔" اب صفا میرے ساتھ کپڑے پسند کر رہی تھی۔ "ایک اور بات صفا۔"
"جی انکل۔"
آپ کا جو پرانا اسکول ہے نا وہ ہمارے گھر سے بہت دور ہے۔"
"تو....." صفا کا لہجہ بدلا۔
"تو یہ کہ آپ روزانہ اسکول سے لیٹ ہو سکتی ہو۔ پھر آپ کو ٹیچر سزا بھی دے سکتی ہیں۔"
"میں جلدی چلی جاؤں گی۔"
"ہم م م م م..... لیکن میں لیٹ ہو جایا کروں گا پھر مجھے میرے باس سے ڈانٹ پڑا کرے گی۔"
"اوہو..... پھر؟" صفا نے تشویش سے کہا۔
"پھر یہ کہ اگر آپ گھر کے پاس والے اسکول میں چلی جاؤ تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ آپ سے اسی لیے کہا تھا لیکن آپ نے منع کر دیا۔"
"وہاں میرے فرینڈز ہیں۔ نئے اسکول میں وہ والے فرینڈز نہیں ہوں گے۔"
"آپ کو نئے فرینڈز بنانا کیسا لگتا ہے؟" منصور نے پوچھا۔
"وہ تو اچھا لگتا ہے لیکن....."
"چلو ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔" منصور نے مزید زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ صفا ان کے پوچھنے پر اپنی رائے دے رہی تھی یہی بہت تھا۔ کپڑے' کھلونے' جوتے وغیرہ لینے کے بعد ڈنر کر کے وہ لوگ واپس گھر جا رہے تھے کہ صفا بولی۔
" انکل! آپ جس اسکول میں میرا ایڈمیشن کروائیں گے میں وہاں چلی جاؤں گی۔"
"واقعی.....؟" میں نے پیچھے مڑ کر صفا کو دیکھا۔ یہ کیسے مان گئی۔ میں نے سوچا۔ جبکہ منصور زیرلب مسکرا کر کہنے لگے۔
"آپ کو کوئی پرابلم تو نہیں ہو گی بیٹا؟"
نہیں انکل۔"
منصور سمجھ گئے تھے کہ صفا کو کیسے ہینڈل کرنا ہے۔



صفا کا نئے اسکول میں ایڈمیشن ہو چکا تھا۔ چونکہ سال کے درمیان میں ایڈمیشن ہوا تھا اس لیے منصور نے ایک ہفتہ مانگا تھا تاکہ صفا کتابیں وغیرہ پڑھ لے کیونکہ اس کا پہلا اسکول اردو میڈیم تھا اور یہ اسکول انگلش میڈیم۔
صفا کا پچھلا ریکارڈ اچھا تھا اور کچھ منصور کے تعلقات کام آئے تو داخلے کا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ اس ایک ہفتے میں صفا نے مجھے ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ میں جتنا ابراہیم کے قریب ہونے کی کوشش کرتی' صفا اتنا ہی اسے ساتھ ساتھ چپکا کر رکھتی۔ ابراہیم پہلے سے زیادہ بے تکلف ہوا تھا لیکن میں چاہتی تھی کہ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھے تو ایسا نہیں

ہو سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں بچے ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ ابھی یہاں سے چلے جائیں گے۔

مسز چودھری نے بھی خاص طور پر فون کیا۔ میں نے انہیں بھی بتا دیا کہ صفا مجھے ابراہیم کے زیادہ قریب نہیں ہونے دیتی۔

"وہ ایسی ہی ہے مسز منصور! ابراہیم کے لیے بہت اوور پروٹیکٹیو ہے۔ آپ یہ مت سمجھیں کہ وہ صرف آپ کے ساتھ ایسا کر رہی ہے۔"

اب میں تو ایسا ہی سمجھ رہی تھی۔ خیر مسز چودھری سے بات کرنے کے بعد میری آدھی الجھن دور ہو گئی۔ میری دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی جبکہ صفا میرے لیے معمہ بنی ہوئی تھی۔ ہر بات میں روک ٹوک کرتی تھی کہ یہ نہ کریں، وہ نہ کریں۔ میرے بھائی کو ایسے نہ پکڑیں، اس کو زیادہ چومیں نہیں، اس کو یہ کیوں کھلا دیا وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن منصور ابراہیم کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ کھیلتے کھیلتے اسے گدگدی کرنے لگے۔ صفا کمرے سے دوڑی دوڑی آئی۔

"انکل! میرے بھائی کو زیادہ گدگدی نہ کریں۔"

میں تو اب اس کی ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتی تھی لیکن منصور کے لیے صفا کی ہر بات ماننا فرض تھا جیسے۔

"اوکے نہیں کرتے۔" منصور نے فوراً ابراہیم کو گود سے اتار دیا۔

"لیکن آپ یہ بتاؤ کہ آپ کی اسکول کی تیاری کیسی ہے۔ آپ کو نئی بکس سمجھ میں آرہی ہیں یا ہیلپ چاہیے۔"

"نہیں، ہیلپ نہیں چاہیے۔ میں خود پڑھ لیتی ہوں۔" منصور اس کے اعتماد سے متاثر ہوئے۔

"ساری بکس سمجھ میں آتی ہیں۔ کبھی کوئی پرابلم نہیں ہوتی؟"

"آآآآآ .... ہو .... تی ہے لیکن پھر میں خود ہی سمجھ لیتی ہوں۔"

"ویری گڈ۔"

"انکل! اب میں اپنے بھائی کو لے جاؤں کمرے میں ...."

"اوکے۔" منصور نے ابراہیم کو بھیج دیا۔

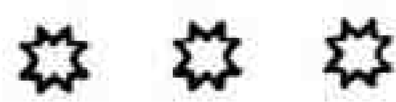
یہی بات مجھے پسند نہیں تھی کہ وہ ابراہیم پہ بہت حق جتاتی تھی اور مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ مجھے یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ دیکھو یہ صرف میرا ہے اس پہ میرے علاوہ کسی کا حق نہیں ہے۔ اسکول جانے سے ایک دن پہلے ایک صفحہ لے کر آگئی۔

"آنٹی! اس میں، میں نے ابراہیم کی سب پسند نا پسند لکھ دی ہے۔ آپ کو پرابلم ہوتی ہے نا ...." میں نے صفحہ دیکھا ٹوٹی پھوٹی اردو میں نکات کی صورت کافی کچھ لکھا گیا تھا۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" مجھے برا لگا۔

"آنٹی" آپ کو ہے۔ کل بھی آپ نے گوبھی کھلا دی تھی، اسے گیس ہو گئی تھی رات کو۔ اسکول جا کر بھی مجھے اس کی فکر رہے گی۔" منصور بھی سامنے ہی بیٹھے تھے مجھے صفحہ تھام لینے کا کہا۔ منصور سے اس کی کافی بے تکلفی تھی۔ مجھ سے وہ اکثر باتیں منصور کے سامنے ہی کرتی تھی۔ ورنہ اکثر خاموش ہی رہتی تھی۔

اب صفا اسکول جانے لگی تھی اور اس کے اسکول جانے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اب ابراہیم دن کا بڑا حصہ میرے ساتھ گزارتا تھا۔ اس طرح وہ روز بروز میرے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ صفا اسکول سے آکر کھانا کھانے کے بعد سو جاتی پھر اٹھنے کے بعد اپنی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی۔ ابراہیم کی طرف چاہ کر بھی وہ اس طرح دھیان نہیں دے پا رہی تھی جیسے وہ پہلے دیتی تھی اسی وجہ سے ابراہیم اب میرے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور میرا ابراہیم کے لیے پیار مزید بڑھ گیا تھا۔



ایک دن منصور نے اس سے کہا کہ وہ ہمیں ماما پاپا کیوں نہیں کہتی۔

"کیونکہ آپ میرے ماما پاپا نہیں ہیں۔" منصور کو کافی برا لگا لیکن وہ بہت تحمل سے بولے۔

"وہ تو ہم ابراہیم کے بھی نہیں ہیں لیکن وہ تو ہمیں

ماما پاپا ہی کہتا ہے۔"

"وہ تو میں نے اسے سکھایا تھا کیونکہ وہ ہر وقت ماما پاپا کے بارے میں پوچھتا تھا۔ جب ذاکر انکل نے ہمیں بتایا تھا کہ ہمیں یہاں آنا ہے تو پھر میں نے اسے بتایا کہ ہم ماما پاپا کے گھر جا رہے ہیں۔ اس نے ماما پاپا کو نہیں دیکھا ہوا نا۔" آخری جملہ اس نے منصور کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا کہ کہیں ابراہیم سن نہ لے۔ حالانکہ وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔

"بات تو پھر وہی ہے کہ آپ کیوں نہیں کہتیں۔"

"کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میرے ماما پاپا کون ہیں۔ مجھے ان کے علاوہ کسی کو ماما پاپا نہیں بنانا۔" بات کے اختتام پر وہ جذباتی ہو چکی تھی۔ منصور پہلے تو کچھ نہ بولے پھر بولے تو یہ کہ "چلو ٹھیک ہے لیکن آپ کا دوست تو بن سکتا ہوں نا۔" اور صفا نے ہاتھ ملا کر دوستی پکی کر لی۔

جب مجھے پتا چلا تو میں منصور پہ خفا ہوئی کہ انہیں سمجھانا چاہیے تھا کہ اب ہم ہی اس کے ماما پاپا ہیں۔

"شازمین! تم اپنے ماما پاپا کی جگہ کسی کو دے سکتی ہو کیا؟"

"میری بات اور ہے۔"

"ایک ہی بات ہے یار۔" منصور نے اتنا کہہ کر کروٹ بدل لی اور سو گئے اور میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

ویسے تو ذاکر انکل نے فون بھی کیا تھا لیکن ایک شام وہ خود ہم سے ملنے آ گئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ چھان بین کرنے آئے کہ ہم بچوں کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں۔ کچھ دیر نیچے بیٹھے رہے پھر بچوں کا کمرہ دیکھنے کے بہانے بچوں کو لے کر اوپر چلے گئے۔ میں نے اتنا دھیان نہیں دیا لیکن جب میں اوپر گئی کہ انکل کو ڈنر تک رکنے کا کہہ دوں تو انکل بچوں سے کرید کرید کر پوچھ رہے تھے کہ ان کو کوئی پرابلم تو نہیں ہے یہاں، وغیرہ وغیرہ مجھے بہت برا لگا لیکن جواب سن کر تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ابراہیم تو ابراہیم صفا بھی بہت خوش تھی۔ میری اور منصور کی تعریف کر رہی تھی۔ اور ابراہیم تو میرا فین نکلا۔ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ ماما اچھی ہیں، مجھے ٹافی دیتی ہیں۔ میرے ساتھ کھیلتی ہیں، وغیرہ وغیرہ مجھے بہت خوشی ہوئی میں چپکے سے نیچے چلی گئی۔

انکل رات کے کھانے تک رکے بلکہ وہ مجھ سے اور منصور سے بہت خوش تھے۔ بار بار مجھے اور منصور کو سراہ رہے تھے منصور بھی پھولے نہ سما رہے تھے۔

"ماشاء اللہ منصور! میں بچوں کو دیکھ کر بہت فخر محسوس کر رہا ہوں تم لوگوں پر۔ منصور! اللہ تم لوگوں کو جزا دے بہت نیکی کا کام ہے۔" ذاکر انکل کہہ رہے تھے۔

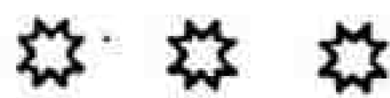
"بس انکل دعا کریں کہ ہم سرخرو ہو جائیں۔" منصور نے کسر نفسی سے کام لیا۔ اتنے میں ابراہیم منصور کے پاس وہ گاڑی لے آیا جو ذاکر انکل لے کر آئے تھے۔ صفا بھی اپنی گڑیا لے آئی۔

"یہ دیکھو اللہ نے رحمت اور نعمت ایک ساتھ بھیج دی۔" اس سے پہلے کہ منصور ابراہیم کو گود میں بٹھاتے، ذاکر انکل نے ابراہیم کو پکڑ لیا۔

"اب یہ دیکھو، ہمارا یہ بچہ تو بہت پیارا ہے۔ اللہ نے اس کو بہت محبت سے بنایا ہے۔ اسی لیے تو اس کو آغوش محبت اور آغوش رحمت دونوں میسر ہیں۔"

"آغوش محبت تو سمجھ میں آتا ہے یہ آغوش رحمت کیا ہے؟" منصور نے میرے منہ کی بات چھین لی۔

"آغوش محبت تو بھئی ہماری شازمین ہے اور آغوش رحمت تو یہ ہماری رحمت ہے، ہماری صفا بیٹی۔" صفا اس تعریف پہ جھینپ گئی جبکہ میں نے اور منصور نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں سکون و خوشی تھی۔



صفا کا نیا اسکول انگلش میڈیم تھا۔ شام میں جب وہ پڑھنے بیٹھتی تو میرے پوچھنے پر کہ اسے کچھ پوچھنا تو نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ کہتی کہ نہیں وہ کر لے گی۔ میں بھی مطمئن ہو جاتی۔ پندرہ دن تو یہ سلسلہ چلا اس کے بعد اس کے اسکول سے اس کی شکایت آ گئی۔

"صفا بیٹا! آپ کی ٹیچر نے شازمین سے آپ کی شکایت کی ہے آپ کو پتا ہے؟" رات کے کھانے کے بعد اب منصور صفا کی کلاس لے رہے تھے کیونکہ میں نے کافی کلاس لی تھی۔ جس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ میرے غصے' پیار' نرمی یا ڈانٹ کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ صفا نے سر جھکا لیا۔

"اگر آپ کو کسی سبجیکٹ میں پرابلم ہوتی ہے تو آنٹی سے پوچھ لیا کرو۔"

"مجھے آنٹی کو ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگتا۔" اس کی منمناتی آواز نکلی۔

"وہ آپ کے لیے فری ہیں ہر وقت۔ آپ جب چاہو ان سے ہیلپ لے لیا کرو۔ اوکے....."

"اوکے۔"

"اور آپ کی ٹیچر یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ کلاس میں کسی سے بات بھی نہیں کرتی ہو۔ ایسا کیوں؟"

صفا خاموش رہی۔

"صفا! بتاؤ بیٹا ایسا کیوں ہے؟" کچھ دیر وہ خاموش رہی۔ پھر بڑی مشکل سے بولی۔

"وہ سب بہت ڈفرنٹ ہیں۔"

"ڈفرنٹ کی کیا بات ہے؟" اب یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ صفا نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر نظر جھکالی۔ منصور نے خاموشی اختیار کر لی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! آنٹی سے ہیلپ لے لیا کرو اور اب جاؤ۔" انہوں نے اس کے سر پر پیار کر کے اسے بھیج دیا۔

"ذرا توجہ دیا کرو اس پر بھی۔" اب منصور کی توپوں کا رخ میری طرف ہو چکا تھا۔

"میں اس سے پوچھتی ہوں روز کہ جو پوچھنا ہے پوچھ لے لیکن وہ کہتی ہے اسے ضرورت نہیں۔"

"تم سے ہچکچاتی ہے ذرا۔ تم فاصلے ختم کرنے کی کوشش کرو ذرا' دیکھنا وہ بھی تکلف ختم کر دے گی۔"

"میں کوشش کرتی ہوں منصور! لیکن اس کا نخرہ ہی ختم نہیں ہوتا۔"

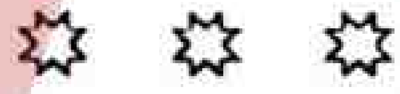
"شازمین! میرے سامنے کی بات ہے کہ تم ہر وقت ابراہیم کے ساتھ ہوتی ہو۔ تمہاری ساری توجہ' سارا پیار صرف ابراہیم کے لیے ہے۔"

"منصور! میں اس پر بھی توجہ دیتی ہوں۔ وہ خود مجھے قریب نہیں آنے دیتی۔"

"وہ تو تکلف برتے گی ہی کیونکہ وہ اب تک اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتی۔" منصور کے لہجے میں تلخی گھلتی گئی۔

"تو کس نے کہا ہے اس سے کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے۔ اب وہ ایسا سمجھتی ہے تو میں کیا کروں۔"

"شازمین..... تم' تم کچھ نہ کرو۔" منصور اتنا کہہ کر اوپر کمرے کی طرف چل دیے جبکہ میں لاؤنج میں اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ صفا کی وجہ سے ہر ایک دو دن بعد میری اور منصور کی بحث ہونا معمول بنتی جارہی تھی۔



میں سمجھتی تھی کہ بچوں کا شوق صرف مجھے ہے' منصور کو فرق نہیں پڑتا بچے کے ہونے نہ ہونے سے' لیکن میں غلط تھی۔ منصور کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ پہلے بھی مجھے وقت تو دیتے تھے لیکن زیادہ وقت ان کا ٹی وی کے آگے گزرتا تھا لیکن بچوں کے آنے کے بعد سے تو ان کی معمولات بالکل ہی بدل گئے تھے۔ اب آتے ساتھ ہی وہ ابراہیم کے ساتھ لگ جاتے۔ صفا کو بھی ساتھ شامل کر لیتے۔ صفا بھی ان کے ساتھ خوش رہتی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد خود صفا کا ہوم ورک چیک کرتے تھے۔ اس سے اسکول کے حوالے سے پوچھتے' اس کی فرینڈز کے بارے میں بات کرتے۔

اب صفا خود منصور سے اپنی باتیں ڈسکس کرتی تھی کہ کس مضمون میں کیا مسئلہ ہے۔ کس کلاس فیلو نے اسے کیا کہا وغیرہ وغیرہ۔ اب میں صفا کی طرف سے کم از کم اس حوالے سے بے فکر تھی کیونکہ اور بہت سے معاملات تھے جن کی طرف سے مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت تھی۔ جب تک صفا پڑھائی میں الجھی تھی' ابراہیم کی طرف زیادہ دھیان نہیں تھا۔ لیکن آپس کی بات ہے مجھے تو تب بھی لگتا تھا کہ ابراہیم کے لیے کچھ

زیادہ ہی حساس ہے صفا لیکن میرا خیال غلط تھا۔ کیونکہ جب سے منصور نے اسے پڑھانا شروع کیا تھا تب سے اس کی فکر ختم ہو گئی تھی اور ابراہیم کی جانب اس کا دھیان پھر پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اب تک جو ایک تکلف کا دورانیہ تھا' وہ ختم ہو چکا تھا یا یوں کہہ لیں کہ میرا ٹرائل پیریڈ ختم ہو چکا تھا۔ بقول صفا ابراہیم کافی حد تک بگڑ چکا تھا کیونکہ وہ اب صفا کی بات پہلے کی طرح نہیں مانتا تھا۔ ضدی بھی ہو گیا تھا۔

ایک دن میرے پاس آئی۔ اتوار کا دن تھا اور میں منصور کے لیے خود ان کا من پسند اٹالین لنچ تیار کر رہی تھی۔ نورین پاستا ابال رہی تھی اور میں ٹرامیسوا سیمبل کر رہی تھی۔

"آنٹی! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" میرے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ ایک مرتبہ پہلے بھی وہ میرے پاس اسی طرح آئی تھی اور میرے صبح دیر سے اٹھنے پر اعتراض کیا تھا۔ جس کے بعد منصور نے صبح جلدی اٹھ کر صفا کو تیار کر کے اسکول بھیجنا' میری ڈیوٹی میں شامل کر دیا تھا۔ میں نے کافی شور مچایا تھا لیکن سب نے صفا کی طرف داری کی تھی' ممانی تک نے فون کر کے ایک ہدایت نامہ جاری کیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں اب اسے زیادہ لفٹ نہیں کرواتی تھی۔

"ابراہیم کو الفابیٹس کی پہچان نہیں رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اسے اگلے سال داخل کروانا ہے تب تک ہو جائے گی۔"

"لیکن پہلے تو اسے "جے" تک پہچان تھی۔"

اب یہ بات تو میں نے بھی نوٹ کی تھی کہ ابراہیم اب کھلونوں سے کھیلنا زیادہ پسند کرتا ہے اور پہلے سے زیادہ ضدی بھی ہو گیا ہے لیکن میں اس بات کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میں اس وقت مصروف ہوں پھر بات کرتے ہیں۔" صفا باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ابراہیم کے چیخنے کی آواز آنے لگی۔

"ماما... ماما..." اب وہ رو رہا تھا۔

"کیا ہوا میری جان...." میں نے ابراہیم کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپی...." میں نے صفا کی طرف دیکھا۔ وہ سکون سے کھڑی تھی۔

"میرا ٹیبیٹ (ٹیبلٹ) لے لیا.... آپی دو۔"

"صفا! آپ نے اس کا ٹیبلٹ لیا ہے۔" میں اپنا ٹیبلٹ اکثر ابراہیم کو دے دیتی تھی جس پہ وہ کارٹون وغیرہ دیکھتا تھا۔

"جی...."

"آپ ابھی اس کو دے دو۔ بعد میں آپ لے لینا۔"

"مجھے نہیں چاہیے۔"

"تو پھر لیا کیوں ہے؟" میرا لہجہ سخت ہوا کیوں کہ یہ مجھے ستانے والی بات تھی۔

"اس کی آئی سائٹ ویک ہو جائے گی۔"

"نہیں ہوتی' واپس کرو۔"

"میری ٹیچر نے بتایا تھا اور ان ہی چیزوں کی وجہ سے یہ غصہ بھی زیادہ کرنے لگا ہے۔" بڑے اطمینان کے ساتھ میری معلومات میں اضافہ کیا گیا تھا۔ میرے لیے غصہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

"صفا...." میں دھاڑی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اس نے ٹیبلٹ واپس کر دیا اور واش روم میں چلی گئی۔ میں نے ابراہیم کے آنسو صاف کیے اور ٹیبلٹ اسے پکڑا دیا۔

"تھینک یو ماما۔" ابراہیم نے خوش ہو کر مجھے گلے لگایا۔

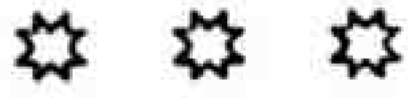
"لیکن دس منٹ بعد میں لے لوں گی...."

"اوکے...." اس نے سر ہلایا۔ میں واپس کچن میں چلی گئی۔ منصور اس قصے سے لاعلم تھے۔ لنچ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ الفریڈو پاستا انہیں بہت پسند تھا۔

"چکن پامیجان بھی بنایا ہے۔" میں نے ڈش آگے کرتے ہوئے بتایا۔ انہوں نے اپنی پلیٹ میں ڈالنے کے بعد صفا کی پلیٹ میں ڈالا جبکہ میں ابراہیم کو کھلانا شروع کر چکی تھی۔

"صفا! اک اسٹڈی کے ٹیسٹ کی تیاری ہوگئی کیا؟"
"جی انکل۔"
"میں ٹیسٹ لوں گا کھانے کے آدھے گھنٹے بعد۔"
"اوکے۔" صفا کی تیاری بھی اچھی تھی شاید اس نے بھی ہامی بھرلی۔ صفا کی یہ بات اچھی تھی کہ وہ شکایت نہیں لگاتی تھی نہ ہی رو رو کے متوجہ کرتی تھی۔

"ماما اور رررررر۔" میں جو ڈر رہی تھی کہ میری شکایت لگے گی تو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں ابراہیم کو کھانا کھلانے لگی۔
"ابراہیم! اپنے ہاتھ سے کھاؤ۔" صفا کے کہنے پر منصور بھی ابراہیم کو دیکھنے لگے۔
"میرا بیٹا اب خود کیوں نہیں کھانا کھاتا۔"
"ماما سے کھانا ہے۔" ابراہیم نے پاستا سے بھرے منہ سے بتایا۔
"بیٹا جی' خود کھایا کرو۔ آپ کی ماما کو آپ کے ٹیبل مینرز بہت پسند آئے تھے۔" منصور نے پچھلا حوالہ دیا۔
"وہ پہلے کی بات تھی۔ اب تو مجھے ابراہیم کو خود کھلا کر اور اس کے کام خود کر کے دلی خوشی ملتی ہے۔" میں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک ساتھ اپنی آنکھیں ادا سے جھپکائیں اور میں نے بھی آنکھیں اسی طرح جھپکائیں۔
یہ ہم ماں بیٹا کا اسٹائل تھا۔
کھانے کے بعد صفا کا ٹیسٹ ہوا جو کہ اچھا ہوا۔ اس کے بعد منصور اس کی اسکول ایکٹیویٹیز کے بارے میں پوچھتے رہے اسے کسی تقریری مقابلے میں حصہ لینے کی ترغیب دیتے رہے پھر خود تقریر لکھنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ باہر گھومنے چلے گئے۔ رات میں ماموں ممانی سے بات ہوئی۔ وہ مجھے کافی سراہ رہے تھے کہ میں نے بہت اچھا ہینڈل کیا ہے سب کچھ۔ ابراہیم اور صفا کی صحت بھی ایک مہینے بعد ہی کافی اچھی ہوگئی تھی۔ میں ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ بچوں کے آنے کے بعد مجھے کافی تبدیل ہونا پڑا تھا۔ پہلے میں اتنی ذمہ دار نہیں تھی نہ ہی کبھی مجھے کسی نے احساس دلایا تھا۔ لیکن اب دو بچے تھے تو ذمہ داری بھی خود بہ خود آگئی تھی۔ پہلے کچن میں جانا مشکل لگتا تھا اب اکثر ہی ابراہیم کے لیے کچھ نہ کچھ پکاتی رہتی تھی پھر منصور کی پسند کا بھی خیال رکھنے لگ گئی تھی۔ ہم پرفیکٹ فیملی ــــ بنتے جارہے تھے۔ بس صفا کا معاملہ الگ تھا ہم سے میں بڑی کوشش کررہی تھی لیکن وہ پھر بھی ہمارے پرفیکٹ فیملی فوٹو میں جگہ نہیں بنا پارہی تھی۔



اگلے دن سے صفا صحیح معنوں میں میدان میں آگئی تھی۔ اسکول جاتے ہوئے وہ ابراہیم کو جگا کر گئی تھی۔ اسے بھی دیر سے اٹھنے کی عادت پڑ چکی تھی جو صفا بدلنا چاہتی تھی۔ میں صفا کو بھیج کر سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ ابراہیم میرے پاس آگیا۔
"ماما۔۔۔ بنانا۔۔۔"
"آپ جاگو' اتنی جلدی اٹھ گئے۔"
"آپی نے اٹھا دیا۔" میں ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی۔ کیونکہ وہ اب دو تین گھنٹوں سے پہلے سونے والا نہیں تھا۔ مجھے بھی نیند قربان کرنی پڑی۔ اسکول سے آکر کھانا کھانے کے بعد وہ سونے کے بجائے ابراہیم کو لے کر بیٹھ گئی۔
"آؤ ہم کلر سورٹنگ کریں۔" ابراہیم بھی فوراً بیٹھ گیا۔
"ریڈ کلر اور ریڈ بلاک کو ریڈ پیالی میں رکھو۔" ابراہیم نے دو مختلف رنگوں کے بلاک اور کلر پنسل کو ریڈ پیالی میں رکھا یعنی وہ رنگوں کی پہچان بھی بھول چکا تھا۔ میں جو دروازے کی اوٹ میں کھڑے سب دیکھ رہی تھی شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی کیونکہ وہ جب یہاں آیا تھا تو اسے تین سے چار رنگوں کی پہچان تھی جو کہ صفا نے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ میں نے سکھایا ہے۔ میں جانتی تھی کہ ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ بچے بھول جاتے ہیں اور پھر سیکھ جاتے ہیں

لیکن ابراہیم میرے پیار میں بگڑ رہا تھا اور یہ بات میں قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔
"یہ دیکھو ابراہیم! یہ ہے ریڈ کلر اور یہ ریڈ بلاک ہے۔" لیکن ابراہیم اب دوسرے بلاکس کو جوڑنے میں مگن ہو چکا تھا۔ صفا نے پھر اس کو متوجہ کرنا چاہا لیکن اب وہ اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ ایک دو بار صفا کے مزید کہنے پر وہ چڑ گیا اور سارے بلاکس اٹھا کر پھینک دیے۔
"میں ماما کو بلاؤں گا۔"
"چلو باہر چل کر کھیلیں۔" صفا نے بڑے آرام سے کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ابراہیم بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پھر پوری شام صفا ابراہیم کے ساتھ ساتھ ہی رہی۔ میرے کہنے کے باوجود اس نے اپنا ہوم ورک نہیں کیا۔ میں اب اس کے کاموں میں دخل نہیں دیتی تھی۔ ویسے بھی منصور خود ہی پوچھ لیتے اور منصور نے رات کے کھانے کے بعد پوچھ ہی لیا۔
"میں کرلوں گی۔"
"کب کرو گی؟"
"ابراہیم کے سونے کے بعد۔"
"تو پھر آپ کب سوؤ گی۔"
"میں... ہوم ورک کرنے کے بعد۔" صفا سوچ کر بولی۔
"پھر اسکول سے لیٹ ہو جاؤ گی اگر رات کو دیر تک جاگو گی تو۔" اب صفا خاموش تھی۔
"یہ بتاؤ کہ شام کو کیوں نہیں کیا؟"
"میں ابراہیم کی روٹین ٹھیک کر رہی تھی۔"
"ابراہیم کی روٹین کو کیا ہوا ہے؟" منصور نے حیرانی سے پوچھا۔
"خراب ہو گئی ہے۔" ایک تو یہ لڑکی، میں اندر ہی اندر تاؤ کھا کر رہ گئی۔
"کیا خرابی ہو گئی ابراہیم کی روٹین میں..." منصور کو صفا کی ایسی باتوں پہ بہت ہنسی آتی تھی۔
"اب وہ لیٹ اٹھتا ہے۔ سوتا بھی دس بجے ہے۔ اسے بی سی بھول گیا ہے۔ کلرز کی بھی اب پہچان نہیں رہی۔"
"اور..." منصور کو بھی مزہ آرہا تھا۔
"ضدی بھی ہو گیا ہے۔ میری بات نہیں مانتا۔ پہلے ایک دو گھنٹے کھیلتا تھا اب ہر وقت کھیلتا ہے یا پھر ٹیبلٹ پر کارٹون دیکھتا رہتا ہے۔"
"اور..." منصور نے صفا کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
"اور... بس۔"
"اور یہ کہ آپ چاہتی ہو کہ ابراہیم پہلے کی طرح ہو جائے۔ وقت پر اٹھے، وقت پر سوئے، کھیلے کودے، کھائے پیے، سب کام وقت پر۔"
"جی!" صفا نے زور و شور سے ہاں میں سرہلایا۔
"یہ تو نہیں ہو سکتا۔" منصور نے نفی میں سرہلایا۔
"کیوں؟"
"کیونکہ اب آپ لوگ گھر میں رہتے ہو۔ کسی ہاسٹل میں نہیں اور گھر میں جب جس کا جو دل چاہے، وہ کر سکتا ہے۔ ابراہیم کا جب کھیلنے کا دل چاہے گا وہ کھیلے گا۔ جب سونا چاہے گا وہ سوئے گا۔" صفا اب منصور کو کچھ ناراضی سے دیکھ رہی تھی۔
"ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔ صفا بیٹا! آپ یہاں ایک مہینے سے ہو اور اب ہمیشہ یہیں رہنا ہے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو اور یہ دیکھو یہ میرا شہزادہ۔" منصور نے ٹی وی دیکھتے ابراہیم کو، جو ان کے پاس ہی بیٹھا تھا گود میں بٹھایا۔
"یہ اس بات کو سمجھ گیا ہے۔ یہ گھر ہم سب کا ہے۔ یہاں کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہمارا جو دل چاہے گا ہم کریں گے۔" منصور نے ابراہیم کو گدگداتے ہوئے کہا اور اس کی ہنسی سے میرا گھر گونج اٹھا۔ میں مطمئن ہو کر کچن میں چلی گئی۔
"جیسے میں اپنے گھر میں رہتی تھی۔" منصور نے صفا کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو دیکھا۔
"ہاں بیٹا! جیسے آپ اپنے گھر میں رہتی تھیں اور اب یہ آپ کا گھر ہے۔"

"لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"کیا اچھا نہیں لگتا آپ کو۔" منصور کو اسی لمحے احساس ہوا کہ بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا باپ کے بس کی بات نہیں ہے۔

"مجھے لگتا ہے' یہ میرا گھر نہیں ہے۔ میرا بھائی بھی چھن گیا ہے' مجھ سے یہاں آکر۔"

"آپ کے بھائی کو کسی نے نہیں چھینا آپ سے۔" منصور نے تصحیح کی۔

"آنٹی نے چھین لیا ہے۔ اب ابراہیم ہر وقت ان کے پاس ہوتا ہے۔ ان کی بات مانتا ہے۔ میری بات نہیں مانتا۔ میں نے اسے اتنا کچھ سکھایا لیکن یہاں آکر یہ سب بھول گیا۔ پہلے ہر وقت میرے ساتھ ہوتا تھا۔ اب میری پرواہ بھی نہیں کرتا۔"

"لیکن سوتا تو آپ کے ساتھ ہی ہے۔ آپ کی آنٹی نے کوشش بھی کی کہ ابراہیم ان کے ساتھ سوئے لیکن وہ آپ کے بغیر نہیں سوتا۔" منصور نے صفا کے عدم تحفظ کو ختم کرنا چاہا۔

"میرے ماما پاپا نے کہا تھا' ابراہیم کا خیال رکھنا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"ابراہیم آپ کا بھائی ہے۔ اس پر سب سے زیادہ حق بھی آپ کا ہے۔ ہم سب مل جل کر رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کوئی کسی کو کسی سے چھین نہیں رہا۔ اور آپ ایسا سوچنا چھوڑ دو بیٹا اور اب جلدی سے اپنا بیگ لے کر آؤ۔ آج میرے سامنے بیٹھ کر ہوم ورک کرو۔"

☆ ☆ ☆

"شازمین! تم صفا کو بھی اسی طرح پیار کیا کرو' جس طرح ابراہیم کو کرتی ہو۔" میں جو سونے ہی والی تھی' منصور کی بات سن کر تڑپ اٹھی۔

"منصور! میں اس کے قریب ہونے کی کوشش بھی کرتی ہوں تو وہ خود پیچھے ہٹ جاتی ہے۔"

"وہ ہچکچاتی ہے اس لیے ایسا کرتی ہے۔ اب دیکھو' میرے ساتھ بھی پہلے ایسا ہی کرتی تھی لیکن اب بہت بے تکلف ہو گئی ہے۔"

"پتا نہیں..... جیسا چل رہا ہے' چلنے دیں۔"

"ایسا زیادہ دیر تک نہیں چلے گا۔ اگر اسے اس گھر میں اپنائیت نہ ملی تو وہ ابراہیم کو لے کر چلی جائے گی ایک دن۔"

"ایسے کیسے چلی جائے گی؟ اگر جانا چاہے گی تو خود جائے گی' ابراہیم یہیں رہے گا۔"

"غلط بات مت کرو شازمین' میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ صفا کو اپنا بناؤ اور تم اس کے گھر سے جانے کی باتیں کر رہی ہو۔"

"تو اور کیا کروں' صفا کو لے کر ہر دوسرے روز آپ مجھے ڈانٹ رہے ہوتے ہیں' یہ مت کرو' صفا کو برا لگے گا۔ وہ مت کہو اسے۔ یہ کرو' وہ نہ کرو۔ میں تنگ آ گئی ہوں منصور۔" میں بھی غصے میں آ گئی۔

"شازمین! بڑے بچے ایڈجسٹ ہونے میں وقت لیتے ہیں۔ میں جتنا چاہتا ہوں کہ تم اس بات کو سمجھو' تم اتنا ہی خود بچی بنتی جا رہی ہو۔" منصور کی آواز بھی اونچی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے۔ وقت لیتے ہیں لیکن ایڈجسٹ ہو جاتے ہیں' ابراہیم بھی ہو گیا ہے تو وہ کیوں نہیں ہو رہی۔"

"ہر بچہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر وہ ابراہیم سے کافی بڑی ہے۔ اس کو زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔"

"اور کتنی توجہ دوں میں اسے۔ چلو ٹھیک ہے' میں اسے توجہ دیتی ہوں لیکن اس سے بھی کہو کہ مجھے جج کرنا چھوڑ دے' ہر بات پہ مجھے ٹوکا نہ کرے۔ ابراہیم پہ تسلط جما کر نہ رکھا کرے۔" میں بھی چڑی بیٹھی تھی۔

"لو یہ اچھی کہی تم نے کہ وہ تسلط جما کر رکھتی ہے۔ اسے تم سے یہ شکایت ہے کہ تم نے اس کے بھائی کو چھین لیا ہے اس سے۔"

"میں نے..... یعنی میں نے ابراہیم کو چھین لیا ہے' حد ہے الزام تراشی کی۔"

"تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو شازمین۔"

"کیا سمجھوں۔۔۔ کچھ نہیں سمجھنا مجھے۔" میں غصے سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے' حالات خراب ہو رہے تھے' میرے اور صفا کے درمیان سرد جنگ جاری تھی' جسے وہ خود ہوا دے رہے تھی۔ ایک مرتبہ پھر وہ ابراہیم پہ مسلط ہو چکی تھی۔ لیکن اب ابراہیم مجھ سے زیادہ قریب ہو چکا تھا اس لیے اس کی زیادہ بات نہیں مانتا تھا۔ اس بات سے وہ اور بھی چڑ جاتی تھی۔ ایک دن مجھے تھوڑی دیر کے لیے مارکیٹ جانا تھا میں نے سوچا کہ منصور کے آنے کا بھی ٹائم ہونے والا ہے تو اکیلی ہی چلی جاتی ہوں لیکن اس سے پہلے کہ میں نکلتی ابراہیم نے مجھے دیکھ لیا اور میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں اسے ساتھ لے کر جاؤں۔ میں نے ہامی بھرلی۔ اور ہم چلے گئے۔ میں نے خریداری مکمل کی تو مارکیٹ میں ایک دوست مل گئی اور میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی چنانچہ مجھے واپسی میں دیر ہو گئی۔ خیر گھر پہنچی تو منصور آچکے تھے۔ مجھے تسلی ہو گئی کہ صفا کو زیادہ دیر اکیلے نہیں رہنا پڑا۔ اندر گئی تو منصور تو نہیں تھے البتہ صفا لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ نورین بھی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ہمیں اندر آتا دیکھ کر بھاگ کر آئی۔ شکل سے بھی روئی ہوئی لگ رہی تھی۔

"آپ کہاں لے کر گئی تھیں میرے بھائی کو۔"

میں اور ابراہیم اپنی دُھن میں آئے تھے میں تو گھبرا ہی گئی۔

"باجی! وہ ہم نے کافی فون کیے' آپ نے اٹھایا ہی نہیں۔" نورین نے فوراً" آگے بڑھ کر وضاحت کی۔

"آپ کیسے میرے بھائی کو لے کر جا سکتی ہیں۔" صفا زور سے بولی۔

"کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ نورین! کیا ہوا ہے' منصور کہاں ہیں۔" میں نے پہلے اسے دیکھا پھر نورین سے پوچھا۔

"وہ صاحب تو اپنے کمرے میں گئے ہیں۔ ان کا کوئی ضروری فون آنا تھا تب سے باہر ہی نہیں آئے۔"

"اوہ۔۔۔ اچھا۔" میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ صفا نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ میں آگے بڑھنے لگی کہ صفا نے زور سے ابراہیم کو پکڑ کر کھینچا۔

"کہاں گئے تھے؟" وہ اس اُفتاد کے لیے تیار نہیں تھا اسی لیے گر گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے صفا!" لیکن وہ ابراہیم سے پوچھ رہی تھی۔

"کہاں گئے تھے تم؟"

"میرے ساتھ گیا تھا۔" میں نے ابراہیم کو اٹھایا۔

"آپ میرے بھائی کو لے کر کیسے جا سکتی ہیں۔"

آج صفا کی بدتمیزی عروج پر تھی۔

"جاؤ یہاں سے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو۔" اس نے ابراہیم کو کھینچنا شروع کر دیا۔ ابراہیم نے رونا شروع کر دیا۔

"پیچھے ہٹو۔" میں نے ابراہیم کا ہاتھ چھڑا کر اسے پیچھے دھکیلا اور اس کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے پاس پڑے آرائشی گل دان کو ٹھوکر مار کر گرا دیا اور وہ ٹوٹ گیا۔ صفا کا یہ روپ نیا تھا میرے لیے۔ میں نے اسے کھینچ کر ایک تھپڑ لگا دیا۔ اسی وقت منصور شور کی آواز سن کر باہر آئے۔

"شازمین۔۔۔" وہ زور سے دھاڑے۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" صفا منصور کو آتا دیکھ کر ان کے پاس بھاگی۔

"آپ نے یہ تو دیکھ لیا کہ میں نے کیا کیا لیکن یہ نہیں دیکھا کہ آپ کی لاڈلی نے کیا کیا ہے؟" میرا پارہ مزید چڑھ گیا۔ منصور نے نورین کی طرف دیکھا۔

"وہ صاحب! باجی ابراہیم کو لے کر باہر گئی تھیں۔ صفا سو کر اٹھی تو پریشان ہو گئی کہ ابراہیم کہاں چلا گیا ہے۔ تب سے ہم باجی کو فون کر رہے ہیں لیکن باجی نے فون نہیں اٹھایا۔" منصور نے مجھے دیکھا۔

"میرا فون بیگ میں تھا' پتا نہیں چلا اور آپ کیوں مجھے اس طرح دیکھ رہے ہیں؟ یہ دیکھیں اس نے کتنی بدتمیزی کی ہے میرے ساتھ۔ کہہ رہی ہے کہ آپ

کہاں لے کر گئی تھیں میرے بھائی کو۔" میں نے صفا کی طرف دیکھا جواب منصور کے آنے کے بعد رونے کے شغل میں مصروف تھی۔

"وہ پریشان ہو گئی ہوگی۔ تم اسے بتا کر چلی جاتیں۔"

"فار گاڈ سیک منصور! اب میں اس بالشت بھر کی لڑکی سے پوچھ کر جایا کروں۔ آپ مجھ سے پوچھے جا رہے ہیں تم اس سے کیوں نہیں پوچھتے کہ اتنی بدتمیزی کر رہی تھی میرے ساتھ اور یہ واز بھی توڑ دیا اس نے۔" میری آواز بلند ہو گئی۔

"صفا کیوں کیا ہے یہ آپ نے۔" منصور نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا۔ صفا منصور کے پوچھنے پر گھبرا گئی کیونکہ اسے ہمیشہ منصور کی حمایت حاصل رہی تھی۔

"بتاؤ اب کیوں کیا ہے؟" میں نے صفا کو جھنجھوڑا۔

"پیچھے ہٹو شازمین کیا کر رہی ہو؟" منصور نے مجھے پیچھے کیا۔

"کیا مطلب کیا کر رہی ہوں۔ جتنے لاڈ سے پوچھ رہے ہیں وہ ضرور بتائے گی بھی۔"

"تو کیا اب جاہلوں کی طرح مارنا شروع کر دوں۔"

"اوہ تو میں اب جاہل ہو گئی ہوں۔" آج میری بھڑاس کو صحیح معنوں میں باہر آنے کا موقع ملا تھا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا لیکن جو بھی ہے، تمہیں اسے مارنا نہیں چاہیے تھا۔" ابراہیم نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا۔ میرا دماغ اور خراب ہو گیا۔

"اچھا!! آپ مجھ میں ہی ساری غلطیاں نکالیں۔ جب سے یہ آئی ہے یہی ہو رہا ہے۔ آپ کو ہمیشہ سے ہی لگتا تھا کہ میں بچے پالنے کی اہل نہیں ہوں اور اس نے آپ کی اس بات پہ مہر لگا دی۔"

"کیا بول رہی ہو شازمین..." منصور کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

"صحیح کہہ رہی ہوں ورنہ آپ اسے ڈانٹتے۔ اس کے سامنے مجھے بے عزت کر کے اسے شہ نہ دے رہے ہوتے۔"

"چپ کرو تم۔" منصور دھاڑے۔ "نورین! صفا اور ابراہیم کو کمرے میں لے کر جاؤ۔" نورین جواب تک حیرت کا بت بنی کھڑی تھی کیونکہ وہ میری شادی کے وقت سے یہاں تھی اور اس گھر میں یہ پہلا معرکہ تھا جو وہ دیکھ رہی تھی۔ منصور کی بات سن کر فوراً حرکت میں آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ بچوں کو لے کر جاتی میں نے صفا کو جھپٹ لیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟ اب پورا تماشا تو دیکھو۔ یہی چاہتی ہو نا کہ مجھے بے عزت کیا جائے۔"

"آ... نٹی... سوری... سوری... آئی ایم۔" صفا رو رو کر معافی مانگنے لگی۔ منصور نے کبھی مجھ سے اس طرح بات نہیں کی تھی جیسے اب کر رہے تھے۔

"چھوڑو اسے شازمین... میں کہہ رہا ہوں چھوڑو۔" لیکن میں ان کی بات نہیں سن رہی تھی۔ میں تو جذباتی تھی ہی، منصور بھی جذباتی ہو گئے۔ یکدم چٹاخ کی آواز آئی اور میں ہکا بکا منصور کو دیکھنے لگی۔ مجھے یقین ہی نہ آیا کہ منصور نے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا ہے۔ منصور کو بھی فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

"شازمین... میں..." منصور نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"دیکھو شازمین... میں، مجھے نہیں پتا چلا۔" اب انہوں نے مجھے کندھے سے پکڑ لیا۔

"آپ... منصور آپ...؟" میرے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ "اس کی وجہ سے..." میں نے صفا کو دیکھا جو رونا بھول کر ہمیں دیکھ رہی تھی جبکہ نورین ابراہیم کو گود میں اٹھا کر چپ کرا رہی تھی۔ اب وہ بھی ساکن ہو گئی تھی۔ اتنی بے عزتی تو میری کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی گھر کے نوکروں کے سامنے۔

"اس کی وجہ سے منصور! آپ نے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا۔" میں باز تو کیا آتی الٹا پاگل پن سوار ہو گیا۔

"ٹھیک ہے پھر میں جا رہی ہوں۔ مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔" میں باہر کی طرف بھاگی۔

منصور میرے پیچھے آئے۔ "شازمین! کہاں جا رہی ہو۔ بات سنو۔"

"مجھے اب اس گھر میں نہیں رہنا۔"

منصور نے مجھے بازو سے پکڑ کر روکا۔ "پاگل ہو گئی ہو۔ کہاں جاؤ گی۔"

"کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ آپ میری فکر نہ کریں۔"

"پلیز شازمین رک جاؤ۔ جو تم کہو گی وہی ہو گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' یا تو وہ رہے گی یا میں.... مجھے روکنا چاہتے ہیں تو اسے بھیجیں یہاں سے۔"

"کیا بات کر رہی ہو شازمین' وہ بچی ہے۔ وہ کہاں جائے گی۔"

"تو ٹھیک ہے' مجھے جانے دیں۔ میں جا رہی ہوں۔"

"فار گاڈ سیک یار! بچی مت بنو۔"

"میں بچی نہیں بن رہی ہوں۔ وہ فسادن بن رہی ہے۔" اس کے ذکر پہ پھر میرا غصہ بڑھنے لگا۔

"یا تو وہ رہے گی یا میں۔" اتنا تو مجھے پتا تھا کہ منصور کبھی مجھ سے دستبردار نہیں ہوں گے اور وہی ہوا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ پہلے اندر چلو۔ آرام سے بیٹھو پھر اس معاملے پر صبح بات کریں گے۔"

"نہیں ابھی فیصلہ ہو گا۔" میں اپنی ضد پر اڑی رہی۔

"لیکن وہ کہاں جائے گی۔" منصور نے بے بسی سے کہا۔

"جہاں سے آئی تھی وہیں جائے گی۔" "ٹھیک ہے اندر چلو۔" منصور نے غصہ پیتے ہوئے تحمل سے کہا۔

جب منصور مجھے لے کر لاؤنج میں آئے تو اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ نورین انہیں لے کر کمرے میں جا چکی تھی۔ مجھے صوفے پہ بٹھا کر منصور پانی لینے چلے گئے۔

"یہ لو پانی پیو۔" میری طرف گلاس بڑھایا۔

"میری بات کو ہلکا مت سمجھیے گا۔ میں سنجیدہ ہوں اس معاملے میں۔"

"شازمین! تمہیں مسئلہ کیا ہے اس سے۔" منصور پھر شروع ہو گئے۔

"منصور' وہ جس دن سے اس گھر میں آئی ہے ہم جھگڑ ہی رہے ہیں اور آج تو حد ہو گئی ہے۔ اب یہی ہوا کرے گا۔ وہ شکایت لگایا کرے گی اور آپ مجھے مارا کریں گے۔"

"میں معافی مانگتا ہوں تم سے۔ پلیز' اس بات کو چھوڑ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں' آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن وہ اب اس گھر میں نہیں رہے گی۔" میں اتنا اونچا اونچا بول رہی تھی کہ اب میری آواز پھٹ رہی تھی۔ "یا تو وہ رہے گی یا میں۔ ابھی فیصلہ کریں آپ۔"

"میں اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ معافی مانگے گی بلکہ وہ مانگ بھی رہی تھی۔"

"نہیں' مجھے اس کی معافی نہیں چاہیے۔ آپ مجھے بتائیں' نہیں تو میں جا رہی ہوں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو شازمین' تم کہیں جا سکتی ہو کیا یہاں سے' یہ تمہارا گھر ہے۔"

"تو ٹھیک ہے' وہ جا رہی ہے پھر ابھی اور اسی وقت۔"

"ٹھیک ہے' وہ جا رہی ہے لیکن ابھی نہیں.... رات ہونے والی ہے' صبح لے جاؤں گا اسے۔" منصور نے شکستہ لہجے میں کہا۔

اس رات ابراہیم کے سوا کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ میں نے ابراہیم کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ صبح ہوئی تو میں خلاف معمول جلدی اٹھ گئی۔

"اسے کہو تیار ہو جائے۔" میں نے نیچے جاتے ہوئے کہا۔

"ایک بار پھر سوچ لو شازمین۔" اور میں نے جس طرح منصور کو دیکھا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ اب منصور بچوں کے کمرے کے باہر کھڑے سوچ رہے تھے کہ اندر جا کر کیا کہیں۔ ساری ہمت مجتمع کر کے انہوں نے دروازہ کھولا تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ صفا اور ابراہیم تیار بیٹھے تھے اور ان کا سامان بھی پیک تھا۔ میرے پیچھے ہی نورین بھی داخل ہوئی۔

"صاحب! میں نے تو منع کیا تھا صفا بیٹا کو لیکن کل

جو باجی کہہ رہی تھیں اس کے بعد صفا بیٹا نے خود ہی سامان پیک کرلیا پھر مجھے بھی مدد کرنا پڑی۔" اب دونوں بچے تیار کھڑے تھے۔ صفا کی آنکھیں ۔۔۔ سوجی ہوئی تھیں جبکہ ابراہیم ہر بات سے بے خبر تیار کھڑا تھا۔

"انکل چلیں ۔۔۔" صفا نے ہی منصور کو پکارا۔

منصور کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"بیٹا! آپ کو کل اتنی بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"آئی ایم سوری میں آنٹی سے بھی سوری کرلوں گی۔ بس کل میں پینک ہوگئی تھی ابراہیم کو گھر میں نہ دیکھ کر۔" منصور نے ٹھنڈا سانس خارج کیا کیوں کہ جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔

"ناشتہ کرلیں پھر چلتے ہیں۔" منصور دونوں بچوں کو لے کر ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو میں وہاں پہلے سے ہی بیٹھی تھی۔

"نورین نے بتایا ہے کہ اس نے خود ہی سامان پیک کرلیا ہے۔" میں نے منصور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ناشتے کے بعد میں لے جاؤں گا۔"

"آئی ایم سوری آنٹی ۔۔۔" صفا کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔ میں نے اسے نظر انداز کیا اور ابراہیم کو ناشتہ کروانے لگی۔

"چلیں!" صفا اور منصور نے برائے نام ہی ناشتہ کیا تھا اور صفا کی پلیٹ بھی جوں کی توں ہی پڑی تھی۔

"چلیں۔" نورین سامان لے آئی۔ وہی دو بیگ تھے جو وہ ساتھ لائے تھے۔

"چلو ابراہیم۔" وہ ابراہیم کی انگلی پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ۔۔۔! یہ کہاں جارہا ہے۔" یہ تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔

"خود ہی تو کہا تھا کہ یہ چلے جائیں۔ اب جارہے ہیں۔"

"میں نے صفا کو جانے کا کہا تھا ابراہیم کو نہیں۔"

صفا جائے گی تو ابراہیم بھی جائے گا۔ یہ تو یقینی بات ہے۔" منصور نے وضاحت کی۔

"نہیں ابراہیم یہیں رہے گا۔ ابراہیم آپ ماما کے ساتھ رہو گے نا۔" میں نے ابراہیم سے پوچھا۔ اس نے ہاں میں سر ہلایا۔

"انکل ۔۔۔" صفا نے منصور کی طرف دیکھا۔

"نہیں شازمین! یہ ساتھ آئے تھے۔ اگر جائیں گے تو دونوں ہی جائیں گے۔"

"کیا بات کر رہے ہیں آپ! منصور، وہاں کیا مستقبل ہوگا اس کا۔ یہاں میں ہوں، آپ ہیں، اس کی اچھی تربیت ہوگی اور یہ اچھا پہنے گا، اچھا پڑھے گا۔ ابراہیم کو اور ٹوائز چاہئیں۔" میں نے منصور سے بات کرتے ہوئے ابراہیم سے کہا اور وہ خوش ہو کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"تو یہ سب باتیں تو صفا کے لیے بھی ضروری ہیں۔"

"انکل، چلیں ۔۔۔" منصور کی بات کاٹ کر صفا نے کہا۔

"ہاں بیٹا چلتے ہیں۔ ابراہیم چلو۔" منصور نے ابراہیم کو پکڑنا چاہا لیکن میں نے اسے خود میں بھینچ لیا۔

"نہیں منصور ۔۔۔ یہ کہیں نہیں جائے گا۔"

"انکل ابراہیم کو یہیں رہنے دیں۔" صفا کی رندھی ہوئی آواز آئی۔

"صفا! یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹا!" منصور کو یقین ہی نہ آیا اور سچ بات ہے کہ مجھے بھی نہیں آیا۔

"آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ابراہیم کو یہیں رہنا چاہیے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"منصور! جب اسے کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ کیوں منع کر رہے ہیں۔" میں نے منصور کی بات مکمل ہی نہیں ہونے دی کہ کہیں صفا کو وہ راضی ہی نہ کرلیں۔

"اللہ حافظ ۔۔۔" صفا نے آگے بڑھ کر ابراہیم کو گلے لگا لیا۔

ابراہیم کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ صفا ہمیشہ کے لیے جا رہی ہے۔ صفا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرا دل

ذرا نرم ہوا لیکن میں نے پھر خود پہ قابو پالیا۔ منصور نے مجھے کڑے تیوروں سے دیکھا اور صفا کو لے کر چلے گئے۔ اب یہ دوسرا جھٹکا تھا کیوں کہ اس طرح کے معاملات میں منصور اگر اڑ جاتے تو پھر کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ خیر جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ ورنہ میں تو فارم میں آنے ہی والی تھی۔

صفا پورے راستے روتی رہی منصور نے بھی اس کی دلجوئی نہیں کی نہ ہی یہ کہا کہ وہ ابراہیم کو جلد ہی اس کے پاس لے آئیں گے۔ ابراہیم میرے بہت قریب تھا اور میرے پاس زیادہ خوش رہنے والا تھا اسی لیے صفا اسے چھوڑ گئی تھی لیکن اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ منصور انکل اسے دلاسا دیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔

"صفا بیٹا، چلو اترو۔" اتنی جلدی" صفا نے سوچا اور باہر دیکھا۔

"انکل! یہ تو وہ جگہ نہیں ہے۔"

☼ ☼ ☼

ابراہیم کو تو جیسے صفا کے جانے سے کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا۔ ہمارے معمولات روزمرہ کی طرح چل رہے تھے۔ لیکن جیسے جیسے دوپہر ڈھلنا شروع ہوئی، ابراہیم نے صفا کا پوچھنا شروع کر دیا۔

"ماما آپی نہیں آئی۔" میں نے ایک دو دفعہ تو اسے ٹالا لیکن چوتھی مرتبہ پوچھنے پر میں نے اسے بتا ہی دیا۔

"ابراہیم! آپ کی آپی اب یہاں ہمارے ساتھ نہیں رہے گی۔"

"تیوں (کیوں)..." ابراہیم جھٹ بولا۔

"کیونکہ ان کو اپنی پرانی فرینڈز یاد آ رہی تھیں تو انہوں نے آپ کے پاپا سے کہا کہ انہوں نے اپنی فرینڈز کے ساتھ رہنا ہے۔ تو اب وہ ان کے پاس رہا کریں گی۔"

"نائٹ میں آئیں گی۔" ابراہیم کو شاید یقین نہیں آیا تھا۔

"نہیں میری جان! نائٹ میں بھی نہیں آئیں گی۔

اب میں، آپ اور پاپا ساتھ رہیں گے۔" میں نے اپنی طرف سے اسے سمجھا دیا تھا۔ پتا نہیں اس کی سمجھ میں آیا کہ نہیں۔

منصور گھر دیر سے آئے تھے اور میرے اندازے کے عین مطابق ناراض تھے۔ اب انہوں نے دو تین دن سے پہلے نہیں راضی ہونا تھا اسی لیے میں نے زیادہ پرواہ نہیں کی۔ رات کو میں نے سوچا کہ ابراہیم کو اپنے ساتھ ہی سلا لوں۔ لیکن وہ تو سونے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

آپی آپی کی رٹ لگا رکھی تھی اس نے پھر منصور کے پاس گیا۔

"پاپا! آپی کو لا دو۔" منصور نے ملامتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"وہ نہیں آئیں گی اب... اسے لے جاؤ یہاں سے۔" مجھے اور ابراہیم کو ایک ساتھ کہا گیا۔

میں ابراہیم کو لے کر اس کے کمرے میں چلی گئی اور سب سے پہلا خیال مجھے یہ آیا کہ اس کمرے کو پھر سے پہلے جیسا کر دینا۔ چاہیے صفا کا فرنیچر وغیرہ اٹھا دینا چاہیے۔ لیکن اگلے دن مجھے بالکل موقع نہیں ملا۔ کیونکہ اس رات ابراہیم نے مجھے خوب ستایا، وہ صفا کے ساتھ سونے کا عادی تھا۔ لیکن خود ہی ٹھیک ہو جائے گا' میں نے یہ سوچ کر وہ پوری رات ابراہیم کو سلانے کی تگ و دو میں گزار دی۔ فجر کے وقت جا کر وہ سویا اور میں بھی۔

اگلے دن بارہ بجے ہم اٹھے۔ دو تین گھنٹے تو وہ بھولا رہا لیکن تین بجتے ہی اس کی آپی آپی کی رٹ شروع ہو گئی۔ میں نے اور نورین نے بہت بہلایا لیکن وہ کسی طور قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں اسے لے کر پارک چلی گئی۔ وہاں بھی پوچھتا رہا کہ آپی کے پاس جا رہے ہیں۔ جھولے دیکھ کر تھوڑا بہل بھی گیا لیکن گھر آ کر پھر وہی رٹ لگا دی۔ منصور آج بھی دو تین گھنٹے لیٹ آئے۔ اس وقت تک میری بس ہو چکی تھی، عادت کے مطابق وہ جیسے ہی آئے میں شروع ہو گئی۔

"آج ابراہیم نے بہت تنگ کیا۔ میں تو تھک ہی

گئی۔"

"شناز میں مجھے اپنے معاملات سے دور رکھو۔" میں ابھی اور بھی بہت کچھ کہنے والی تھی کہ منصور نے مجھے ٹکا سا جواب دے دیا اور خود کمرے میں چلے گئے اور اس رات بھی کھانا نہیں کھایا۔ میں نے بھی غصے میں نہیں پوچھا۔

آج رات میں نے نورین کو بھی روک لیا تاکہ وہ ابراہیم کو میرے ساتھ سنبھال لے۔ اور اچھا ہی ہوا کہ روک لیا کیونکہ ابراہیم نے بہت تنگ کیا تھا اب تو وہ مسلسل رونے لگا۔ میں اور نورین اسے جتنا چپ کرواتے وہ اور گلا پھاڑ کر روتا۔ نورین کے اپنے بھی دو بچے تھے جنہیں وہ سنبھالتی تھی لیکن ابراہیم تو اس وقت اس سے بھی نہیں بہل رہا تھا۔ آخر رو رو کر چار بجے کے قریب خود ہی سو گیا۔ میں نے اور نورین نے شکر ادا کیا۔ نورین کو میں نے ابراہیم کے پاس ہی سونے کا کہا اور خود کمرے میں چلی گئی۔ صبح کے نو ہی بجے ہوں گے کہ نورین مجھے اٹھانے آگئی۔

"باجی اٹھیں ابراہیم کو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔"

"کیا...؟" میں کافی گہری نیند میں تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔

"ابراہیم کو ایک سو تین بخار ہو رہا ہے۔"

میں فوراً" اٹھی۔ "منصور کہاں ہیں؟"

"وہ تو جی سات بجے کے گھر سے نکل گئے ہیں۔"

"کیا؟ اتنی جلدی۔ انہوں نے ناشتہ کیا؟"

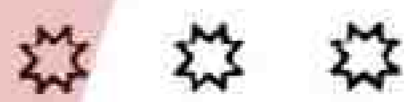
"نہیں جی میں اسی وقت اٹھی تھی۔ میں نے کافی کہا لیکن وہ کل کی طرح ناشتہ کیے بغیر ہی چلے گئے۔"

ایک تو یہ منصور بھی ناک پر غصہ تھوک بھی دیں۔ مجھے ہر کام میں منصور کی حمایت حاصل رہی تھی۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہوتے تھے لیکن اس دفعہ وہ میرے ساتھ نہیں تھے یہ مجھے پتا تھا لیکن سب الٹا ہو رہا تھا اور اسے سیدھا کرنے کے لیے منصور کہیں نہیں تھے۔ ابراہیم کو دیکھا تو وہ نیم بے ہوش تھا۔ اس کا سارا جسم تپ رہا تھا۔

"میں نے باجی پانی کی پٹیاں بھی رکھی ہیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑ رہا۔" میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے منصور کو فون کیا۔ وہ شاید میرے فون کو بھی نظر انداز کر رہے تھے۔ تیسری مرتبہ کرنے پر اٹھایا۔

ابراہیم کا فوراً" سے بتا کر میں نے فون بند کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد منصور گھر آگئے تب تک میں پانی کی پٹیاں رکھتی رہی تھی۔

"نورین! نیم گرم پانی جمع کر دو ٹب میں" ابراہیم کے کپڑے اتارتے ہوئے منصور نے کہا۔ اور ابراہیم کو پانی سے بھرے ٹب میں بٹھا دیا۔ ابراہیم پہلے کے مقابلے میں ذرا ہوش میں آچکا تھا۔ دس منٹ پانی میں بٹھا کر منصور نے اسے کپڑے پہنائے اور اسپتال لے گئے۔ میں بس ان کے ساتھ ساتھ تھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ منصور سب ٹھیک کرلیں گے۔



ابراہیم کا بخار تو دو روز بعد ٹھیک ہو گیا لیکن اب وہ پہلے جیسا ابراہیم نہیں رہا تھا۔ ہر وقت اداس رہتا اور صفا کو یاد کرتا رہتا تھا۔ میں نظر انداز کر رہی تھی۔ ظاہر ہے اس نے ہوش سنبھالتے ہی صفا کو دیکھا تھا۔ اب اتنا ری ایکشن تو سامنے آنا ہی تھا۔ کسی نے بھی اس معاملے میں مجھے کوئی لعنت ملامت نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ نورین جو اکثر اپنے مفت مشوروں سے مجھے نوازتی رہتی تھی وہ بھی خاموش تھی۔ ماموں، ممانی کا فون آیا۔ انہوں نے بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ بس یہ کہا کہ ان کا ارادہ بدل گیا ہے پاکستان آنے کا۔ مجھے پتا چل گیا کہ وہ انجان نہیں ہیں۔

میں نے کافی کوشش کی کہ اپنی دھن میں مگن رہوں لیکن میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا رہا کہ اس دن میں نے جو کیا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ بات اتنی نہ بڑھتی۔ اگر میں نہ بڑھاتی میں نے لاشعوری طور پہ ہی سہی لیکن وہ سب صفا سے پیچھا چھڑانے کے لیے کیا تھا۔ کیونکہ اس کا وجود میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چھوٹی سی بچی اپنی ذہانت کے بل بوتے پہ مجھے

چیلنج کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ ابراہیم کو کبھی میرا نہیں ہونے دے گی۔ میں چاہتی تھی کہ ابراہیم پورے کا پورا میرا ہو۔ جیسے میں منصور کو کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ میں اپنی محبتوں کے بارے میں بہت تنگ نظر اور تنگ دل تھی۔ حالانکہ محبت تو تقسیم کرنے سے ضرب کھاتی ہے۔

صفا کو گئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ ابراہیم بھی کسی حد تک نئے معمولات کا عادی ہو گیا تھا۔ منصور بھی پہلے کی طرح مجھ سے بات چیت کر رہے تھے۔ میں جیسا چاہتی تھی ویسا ہو گیا تھا۔ میں خوش رہنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ اپنے آپ کو خوب تاویلیں بھی دیں کہ میں نے جو کیا ٹھیک کیا لیکن پھر بھی کچھ تھا.... کوئی خلا تھا جو پُر نہیں ہو رہا تھا۔

میں کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ ذاکر انکل کی طرف ہو آؤں کیونکہ صفا جب سے گئی تھی میں نے نہ تو انہیں کوئی فون کیا تھا نہ ہی ان سے ملنے گئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ ناراض ہوں گے۔ میں بھی بہت شرمندہ تھی ان سے لیکن ایسا کب تک چل سکتا تھا۔ کچھ دن پہلے میں نے منصور سے ان کے بارے میں پوچھا تھا تو منصور نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سب جانتے ہیں۔ انہیں غصہ بھی بہت تھا لیکن منصور نے سب سیٹ کر دیا ہے بلکہ منصور تو ایک دو مرتبہ ان سے ملنے بھی گئے تھے۔ اس بات سے مجھے ذرا ڈھارس ملی تھی۔ ویسے بھی ان کی بہو سے میرے اچھے مراسم تھے۔ اگر زیادہ ناراض ہوئے تو اس سے بھی سفارش کروائی جا سکتی تھی۔ آج میں نے ہمت پکڑ ہی لی۔ منصور بھی پچھلے ایک مہینے سے دیر سے گھر آتے تھے تو شام کو میں فارغ ہی ہوتی تھی۔ اپنے دماغ کو یہ جواز پیش کیا کہ ابراہیم بھی وہاں جا کر ان کے پوتا پوتی سے کھیلے گا تو اچھا محسوس کرے گا۔

میں جب ذاکر انکل کے گھر پہنچی تو منصور کی گاڑی پہلے سے ہی وہاں کھڑی تھی۔ مجھے بہت برا لگا کہ اگر آنا تھا تو بتا دیتے ہم اکٹھے ہی آجاتے۔ میرے سامنے تو روز یہ رونا روتے تھے کہ کام کا بہت دباؤ ہے۔ خیر میں دروازے پہ پہنچی تو دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلی گئی۔ اندر سے ذاکر انکل کا پوتا شجی باہر آ رہا تھا۔ ابراہیم کی اس سے پہلی ملاقات تھی۔

"السلام علیکم آنٹی۔"

"وعلیکم السلام.... کہاں ہیں سب' باہر کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔"

"وہ منصور انکل آئے ہیں نا تو سب کو آئس کریم کھلانی ہے انہوں نے ہمیں نے باہر آئس کریم والے کو روکا ہوا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ایسا کرو ابراہیم کے لیے بھی لے آؤ۔" میں نے پیسے نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں آنٹی ایکسٹرا ہیں میرے پاس" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ میں لاؤنج میں داخل ہوئی تو محفل جمی ہوئی تھی۔ ابراہیم نے میری انگلی پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے سلام کیا تو سب میرے طرف متوجہ ہو گئے بلکہ متوجہ کیا ہوئے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ایک دم سے ابراہیم نے مجھ سے انگلی چھڑائی اور آپی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کچن کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے وہاں دیکھا اور صفا مجھے دیکھ کر وہیں رک گئی جبکہ ابراہیم اس سے جا کر لپٹ گیا۔ سب سے پہلے ذاکر انکل کی بہو کو خیال آیا۔

"آئیں شازمین! بیٹھیے۔" میں نے سب کی طرف دیکھا اور چل کر ایک صوفے پہ بیٹھ گئی۔ مجھے اپنا آپ بہت مس فٹ محسوس ہو رہا تھا۔ میرے آنے سے پہلے کافی شور مچا ہوا تھا اور مجھے دیکھ لینے کے بعد سب کے الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔ میں نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ وہ صفا سے چمٹا ہوا تھا اور صفا رو رہی تھی۔ میں آج بھی وہیں کھڑی تھی جہاں پہلے دن سے تھی۔ صفا کی جگہ ابراہیم کی زندگی میں جو تھی' وہ کبھی میری نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے منصور کی طرف دیکھا.... تو یہ تھا وہ ورک لوڈ جس کے لیے منصور صبح جلدی نکلتے تھے اور شام کو دیر سے آتے تھے۔

یک دم ہی مجھ پہ ایک حقیقت آشکار ہوئی تھی کہ

میں بالکل اچھی انسان نہیں ہوں۔ مجھے رشتے نہ تو بنانے آتے ہیں نہ ہی نبھانے آتے ہیں کیونکہ یہاں جو سب لوگ بیٹھے تھے' آپس میں رشتوں کی ڈور سے بندھے تھے۔ چار پلائی کی ڈور جس میں محبت' دوستی' یگانگت اور ہم رازی گندھے ہوئے تھے۔ کیونکہ صفا یہاں بڑے مالکانہ حقوق کے ساتھ رہ رہی تھی جبکہ میرے اور منصور کے رشتے کی ڈور صرف ایک پلائی تھی اور وہ تھی منصور کی محبت۔ میں نے تو ہمیشہ لیا ہی تھا ان سے.... کبھی کچھ دیا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اعتبار بھی نہ دے سکی تھی جو کہ میاں بیوی کے رشتے کی بنیاد ہوتا ہے۔

"شازمین! میں بہت دنوں سے تمہارا منتظر تھا۔" ذاکر انکل نے ہی بات کرنے میں پہل کی۔ "تم نے بہت دن لگادیے آنے میں۔"

"میں مصروف تھی۔" اس سے زیادہ میں کیا کہتی۔

"ہاں منصور نے بتایا تھا جب صفا سے ملنے آیا تھا۔ ماشاء اللہ صفا کے منتھلی ٹیسٹ میں بہت اچھے نمبر آئے ہیں۔ اسی کی خوشی میں منصور سب بچوں کو آئس کریم کھلا رہا ہے۔ دونوں باپ بیٹی نے محنت بھی بہت کی تھی۔" میرا سر جھکا ہوا تھا۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ اس وقت سب مجھے ہی دیکھ رہے ہیں۔

"صفا بہت اچھی بچی ہے۔ کچھ دن لگے مگر اب وہ ہم سب میں اس طرح گھل مل گئی ہے جیسے ہمیشہ سے یہیں رہتی ہو۔ ابراہیم کو بہت یاد کرتی ہے تم نے اچھا کیا کہ اسے ملوانے لے آئیں۔" میں نے کچن کی طرف دیکھا۔ اب بچے وہاں نہیں تھے۔

"اگر خود نہ آنا چاہو تو منصور کے ساتھ بھیج دیا کرو۔" میں نے تڑپ کے انہیں دیکھا.... کیا سب اس بات سے واقف تھے کہ میں نے صفا کو گھر سے کیوں نکالا۔ میں کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہی تھی بلکہ میں کسی قابل نہیں رہی تھی۔

"اب آگئی ہو تو رات کا کھانا کھا کر جانا۔" ذاکر انکل کہہ رہے تھے۔ میں خاموش تھی۔ تھوڑی دیر بعد سب نارمل ہوگئے۔ ابراہیم مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ سب باتوں میں مصروف تھے۔ ذاکر انکل اور ان کی بہو نے مجھے باتوں میں شامل کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس وقت کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

"میں کھانے کا انتظام دیکھ لوں ذرا۔" ذاکر انکل کی بہو کو میں نے کہتے سنا۔ منصور بھی ذاکر انکل کے بیٹے کے ساتھ سیاسی گفتگو کرنے لگے — جبکہ میں بت بنی بیٹھی تھی۔

"ارے بھئی' میری بیٹی کو تو تم لوگ بور کر رہے ہو چلو شازمین! ہم اوپر چلتے ہیں۔ تمہیں میری میوزیکل کلیکشن بہت پسند ہے نا' چلو آؤ' تمہیں کچھ سنواتا ہوں۔" میں انکار کرنا چاہتی تھی لیکن پھر ان کے پیچھے چل پڑی۔

اوپر کی منزل سے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ذاکر انکل مجھے اپنے چھوٹے سے آفس میں لے گئے۔

"یہ دیکھو' کون سی پسند ہے تمہیں...." انہوں نے کچھ ڈی وی ڈیز میرے آگے رکھیں۔ میں نے غائب دماغی سے ان ڈی وی ڈیز کو دیکھا۔

"منصور ایک صبح صفا کو لے کر آیا۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ صفا یہاں ہمیشہ کے لیے آگئی ہے۔" ذاکر انکل نے خود ہی بتانا شروع کیا۔ "میں نے منصور سے کچھ نہیں پوچھا۔ کیونکہ وہ بہت شرمندہ تھا' میں اسے مزید شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابراہیم تمہارے دل کی خوشی تھا' اس لیے اس گھر میں نہ صرف ایڈجسٹ کر گیا بلکہ تم نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا' اسے وہی حقوق دیے جو ایک بیٹے کے ہوتے ہیں۔ صفا ایک بوجھ تھی اور بوجھ ہی رہی۔" پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد بولے۔

"میری بہو نے بھی شور مچایا تھا صفا کے آنے پر لیکن میں نے کہا' صفا میری بیٹی ہے۔ اس گھر سے صفا جائے گی تو میں بھی جاؤں گا۔ اس بات پہ وہ خاموش تو ہوگئی لیکن دل سے راضی نہیں ہوئی لیکن صفا نے اپنی جگہ بنا ہی لی۔ روز اس کے پاس کچن میں جاتی ہے اور پوچھتی ہے کہ آنٹی آپ کی کچھ ہیلپ کرواؤں۔" ذاکر

انکل ہنسے... ایسی ہنسی جس میں دکھ نمایاں تھا۔
"صفا نے اس بات کو سمجھ لیا ہے کہ اس گھر میں جگہ بنانے کے لیے اسے خود کو کار آمد ثابت کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ دربدر ہو جائے گی۔ اسے آٹھ سال کی عمر میں ہی ادراک ہو گیا ہے کہ وہ کسی کی ضرورت تو بن سکتی ہے لیکن کسی کی خوشی نہیں بن سکتی۔" میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"پتا ہے شازمین! کچھ دن پہلے میرا بیٹا اور بہو ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ میں بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ کوئی ڈاکومنٹری تھی 'ایڈاپٹیشن' کے بارے میں۔ میرا بیٹا وہ اس لیے دیکھ رہا تھا تاکہ وہ ڈاکومنٹری وہ لوگوں کو دکھائے اور زیادہ لوگوں کو بچے ایڈاپٹ کرنے کے لیے راغب کر سکے۔ اس کے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ اس کا باپ ایک یتیم خانہ چلاتا ہے۔ خیر اس ڈاکومنٹری میں ایک یتیم بچہ دکھایا گیا تھا جسے ایک فیملی ایڈاپٹ کرتی ہے پھر کچھ عرصے بعد اسے اس کے ادارے کو واپس کر دیتے ہیں۔ پھر ایڈاپٹ کیا جاتا ہے اور واپس کر دیا جاتا ہے۔ لوگ اسے ایڈاپٹ کرتے ہیں اور واپس کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ بچہ بارہ سال کا ہو جاتا ہے۔ اس دوران وہ کئی گھر بدل چکا ہوتا ہے۔ آخر کار ایک خاندان اسے ایڈاپٹ کرتا ہے جن کے پہلے سے ہی دو بچے ہوتے ہیں' بیٹا اور بیٹی۔ اس گھر میں اسے کچھ وقت لگتا ہے لیکن وہ ایڈجسٹ کر ہی جاتا ہے۔ اپنی بہن سے اس کی کوئی خاص نہیں بنتی لیکن بھائی سے کافی دوستی ہو جاتی ہے۔ ایک دن وہ اپنے ماں باپ کو باتیں کرتا سن لیتا ہے کہ "لڑکے کا اس گھر میں رہنا اب ٹھیک نہیں ہے۔"
وہ دھتکار کا اتنا عادی ہو چکا ہوتا ہے کہ اگلی صبح خود ہی گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ اس کے ماں باپ کو جب پتا چلتا ہے کہ وہ بھاگ گیا ہے تو وہ اس کو ڈھونڈتے ———— ہیں۔ آخر کار اس کا بھائی اسے ڈھونڈ لیتا ہے۔ اور اس سے پوچھتا ہے کہ وہ گھر سے کیوں بھاگا تو وہ اسے ماں باپ کے درمیان ہونے والا مکالمہ سنا دیتا ہے' جس پہ وہ اس کی غلط فہمی دور کرتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی بیٹے کی بات کر رہے تھے جو کہ بیمار ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ اسے گھر کے بجائے اسپتال میں رکھیں۔ اس بات پہ وہ بچہ بہت شرمندہ ہوتا ہے۔ اپنے باپ کے پاس معافی مانگنے جاتا ہے تو اس کا باپ اسے ایک کہانی سناتا ہے۔ اور وہ کہانی سننا چاہو گی شازمین..." میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اس کا باپ اس سے کہتا ہے کہ تمہیں پتا ہے بچے کہ گھروں اور پارکوں میں جو پام کے درخت لگے ہوتے ہیں نا' ان کے بیج در حقیقت فارمز میں اگائے جاتے ہیں۔ جب وہ بیج تناور درخت بن جاتے ہیں تب انہیں کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ درخت کو جڑ سے اکھاڑا جاتا ہے اور اس کی شاخوں کو باندھ دیا جاتا ہے۔ مطلوبہ مقام پہ لے جا کر اسے دوبارہ زمین میں بو دیتے ہیں لیکن اس کی شاخوں کو نہیں کھولتے بلکہ بندھا ہی رہنے دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی شاخیں گل سڑ جائیں۔ ان کی نشوونما ہو اس طرح سے اس درخت کی جڑیں زمین میں پھیلتی ہیں۔ ایک مرتبہ اس کی جڑیں مضبوط ہو جائیں تو پھر گلی سڑی شاخیں جھڑ جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی شاخیں آجاتی ہیں۔ اور زندگی رواں دواں ہو جاتی ہے۔ لیکن... اگر شاخوں کو فوراً" کھول دیا جائے نا تو درخت کی جڑیں کبھی مضبوط نہیں ہوں گی بلکہ شاخیں پھلے پھولیں گی۔ بظاہر لگے گا کہ درخت پھل پھول رہا ہے لیکن وہ اندر ہی اندر مر رہا ہو گا۔ اور ایک دن مکمل ہی مر جائے گا۔ کیوں کہ اس کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہوں گی۔
یہ جو ایڈاپٹڈ بچے ہوتے ہیں نا' یہ پام کے درخت کی طرح ہوتے ہیں اور جو انہیں ایڈاپٹ کرتے ہیں یہ زمین ہوتے ہیں۔ شاخیں ان بچوں کی پچھلی یادیں ہوتی ہیں جنہیں مرنا ہی ہوتا ہے۔ مر ہی جانا چاہیے تاکہ نئی زمین کی نئی یادیں وجود میں آسکیں۔" کہانی ختم ہو چکی تھی۔ اور میں مسلسل رو رہی تھی۔
"میری بہو بھی ایسے ہی روئی تھی اور اگلے دن میں نے دیکھا کہ وہ صفا کو ڈانٹ رہی تھی۔" وہ پھر ہنسے۔ وہی دکھ والی ہنسی۔
"میں عدم تحفظ کا شکار ہو گئی تھی۔" میں نے

روتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔"

"میں نے اسے کبھی دل سے قبول ہی نہیں کیا۔"

"یہ بھی جانتا ہوں میں۔" ذاکر انکل کو میں نے کہتے سنا۔

"شازمین! تم ہی نہیں وہ بھی عدم تحفظ کا شکار تھی۔ اس نے بھی تمہیں کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ لیکن مسئلہ تب شروع ہوا جب تم بھی آٹھ سال کی بچی بن گئیں۔ تمہاری عمر، تمہارا تجربہ بڑا تھا۔۔۔ تمہارا ظرف بھی بڑا ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ خیر میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ میرے دل پہ ایک بوجھ تھا جو میں بانٹنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ صفا کو تم اپنے گھر لے کر جاؤ کیونکہ اس طرح بار بار گھر بدلنا اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ جیسا بھی ہے وہ یہاں ایڈجسٹ ہو گئی ہے۔ پھر میری نظروں کے سامنے ہے۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تم ابراہیم کو اس سے ملوانے لے آیا کرو۔"

"جی اچھا۔۔۔" میں صرف اتنا ہی کہہ سکی کیونکہ اس مرتبہ میں جذبات میں آکر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں ہر طرح سے ہر پہلو پہ غور کرنا چاہتی تھی۔

میں کھانے کے لیے نہیں رکی، میری حالت ہی ایسی نہیں تھی۔ میں ابراہیم کو بھی وہیں چھوڑ آئی۔ ذاکر انکل کی بہو نے مجھے روکنا چاہا تو ذاکر انکل نے اسے منع کر دیا۔

میں اس وقت تنہا رہنا چاہتی تھی اور ذاکر انکل سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے صرف یہ کہا کہ منصور ابراہیم کو لے آئے گا اور میں گھر واپس آگئی۔

☆☆☆

ایک ہفتہ میں نے سوچا اور خوب سوچا۔ ہر طرح کے منفی اور مثبت پہلو کے بارے میں۔ اگلے ہفتے میں ہمت جمع کرتی رہی منصور سے بات کرنے کے بارے میں۔۔۔ پھر جب میں نے منصور سے بات کی تو وہ بدک گئے۔

"نہیں ہمیں بار بار شرمندہ نہیں ہو سکتا۔ تم رہنے دو۔" میں جانتی تھی کہ وہ یہی کہیں گے۔ انہیں اور ذاکر انکل کو منانا آسان نہیں تھا اس کے لیے مجھے پہلے اپنے آپ کو ثابت کرنا تھا کہ میں صفا کے لیے اچھی ماں بن سکتی ہوں۔

میں نے ذاکر انکل کے گھر جانا اپنا معمول بنا لیا۔۔۔ شروع میں صفا میرے سامنے نہیں آتی تھی لیکن میں نے اس کے کمرے میں جانا شروع کر دیا۔ اس کو منانے کے لیے میں جو کر سکتی تھی میں نے کیا۔ آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن وہ مان گئی۔ میں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جو تھوڑی پس و پیش کے بعد اس نے تھام لیا۔ پھر میں نے اسے راضی کیا کہ وہ اپنے گھر یعنی ہمارے گھر جانے کی بات کرے۔ منصور اور ذاکر انکل اس ساری کارروائی سے لاعلم نہیں تھے لیکن شاید وہ دونوں مجھے آزمانا چاہتے تھے اور اس بار میں ان کی کسوٹی پہ پوری اتری تھی اسی لیے بنا کسی اعتراض کے وہ دونوں مان گئے۔

اس طرح صفا ایک مرتبہ پھر ہمارے گھر آگئی اور اس مرتبہ اس نے آکر ہمارے فیملی فوٹو کو مکمل کر دیا۔

☆☆☆

آج بیس سال بعد بھی میری آنکھیں نم ہیں۔۔۔ میری کیا منصور کی آنکھیں بھی نم ہیں لیکن انہیں اپنے تاثرات چھپانے آتے ہیں۔ ابراہیم بھی اداس ہے لیکن مجھے چپ کروا رہا ہے۔ کیونکہ آج پھر ہماری صفا ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے۔

لیکن اس دفعہ کوئی بہت چاہت اور مان سے اسے لے کر جا رہا ہے۔ کوئی ایسا جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ صفا اس کی ضرورت نہیں محبت ہو گی۔

اس دن کا میں نے اور منصور نے بہت بے صبری سے انتظار کیا تھا کیونکہ سب کو صفا کے کوائف تو پسند آتے لیکن یہ بات پسند نہ آتی کہ وہ ہماری لے پالک اولاد ہے۔ کچھ لوگ نظریہ ضرورت کے تحت

بھی آگے بڑھے کہ کیا ہوا لیا لک ہے تو سائیکاٹرسٹ۔ جہیز کا لالچ بھی لوگوں کو کھینچ لاتا لیکن ہم نے انتظار کیا صحیح وقت اور صحیح انسان کا اور آج ہماری صفا کا نکاح ہے۔ اس کے بعد مہندی کی رسم ہوگی۔

"ماما اب بس بھی کریں نا۔" ابراہیم میرے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"میں تو خوش ہوں۔ شکر ہے جان بخشی ہوگی۔" ابراہیم شرارت سے بولا۔ کیوں کہ صفا آج بھی اس کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ میں نے اس کے کندھے پہ دھپ لگائی۔ اچانک صفا کی آواز آئی یعنی وہ پارلر سے آچکی تھی۔ میں نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔

"ابراہیم... ماما (میں کب صفا کی ماما بنی پتا ہی نہ چلا) ... آپ لوگ ابھی تک تیار ہی نہیں ہوئے۔ حد ہے، مہمان آنا شروع ہو جائیں گے تھوڑی دیر میں..."

"ہم ویلے نہیں ہیں تمہاری طرح کہ کچھ کرنا کرانا تو تھا نہیں بس پارلر جا کر تیار ہوگئیں اور اب آکر ہمیں کہہ رہی ہو۔ پتا ہے کیا کیا کر رہا ہوں میں صبح سے۔" ابراہیم نے صفا کو چھیڑا۔

"اچھا جی... بتائیں ماما اسے کہ میں ویلی نہیں تھی۔" صفا نے میری طرف دیکھا۔

"ماما... آپ رو رہی ہیں۔" اور میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور میرے آنسو صاف کیے۔

"تو کیا نہ روؤں..." میری آواز رونے کی وجہ سے کافی بھاری ہو چکی تھی۔

"میں روز آپ سے ملنے آیا کروں گی نا۔"

"لو جی یعنی ہماری جان بخشی نہیں ہوگی۔" ابراہیم نے ٹکڑا لگایا۔ صفا نے اسے گھورا۔ منصور جو پتا نہیں کب سے دروازے میں آکھڑے ہوئے تھے، ہنسنے لگے۔ ہم سب نے پیچھے مڑ کر انہیں دیکھا۔ آج وہ مجھے باقی دنوں کی نسبت بوڑھے لگ رہے تھے۔

"پاپا! آپ ماما سے کہیں کہ یہ نہ روئیں۔" صفا نے ہمیشہ کی طرح منصور سے مدد طلب کی۔

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں کہوں گا اور یہ مان جائیں گی۔"

"منصور..." میں نے احتجاجاً کہا "آج کے دن تو بس کریں۔"

"اوکے اوکے..." منصور نے ہاتھ کھڑے کر دیے اور میرے برابر بیڈ پہ آکر بیٹھ گئے۔

"صفا یہ مت سمجھنا کہ اس گھر سے جا رہی ہو تو یہ گھر تمہارا نہیں رہا۔ بیٹا! اس گھر کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے ہیں۔ تم ہماری بیٹی ہو۔ ہمیشہ یاد رکھنا کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن ہمیشہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

"ماما پاپا تھینک یو سو مچ۔" اب صفا سنجیدہ ہو چکی تھی۔

"کس بات کا بیٹا۔" منصور تڑپ اٹھے۔

"میری اتنی اچھی تربیت کرنے کا۔ مجھے ہمیشہ یقین دلانے کا کہ میں اگر کچھ غلط بھی کرلوں تب بھی آپ لوگ میرے ساتھ ہوں گے۔ مجھے اون کریں گے۔"

منصور نے اس کا سر چوما۔

"ایک منٹ خواتین و حضرات! اتنا ایموشنل کیوں ہو رہے ہیں سب۔"

ہم سب نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ وہ کیمرہ ٹائمر پہ سیٹ کر رہا تھا۔ پھر پھدک کر بیڈ پہ چڑھ گیا میرے اور منصور کے پیچھے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میں اور منصور بیڈ پہ بیٹھے تھے۔ صفا مہندی کی دلہن بنی، نیچے میرے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھی تھی۔ ہم سب خوش تھے۔ ہم سب کی آنکھیں نم تھیں اور کیمرے کی آنکھ نے اس لمحے کو امر کر دیا تھا۔

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل	ثانیہ
میک اپ	سلیک بائی عینی
فوٹوگرافی	ایم۔ کاشف

عبیر ایک کم زور لڑکی ہے۔ جس کی ماں مر چکی ہے۔ اس کا باپ سلطان اور سوتیلی ماں فارہ۔ دونوں بے حد حسین ہیں، جس کی وجہ سے وہ احساس کم تری کا شکار ہے۔ فارہ بظاہر بہت اچھی ہے، لیکن اس نے اپنے رویے سے عبیر کی شخصیت کو کچل دیا ہے۔

سلطان پر پندرہ کروڑ غبن کا جھوٹا الزام لگ جاتا ہے۔ وہ نوکری چھوڑ کر کینیڈا جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔

عبیر کی دوست رکزی اس کی ہمدرد ہے۔ ایک روز عبیر اور رکزی کی باتیں، نبیل، جو عبیر کا کزن ہے، سن لیتا ہے۔ نبیل اس کو احساس کمتری سے نکالنا چاہتا ہے۔

چوہدری راحت اکبر نے اپنی بیوہ بھابھی پروین اور بھتیجے حذیفہ کو اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ جہاں ان کی حیثیت ملازمین سے بد تر ہے۔ راحت اکبر کی بیٹی نیلم ایک بگڑے مزاج کی خود سر لڑکی ہے۔ جسے اس کی ماں چاندنی بیگم کی شہ حاصل ہے۔

نیلم کا دوست ٹیپو ایک روز اس سے خفیہ طور پر ملنے آتا ہے۔ لیکن حذیفہ اسے دیکھ لیتا ہے۔

حذیفہ کی بات پر یقین کرنے کے بجائے نیلم اور اس کی ماں اسے ہی موردِ الزام ٹھہراتی ہیں۔ چوہدری راحت، حذیفہ سے خطرہ محسوس کرتے ہیں، کیونکہ اس کے باپ کی جائیداد پر انہوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔

زویا وقار اپنے آفس کولیگ ہینڈسم کو پسند کرتی ہے۔ مگر ہینڈسم راہ و رسم کے علاوہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

مصباح نوشین

عشق لا مجذوب

مکمل ناول





نبیل، عبیر کو کتابیں اور ایڈمیشن فارم دینے آتا ہے۔ فارہ دیکھ لیتی ہے اور بات کو غلط رنگ دے کر عبیر کو اس کے والد کی نظروں سے گرادیتی ہے۔ عبیر اپنی صفائی دینا چاہتی ہے، مگر سلطان اس کی بات نہیں سنتے۔ عبیر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ نبیل امتحانات سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلا جاتا ہے۔ عبیر اسے فون کرتی ہے کہ اس سے شادی کرلے یا سلطان کو آکر سچ بتا دے کہ ان کے درمیان کوئی تعلق نہیں، مگر نبیل دونوں کاموں سے انکار کردیتا ہے اور نہایت رکھائی سے پیش آتا ہے۔

رکزی اور نبیل کی حوصلہ افزائی سے عبیر کی سوچ تک تو بدل گئی ہے، مگر ابھی اس میں حوصلہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ اپنے والدین اور اپنے مسئلے کا حل اپنی شادی میں تلاش کرتی ہے، مگر ہر بار رشتے کے لیے آنے والے اسے ٹھکرا کر چلے جاتے ہیں۔

راحت اکبر کے الیکشن جیتنے کی خوشی میں جشن ہوتا ہے۔ جس میں نیلم کے والدین اس کی منگنی آصف سے، جو اس کا خالہ زاد اور انتہائی امیر ہے، کردیتے ہیں۔ نیلم جو اس باختہ ہو کر ٹیپو کو بتاتی ہے۔ ٹیپو اسے ایک منصوبہ سمجھاتا ہے۔ نیلم اپنی چاچی اور حذیفہ سے انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے۔ نیلم کی طبیعت کی خرابی سے چاندنی بیگم کو تشویش ہوتی ہے تو نیلم انہیں ٹیپو کے بارے میں بتاتی ہے تو چاندنی بیگم اسے ڈانٹ دیتی ہیں وہ ہر صورت اس کی شادی آصف سے ہی کریں گی۔

حذیفہ، راحت اکبر سے اپنے حصے کا مطالبہ کرتا ہے اور باتوں باتوں میں انہیں جتا دیتا ہے کہ وہ جائیداد کا اصل وارث ہے اور باپ کے قاتل کو جان گیا ہے۔ راحت اکبر اور حذیفہ کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔

تیسری قسط

"سچ آپ بھی نہیں جانتیں۔" اس نے کہنا شروع کیا "میرے بابا اگر اچھے انسان نہیں تھے تو بہت برے بھی نہیں تھے اور مرنے سے پہلے وہ اپنی ساری جائیداد بیچ کے نہیں مرے تھے بلکہ چچا جان نے دھوکے سے ان کی ساری زمین اپنے نام کروالی تھی۔" اس بات پہ

پروین بیگم نے فوراً" ڈرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کے اسے چپ کروایا تھا کہ کیوں اپنی جان کا دشمن بنا ہوا تھا۔

"تمہیں یہ باتیں کس نے بتائیں؟" پروین بیگم نے گھبرا کر کہا۔

"جس نے بھی بتائی ہیں لیکن یہ ہی سچ ہے کہ جس وقت بابا کے ایکسیڈنٹ کی خبر چچا جان کو ملی اسی وقت انہوں نے وکیل سے کاغذات منگوا کے جو کہ انہوں نے پہلے سے بنوا کے رکھے ہوئے تھے۔ ان پہ بابا سے پہلے دستخط لیے، یہ پیپر انہوں نے پہلے اس لیے بنوا کے رکھے ہوئے تھے کہ ویک اینڈ پہ بابا جب گاؤں آئیں تو شراب پلا کے نشے میں ان سے دستخط کروالیے جائیں لیکن بابا کی اچانک موت کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ چچا جان نے بابا کے ہاتھوں کے انگوٹھے لگوالیے تھے اور ان کے سائن کاپی کروالیے تھے اور بعد میں ہمیں اطلاع کی اور ہم پر ظاہر کیا کہ میرے بابا نے چچا جان کو خود وہ ساری زمین بیچی ہے اور اس کا پیسہ لے کے وہ اپنی عیاشی میں اڑا چکے ہیں۔"

حذیفہ کے لہجے میں پہلے افسوس ابھرا لیکن اس کے بعد وہی لہجہ بھرا گیا تھا، اسے سن کے بے حد صدمہ پہنچا تھا۔ کم از کم وہ اپنے چچا جان سے ایسی بے ایمانی کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

"بس چپ کر جا حذیفہ اور آج کے بعد یہ بات تم کسی اور سے مت کرنا۔" پروین بیگم نے بالکل اچانک ہی ڈرتے ہوئے اسے روکا تھا۔

"نہیں امی جان! میں اب چچا جان سے اپنا حصہ لے کے رہوں گا۔" اس کے لہجے کا عزم پروین بیگم کے اوسان خطا کر گیا تھا۔

Young's

I



Mom

رشتے صرف باتوں سے نہیں بنتے، انہیں چاہیے ہوتا ہے احساس، پیار اور بہت سا خیال،
جیسے ینگز مایونیز کے اعلیٰ معیار میں جب ملے ماں کا پیار تو کھانا بنے شاہکار اور
لذت و صحت کی ڈور سے بندھا... ہر رشتہ پکارے I Love Mom!

ینگز کا اعلیٰ معیار... بڑھائے سچے رشتوں کا پیار



Thanks Young's

YoungsFood

"میں نے کہا نا، تم ایسی کوئی غلطی نہیں کرو گے۔"

"مجھے معاف کیجئے گا لیکن میں یہ بات نہیں مان سکتا۔ آپ نے ساری زندگی یہاں نوکروں کی طرح سے گزاری ہے، میں اب آپ کو وہ سب دلا کے رہوں گا جو آپ کا حق ہے۔" اس کے لہجے میں عزم تھا، لیکن پروین بیگم اس پہ فخر نہیں کر سکیں۔ یہ ان کے لیے لمحہ فکریہ تھا، ان کے بیٹے نے یہ کون سی راہ چن لی تھی۔

"میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں، سمجھے تم.... اور ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ ایسی باتوں کے فیصلے کر سکو، تمہارے چچا کے بہت سے احسانات ہیں تم پر، ورنہ آج تم یہاں اتنے سکھ میں نہ ہوتے۔" انہوں نے اسے درشتی سے ڈانٹ دیا تھا۔

"کوئی احسان نہیں تھا ان کا۔ صرف اپنا گناہ چھپانے کے لیے انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا تاکہ کسی کو پتا نہ چل سکے، کوئی ان کے گریبان پہ ہاتھ نہ ڈال سکے، رہی سہی کسر آپ نے پوری کر دی، اس گھر میں ملازمہ بن کر" اس بار وہ جذباتی انداز میں کہتے ہوئے چلایا تھا۔

"بس کرو حذیفہ! خدا کے لیے اگر کسی نے تمہاری یہ باتیں سن لیں تو قیامت آجائے گی۔"

"تو آجانے دیں قیامت، کم از کم سچ اور جھوٹ کا فیصلہ تو ہو پائے گا۔" وہ بغیر ڈرے ایسے بولا تھا جیسے سب کچھ ہی طے کیے ہوئے تھا۔

"تمہیں جس نے یہ سب کچھ بتایا ہے، صرف تمہارے چچا کے خلاف بھڑکایا ہے، تمہیں اور کچھ نہیں۔" وہ بے بس ہو کے بس یہی کہہ سکیں۔

"مجھے کسی نے نہیں بھڑکایا۔ میں نے خود اس بات کا سراغ لگایا ہے۔" اس نے دانستہ طور پہ منشی صاحب کا نام نہیں لیا تھا، کجا اس کی امی ان تک نہ پہنچ جائیں۔

"پھر بھی میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دوں گی کہ تم اپنے چچا سے کوئی ایسی بات کرو۔" پروین بیگم کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"میں الیکشن کے دنوں میں ان سے کوئی بات نہیں کروں گا۔" اس نے اطمینان سے کہہ کے ناشتا شروع کیا تھا۔

"تم کبھی ان سے اس موضوع پہ بات نہیں کرو گے، سنا تم نے...." پروین بیگم نے اپنے جسم کا پورا زور لگا کے اپنے لہجے کو مضبوط کیا، ورنہ تو ان کی سانس ہی نہیں نکل رہی تھی۔ حذیفہ کو یہ باتیں آخر کس نے بتادی تھیں۔ اس وقت تو انہوں نے اسے خاموش کروادیا تھا، لیکن اب دو چار ماہ بعد وہ پھر وہی باتیں دہرا رہا تھا۔ پروین بیگم کے لیے اس سے بڑی پریشانی کی بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اسی لیے وہ اس کے یہ بتانے پہ کہ اس نے چچا جان سے براہ راست اپنے حصے کی بات کی ہے، پریشان ہو گئی تھیں، وہ سمجھ سکتی تھیں کہ راحت اکبر کی کیا حالت ہوئی ہوگی اور چاندنی بیگم اس بات کو لے کے انہیں کتنا بھڑکا رہی ہوں گی۔ اب یقیناً گھر میں کوئی طوفان آنے والا تھا۔

"کیوں طوفان لانا چاہتے ہو اس گھر میں، تمہیں اس گھر کا سکون کیوں برا لگتا ہے، جیسا چل رہا ہے چلنے دو خدا کے لیے۔" پروین بیگم نے روتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

"آپ نے میرے مستقبل کے لیے کیا سوچ رکھا ہے امی جان؟" حذیفہ نے اچانک ہی ان کے سامنے سوال رکھا تھا۔ "اگر چچا یا چچی ہمیں کسی بھی وقت اس گھر سے نکال دیں تو میرے پاس کیا ہے ایسا کہ میں آپ کو گھر کے تحفظ کے ساتھ دو وقت کی روٹی بھی کھلا سکوں۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ پروین بیگم کو پہلی بار اس کی سوچ کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ "اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے، جس نے پیدا کیا ہے وہ بھوکا نہیں رکھے گا۔" انہوں نے کہا تو حذیفہ ہنس دیا۔ "اللہ نے ہی عقل دی ہے کہ ہم اسے استعمال کر کے اپنا اچھا برا خود سوچیں۔ اس لیے نہیں کہ ہاتھ پہ ہاتھ باندھے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیں کہ وہ ہمیں جس

جگہ چاہے بہالے جائے۔" اس کے پاس سارے سوالوں کے جواب تھے۔

"تم چھوڑو خود کو حالات کے سہارے' کسی بھی بات کی فکر مت کرو۔" پروین بیگم نے قطعیت سے کہا تو حذیفہ مسکرا دیا تھا۔

"نہیں امی جان! یہ میری بقا کی جنگ ہے' اسے میں ضرور لڑوں گا' آپ میرا ساتھ نہیں دے سکتیں تو مجھے روکیں بھی مت۔"

"جانتے بھی ہو کہ تمہارے چچا جان کیا کر سکتے ہیں تمہارے ساتھ؟"

"میں تیار ہوں۔" حذیفہ نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ "آپ میری طاقت نہیں بن سکتیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا' لیکن میری کمزوری بھی مت بنیں۔ پلیز یہ میری ریکویسٹ ہے آپ سے۔" اس نے اٹھتے ہوئے اپنی ماں کے کاندھے دونوں ہاتھوں سے دباتے' التجائیہ انداز میں کہا تھا۔ پروین بیگم اس بار اس سے کچھ نہیں بول سکیں۔

"کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے اس کی تیاری دیکھ کے پوچھا تھا۔

"ایک کام ہے۔ ہو سکتا ہے آنے میں رات ہو جائے' آپ پریشان مت ہوئیے گا۔" حذیفہ نے والٹ میں پیسے رکھتے ہوئے کہا تھا۔ پروین بیگم سر ہلا کے رہ گئی تھیں۔ "کچھ بتاتے کیوں نہیں کہ جا کہاں رہے ہو؟"

"ایک وکیل دوست کے پاس جانا ہے تھوڑا سا کام ہے۔" حذیفہ کے لہجے میں لاپروائی تھی' لیکن پروین بیگم دہل گئیں۔ وہ اپنے باپ جیسا نرالی فطرت کا تھا' پہلے کسی بھی کام کی ہوا نہیں لگنے دیتا تھا' جب دھواں اٹھتا تو خبر ہوتی تھی۔

"تم کیوں جا رہے ہو وکیل کے پاس؟"

"ارے میری ماں پرسکون رہو۔ خواہ مخواہ میں اپنا بلڈ پریشر ہائی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہمیں منشی جی کے بیٹے کی ضمانت کے لیے وکیل سے ملنے کے لیے جا رہا ہوں۔"

پروین بیگم کی جان میں جان آئی۔ وہ جانتی تھیں منشی کے بیٹے سے ایک لڑکے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بچہ کافی زخمی ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا پرچا کٹ گیا تھا۔ حالانکہ راحت اکبر نے کافی کوشش بھی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

آنے والوں میں صرف ایک خاتون تھیں' جنہوں نے سرتاپیر اسے گھور کے دیکھنے کے بعد چائے میں بسکٹ ڈبو کے اپنے منہ میں ڈال لیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ تو یہ ہے تمہاری بیٹی؟"

فارہ نے جز بز ہوتے ہوئے تصحیح کی۔ "سوتیلی بیٹی۔"

"ارے ہاں وہی۔۔۔ تمہاری بیٹی تو تمہارے جیسی ہوتی مکھن ملائی سے بنی۔" سکینہ بوا نے بسکٹ منہ میں ڈالتے ہوئے خوشامدی لہجہ اپنایا تھا بھلا فارہ کے حسن کا کون معترف نہیں تھا۔ اس محلے میں۔۔۔

"جلدی بولو بوا۔۔۔ پھر میں رشتہ پکا سمجھوں۔" فارہ کو سکینہ بوا کی بے وقت اور بلاوجہ کی خوشامد اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ویسے بھی جب سے سلطان کی نوکری والا معاملہ ہوا تھا' اس کے بعد سے اسے بس ایک ہی ٹینشن تھی کہ عبیر کی شادی ہو جائے اور وہ سلطان کے ساتھ کینیڈا جا سکے۔ عبیر کے لیے آنے والے رشتے عبیر میں تو جو نقص نکالتے سو نکالتے' لیکن فارہ کی قصیدہ گوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے' پہلے پہل تو فارہ کو خوشی ہوتی' لیکن اب گزشتہ تین چار ماہ سے ہونے والی اس تعریف سے وہ تنگ آچکی تھی۔ اس تعریف نے اسے کوئی فائدہ نہیں دیا تھا۔

اسی لیے جب بوا سکینہ جو کہ اسی محلے میں رہتی تھیں نے تعریف کی تو وہ ٹوک گئی۔

"ارے ہاں ہاں۔۔۔ میری اس سے بڑھ کے خوش نصیبی کیا ہو گی بھلا کہ میرا بیٹا یا سر سلطان احمد کا داماد بنے۔" سکینہ بوا نے بسکٹ کے بعد چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے اسی انداز میں کہا۔ عبیر کا سر جھک گیا۔

"تو اب یہ نوبت آگئی کہ میرے لیے یاسر جیسے لوفر اور غنڈے لڑکے کا رشتہ قبول کرلیا گیا۔" اس نے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کی جانب دیکھتے ہوئے بے دلی سے سوچا۔ میں شاید اسی قابل تھی۔ اس نے سفاکی سے خود کو جتلایا۔

"بھئی.... مجھے تو جیسے ہی تمہارا پیغام ملا' میں تو اسی وقت انگوٹھی لے کے آنا چاہ رہی تھی' لیکن بعد میں سوچا کہ بے شک تم نے ہاں کہہ دینی ہے' پھر بھی دنیا دکھاوے کو مجھے ایک بار تو رشتہ ڈالنے آنا چاہیے۔"

سکینہ بوا نے احسان جتلاتے ہوئے اپنے دوپٹے کے پلو سے مڑا تڑا ہزار کا نوٹ نکال کے عبیر کے ہاتھوں پہ شگن کے طور پہ رکھا۔

"اسے بھی یہ شگن نہ سمجھنا' بہت جلد دھوم دھام سے منگنی کرنے آوں گی ہاں۔" سکینہ بوا نے فخریہ لہجے میں کہتے ہوئے عبیر سے زیادہ فارہ کو خوش کیا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بوا۔ رشتہ پکا ہوگیا' اب سادگی سے شادی ہوگی' وہ بھی بہت جلد۔" فارہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں منع کیا تھا۔

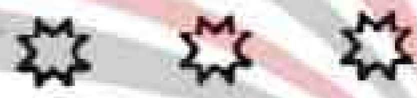
"میں اور سلطان اس کی جلد از جلد شادی کرنے کے بعد کینیڈا جارہے ہیں' یہ گھر بھی کوشش کریں گے کہ عبیر کے نام کرجائیں۔ جہیز بھی کافی دیں گے اور سلامی میں لڑکے کو موٹر سائیکل بھی....." فارہ نے سکینہ بوا کو لالچ دیا۔ ان کی آنکھیں اتنی سی بات پہ ابل کے باہر آگئی تھیں۔

ان کے یاسر کی کیسی لاٹری لگی تھی کہ بیٹھے بٹھائے اس کا اتنے اچھے گھر میں رشتہ ہوگیا تھا اور وہ بھی لڑکی والوں نے خود بلا کے دیا تھا۔ ورنہ تو وہ پورے خاندان اور محلے میں اسے بلی کے بچے کی طرح سات گھروں میں پھرا چکی تھیں' لیکن کہیں بھی اس کی دال نہیں گلی تھی۔ اس کی حرکتیں اچھی ہوتیں تو شاید وہ بہت جلد کسی ٹھکانے لگ جاتا' لیکن وہ نکما اور لوفر سا لڑکا تھا جو سارا دن محلے کے تھڑے پہ بیٹھ کے آتی جاتی لڑکیوں کو چھیڑتا یا کسی نہ کسی راہ گیر کی جیب سے پیسے نکال کے جوئے میں اڑا دیتا یا پھر ان کا رستہ روک کے انہیں ویسے ہی تنگ کرتا۔ کام دھندا کرنے کا جسے کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ خود کو ہیرو سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ پھول دار شرٹ کے ساتھ سرخ پینٹ اس کا شاید پسندیدہ لباس تھا۔ اسی لیے اسے عبیر نے جب بھی دیکھا۔ اسی رنگ و لباس میں دیکھا تھا اور منہ میں پان چبانے کا انداز الگ اف.....

"ہاں.... ہاں تم فکر ہی نہیں کرو' میں یاسر کی نوکری لگتے ہی بارات لے کے آوں گی۔" سکینہ بوا ابھی پوری طرح سے متاثر بھی نہیں ہوپائی تھیں کہ فارہ کی اگلی

بات نے انہیں ہکلا دیا تھا اور وہ سوچنے پہ مجبور ہوگئی تھیں کہ یہ یاسر نے کس بابے سے عمل کروایا تھا' جو اس کی قسمت یوں راتوں رات جاگ گئی تھی' بلکہ چمک گئی تھی۔

"ونہیں' نوکری شوکری ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس..... تم شادی کی جلدی سے تیاری کرلو۔ میں بھی جہیز کی تیاری کروں' آخر کو سلطان کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہورہی ہے۔" فارہ نے عبیر کی طرف دیکھے بغیر سکینہ بوا سے کہا تھا عبیر سے آگے سنا نہیں گیا' وہ اٹھ کے باہر آگئی تھی۔



برا وقت کبھی بتا کے نہیں آتا اور اس کے ستارے تو آج کل ویسے ہی گردش میں تھے۔ تاریخ میں ایسے کئی ابواب رقم ہیں جب حق کی آواز بلند کرنے والوں کو کچل دیا گیا۔

چاندنی بیگم ساری رات سو نہیں سکی تھیں' انہیں رہ رہ کے اپنی غفلت پہ افسوس ہورہا تھا۔ انہوں نے آخر اپنی آنکھیں کیوں بند کرلی تھیں۔ انہوں نے نیلم پہ نظر کیوں نہیں رکھی تھی۔ انہیں خبر کیوں نہیں ہوسکی۔ ان کی بیٹی کسی اور راہ کی مسافر بن رہی ہے جہاں سوائے ذلت و بدنامی کے کچھ اور نہیں ملتا۔ وہ

سمجھ کیوں نہیں سکیں کہ نیلم اس رشتے پہ خوش نہیں ہے۔ وہ منگنی کے بعد سے بہت گم صم رہنے لگ گئی ہے۔

وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکیں کہ اس کی آنکھوں میں سرکشی اور ذہن و دل میں کوئی اور بس چکا ہے۔ جس کی محبت اسے آسمانوں کی اور اڑائے جارہی ہے۔ وہ بستر پہ لیٹی راحت اکبر کی طرف سے کروٹ کیے ہوئی تھیں لیکن انہیں نیند نہیں آرہی تھی۔ بہت سال وہ بے فکری کی نیند سو لی تھیں لیکن اب وہ مزید نہیں سو سکتی تھیں۔ آج جو نیلم کا روپ انہوں نے دیکھا تھا' وہ کسی طور پہ بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ پرسکون رہ پاتیں یا اسے اپنے ذہن و دل سے جھٹک سکتیں۔ انہیں نیلم کا رویہ حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ کیسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے انہیں اپنی محبت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اس سے پہلے کہ طوفان آئے۔ وہ نیلم کی جلد از جلد شادی کردیں گی۔ شادی کے بعد لڑکیاں گھرداری میں پڑ کے گہری سے گہری محبت کو بھول جایا کرتی ہیں۔ انہیں پورا یقین تھا کہ نیلم بھی بھول جائے گی۔ لیکن ان کا دل کسی ایک بھی بات پہ مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے دل کو عجیب طرح کے واہمے ستانے لگے تھے۔ وہ سوتے سے اٹھ بیٹھی تھیں۔ یکایک ایک خوف نے ان کے پورے جسم میں سرد لہر دوڑا دی تھی۔ وہ پہلے لیٹے سے اٹھیں اور پھر کھڑی ہوگئی تھیں۔ دوپٹا کاندھے پہ ڈالے وہ راحت اکبر سے نظر بچا کے نیلم کے کمرے کی جانب جارہی تھی۔ یک دم ہی ان کے دل کو پنکھے سے لگ گئے تھے۔ وہ گرتی پڑتی اس کے کمرے کے دروازے تک پہنچیں' لیکن اس سے پہلے کہ وہ اندر جا کے اس سے بات کرتیں یا سمجھاتیں' اندر سے آتی آواز نے ان کے قدم منجمد کردیے تھے۔

"میں نہیں رہ سکتی اب یہاں... آخر تم کب بات کرو گے اپنی امی جان سے... میری حالت سے تم واقف ہی ہو۔ میں آخر اور کتنی دیر تک اس حقیقت کو چھپا پاؤں گی... نہیں' میں اب مزید صبر نہیں کرسکتی۔ میں نے تو آج ماما کو بھی بتادیا ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور میں بتا رہی ہوں اگر تم نے جلد اپنے گھر والوں سے بات نہیں کی تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گی' پھر مجھے کوئی الزام مت دینا۔"

چاندنی بیگم کو لگا ان پہ کسی نے ٹھنڈے یخ پانی کی پوری بالٹی انڈیل دی ہے' رات کے آخری پہر ان کی بیٹی کسی کو اپنے دل کی داستان سنا رہی تھی' وہ اپنی بے تابی کے قصے کسی اور کو سنا رہی تھی' وہ کسی کے لیے تڑپ رہی تھی۔

چاندنی بیگم کا دل چاہا کہ وہ یہیں کھڑے کھڑے اسے زندہ زمین میں گاڑ دیں' ان کی بیٹی خاندان کی عزت کا احساس کیے بغیر گھر سے بھاگنے کی بات کر رہی تھی۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ نیلم اس حد تک بھی جاسکتی ہے۔ وہ بے ساختہ طیش کے عالم میں دروازہ کھول کے اندر بڑھی تھیں۔ نیلم جو کھڑکی کے پاس کھڑی فون پہ ٹیپو سے بات کر رہی تھی۔ اس نے ماں کے تیوروں سے سہم کے فوراً ہی فون بند کیا تھا۔

"ماما!" نیلم نے بے ساختہ ہکلاتے ہوئے کہا تھا' لیکن وہ چیل کی طرح اڑتی ہوئی اس تک آئی تھیں۔

"بے شرم' بے حیا... کہاں کمی رہ گئی تھی ہماری محبت میں' جو تم نے ہمارے ساتھ ایسا کیا۔" چاندنی بیگم نے آتے ہی اسے بری طرح سے مارنا شروع کیا تھا۔ وہ اس کے بال نوچتے ہوئے چلا رہی تھیں' جو بھی تھا ان کے خاندان میں آج تک کسی بھی عورت نے ایسی جرأت نہیں کی تھی محبت کرنا اور گھر سے بھاگنا تو بہت دور کی بات تھی۔

"چھوڑیں ماما! مجھے درد ہو رہا ہے۔" نیلم کو وہ پھولوں کی طرح سے رکھنے کی عادی تھیں۔ کبھی آج تک پھولوں کی ٹہنی سے بھی نہیں مارا تھا۔ اسی لیے آج اسے ماں کا یہ روپ تکلیف کے ساتھ ساتھ گہرے صدمے میں بھی مبتلا کر رہا تھا۔ اپنی وہ غلطی وہ

بھول گئی تھی۔ ہر محبت کرنے والے کی طرح۔

"جان سے ماردوں گی تمہیں میں..... بول کون ہے وہ' جس کا گناہ تیرے پیٹ میں پل رہا ہے۔" اچانک ہی انہوں نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا تھا' نیلم بے ساختہ خاموش ہوئی تھی' وہ کیا بتاتی کہ وہ کیا کر چکی ہے۔ چاندنی بیگم پہ جنون سوار تھا۔ ان کے انداز سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ جیسے وہ آج نیلم کو جان سے ہی مار دیں گی۔ وہ اسے مار رہی تھیں جب ان دونوں ماں' بیٹی کا شور سن کے راحت اکبر اور پروین ایک ساتھ اپنے کمرے سے نکلے تھے۔

"کیا بات ہے چاندنی کیوں جھگڑ رہی ہو؟" اچانک ہی راحت اکبر ان دونوں کے پاس آئے تھے۔ چاندنی بیگم نے غصے و نفرت سے نیلم کی طرف دیکھا جو بھاگ کے باپ کی طرف بڑھی تھی۔

"میں اسے جان سے ماردوں گی' میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں کہتے ہوئے ایک بار پھر اس کی جانب بڑھیں' لیکن راحت اکبر نے اسے بچالیا تھا۔ پروین بیگم ہکا بکا سی ساری صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"بابا! مجھے بچالیں ماما سے....." نیلم باپ سے لپٹی۔

"نہ جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ راحت اکبر کے پہلو سے لگی رو دی۔

"اس سے پوچھیں' کون ہے وہ جس کے ساتھ یہ....." اس سے آگے چاندنی بیگم پوچھ نہیں سکی تھیں۔ حجاب مانع تھا۔ کچھ راحت اکبر کے چہرے کے تاثرات ہی ایسے تھے کہ وہ ایسی بری خبر انہیں فوری طور پہ سنا نہیں سکیں۔ اسی وقت گھر میں داخل ہوتے حذیفہ نے اس شور کو عجیب حیرت سے سنا تھا کہ گھر میں اس تماشے سے پہلے نوکر وہاں موجود نہیں تھے۔ رات کا ایک بج رہا تھا اور وہ اس وقت ابھی ابھی شہر سے لوٹا تھا' سارا دن کی خواری کے بعد اب وہ بے حد تھک چکا تھا۔

"کون' تم کس کی بات کر رہی ہو؟" راحت اکبر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چاندنی بیگم کیا کہہ رہی تھیں۔ ویسے بھی وہ غصے کی بے حد تیز ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد جذباتی واقع ہوئی تھیں۔ وہ موقع محل دیکھے بنا اپنے جذبات کا اظہار کر دینے کی قائل تھیں۔ اس لیے وہ اب بھی اپنا غصہ و نفرت نہیں چھپا سکی تھیں' ورنہ سمجھ داری سے کام لیتیں تو یہ بات دبا دیتیں' لیکن وہ اپنا طیش دبا نہیں سکیں۔ وہ اتنی معاملہ فہم نہیں تھیں۔

"بول' کون ہے وہ بدذات' جس کے ساتھ تو منہ کالا کر چکی ہے۔ بول۔"

چاندنی بیگم نے آگے بڑھ کے ایک بار پھر اسے مارتے ہوئے پوچھا۔ نیلم راحت اکبر کے پہلو سے چپکی کھڑی روتی رہی تھی۔ اس بات پہ ان کی گرفت بے ساختہ اس کے کندھوں پہ ڈھیلی پڑی۔ نیلم نے روتے ہوئے اندر داخل ہوتے حذیفہ کی جانب اشارہ کیا تھا۔ راحت اکبر تو کیا چاندنی بیگم بھی دم بخود رہ گئی تھیں۔

"مجھے یہ سب کرنے کے لیے حذیفہ نے اکسایا تھا۔" اندر داخل ہوتے حذیفہ نے روتی ہوئی نیلم کے منہ سے اپنا نام کس قدر حیرت سے سنا تھا۔ باقی سب نفوس ایسے کھڑے تھے۔ جیسے کسی نے ان کے جسم سے جان نکال لی ہو۔



پروین بیگم کو لگا جیسے کسی نے وہیں کھڑے کھڑے ان کی جان نکال دی ہو۔ وہ کسی حنوط شدہ ممی کی طرح دم سادھے کھڑی تھیں۔ ان کے لیے حرکت کرنا ناممکن ہو گیا' یہی حال راحت اکبر کا بھی تھا۔ وہ یک ٹک حذیفہ کو دیکھ رہے تھے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حذیفہ اپنے ساتھ ہوئی حق تلفی کی سزا انہیں اس انداز میں بھی دے سکتا ہے۔

حذیفہ اس ساری صورت حال سے بے خبر تھا بس ہوش میں تھیں تو چاندنی بیگم جو چیل کی سی تندی و تیزی سے حذیفہ کی جانب بڑھی تھیں۔ وہ اس کا

گریبان پکڑے اس کے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے ہذیان بک رہی تھیں.....
"بے غیرت انسان۔ اس لیے تجھے پال پوس کے بڑا کیا تھا..... کمینے، کتے کی اولاد، چچا کی عزت سے کھیلتے شرم نہیں آئی۔"
حذیفہ نے کسی قدر حیرت سے اس ساری بات پہ ان کی جانب دیکھا تھا وہ مزاحمت کرنا بھی بھول گیا۔
"کیا کہہ رہی ہیں چچی جان! میں نے کیا کیا ہے؟" حذیفہ ناسمجھی سے بولا تھا۔
"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ کیوں کیا تم نے ایسا؟ ارے چچا کا کوئی احسان تو یاد رکھتے۔"
چاندنی بیگم نے روتے ہوئے ساتھ میں چیختے ہوئے اسے شرم دلائی' نیلم ایک جگہ کھڑی دبکی سمٹی رو رہی تھی۔
"مگر میں نے کیا کیا ہے' کچھ پتا تو چلے؟"
حذیفہ اس بار جھنجلایا۔ ساتھ ہی دو قدم چل کے ماں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
"امی جان۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے میں نے کیا' کیا ہے؟"
مگر ماں تو بے جان تھی وہ اسے کیا کہتی' کیا بتاتی کہ کیسی قیامت ٹوٹ پڑی تھی' ہر طرف تباہی ہی تباہی تھی۔
"بدلہ لینا تھا تو مجھ سے لیتے گھٹیا انسان۔" راحت اکبر نے بھی کہنا شروع کیا۔ ان کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور لہجے میں لوہے جیسی کاٹ تھی۔
"کہا تھا ناں میری بیٹی پہ کوئی بات بھی کرے میں اس کی زبان کاٹ دوں' کجا اس کی عزت کی دھجیاں اڑانے کی جرأت کرنا۔"
انہوں نے حذیفہ کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ حذیفہ خاموشی سے پٹتا رہا یہاں تک کہ راحت اکبر خود ہی ہانپنے لگے۔
"یہ جھوٹ ہے' میں نے کچھ نہیں کیا۔" حذیفہ بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہوا۔
"کیوں جھوٹ ہے یہ.... میری زندگی خراب کر کے تم یوں اب جان نہیں چھڑا سکتے۔ تم نے تو کہا تھا کہ میں چچا جان کو منا لوں گا....."
نیلم وحشیانہ انداز میں آگے بڑھی۔ حذیفہ نے اسے کینہ توز نظروں سے دیکھا' لمحے میں وہ ساری صورت حال تک پہنچا تھا' وہ جان چکا تھا کہ وہ کس سازش کا شکار ہوا ہے۔
"تم جھوٹ بول رہی ہو' میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔" یکایک حذیفہ سرسراتے لہجے میں بولا تھا۔
"کیوں واسطہ نہیں ہے' میرے ساتھ محبت کے دعوے کرتے وقت تمہیں یہ یاد نہیں تھا کیا..... مجھے اپنے جال میں پھنسا کے اب تم یوں مکر نہیں سکتے۔"
نیلم نے اب اس پہ سب کے سامنے الزام تراشی کر دی تھی..... "کیوں اکسایا مجھے یہ سب کرنے پہ۔" وہ چیخی تھی۔ راحت اکبر نے قہر و غضب سے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ چاندنی بیگم نے اس ہار کو قبول نہ کرتے ہوئے زمین پہ بیٹھ کے رونا ڈال دیا۔
"دیکھ لیا چوہدری صاحب! میں شروع سے کہتی آ رہی ہوں کہ اس سنپولیے کو پالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کسی دن آپ کو ڈس لے گا مگر آپ نے میری بکواس نہیں سنی....." وہ دوہتھڑ اپنے سینے پہ مارتے ہوئے راحت اکبر سے بولی تھیں۔ "ہو گئیں خوش کر دیا تمہارے بیٹے نے ہمیں برباد۔ جشن مناؤ اپنی کامیابی کا۔ لے لیا تم دونوں نے بدلہ ہم سے" اب وہ پروین کی جانب رخ کیے انہیں کوس رہی تھیں۔
"میں اس کا خون پی جاؤں گا' اس کی بوٹی بوٹی کر کے کتوں کے آگے پھینکوا دوں گا اس نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے....." وہ ایک بار پھر حذیفہ پہ پل پڑے' اس بار حذیفہ نے انہیں پرے دھکا دیا وہ لڑکھڑا گئے۔
"آپ کا چور میں نہیں ہوں۔ یہ گھٹیا لڑکی مجھ پہ الزام لگا رہی ہے۔" وہ غصے کا شروع سے ہی تیز تھا اسی

لیے اس وقت آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

"تو اس رات جب تم مجھے ساتھ والے گاؤں سے لینے گئے تھے تب برستی بارش میں تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا' بولو۔" نیلم آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے کہہ رہی تھی۔ حذیفہ کا جی چاہا تھپڑ مار کر اس کا منہ بند کر دے۔ وہ کس قدر بے حیائی سے اپنے باپ کے سامنے ایسی باتیں کر رہی تھی۔

"اپنی بکواس بند کرو' ورنہ میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔" حذیفہ اسے مارنے کو لپکا۔ نیلم بغیر ڈرے اپنے باپ کے قدموں میں جا بیٹھی۔

"بابا مجھے معاف کر دیں' مجھے یہ سب کرنے پہ اس نے اکسایا تھا اس نے مجھے ورغلایا تھا۔ بابا! میرا کوئی قصور نہیں ہے' اس نے میرے ساتھ زبردستی کی تھی۔" نیلم آنکھوں میں آنسو بھر کے گڑگڑاتے ہوئے باپ کے قدموں سے لپٹی تھی۔

مجھے جان سے مار دیں بابا...... لیکن مجھ سے بدگمان مت ہوں میں مجبور تھی کمزور تھی اور بے بس بھی' اس نے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ اس نے مجھے ڈرا دیا تھا کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو یہ مجھے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ بابا!" نیلم باپ کے قدموں سے لپٹی روتے ہوئے تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہی تھی۔ وہ تابوت جو اس نے حذیفہ کے لیے تیار کیا تھا۔

راحت اکبر نے قہر بھری نگاہ حذیفہ پہ ڈالی۔ کیا کیا نہیں کیا تھا انہوں نے اس کے لیے۔ ہمیشہ اس کی خوشی کا خیال رکھا تھا حالانکہ وہ بدگمان ہو جایا کرتا تھا۔ وہ لوگوں کی سنی سنائی باتوں میں بھی آجایا کرتا تھا لیکن وہ اسے بچہ سمجھ کے نظرانداز کرتے آئے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے جائیداد میں سے اپنا حصہ مانگنے کی بات کی تب بھی کتنا کچھ اس نے انہیں کہہ دیا تھا لیکن وہ چپ کر کے سہ گئے تھے۔ وہ اسے اتنی اہمیت دیتے ہی نہ تھے انہیں اندازہ کہاں تھا کہ دشمن بھلے جتنا ہی کمزور ہو' اسے کمزور نہیں سمجھنا چاہیے اور مکافات عمل بھی کسی چڑیا کا ہی نام ہے۔ حذیفہ' راحت اکبر کے سامنے ڈرامہ کرتی نیلم کو دیکھتے ہوئے اس کا خون پی جانے کے درپے تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس کا ایسا حال کرے کہ وہ عبرت کا نشان بن جائے۔

وہ سراپا شکوہ بن گیا جبکہ نیلم ایک بار پھر اپنی معصومیت کے پیش نظر اپنے والدین کی نظر میں خود سرخرو ہو چکی تھی۔ نیلم نے ان سے کہا کہ اس نے اسے دھمکایا تھا تو وہ مان گئے۔ حذیفہ نے اسے ڈرایا تھا وہ یہ بھی مان گئے لیکن نیلم نے انہیں بتانے کی ہمت نہیں کی خود لٹتی رہی۔ یہ سوال بھی چلو مان لیا کہ ان کے ذہن میں نہ آیا ہو لیکن حذیفہ' راحت اکبر سے زیادہ طاقت ور تو نہیں تھا' اس نے جب پہلی بار نیلم سے کوئی بات کی تھی' وہ اسی وقت ان سے کہہ دیتی وہ خود ہی اس سے نمٹ لیتے۔

سوالات کا انبار تھا مگر جوابات ندارد

وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھے پھوٹ پھوٹ کے رو دیا ابھی اور کتنے امتحانات باقی تھے بھلا۔

رات کے آخری پہر جب چاند اپنی منزل کی جانب رواں تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹا جاگ رہے تھے۔ پروین نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بس خاموش تھیں اور حذیفہ کو اس خاموشی سے ڈر لگ رہا تھا' جو کچھ آج نیلم نے کیا تھا اس نے اسے ہلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نیلم اس کے ساتھ اتنا گھناؤنا کھیل بھی کھیل سکتی ہے۔

اور حیران تو پروین بھی تھیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نیلم نے ایسا کیوں کیا تھا۔ حذیفہ کے ساتھ اب پچھلے کچھ عرصے سے اس کا رویہ بہتر ہو گیا تھا لیکن اس میں تو کہیں سے بھی ایسا نہیں ظاہر ہوتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ایسی بات چل رہی ہے بقول نیلم کے حذیفہ اسے ڈراتا دھمکاتا تھا تو نیلم تو اس سے خائف رہتی اس کا رویہ حذیفہ سے اتنا اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔

حذیفہ خاموش بیٹھی ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

سر جھکا کے ان کی گود میں رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

"امی جان! آپ تو میرا اعتبار کریں۔ آپ کا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

پروین بیگم خاموش رہیں۔ حذیفہ کتنی ہی دیر سسکتا رہا۔۔۔ وہ تو اپنی ماں کے دکھوں کے ازالے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ وہ تو بس اپنی ماں کو سکھ، سکون اور خوشیاں دینے کا متمنی تھا۔ اس نے یہ تو نہیں سوچا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب ہو جائے گا۔ اس کا ذہن تو اس وقت اس ساری بات سننے کے بعد اتنا ماؤف ہو گیا تھا کہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا بات کرے۔ اپنے حق میں وہ جو بولنا چاہتا تھا' بول ہی نہیں پایا۔ الفاظ دم توڑ گئے۔ قسمت ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

اس نے اپنی ماں کے بوڑھے چہرے کی جانب دیکھا اور پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ وہ کب اپنی ماں کی زندگی آسان کر پائے گا۔

"کھانا لاؤں تیرے لیے؟" ماں کو تو بس ایک ہی فکر تھی کہ وہ بھوکا نہ سو جائے۔

"بھوک نہیں مجھے۔" اس نے آہستہ سے بتایا۔

ماں نے ماتھے پر آئے بال ہٹائے۔

"امی جان! آپ میرا یقین کرتی ہیں ناں۔؟" اس نے جانے کیوں مگر یہ سوال اس رات بار بار پوچھا تھا نہ پوچھتا تو شاید اس کا دل پھٹ جاتا۔ ماں دہل گئی۔

"ہاں، بہت کرتی ہوں۔" ماں نے ماتھے پہ آئے بال ہٹاتے ماتھا چوما' مجھے پورا یقین ہے کہ میرا بیٹا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں نے اس کی ایسی تربیت ہی نہیں کی۔" ماں کے لہجے میں اپنی تربیت کا فخر اور اپنی ذات کا یقین بول رہا تھا۔

"امی جان میں نے ایسا کچھ نہیں کیا' آپ جانتی ہیں کہ میں اتنا نہیں کر سکتا کہ آپ کی تربیت پہ حرف آئے' میرے خلاف کوئی سازش ہوئی ہے۔" وہ روتے ہوئے ماں کی گود میں سر رکھے کسی بچے کی مانند سسک رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔"

بہت دیر بعد پروین بیگم کے منہ سے یہ دو لفظ سرسراتے ہوئے نکلے تھے۔ چاند خاموشی سے اپنا سفر طے کرتا رہا۔

☆ ☆ ☆

"چوہدری صاحب!" رات کے آخری پہر دوسرے کمرے میں موجود میاں بیوی بھی جاگ رہے تھے۔ چاندنی بیگم کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور بہت رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

"اپنی بہن سے بات کرو کہ جلد از جلد ہماری بیٹی کو بیاہ کے لے جائے۔" راحت اکبر نے چاندنی بیگم کو دیکھ کے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "پھر میں حذیفہ سے نپٹوں گا۔"

"لیکن اب یہ ممکن نہیں ہے۔" چاندنی بیگم ہکلائیں' بھلا اب وہ اپنی بیٹی کی شادی آصف سے کرنے کے قابل رہی تھیں؛

"کیوں ممکن نہیں ہے۔۔۔" راحت اکبر گرجے "تم تو اپنی بہن کی محبت کے ترانے گاتی تھیں اب بلاؤ اسے' ہماری اس مشکل میں مدد کرے۔"

"کیسے بلاؤں' آپ کے بھتیجے اور بیٹی نے جو گل کھلایا ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی ذلیل ہونے کی کسر رہ جاتی ہے بھلا۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔" راحت اکبر اپنا سر تھامے بیٹھے تھے۔ وقت نے کسی کیسی شکست دی تھی انہیں خود اپنے خون کے ہاتھوں۔

"شادی! آپ شادی کر دیں ان دونوں کی' گھر کی عزت بچانے کو اب اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے' خاندان اور پارٹی حلقوں میں بھی آپ کی واہ واہ ہو جائے گی کہ چوہدری صاحب نے یتیم بھتیجے کو اپنی بیٹی دے کے اپنی جائیداد کا وارث بنا دیا ورنہ تو آپ جانتے ہیں کہ وہ کیسا بے دید ہو چکا ہے۔" چاندنی بیگم نے ہکلا کے بات پوری کی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" وہ گرجے۔

"تم جانتی بھی ہو میں اس کا خون پینے کے درپے ہوں اور تم مجھے اسے بیٹی دینے کی بات کر رہی ہو، مجھے تو جو وہ سانسیں لے رہا ہے۔ وہ بھی گراں گزر رہی ہیں۔ میرے لیے ایک بھی لقمہ حرام ہے، جب تک میں اس سے بدلہ نہ لے لوں اور تم مجھے یہ مشورہ دے رہی ہو۔؟"

"ٹھنڈے دل سے میری بات سنیں اس نے یہ سب آپ سے بدلہ لینے کے لیے کیا ہے ناں۔ تو آپ اس کا وار اسی پہ لوٹا دینا۔"

"کیسے؟" راحت اکبر چونکے۔

چاندنی بیگم نے انہیں سمجھانا شروع کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ہانپتی کانپتی واپس گھر آئی تھیں، خوشی جیسے ان کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"کیا بات ہے اماں! بڑی خوش لگ رہی ہے؟" یاسر نے ماں کی بغل میں دبکے مٹھائی کے ڈبے کو دیکھتے پان کی پیک پھینکتے کہا تھا۔

سکینہ بوا اپنے بھاری وجود کو قابو کرتے ہوئے اس تک آئیں اور اس کا ماتھا چوم ڈالا۔

"مبارک ہو یاسر۔ سمجھ تیری تو لاٹری نکل آئی ہے۔"

"کیا ہو گیا اماں! سلطان احمد کی بیٹی کیا کترینہ کیف جیسی دکھتی ہے.....؟" یاسر نے پان چباتے ہوئے بے شرمی سے ماں کو آنکھ مار کے کہا لیکن ماں کو معیوب نہیں لگا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کترینہ اس کی پسندیدہ تھی۔ یاسر نے اپنے چونے لگے کمرے کی دیواروں پہ سب جگہ اسی کی تصویریں کاٹ کاٹ کے لگائی ہوئی تھیں۔

"ارے دفع کر اسے، شکل میں کیا رکھا ہے، اصل بات تو ساری گنوں کی ہوتی ہے۔" سکینہ بوا نے یاسر کا ذہن بنانے کی غرض سے کہا تو یاسر کا منہ بن گیا۔

"اماں! کب سمجھے گی تو شکل میں ہی تو سب رکھا ہے۔" وہ پلٹ کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنی بھوری سرمہ زدہ آنکھوں کو دیکھنے لگا۔

"میرے چاند سے بیٹے کی لاٹری نکل آئی ہے لاٹری۔" وہ مٹھائی کا ڈبہ کھولتے ہوئے اس کے منہ میں گلاب جامن ٹھونستے ہوئے بولی تھیں۔

"اچھا سچ! اپنے چاند سے بیٹے کے لیے تو نے چاند سی ہی بہو ڈھونڈ لی ناں اماں' میں جانتا تھا۔" وہ ماں سے لپٹ گیا۔

"چل شریر پیچھے ہٹ!" شریر کی عمر کم سے کم بھی پینتیس برس تھی لیکن اپنی اماں کا تو وہ کاکا تھا۔

"اماں لا دکھا نا تصویر' ذرا ہم بھی تو دیکھیں' وہ کون ہے خوش نصیب جو ہماری دلہن بن کے اس گھر میں آنے والی ہے۔" یاسر وفور شوق سے مغلوب اماں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"لو تصویر کو کیا کرے گا خود آیا جایا کر اب اپنی سسرال۔" سکینہ بوا نے پیار سے چمکارا۔ "اور سن شکل بھی اس کی اچھی ہے' بس تھوڑا سا بوٹی کم ہے' شادی کے بعد وہ بھی آجائے گا لیکن تمہیں ایک فائدہ ہو گا۔" سکینہ بوا نے بات میں وزن اور سسپنس پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔ سرمہ بجی آنکھوں والے شریر کاکے نے ماں کی جانب اشتیاق سے دیکھا۔

"تیرے سے دب کے رہے گی وہ ورنہ بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ تجھے تو ہر وقت تڑی ہی لگائے رکھتی پھر سلطان احمد کا ہاتھ بھی رہے گا تیرے سر پہ میں کوشش کروں گی بلکہ شادی کے بعد دباؤ ڈالوں گی کہ تجھے بھی اپنے ساتھ کینیڈا لے جائیں۔ یہاں تو تجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا چلو وہیں سہی۔ سال دو سال میں ہمیں بھی چکر لگا لیا کروں گی....."

جو گاؤں ابھی بسا ہی نہیں تھا اس کو لوٹنے کی سازباز کی جا رہی تھی۔

"کیا بات ہے اماں! تو بھی بڑی چالاک ہو گئی ہے۔" یاسر ماں کے پاس سے اٹھتے ہوئے شرارت

سے بولا تھا۔ "تو پھر میں آج جاؤں اپنی سسرال۔ اپنی منگیتر سے ملنے۔؟"

"ضرور جانا لیکن خالی ہاتھ نہیں بلکہ میری بہو کے لیے کچھ لے کے جانا اور ہاں سن ذرا اچھے سے تیار ہو کے جانا یہ پھول پتاخوں والے کپڑے نہ پہن کے جانا۔" سکینہ بوا نے اس کی سرخ پھول دار شرٹ کی جانب اشارہ کیا تو باسر کا منہ بن گیا۔

"لے اماں! تجھے یہ بھی پتا نہیں کہ یہ آج کل فیشن ہے۔" اس نے اپنی چھوٹی سی ٹائٹ پھول دار شرٹ کو اپنی توند پہ کھینچتے ہوئے کہا۔

"فیشن ہے لیکن ڈھنگ کا تو کیا کر، یہ کیا نیلی پیلی شرٹیں پہن لیتا ہے۔ نعمان اعجاز سے ہی کچھ سیکھ لے وہ کتنے اچھے کپڑے پہنتا ہے۔"

اماں کو نعمان اعجاز بہت پسند تھا اسی لیے وہ اپنے بیٹے کو بھی اسی کے جیسا بنانا چاہتی تھیں لیکن وہ نجانے کیا بن گیا تھا، شکل و صورت تو عام سی ہی تھی۔ رنگت بھی سانولی تھی۔ اوپر سے ہر وقت پان کھانے کی وجہ سے دانت بھی خراب ہو چکے تھے۔ ہونٹ ہمہ وقت پان کی سرخی سے رنگے رہتے، موٹی موٹی انگلیوں میں بڑی بڑی انگوٹھیاں ہوتیں کلائیوں میں سلمان خان کی نقل میں پہنا گیا بینگ ہومین کا بریسلیٹ۔ قد چھوٹا تھا اور وہ ڈٹ کے کھانے کی وجہ سے کافی فربہ بھی تھا۔ یہ سب بھی چل جاتا اگر اس کے خواب بہت اونچے نہ ہوتے۔ کام وام تو وہ کرتا نہیں تھا بس ایک باپ کی چھوڑی ہوئی دکان تھی جس کا کرایہ آتا تھا۔ اسی میں سکینہ بوا گزارہ کیا کرتی تھیں، خود باسر اپنی ضروریات اوپر کی آمدنی سے کرلیا کرتا۔ آخر لوگ اپنے جیبوں میں پیسے اسی کے لیے تو لے کے گھومتے تھے۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن کا آغاز عام سے ہی انداز میں ہوا تھا لیکن کچھ بھی عام نہیں تھا۔

خاندان کے سب بڑے بلا لیے گئے تھے، خاندان کے بڑے کسی ایسے ہی فیصلے پہ بلائے جاتے۔ حذیفہ کو راحت اکبر کے شدید رد عمل کی بابت اندازہ تو تھا لیکن وہ اس صورت نکلے گا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسی لیے وہ نیلم کے پاس گیا تھا اسی رات کو جس رات یہ قصہ ہوا تھا اس نے اسے سچ بولنے کے لیے کہا تھا لیکن وہ اڑیل گھوڑی کی طرح ماننے سے انکاری تھی۔

"تم نے یہ سب کر کے اچھا نہیں کیا نیلی! میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔" اس کے کمرے کی کھڑکی پہلی بار پھلانگ کے اس کے کمرے میں جاتے وہ غرایا تھا۔ اب اس نے سارا لحاظ بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اسے اب کسی بھی بات کی پروا نہیں تھی۔ اسے فکر تھی تو بس اپنے کردار کی۔ اس نے آج تک نیلی کو کبھی آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ٹھیک ہے اس کے اپنے چچا کے ساتھ کچھ اختلافات تھے لیکن اس کے باوجود بھی وہ کوئی گھٹیا یا گرا ہوا لڑکا نہیں تھا کہ اپنے گھر کی ہی تھالی میں چھید کر ڈالتا۔ اس نے تو ٹیپو کو بھی اپنے گھر والوں کو بھیجنے کی بات کی تھی لیکن نیلم نے نجانے کون سا بدلہ لیا تھا اس سے۔۔۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے تو تم تب کچھ کہو گے جب میرے بابا تمہیں چھوڑیں گے۔" جواباً وہ قہقہہ لگا کے ہنسی تھی۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟ بولو جواب دو۔"

وہ کتنی ہی دیر حیرت سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے گیا۔ نیلم کس قدر بے خوف تھی، اسے ذرا بھی شرم نہیں تھی کہ وہ کیا کر چکی ہے یا اس سارے قصے میں اس پہ کتنی کیچڑ اچھالی جا سکتی ہے۔ وہ تو جیسے ہر خوف سے بے نیاز تھی۔

"میں نے یہ سب کس لیے کیا، یہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا لیکن تم میرے بہت کام آئے اچھے کزن!" وہ شرارت سے کہتی مسکراتے ہوئے اسے چڑا رہی تھی۔ حذیفہ کا جی چاہا اسے کھڑے پیر ہی زندہ زمین میں گاڑ دے۔ اس کی قبر اسی کمرے میں کھود

دے تاکہ جو کالک اس کے چہرے پہ وہ مل چکی تھی وہ صبح کی پو پھوٹنے سے پہلے ہی اس کے چہرے سے صاف ہوجائے کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ سرخرو ہوسکے اپنی نظروں میں' اپنی ماں کی نظروں میں' اپنے چچا چچی کی نظروں میں۔

"ٹھیک ہے' میں ابھی جا کے تمہارے کرتوت تمہارے باپ کو بتاتا ہوں تاکہ وہ خود ہی معلوم کرسکیں۔" حذیفہ نے اس بار تپ کے کہا تھا لیکن نیلم کے سکون میں کوئی کمی نہیں آئی تھی' وہ اسی قدر پرسکون تھی جتنی پہلے نظر آرہی تھی۔

"ضرور جاؤ اگر وہ تمہارا یقین کرلیں تو؟" وہ لب دانتوں میں دبائے ابھی بھی مائل بہ شرارت تھی۔ کیا کسی کی زندگی سے کھیلنا اتنا آسان تھا۔ آن واحد میں اس نے حذیفہ کی ہستی کا غرور اس کی مردانگی کو خاک کیا تھا' زمیں پھٹی تھی نہ آسمان۔

"میں انہیں سچ بتا کے رہوں گا نیلم' جو کنواں تم نے میرے لیے کھودا ہے تم اسی میں گروگی یاد رکھنا۔" یہ کہہ کے وہ غصے سے تن فن کرتا واپس چلا گیا تھا نیلم کا قہقہہ اس نے اپنی پشت پہ سنا تھا اس کی پشت جلنے لگی تھی۔



پروین بیگم اس کا ناشتا لے کے آئی تھیں اس نے ناشتا بھی نہیں کیا حالانکہ وہ کل دوپہر سے بھوکا تھا لیکن اس کی بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی۔ فطرتاً وہ ایک اچھا سلجھے ہوئے مزاج کا لڑکا تھا۔ چالاکی عیاری اس میں نہیں تھی اس کے دل میں جو بھی ہوتا۔ وہ صاف برملا منہ پہ ہی کہہ دیا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دل دماغ میں جو بھی بات آتی۔ اسے وہ جا کے اپنے چچا سے کہہ دیا کرتا۔ چالاک ہوتا تو ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی تیاری کرتا لیکن اس کی صاف گوئی ہی اس کی دشمن بن گئی تھی وہی اس کے لیے یہ مصیبت کھڑی کررہی تھی۔

"خاندان کے بڑوں کا فیصلہ تمہیں منظور ہے۔" پروین بیگم کچھ دیر بعد دوبارہ اس کے پاس آکے بیٹھیں تو اس کا ناشتا ویسے کا ویسے ہی پڑا ہوا تھا انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر پوچھا تھا۔ وہ نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جمائے بیٹھا ہوا تھا۔

"مجھے کسی کا کوئی فیصلہ منظور نہیں ہے امی جان میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں زبردستی کیوں اس کے ساتھ شادی کروں۔"

حذیفہ نے ماں کی جانب خالی خالی نظروں سے دیکھ کے کہا تھا آج اس کے لہجے کی وہ کھنک ناپید تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔

"تو پھر؟" اس بار حذیفہ نے اپنی ماں کی جانب حیرت سے دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے مردان خانے میں جارہا تھا جہاں اس کی زندگی کا فیصلہ کیا جارہا تھا۔ پروین بیگم پردے کی اوٹ میں جا کے کھڑی ہوگئی تھیں۔ یہ ایک بڑا سا ہال تھا جہاں چاروں اطراف میں صوفے رکھے گئے تھے۔ پورا ہال مردوں سے بھرا ہوا تھا اسی ہال کے ایک طرف ڈائننگ ہال تھا جس میں چودہ کرسیوں والی بڑی ڈائننگ میز پڑی تھی اور بڑے ہال اور اس ہال کے درمیان محراب تھی جسے پردے کی مدد سے الگ کیا گیا تھا۔ پروین بیگم پردے کی اوٹ میں کھڑی ہوکے فیصلہ سننے لگیں لیکن ایک بات وہ دونوں ماں بیٹا بھول گئے تھے۔

وہاں فیصلہ نہیں ہورہا تھا وہاں نکاح کی تاریخ طے کی جارہی تھی۔ راحت اکبر اتنے بے وقوف ہرگز نہیں تھے کہ اپنے پیروں پہ خود ہی کلہاڑی مارتے اپنی گھر میں رات کے اندھیرے میں لگی کالک زمانے بھر کو دکھا دیتے انہوں نے اس کالک کو چھپانے کے لیے انوکھا اقدام کیا تھا' ایسا کام کہ خاندان بھر میں ان کی واہ واہ ہوگئی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی حذیفہ کے ساتھ کردوں' حذیفہ میرے بھائی کا بیٹا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد پارٹی کا ووٹ اسے

ملے اور یقیناً" یہ میرا نام روشن کرے گا۔ مجھے اس سے بہت سی امیدیں ہیں اور مجھے امید ہے کہ یہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔"

راحت اکبر نے یہ چند الفاظ کس دل سے کہے تھے وہاں بیٹھا کوئی بھی شخص اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا اور اندازہ تو حذیفہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس فیصلے کے پیچھے وہ اس کے لیے کون سا پھندا تیار کروا رہے تھے۔

سب نے ان کے فیصلے کو سراہا تھا سوائے حذیفہ کے' راحت اکبر کی بات ختم ہوئی تو سب ہی نے انہیں شاباش دینا شروع کردی تھی۔ خاندان کے بڑوں نے ان کے فیصلے کو سراہا تھا جن کی نظروں میں ان کا قد اور بھی اونچا ہو گیا تھا۔

"دولہا میاں آگئے ہیں۔۔۔" کسی نے اسے دیکھ کے جوش سے نعرہ لگایا تھا۔ سب ہی کی نظر ایک دم اس کے چہرے پہ پڑی تھی۔ کتنے ہی لوگ اٹھ کے اس کی جانب لپکے تھے۔۔۔ حذیفہ بے تاثر نگاہیں راحت اکبر پہ جمائے کھڑا تھا۔

"یہ میری زندگی کا فیصلہ ہے اسے میری مرضی کے خلاف کوئی کیسے کر سکتا ہے؟" اس نے اچانک ہی سب کے سامنے مضبوط لہجے میں سوال کیا تھا۔

"بیٹا ہم تمہارے بڑے ہیں۔ تمہارے لیے اچھا فیصلہ کریں گے۔" خاندان کے داداجی نے کہا تھا۔ انہیں سب ہی داداجی کہا کرتے تھے کیونکہ خاندان میں ایک وہی تھے پچانوے برس کی عمر کو پہنچنے کے باوجود بھی چاق و چوبند تھے۔

"میں جانتا ہوں کہ سوائے میرے' میرے لیے کوئی اچھا فیصلہ نہیں کر سکتا آپ لوگ یہاں جمع ہیں تو میری جائیداد کا فیصلہ کردیں' میں اپنے چچا سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔" اس بات پہ راحت اکبر نے اسے چونک کے دیکھا تھا۔

ہال میں موجود سب ہی لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

"اس موقع پہ بٹوارے کی باتیں مناسب نہیں ہیں۔" داداجی نے اپنے کڑک دار لہجے میں کہا تھا۔۔۔ راحت اکبر اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے ابھی کچا چبا جائیں گے۔

"کیوں مناسب نہیں' آپ کو کیا لگتا ہے شادی کے بعد میں ان کے گھر پہ ان ہی کے ٹکڑوں پہ پلتا رہوں گا۔۔۔ شادی کے بعد میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے گھر میں رہنا چاہتا ہوں میں بارات اپنے گھر سے لانا چاہتا ہوں اور یہ تو اسی صورت ممکن ہے کہ جب میں اپنے چچا سے اپنا حصہ لے لوں۔" حذیفہ نے بات ختم کرنے کے بعد مسکرا کے راحت اکبر کا چہرہ دیکھا تھا جو سیاہ ہو رہا تھا کاش کہ وہ اس آستین کے سانپ کو مار سکتے۔

"بات تو لڑکے کی سچ ہے' ہاں راحت بتاؤ کیا کہتے ہو؟" داداجی کا رخ راحت اکبر کی جانب ہوا تھا جو کھا جانے والی نگاہوں سے حذیفہ کو دیکھ رہے تھے۔

"میرا تو سب کچھ ہی اب ان دونوں کا ہے۔" وہ بمشکل ہکلائے تھے۔

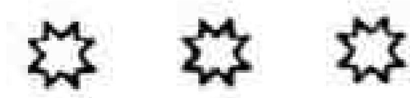
"تو پھر ابھی دے دو نا۔ تاکہ وہ بچہ کل کو تمہارے گھر سر اٹھا کے آسکے نہ کہ نگاہ جھکا کے۔۔۔" داداجی کی بات پہ راحت اکبر کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی تھی۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کے سیاسی جماعتوں میں ان کی تقریریں سننے والا ان کا بھتیجا انہیں ہی لاجواب کردے گا۔

"ٹھیک ہے لیکن نکاح کے ساتھ ہی رخصتی چاہوں گا اور وہ بھی دھوم دھام سے' اس لیے نکاح آج نہیں کل ہوگا۔۔۔ آپ مجھے ابھی اسٹامپ پیپر پہ ان سب کے سامنے میری پائی پائی کا حساب لکھ دیں۔ میں کل بارات دھوم دھام سے لے آؤں گا۔" حذیفہ نے راحت اکبر کی بات کے جواب میں کہا تھا وہ بس پہلو بدل کے رہ گئے تھے۔ انہیں رہ رہ کے اپنے فیصلے پہ تاؤ آرہا تھا۔ کاش کہ وہ اسے ابھی کھڑے کھڑے زندہ زمین میں گاڑ سکتے۔

"ٹھیک ہے میں اس کی ساری جائیداد میں سے اس کا حصہ دینے کو تیار ہوں لیکن میری بھی ایک خواہش ہے۔" سب نے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"میری خواہش ہے کہ نکاح اور رخصتی اسی گھر سے ہو کیونکہ بھتیجا ہونے کے ساتھ ساتھ یہ میرا بیٹا بھی ہے۔ میں نے اسے کبھی اپنے سگے بیٹے سے کم نہیں سمجھا۔ اسی لیے شادی ہوگی تو اسی گھر میں دھوم دھام سے ہوگی۔ کم از کم میری یہ التجا تو پنچایت والوں کو ماننی پڑے گی۔"

یہ کہہ کے انہوں نے جملہ حاضرین کی جانب دیکھا تھا' حذیفہ ان کی چال پہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔



نیلم نے سنا تو وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا رچایا کھیل اسی کے خلاف چلا جائے گا۔

اس نے فیصلہ سنتے ہی ٹیپو کو کال کی تھی' اس کا موڈ بے حد برہم تھا اور خود وہ بے حد پریشان تھی۔

"آخر تم کب آؤ گے رشتہ لے کے ٹیپو...... یہاں بابا میرا اس گھونچو کے ساتھ نکاح پڑھانے کے چکر میں ہیں۔"

اس نے فون اٹھاتے ہی پریشانی کے عالم میں کہا تھا دوسری جانب ٹیپو اسی قدر پرسکون تھا۔

"میں تم سے بات کر رہی ہوں ٹیپو......؟" نیلم اس بار اچھی خاصی جھنجلائی تھی۔

"کیوں فکر کر رہی ہو جان' میں نے تم سے وعدہ کیا ہے' تمہاری شادی ہوگی تو صرف مجھ سے ہی اور کسی سے نہیں۔"

"وہاں بابا نے میرا نکاح طے کردیا ہے۔" وہ ہلکی آواز میں چلائی تھی وہ جس قدر بے سکون تھی۔ وہ اسی قدر پرسکون تھا۔ نیلم کو اس کا یہی سکون غصہ دلا رہا تھا۔

"تو گھر سے بھاگ کے آجاؤ میرے پاس۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔ ہوش میں ہو بابا میری بوٹی بوٹی کردیں گے۔"

"اگر پہلے کچھ نہیں کہا تو اب بھی نہیں کریں گے۔ اگر تمہارا ہر صورت نکاح کل پڑھایا جانا ہے تو تم میرے ساتھ بھاگ کے شادی کرلو میں کل تمہیں لینے آجاؤں گا۔" ٹیپو نے اس کے سامنے بے فکری سے حل پیش کیا تھا۔

"میں یہ سب نہیں کرسکتی۔" کچھ دیر کے بعد نیلم نے بے بسی سے کہا تھا وہ پہلے ہی اتنا بڑا جھوٹ بول کے اپنے والدین کو اتنا پریشان کرچکی تھی' اب مزید نہیں کرسکتی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر میری محبت کو بھاڑ میں جھونک دو اور جاکے اسی گھونچو کے ساتھ نکاح پڑھالو۔" وہ ٹھیک ٹھاک ناراض ہوا تھا۔

"میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر' تم جانتے ہو لیکن میں یہ بھی نہیں کرسکتی جو تم کہہ رہے ہو۔ پہلے ہی تمہارے کہنے میں آکے میں نے اس بے چارے کو پھنسا دیا ہے۔" نیلم کا کہنا تھا کہ وہ بھڑک اٹھا تھا۔

"اتنی ہی ہمدردی ہے تو جاکے سب کے سامنے سچ اگل دو' ناں کردو قتل ہماری محبت کا' کردو اسے رسوا' میرا کیا ہے چرسی بن جاؤں گا اور اسی طرح ایک دن چرس کے نشے میں ہی کسی سڑک پہ جان دے دوں گا۔"

"اللہ نہ کرے ٹیپو! کیسی باتیں کررہے ہو' میری عمر بھی تمہیں لگ جائے ایسی باتیں تو مت کرو' تم جانتے بھی ہو کہ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" نیلم نے اگلے ہی لمحے سسکتے ہوئے کہا تھا۔ ٹیپو کے دل پہ نیلی کے آنسو شبنم کی پھوار بن کے گرے تھے۔

"تو پھر کیوں کرتی ہو ایسی باتیں جو مجھے تکلیف دیتی ہیں۔"

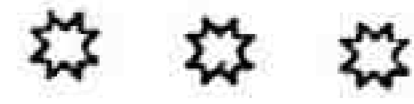
"بابا کل سے بہت ٹینشن میں ہیں مجھے ان سے شرم آتی ہے' میں تو ان سے نظریں ہی نہیں ملا پارہی۔" نیلم کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

"اب محبت کی جنگ جیتنے کے لیے یہ سب تو سہنا ہی پڑے گا۔" ٹیپو کا لہجہ دھیما ہوگیا تھا۔ "بس یہ کل کا ہنگامہ سرد ہوجانے دو میں جلدی ہی رشتہ لے کے آؤں گا۔ تم بس کسی بھی طرح سے یہ نکاح مت

"ہونے دو۔" وہ اسے ایک نیا سبق پڑھا رہا تھا اور وہ عقل کی اتنی اندھی تھی کہ اپنی سوچ کو اس کے پاس گروی رکھوائے آمنا وصدقنا کیے جا رہی تھی۔

"اور اگر کل نکاح ہو گیا تو؟" نیلم کے لہجے میں آنے والے وقت کا خوف تھا۔

"اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو تم تیار رہنا۔ نکاح کل ہی ہوگا لیکن تمہارا اور میرا۔" نیلم نے اس بات پہ بے ساختہ اپنے کاندھوں سے بوجھ سرکتا محسوس کیا تھا۔



"آخر تم کرنا کیا چاہ رہے ہو؟" پروین بیگم نے اپنے بیٹے کی جانب دیکھ کے کہا تھا جو سر جھکائے نجانے کس سوچ میں مصروف تھا۔

"یہ کل آپ کو معلوم ہو جائے گا۔" ان کے استفسار پہ اس نے آہستہ سے کہا تھا۔

پروین بیگم اس کے بعد اس سے کچھ نہیں بولی تھیں اور سیدھی نیلی کے کمرے کی جانب گئی تھیں۔

نیلم اس وقت نہا کے نکلی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ پروین بیگم اس طرح سے اس کے کمرے میں آجائیں گی۔ وہ انہیں دیکھ کے ٹھٹکی پھر اگلے ہی لمحے سر جھٹک کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کے اپنے بال سنوارنے لگی تھی۔

"ایک سوال پوچھ سکتی ہوں تم سے؟"

"پوچھیں......" نیلم نے بے زاری بھری نگاہ ان پہ ڈالتے ہوئے انہیں جیسے اجازت نہیں دی بلکہ احسان کیا۔

"یہ بات تو میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ تم میرے بیٹے کو پسند نہیں کرتیں اس نے تمہیں ورغلایا ہوگا یہ بھی ایک ناممکن سی بات ہے لیکن مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ یہ سب کرنے کا تمہارا مقصد کیا ہے؟" پروین بیگم نے شاید زندگی میں پہلی بار اتنا لمبا جملہ بولا تھا۔

نیلم نے ایک غصے بھری نظر ان پر ڈالی ——— یوں جیسے وہ پوچھ رہی ہو۔ کیا میں اتنی بے وقوف ہوں جو اس بات کا جواب آپ کو دے دوں گی۔

"جواب دو کیا تم میرے بیٹے کے نکاح میں آکے اپنے کسی جاننے والے کے ساتھ بھاگنا چاہتی ہو؟" نیلم نے اس بار چونک کے دیکھا تھا۔ یہ پروین بیگم کا سوال نہیں تھا بلکہ نیزے کی وہ انی تھی جو سیدھی اس بات پہ نیلم کے سینے میں جا گڑی تھی۔

"زبان سنبھال کے بات کریں چچی!" نیلم نے کہا تو وہ طنزیہ ہنسی تھیں۔

"اپنے اللہ کو حاضر ناظر رکھ کے بتاؤ کیا تم یہ بات کہنے کی اہل ہو؟ اپنی ذات پہ انگلیاں اٹھانے کا موقع تو تم نے خود ہی دیا ہے ناں، بیٹے کی ماں ہونے کے ناتے میں تو تمہیں کچھ بھی کہہ سکتی ہوں۔" نیلم کو لگا اس پہ سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ اسے امید نہیں تھی کہ پروین بیگم اس طرح کی باتیں بھی کر سکتی ہیں لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ بحیثیت عورت کے وہ کمزور ضرور تھیں لیکن ایک ماں کبھی بھی کمزور نہیں پڑتی نہ ہی وہ خوف زدہ ہوتی ہے وقت سے نہ حالات سے۔

"آپ کے بیٹے نے مجھے محبت کا جھانسا دیا ہے، آپ کو یہ بات ماننی پڑے گی۔" نیلم کا لہجہ ہکلا گیا تھا۔

"اچھا! تو پھر تو اسے نکاح والی بات سن کے خوش ہونا چاہیے تھا۔ وہ تم سے شادی کرنے سے انکاری کیوں ہے۔ جواب دو؟" پروین بیگم نے ایک بار پھر اسے لاجواب کیا تھا۔

"وہ خوش ہی تو ہے۔" نیلم اس بار بھی اپنے لہجے کو قابو میں نہیں رکھ سکی، پروین بیگم طنزیہ ہنسی تھیں۔

"نہ تو وہ خوش ہے نہ ہی تمہارے چہرے پر خوشی کی کوئی رمق آرہی ہے۔ تم بے وقوف کسے بنا رہی ہو؟" اس بار نیلم خود پہ کنٹرول نہیں رکھ سکی تھی اور چلائی تھی۔

"چلی جائیں یہاں سے چچی ورنہ شور مچا کے بلا لوں گی بابا، ماما کو آپ جانتی ہیں ناں، وہ پہلے ہی بہت غصہ ہیں آپ پر۔" نیلم نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا تھا اور اگلے ہی لمحے اس نے اس پہ عمل کیا تھا، نیلم نے زور زور سے چاندنی بیگم کو آوازیں

دی تھیں لیکن اس بار وہ خود نہیں آئی تھیں بلکہ انہوں نے شریفاں کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا۔

"ماما کہاں ہیں شریفاں؟" نیلم نے اپنے تیز تنفس کو بحال کیے بغیر کہا تھا۔

"وہ جی کہہ رہی ہیں کہ اپنی آواز کو نیچی رکھ کے بات کریں، چوہدری صاحب پہلے ہی غصے میں ہیں۔۔۔" شریفاں نے ہکلاتے ہوئے کہا تھا۔ نیلم کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

"سن لیا؟ تمہیں کیا لگا تھا جو کچھ تم کر چکی ہو اس کے بعد تمہارے والدین تمہارا ساتھ دیں گے؟" پروین بیگم نے ایک جلتی نگاہ نیلم پہ ڈالی اور اس کے بعد وہ باہر نکل گئی تھیں نیلم کتنی ہی دیر جلتی کلستی رہ گئی تھی۔

"کس مصیبت میں پھنسا دیا ٹیپو نے بھی۔ گھر کے ہی دشمن کھڑے ہو گئے ہیں۔۔۔" کمرے میں چکر کاٹتے وہ بولے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہو گیا فیصلہ۔۔؟" چاندنی بیگم نے بے حد آہستہ سے پوچھا تھا ایک ہی رات میں ان کا سارا طنطنہ سارا رعب ہوا ہو گیا تھا۔

"کر آیا میں اپنے ہاتھوں سے اپنی شکست کا فیصلہ۔" راحت اکبر کے کاندھے جھکے ہوئے تھے۔

"تمہاری بیٹی نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا، سارے زمانے میں اسے کیا یہی ایک ملا تھا۔" راحت اکبر نے سختی سے اپنی انگلیاں بھینچیں۔۔۔ چاندنی بیگم خاموش رہیں وہ کیا کہتیں کہ ان کی بیٹی نے تو انہیں بھی بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، ساری زندگی جن کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھا تھا، وہ انہیں ہی اپنی مانگ کا سندور بنانے پہ تلی ہوئی تھی۔

"بچی کو ورغلا جو لیا اس کمینے نے؟" نہیں لاکھ اس پہ غصہ سہی لیکن وہ راحت اکبر کو نیلی سے بدگمان نہیں کر سکتی تھیں۔

"وہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں تھی۔۔۔ خدا کے لیے اب تو اس کی سائیڈ لینا چھوڑ دو، جو کالک اس نے تمہارے اور میرے منہ پر ملی ہے، وہ ہمارے چھپانے سے بھی نہیں چھپے گی اور تمہیں کیا لگتا ہے کیا دنیا والے پاگل ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کل کو بیٹی کی منگنی تم نے اپنی بہن سے کی ہے تو نکاح ایسے اتنی اچانک بھتیجے سے کرنے کی کیا تک بنتی ہے، بولو۔"

راحت اکبر شاید نہیں یقیناً "خود سے لڑتے لڑتے ہار گئے تھے اسی لیے ایک سانس میں بے ربطی سے کہہ گئے تھے۔

چاندنی بیگم خاموش رہیں اس بار وہ اپنی بیٹی کا دفاع نہیں کر سکیں، ہاں البتہ وہ اپنی بے وقوفی پہ پچھتا ضرور رہی تھیں کاش وہ اس وقت اپنے غصے کو پی جاتیں تو یہ نوبت نہ آتی اور کاش وہ اپنی بیٹی پہ نظر ہی رکھ لیتیں۔

"سارا قصور تمہارا ہے جاہل عورت! ایک بیٹی کی تربیت تم سے نہیں ہو سکی، وہ تمہاری ناک کے نیچے اتنا گھناؤنا کھیل کھیلتی رہی اور تم بے خبر رہیں۔۔۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ تم کو بھی جان سے ماروں اور اسے بھی زندہ زمین میں دفن کر دوں۔ کاش وہ پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔" وہ غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ابھی جو بات گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اسے آپ خود ہی دنیا والوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ سے کہا ہے نا کہ کل ان دونوں کا نکاح کر کے انہیں چلتا کریں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں جائیداد میں سے اپنا حصہ دینے کی۔" چاندنی بیگم راحت اکبر کی نبض پہ ہاتھ رکھنا جانتی تھیں۔ اسی لیے انہیں سمجھا رہی تھیں۔

"اس ذلیل انسان نے تو بھری پنچایت کے سامنے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔ اتنی مشکل سے جان چھڑائی۔" راحت اکبر دن والے واقعے پہ ابھی تک غصے میں تھے حذیفہ نے انہیں آگ ہی ایسی لگائی تھی

جس میں وہ دن رات دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔



وہ اندھیری رات کی خاموشی نہیں موت کے سناٹے تھے۔ جو اس گھر میں گونج رہے تھے۔

"تمہیں یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔" پروین بیگم نے کپڑوں کو تہ کرتے ہوئے حذیفہ سے کہا تھا۔

وہ زمین کو گھور رہا تھا ماں کی بات پہ چونکا۔

"آپ دیکھتی جائیں میں اس کے ساتھ کرتا کیا ہوں۔ اسے ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ وہ یاد رکھے گی۔" پروین بیگم نے سارے کپڑے سمیٹ لیے تھے اب حذیفہ کے پاس آ بیٹھی تھیں۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے' وہ اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں خود ہی گرنے والی ہے۔۔۔" حذیفہ نے بے ساختہ اپنی ماں کے پر سکون چہرے کی جانب دیکھا، جو اس قدر سکون میں تھیں کہ حذیفہ کو حیرت ہوئی بھلا اتنے کشیدہ ماحول میں وہ اتنی پر سکون کیسے ہو سکتی تھیں۔

"وہ کیسے۔۔۔؟"

"میں نے تمہارا سارا سامان پیک کر دیا ہے۔ تم ابھی کھانا کھانے کے بعد یہ گھر چھوڑ کے جا رہے ہو۔" پروین بیگم نے اسی سنجیدگی سے کہا تھا ہاں البتہ ان کے لہجے کی مضبوطی نے حذیفہ کو چونکا دیا تھا۔

"لیکن کہاں؟ اور پھر میں کیوں جاؤں یہ میدان چھوڑ کر۔ میں بھگوڑا نہیں ہوں۔" وہ یک دم ہی بھپرا تھا۔

"میں نے کہا ناں کہ تم ابھی رات کا کھانا کھانے کے بعد یہاں سے جا رہے ہو کیا تمہیں میری کوئی بھی بات سنائی نہیں دے رہی۔" اس بار وہ غصہ ہوئی تھیں۔

حذیفہ اپنی جگہ پہ تھم سا گیا۔

"راحت اکبر کے گناہوں کی سزا تم کیوں اپنے منہ مل لینا چاہتے ہو۔۔۔ یہ اس کے کرموں کی سزا ہے جو آج اس کی بیٹی کسی اور کا گناہ اپنے پیٹ میں پالے اسے کسی کے بھی سر تھوپ دینے کو تیار ہے۔۔۔ لیکن وہ شخص جو بھی ہو لیکن میرا بیٹا کبھی نہیں ہو سکتا۔" حذیفہ نے اپنی ماں کو اس بات پہ بے حد حیرت سے دیکھا تھا۔

"ساری زندگی میں صرف اس لیے ڈرتی رہی کہ راحت اکبر اپنی کہی دھمکی کے مطابق تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔۔۔ میں نے تمہارے ساتھ ہوئی ہر زیادتی پہ خود کو لا تعلق ظاہر کیا لیکن اب نہیں اب میرے بیٹے کے کردار اس کے مستقبل اور اس کی زندگی کی خوشیوں کی بات ہے۔ اب اگر میں کمزور پڑی تو پھر کبھی خود کو معاف نہیں کر سکوں گی۔۔۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم یہ شادی نہیں کرو گے۔" پروین بیگم نے اپنے لہجے کی مضبوطی کو قائم رکھتے ہوئے کہا تھا۔ حذیفہ نے پروین بیگم نے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"آپ مجھے بزدل بنانا چاہتی ہیں۔۔۔؟"

"مجھے تمہاری ایسی بہادری نہیں چاہیے جو دشمن کے دانت کھٹے کرنے کے بجائے اس کی عزت کی لاج رکھ لے۔ میں راحت اکبر کو ذلیل ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔ جس بے دردی سے اس نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ قدرت کی اس گرفت سے وہ کبھی آزاد نہ ہو سکے۔" پروین بیگم اس پہ انکشافات کر رہی تھیں۔ حذیفہ گم صم سا انہیں دیکھ رہا تھا۔ تو کیا وہ سب کچھ سچ تھا جو اس نے سنا تھا لیکن اس کی ماں نے جھٹلا دیا تھا۔

"تو یہ سب آپ مجھے اس وقت کیوں بتا رہی ہیں۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔۔۔؟"

"اس لیے کیونکہ میں مناسب وقت کے انتظار میں تھی اور اس سے مناسب وقت اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ راحت اکبر کے بندے تمہیں ڈھونڈ نہ لیں۔ اس لیے میں تمہیں تمہارے بابا کے ایک بہت اچھے دوست کا پتا دیتی ہوں تم ان کے پاس چلے جانا۔۔۔ کچھ دن ان ہی کے پاس رہنا اور سنو مجھ سے رابطہ کرنے کی بالکل بھی کوشش نہیں کرنا۔ میری فکر کرنے کی کوئی

ضرورت نہیں ہے۔" پروین بیگم اسے ہدایات دے رہی تھیں۔

"کون سا دوست آپ نے پہلے تو کبھی نہیں بتایا مجھے۔" وہ اس بار جھنجلایا تھا۔

"ساری باتیں نہیں پوچھا کرتے۔ میں نے کہا ناں، تم اس پتے پہ چلے جاؤ میں جانتی ہوں وہ کوئی سوال جواب نہیں کریں گے اور تمہاری ہر ممکن طور پہ مدد کریں گے لیکن تم واپس کسی صورت نہیں آؤ گے یاد رکھنا۔"

"ٹھیک ہے لیکن کل جب میں یہاں نہیں ہوں گا تو چچا جان کہیں آپ کو۔" اس سے آگے خوف کے مارے حذیفہ سے بات ہی مکمل نہیں ہو پائی تھی۔

"وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے تم بس جاؤ یہاں سے۔" اس کے بعد انہوں نے اسے کچھ زیور اور رقم دی تھی۔ حذیفہ کے خود کے پاس بھی کافی پیسے ہوتے تھے لیکن اس نے پروین بیگم کی دی ہوئی نقدی بھی سنبھال لی تھی حالانکہ اس کا دل نہیں تھا وہاں سے جانے کو۔ وہ بھگوڑا نہیں کہلانا چاہتا تھا، وہ ڈٹ کے حالات کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن زندگی میں پہلی بار وہ اپنی ماں کے کہنے میں آکے ہار گیا تھا۔

اس نے اپنی ماں کے کہنے میں آکے گھر چھوڑ دیا تھا ہمیشہ کے لیے اور بعد میں بھی اس کا پتا نہیں چل سکا تھا۔

اسی رات نیلم نے بھی گھر سے بھاگنے کی تیاری کی تھی اس نے ٹیپو کو کال کی تھی لیکن وہ اسے لینے کے لیے نہیں آیا تھا نیلم نے زیور نقدی سب اکٹھا کر کے ایک بیگ میں ڈال لیا تھا محبت کے لیے وہ کسی بھی حد تک کہیں بھی جا سکتی تھی۔ اس نے یہ سب ٹیپو کو حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ ادھر آصف سے منگنی تڑوانے کے لیے یہ سب کر رہی تھی، حذیفہ کو اپنے بابا کی نظروں سے گرانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ بابا کبھی بھی اس کی شادی جائیداد بچانے کے لیے حذیفہ سے نہیں کریں گے اور اس سارے واقعے کے بعد ٹیپو اپنا رشتہ بھیج دے گا، راحت اکبر کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہوگا اسی لیے وہ اس کی شادی ٹیپو کے ساتھ کر دیں گے۔

لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ آگ کا کھیل کھیلتے ہوئے اس کا دامن بھی جلے گا۔ کافی دیر گزر گئی تھی۔ اس نے رات کا کھانا بھی بس زہر مار کیا تھا اس کی ماں نے کل سے اس کے کمرے میں نہیں جھانکا تھا اور اسے بھی اب کوئی پروا نہیں تھی وہ اپنی زندگی جینے جا رہی تھی وہ کیوں اپنے ماں باپ کے برابری کے چکر میں اپنی زندگی خراب کر لیتی۔ اس کے والدین کے اسی اصول کی وجہ سے تو ٹیپو اس کا رشتہ لانے سے ڈرتا تھا، وہ اب ذات پات، رنگ نسل اور امیری غریبی کا فرق مٹانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

دروازہ فارہ نے کھولا تو سامنے ہی ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ لیے یاسر کھڑا نظر آیا اس کے مضحکہ خیز حلیے کو دیکھ کے فارہ نے بے ساختہ اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔ گہرے جامنی رنگ کی شرٹ کے ساتھ فان کلر کی پینٹ پہنے، آنکھوں میں سرمہ، ہونٹوں پہ پان کی سرخی سجائے وہ دروازے میں ترچھا کھڑا تھا، رہی سہی کسر جامنی فریم کے چشمے نے پوری کر رکھی تھی جو یاسر کے سر پہ اٹکا تھا، ہاتھوں کا بھی یہی حال تھا بے شمار انگوٹھیاں کلائیوں میں بریسلٹ۔ فارہ کو ہنسی نہ آتی تو کیا کرتی، ویسے بھی کیا خوب جوڑ بنایا تھا اس نے عبیر اور یاسر کا، کم از کم دونوں ساتھ چلتے تو ایک جیسے لگتے ہاں البتہ یاسر تھوڑا شوخا تھا لیکن عبیر اتنی ہی ڈیسنٹ۔ فارہ کو یقین تھا کہ عبیر شادی کے بعد اسے اپنے رنگ میں ڈھال لے گی۔

"السلام علیکم جی۔!" یاسر نے فارہ کے رعب حسن سے متاثر ہو کر فوراً "ماتھے تک لے جا کے سلام جھاڑا تھا فارہ نے مسکرا کے جواب دیا تھا۔

"آؤ آؤ یاسر میاں اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔" فارہ ایک عرصے بعد اپنی جون میں لوٹی تھی اس کے اندر کی

ملکہ جاگی تھی۔
"آپ......؟" یاسر نے اس کے انداز تخاطب پہ پوچھا تھا۔
"تمہاری ساس۔" فارہ سینے پہ ہاتھ باندھ کے مسکرائی، یاسر کی آنکھیں ابل کے باہر آگئیں۔ ایسی قیامت ساس کی توقع اس نے بہرحال نہیں کی تھی۔
"وہ جی میں تو اماں کے کہنے پہ آیا تھا سوچا کہ سلام کر آؤں......" یاسر ڈرائنگ روم میں صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولا تو فارہ نے مسکرا کے فراخ دلی دکھائی۔
"بہت اچھا کیا جو چلے آئے۔ آتے جاتے رہا کرو۔ تمہارا اپنا ہی گھر ہے اور پھر جتنی جلدی تمہاری اور عبیر کی انڈراسٹینڈنگ ہوگی اتنا ہی بہتر ہوگا۔" فارہ نے لبرل ازم کی ساری حدیں ایک ہی جست میں پھلانگتے کہا جیسے وہ کسی برگر فیملی کے پروردہ سے محو گفتگو تھی۔
"وہ جی، آپ کی بیٹی کہاں ہے؟ میں نے تو ابھی اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔" یاسر کو نجانے کیوں پہلی بار شرم آئی۔ کاش وہ آئینہ دیکھ لیتا کہ اچھی خاصی پکی عمر کا مرد شرماتے ہوئے کیسا لگتا ہے۔
"ہاں ہاں کیوں نہیں میں ابھی بلاتی ہوں۔" فارہ یہ کہہ کے اٹھ گئی یاسر کتنی ہی دیر فارہ کے سحر میں گرفتار مسحور سا بیٹھا رہ گیا۔ فارہ گئی تو کچھ دیر بعد اس کے ہمراہ تھی۔ فارہ اسے بٹھا کے وہاں سے چلی گئی لیکن عبیر یاسر کا جی حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ عبیر نے اس کے سارے ارمانوں پہ اوس گرادی تھی۔ حالانکہ اگر یاسر فارہ کو نہ دیکھ لیتا تو یقیناً" اسے عبیر اچھی لگتی کیونکہ بہرحال وہ پڑھی لکھی بھی تھی اور یاسر سے ہزار ہا درجے بہتر بھی۔
"آپ کو کوئی کام تھا کیا......؟" عبیر نے اسے خاموش بیٹھے دیکھ کے کہا تھا۔
اس نے یہ صرف فارہ کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے کہا تھا کیونکہ فارہ نے اسے سختی سے کہا تھا کہ وہ یہ رشتہ ہر حال میں کرنا چاہتی ہے۔ اب عبیر اپنی کسی بے وقوفی کے ہاتھوں اسے ختم کرنے کی کوشش نہ کرے۔ عبیر اسی لیے خاموش تھی لیکن نجانے دل میں...... کہیں ایک درد سا اٹھا تھا جو نامعلوم سا تھا۔ کیا بھری کائنات میں عبیر کا نصیب اس ایک شخص کے ساتھ ہی جوڑنا ضروری تھا اور کیا وہ اتنی بری بیٹی تھی کہ سلطان احمد نے یاسر جیسے مرد سے شادی کر کے اسے سزا دینے کی ٹھانی تھی۔
"مجھے کیوں کوئی کام ہونا ہے جی...... میں تو اپنی سسرال آیا ہوں......" یاسر اب صوفے پہ کھلا ہو کے بیٹھ گیا تھا۔
"میں چائے لاؤں آپ کے لیے......" عبیر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے اس نے میز پہ پڑے گلدستے کو بغور دیکھا وہ تازہ پھولوں کا سجا ہوا تھا جو وہ یقیناً" اسی کے لیے لایا تھا لیکن عبیر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے دے کیوں نہیں رہا تھا۔
"آپ بڑی مختلف ہو جی......" یاسر یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ خوب صورت نہیں ہے۔ عبیر کا رنگ سیاہ پڑ گیا تو کیا وہ یاسر جیسے شخص کے ہاتھوں بھی ذلیل ہونے والی تھی......؟
"میں اپنی ماں پہ گئی ہوں، فارہ پہ نہیں......" عبیر نے قطعیت سے کہہ کے بات ختم کی تھی۔ یاسر کوئی بات نہیں کرسکا۔ اسے تو عبیر کا لہجہ ڈرا گیا تھا ویسے بھی اماں نے اسے بتایا تھا کہ وہ بہت پڑھی لکھی ہے۔ اسکول کالج میں ہمیشہ اول آتی رہی ہے۔ یاسر کو اس سے ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے جو اس رشتے کو ختم کرنے کا باعث بن جائے۔
اسی دوران فارہ چائے بنا کے لیے آئی تھی۔ عبیر نے دیکھا اس نے چائے پہ کافی اہتمام کیا تھا۔ کباب سموسے، نمکو کے ساتھ مٹھائی تھی۔ فارہ نے یاسر کو خود چائے بنا کے دی تھی اور مسکرا مسکرا کے اس سے خوب باتیں کی تھیں۔ عبیر نے خاموشی سے چائے ختم کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ فارہ کو یاسر نے اپنی چرب زبانی کے باعث بہت سے قصے سنائے جنہیں سن کے وہ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے جارہی تھی...... یاسر آیا تو دس منٹ

Watch Us On

YouTube

چہرے کے فالتو بالوں کا

بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

چہرے کی جھریوں کا

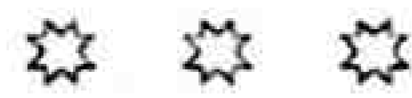
بہت ہی آسان علاج





Health Care Club

کے لیے تھا لیکن وہ پورے دو گھنٹے بعد اٹھا تھا۔۔۔۔
"آتے جاتے رہا کرو تم تو بہت ہی مزے کی باتیں کرتے ہو۔۔۔" فارہ نے مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا یاسر تو پھول کے کپا ہو گیا تھا۔
"آپ بلائیں گی تو ضرور آیا کروں گا جی۔۔۔!"
"بلا ہی تو رہی ہوں۔ اپنے ہی گھر میں روز روز دعوت نامہ نہیں دیا جاتا۔۔۔" فارہ نے اپنائیت کی آخیر کردی تھی۔۔۔
"یہ آپ کے لیے۔۔۔" اس نے جاتے سے پھولوں والا بوکے عبیر کی بجائے فارہ کو تھمایا تھا فارہ نے اسے حیرت سے دیکھ کے سمجھایا تھا۔
"یہ مجھے نہیں بلکہ عبیر کو دو۔۔۔ منگیتر وہ ہے تمہاری میں نہیں۔۔۔"
بات کے اختتام پہ وہ قہقہہ لگا کے ہنسی تھی، عبیر اپنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی تھی۔
"لایا تو اسی کے لیے تھا لیکن اب اس کی صحیح حقدار وہ نہیں، آپ لگ رہی ہیں اس لیے یہ آپ کے لیے۔۔۔"
فارہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے یاسر کے ہاتھوں سے وہ بوکے تھام لیا تھا۔ اس کے دل کو بڑا ہی سکون ملا تھا۔ عبیر یاسر کے دل میں گھر کرنے میں ناکام رہی تھی۔ عبیر نے یہ منظر دیکھا اور سر جھٹک کے اندر بڑھ گئی۔ اس کے لیے اب ایسی باتیں تکلیف کا باعث نہیں بنتی تھیں، جب سے بابا روٹھے تھے وہ جان گئی تھی کہ غم کسے کہتے ہیں۔



"کہاں ہے تمہارا بیٹا۔ کہاں چھپایا ہے تم نے اسے۔۔۔؟" راحت اکبر کی چنگھاڑ نے پورے گھر کے در و دیوار کو لرزا کے رکھ دیا تھا پروین بیگم سر جھکائے ان کے سامنے کھڑی تھیں۔
"میں کچھ نہیں جانتی میں نے اسے بس کل دوپہر کو دیکھا تھا۔" انہوں نے صاف جھوٹ بولا تھا۔
"جھوٹ بولتی ہو تم! تمہارا بیٹا مجھے اس طرح سے ذلیل نہیں کر سکتا، پہلے اس نے میری عزت سے کھلواڑ کیا اور اب مجھے ذلیل ہونے کو یہاں اکیلا چھوڑ گیا ہے۔" راحت اکبر غصے سے بھرے ہوئے تھے۔
"میرا بیٹا ایسا نہیں کر سکتا، اتنا میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔" پروین بیگم کے لہجے کی استقامت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔
"بیٹی تو میری بھی ایسا نہیں کر سکتی۔ سمجھیں تم۔ تمہارے مردود بیٹے نے ہی اس معصوم کو ورغلایا تھا۔" چاندنی بیگم تلملائی تھیں لیکن راحت اکبر نے انہیں ہاتھ اٹھا کے خاموش ہونے کو کہا تھا۔
"اور وہ بہک گئی۔" پروین بیگم نے چاندنی بیگم کو دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز سے کہا۔ تو وہ پہلو بدل کے رہ گئیں۔
"دیکھو، میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ نکاح کی دعوت سب کو دی جا چکی ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر میں سارے خاندان والے آنے والے ہیں، تم ابھی اپنے بیٹے کو فون کر کے اسے بلاؤ۔ میری عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔" راحت اکبر نے اچانک ہی پروین بیگم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔
پروین بیگم نے نفرت کی ایک نظر ان پہ ڈالی۔ انہیں یاد آیا کہ جب وہ لاہور میں تھیں تو راحت اکبر اپنے بھائی کو منانے کے لیے یونہی سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔ وہ ذوالفقار اکبر کے چھوٹے بھائی تھے جو گاؤں میں ان کی زمینوں کا حساب کتاب رکھا کرتے تھے۔ ذوالفقار اکبر کی زمینوں کی سالانہ آمدنی کم از کم دو کروڑ سے زیادہ تھی لیکن راحت اکبر اپنے بھائی کو کم پیسہ بھیجا کرتے تھے۔ جب ذوالفقار اکبر کو یہ بات پتا چلی تو ان کا راحت اکبر سے بہت جھگڑا ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ ان سے بہت ناراض تھے۔ ساری زمینوں کا حساب بھی انہوں نے آن واحد میں ان سے لے لیا تھا،

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



آبلہ

اُداسی کے اُفق پر جب تمہاری یاد
کے جگنو چمکتے ہیں
تو میری روح پر رکھا ہوا یہ ہجر کا پتھر
چمکتی برف کی صورت پگھلتا ہے
اگرچہ یوں پگھلنے سے یہ پتھر سنگریزہ تو نہیں بنتا
مگر اک حوصلہ سا دل کو ہوتا ہے
کہ جیسے سرسبز تاریک شب میں بھی
اک زرد رو، سہما ہوا تارا نکل آئے
تو قاتل رات کا بے اسم جادو ٹوٹ
جاتا ہے
مسافر کے سفر کا راستہ تو کم نہیں ہوتا
مگر تارے کی چلمن سے
کوئی بھولا ہوا منظر اچانک جگمگاتا ہے
سُلگتے پاؤں میں اک آبلہ سا پھوٹ جاتا ہے

عاصمہ امداد علی

یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں
ان میں کچھ صاحبِ اسرار نظر آتے ہیں

دُور تک کوئی ستارا ہے نہ کوئی جگنو
مرگِ امید کے آثار نظر آتے ہیں

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

کل جسے چھو نہیں سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونقِ بازار نظر آتے ہیں

حشر میں کون گواہی مری دے گا ساغر
سب تمہارے ہی طرف دار نظر آتے ہیں

ساغر صدیقی



شگفتہ جاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اتنے عمل کا بوجھ اٹھاؤ جتنے کی تم میں طاقت ہو، کیونکہ بہترین عمل وہ ہے جس کی زیادہ پابندی کی جائے اگرچہ تھوڑا ہو۔

اللہ کی یاد،

مالک بن دینار فرماتے ہیں۔

"جو شخص لوگوں کے ساتھ باتیں کرنا اور مشغول ہونا، بہ نسبت اللہ پاک کی یاد کے اور عبادات کے زیادہ پسند کرتا ہے، اُس کا دل اندھا، علم تھوڑا اور عمر رائیگاں ہے۔"

نادیہ اشرف۔ دائے ونڈ

غصہ،

ایک شہ زور پہلوان غصے میں ایسا لال پیلا ہو رہا تھا کہ زبان سے گالی اور منہ سے کف جاری تھا۔

کسی روشن دل بزرگ نے دیکھ کر پوچھا۔

"اس کی یہ حالت کیسے ہو گئی؟"

لوگوں نے کہا۔ اسے فلاں شخص نے گالی دی ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "یہ کم حوصلہ بھاری مگدر تو اٹھا لیتا ہے مگر ایک ننھی سی بات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ غصے کی عادت شیطان کا کام ہے۔ عاجزی انسان کی صفت ہے۔"

دعوت،

حضرت سلیمان ؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی۔

"اللہ تعالیٰ! میں ایک سال تک آپ کی مخلوق کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "تم نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھا ایک مہینہ کر لیتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا۔ "تم نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھا پھر ایک ہفتہ کر لیتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا۔ "تم نہیں کر سکتے۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھا تو صرف ایک دن کرنے دیں۔"

اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی۔

انہوں نے جنات، ہوا، انسانوں، پرندوں کو حکم دیا۔ "کھانا لگاؤ۔"

جب کھانا لگ گیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا۔ "اپنی مخلوق کو بھیج دیں کھانا تیار ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے پوچھا۔ "زمین والوں کو بھیجوں یا پانی والوں کو؟"

انہوں نے کہا۔ "پانی والوں کو بھیج دیں۔"

پھر ایک مچھلی سمندر سے باہر آئی اور سارے کا سارا دسترخوان برتنوں سمیت کھا گئی اور کہنے لگی۔

"اور دو۔"

حضرت سلیمان ؑ حیرت سے منہ میں انگلی دبا کر کھڑے تھے، کہنے لگے۔

"تو سب کھا گئی اور کہاں سے دوں؟"

وہ بولی۔ "مہمان کو کوئی طعنے دیتا ہے سلیمان! میرا اللہ مجھے روزانہ ایسے تین لقمے دیتا ہے۔ آج تو میں بھوکی رہوں گی۔ یہ تیرا کام نہیں تیرے رب ہی کا کام ہے کہ وہ سب کو کھلاتا ہے۔"

ارم کمال۔ فیصل آباد

انمٹ اور لازوال

انگریزی زبان کے مشہور شاعر شیلے نے کہا ہے۔
چار چیزیں انمٹ اور لازوال ہیں۔
مدھر، رسیلی، پیاری آوازیں
خوشبو
گلاب کی پنکھڑیاں
اور محبوب کی یادیں

نمرہ، اقرا۔ کراچی

آپ اپنے دام میں

بیٹا: "امی! کیا پسند کی شادی سے گھر والے ناراض ہوتے ہیں؟"

ماں: "تو یقیناً کسی چڑیل کے چکر میں ہوگا اور یہ سب تجھ سے اس ڈائن نے کہا ہوگا۔ ایسی لڑکیاں تو بس لڑکوں کو پھنسانے میں لگی رہتی ہیں۔ بیٹا! ایسی لڑکیوں سے بچ کر رہنا، یہ بہت مکار اور گھنی ہوتی ہیں۔"

بیٹا: "امی بس کریں، ایسا کچھ نہیں ہے، وہ تو مجھے ابو بتا رہے تھے کہ آپ دونوں کی پسند کی شادی تھی۔"

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

جدید دور

نایاب اپنی دوست ہاجرہ سے، "پاپا نے کہا ہے کہ اگر اس بار بھی تم فیل ہوئیں تو تمہاری شادی کر دوں گا۔"

ہاجرہ بے چین ہو کر بولی۔ "تو تم نے کتنی تیاری کی ہے؟" نایاب نے خوشی سے کہا۔

"بس دیمے کا ڈریس رہ گیا ہے۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

عشق کی دھول

جانے کون نگر کی چڑیا
شام منڈیر پہ آ بیٹھی ہے
چونچ میں اک نازک سی ڈالی
جیسے عشق سفر کی دھول

(نوشی گیلانی)

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

نمک پارے

- آپ جنہیں بے وقوف سمجھ رہے ہوتے ہیں درا صل وہ آپ کی حرکتیں نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں۔
- لہجہ لفظ کا ڈی این اے... ہوتا ہے کیونکہ لہجے سے ہی نظر کے فتور، نیت کے کھوٹ، اور دل کے چور کو پکڑا جا سکتا ہے۔
- ہم صرف اپنی پیدائش پر ہی غور کرلیں تو ہمارا سارا غرور و تکبر خاک میں مل جائے گا۔
- اگر عورتیں غیرت کے نام پر قتل شروع کر دیں تو شاید ہی کوئی مرد زندہ بچے۔
- اکثر اوقات سچ کڑوا نہیں ہوتا۔ سچ بولنے کا انداز کڑوا ہوتا ہے۔ ہم سچ بولنے کے ساتھ ساتھ دوسرے کو ذلیل کر رہے ہوتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ہماری ذلیل کرنے کی حرکت کو صرف "سچ" ہی سمجھا جائے۔
- جب انسان اندر سے مر جاتا ہے تو حد سے زیادہ خوش اخلاق ہو جاتا ہے۔
- تعلق فرصت کا نہیں توجہ کا محتاج ہوتا ہے۔
- انسان کو سب کچھ بھول سکتا ہے۔ مگر سوائے ان لمحوں کے، جب اسے اپنوں کی ضرورت تھی اور وہ دستیاب نہ تھے۔
- اگر زندگی کے راستے میں کانٹے بوتے جاؤ گے تو تمہارے پیچھے آنے والی نسلیں لہولہان ہو جائیں گی۔

تجربہ انسان کو غلط فیصلے سے بچاتا ہے مگر تجربہ غلط فیصلے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ نودھراں

آزمائش

بیوی کو شادی کے چند سال بعد خیال آیا۔ کہ اگر وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلی جائے تو شوہر کیسا محسوس کرے گا، یہ خیال اس نے کاغذ پر لکھا۔

"اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں اب بور ہوگئی ہوں تمہارے ساتھ، میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔"

اس کاغذ کو اس نے میز پر رکھا اور شوہر کے آنے کا وقت ہوا تو اس کا ردِعمل دیکھنے کے لیے بیڈ کے نیچے چھپ گئی۔

شوہر نے میز پر رکھا کاغذ کھول کر پڑھا۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کاغذ پر کچھ لکھا پھر وہ خوشی کے مارے جھومنے لگا۔ گیت گانے لگا، رقص کرنے لگا اور کپڑے بدلنے لگا پھر اس نے اپنے فون سے کسی کو فون کیا اور کہا۔

"آج میں آزاد ہوں اور تم سے ملنے کے لیے آرہا ہوں۔ کپڑے بدل کر تم بھی تیار ہو جاؤ۔ میرے گھر کے سامنے والے پارک میں ابھی آجاؤ۔"

شوہر باہر نکل گیا۔ آنسو بھری آنکھوں سے بیوی بیڈ کے پیچھے سے نکلی اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے کاغذ پر لکھی لائن پڑھی جس پر لکھا تھا۔

"بیڈ کے نیچے سے پاؤں دکھائی دے رہے ہیں باؤلی، پارک کے قریب والی دکان سے بریڈ لے کر آ رہا ہوں۔ تب تک چائے بنا لینا۔"

میری زندگی کی خوشیاں تیرے آنے سے ہیں
آدھی تجھے ستانے سے ہیں آدھی تجھے منانے سے ہیں

عمارہ رفیق۔ فاضل پور

انسان کی پہچان

تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ فلاں گھٹیا ہے اور فلاں بڑھیا۔ اس کا درجہ بلند ہے اور اس کا کم تر۔ یہ بات انسان کے طے کرنے کی نہیں ہے۔

(اشفاق احمد)

پارو قیصرانی۔ کوٹ قیصرانی

دلچسپ بات

یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے مطابق پیاز ان غلاموں کو کھلائی جاتی تھی جنہوں نے اہرام مصر تعمیر کیے تھے پیاز کے حیرت انگیز فوائد کے باعث ایک بار حکمرانوں نے پیاز کے عوض نو ٹن سونا دیا تھا۔ لیکن چینی سیاح ہیون سانگ کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے لوگ پیاز سے پرہیز کرتے تھے۔ قدیم مصری پیاز کو کائنات کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پیاز بدروحوں کو بھگا دیتی ہے۔ وہ جب کوئی قسم کھاتے تھے تو وہ اپنا ایک ہاتھ پیاز پر رکھتے تھے۔

نادیہ، ارم۔ گلستان جوہر

دل

محبت پانے والا اس بات پر مطمئن نہیں ہوتا کہ اسے ایک دن کے لیے مکمل محبت حاصل ہوئی تھی۔

محبت تو ہر دن کے ساتھ اعادہ چاہتی ہے۔ روز سورج نہ چڑھے تو دن نہیں ہوتا۔ جس روز محبت کا سورج طلوع نہ ہو رات رہتی ہے۔ یہ دل اور جسم بڑے بیری ہیں ایک دوسرے کے۔ جسم روندا جائے تو یہ دل کو پنپنے نہیں دیتا اور دل مٹھی میں بند رہے تو یہ جسم کی نگری کو تباہ کر دیتا ہے۔

(بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ سے اقتباس)

عائشہ فرید۔ ملتان

ناممکن

ایک دانا سے کسی نے پوچھا۔

"ہم ایسا کیا کریں کہ سب کی نظروں میں اچھے بن جائیں؟"

دانا نے جواب دیا۔ "اس دنیا میں اگر کوئی فرشتہ بھی بن جائے تو اسے برا کہنے والے موجود ہوتے ہیں۔"

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

خالدہ جیلانی



سونیا حسین ———— قتال پور

ابھی زندگی کو جواب دینا ہے اس کے پہلے سوال کا
میں یہ دیکھتا ہوں کہ جنوری بھی گزر گیا نئے سال کا
تو یقین کر، تو یقین کر کہ وہ رائیگاں ہے وہ رائیگاں
میری زندگی سے نکل گیا ہے جو لمحہ تیرے خیال کا

جے، آئی، اے ———— ڈی، جی خان

غموں کی حد کیا پوچھتے ہو صاحب
یہ عشق ہے، کوئی دل لگی تو نہیں

نمرہ، اقرا ———— کراچی

وہ خامشی بپا ہے مری مشتِ خاک میں
اک شور حشر سا بھی ہے، آواز بھی نہیں

آسیہ فرید ———— ملتان

کیوں ایسا ہوتا ہے اعتبار کی ٹوٹی دہلیز پر
جو اپنے ہوتے ہیں، وہ اکثر اپنے نہیں رہتے

ملائکہ کوثر ———— بسم اللہ پور

ہمارے لفظوں سے نطق چھینا ہے اپنی محرومیوں نے ورنہ
سخن ور، ہم بھی اپنی بستیوں کے پتھروں کو زبان دیتے
عداوتوں کے عذاب سورج نے اتنی مہلت نہ دی کہ محسن
ہم اپنی جلتی زمین کے سر پہ کوئی بگولہ ہی تان دیتے

ثمرہ جاوید ———— بسم اللہ پور

محبت ہے بہت سرکش، بلا کا حافظہ اس کا
جسے ہم بھول جاتے ہیں پیاس کو یاد رکھتی ہے

نادیہ، نجمہ ———— گلستان جوہر

بچھڑے ہوئے لوگوں کی طلب کرتی ہیں آنکھیں
اس واسطے خوابوں میں سفر کرتی ہیں آنکھیں

ثانیہ یعقوب ———— کبیر والا

جو مجھے سمجھ نہیں سکا
اسے حق ہے کہ مجھے برا ہی سمجھے

نوزیہ ثمر بٹ ———— گجرات

بچھڑتے وقت کسی سے نہیں تھا یہی گماں
کہ زخم کیسا بھی ہو عمر بھر نہیں رہتا

طوبیٰ مشتاق ———— و ہور

کچھ حادثوں سے گر گئے محسن زمین پر
ہم رشکِ آسماں تھے ابھی کل کی بات ہے

پاروہ قیصرانی ———— کوٹ قیصرانی

نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ———— کراچی

اس کی یادوں کی یہ بھی تو اک کرامت ہے
ہزار میل پہ ہو کر بھی ساتھ ہو جیسے
ہمارے دل کو کوئی مانگنے نہ آیا محسن
کسی غریب کی بیٹی کا ہاتھ ہو جیسے

سیدہ لوبا سجاد ———— کہر وڑ پکا

کئی بار دکھایا ہے ہمیں آئینہ وقت نے
ڈرتے جو رہے ہم، بے کار بن کے جیتے
گر وقت کبھی آتا باطل کی خدائی کا
ہم موت سے نہ ڈرتے تلوار بن کے جیتے

صدف عمران ———— کراچی

میرے معیار کا تقاضا ہے
میرا دشمن بھی خاندانی ہو

فائزہ بھٹی ———— پتوکی

تیری یاد کی خوشبو، میرے دامن سے لپٹی ہے
بڑا اچھا سا لگتا ہے تمہیں ہی سوچتے رہنا

یاسمین کنول ———— پسرور

کیسی رُت ہے عجیب ساون کی
جس کی بارش سے دوستی ہی نہیں

امت الصبور

خواتین کی ڈائری

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

میر تقی میر کو زندگی نے بہت آزمایا۔ انہوں نے اپنے دکھوں، غموں اور مایوسی کو اپنی شاعری میں سمیٹ دیا ہے۔ نیرنگی اور دنیا کی بے ثباتی کو بیان کرتی یہ غزل آپ کی نذر۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

توقیر ہاشمی کی ڈائری سے

گمان و یقین کے درمیان بہت سی ایسی منزلیں ہوتی ہیں جہاں عقل فیصلہ کرنے سے قاصر نظر آتی ہے

میری ڈائری میں تحریر افتخار عارف کی یہ غزل اسی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔ آپ کی نذر۔

عشق کیسا کہ بھروسا بھی نہیں تھا شاید
اس سے میرا رشتہ بھی نہیں تھا شاید

خلقت شہر میں جس ہار کے چرچے ہیں بہت
میں وہ بازی کبھی کھیلا بھی نہیں تھا شاید

زیست کرنے کے سبھی آداب اسے از بر تھے
مجھ کو مرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا شاید

خاک اڑاتے ہوئے بازاروں میں دیکھا سب نے
میں کبھی گھر سے نکلتا بھی نہیں تھا شاید

اس کی آنکھوں میں بشارت تھی نئے خوابوں کی
میں اسے دیکھ کے چونکا بھی نہیں تھا شاید

ایک بادل کہ مرے نام سے منسوب ہوا
مرے صحرا میں تو برسا بھی نہیں تھا شاید

سیدہ ثریا سجاد کی ڈائری سے

محبت اور دوستی میں الفاظ بے معنی ہوتے ہیں۔ جذبوں کو الفاظ کی نہیں احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ محسن نقوی نے اس غزل میں یہی بیان کیا ہے۔

میں چاہنے والوں کو مخاطب نہیں کرتا
اور ترک تعلق کی میں وضاحت نہیں کرتا

خوشبو کسی تشہیر کی محتاج نہیں ہوتی
سچا ہوں مگر اپنی وکالت نہیں کرتا

میں اپنی جفاؤں پہ نادم نہیں ہوتا
میں اپنی وفاؤں کی تجارت نہیں کرتا

احساس کی سولی پہ لٹک جاتا ہوں اکثر
میں جبرِ مسلسل کی شکایت نہیں کرتا

میں عظمت انسان کا قائل تو ہوں محسن
لیکن کبھی بندوں کی عبادت نہیں کرتا

صائمہ عبدالمجید کی ڈائری سے

محبتوں میں انا آجائے تو رشتوں میں دوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ محبت میں سب سے پہلے اپنی انا کو ختم پڑتا ہے۔ اسی کشمکش کو اعتبار ساجد میری ڈائری میں لکھی ہوئی اس غزل میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

آپس میں بات چیت کی زحمت کیے بغیر
چل رہے ہیں ساتھ شکایت کیے بغیر

آنکھوں سے کر رہے ہیں بیاں اپنی کیفیت
ہونٹوں سے حالِ دل کی وضاحت کیے بغیر

دونوں کو اپنی اپنی انائیں عزیز ہیں
لیکن کسی کو نظرِ ملامت کیے بغیر

ٹھہرا ہوا ہے وقت مراسم کے درمیان
بحرِ خلیج میں کوئی وسعت کیے بغیر

حیران ہیں اتنے برس کیسے کٹ گئے
رسمی سا کوئی عہدِ رفاقت کیے بغیر

وہ جا نہیں سکے ہیں مگر اس کے باوجود
تنہا کھڑے ہیں ہم اسے رخصت کیے بغیر

چارہ گروں کو دونوں سے پڑا ہے واسطہ
لیکن کسی کے حق میں خیانت کیے بغیر

اُف یہ شوق کا عالم

فریدہ گوہر

ہمارے بچپن کے زمانے میں خواتین کے لیے "حور" اور "زیب النساء" ــــ رسائل آیا کرتے تھے۔ والدین انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھا کرتے تھے کہ اپنی بیٹیوں کو پڑھنے کے لیے کہیں یا خرید کر انہیں تحفہ دیں۔ ان رسائل میں عموماً" رومانوی افسانے ہوا کرتے تھے ۔جس میں ہیرو' ہیروئن شرارتیں کرتے اور پھر ان کی شادی ہو جاتی یا شادی نہ ہوتی' ضبط صبر' برداشت کے دھویں سے ساری کہانی بھر جاتی۔ معلوم نہیں کہ ماں باپ ایسے رسالوں کو ٹیسٹ کرنے کے لیے خود پڑھا کرتے تھے کہ نہیں۔ بس وہ اپنی بچیوں کو یہ رسالے پڑھنے نہیں دیا کرتے تھے۔ پھر خواتین ڈائجسٹ آیا ذرا مختلف موڈ میں۔ افسانوں کے ساتھ ساتھ اس میں انشائیہ' خاکہ' انٹرویو' غزل' نظم' حمد' نعت' اسلامی موضوعات پر مضامین بھی چھپنے لگے۔ بیٹیوں کو رسالے پڑھنے پڑھانے کی ترغیب کے بجائے انہیں پریکٹیکل ورک کی طرف راغب رکھا جاتا تھا۔ ہمیں بھی رسالہ پڑھنے نہیں دیا گیا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ گھر میں دادی' نانی' بڑی تائی' چچی' پھپھو ایسے رشتے موجود ہیں ناں جو بچیوں کی تربیت میں کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس ہوا کہ ان ہی رشتہ داروں میں جہاں پیار محبت' مروت' دوستی' شفقت ہوتی ہے وہاں نفرت' بغض' غصہ' عداوت' جھگڑا' حماقت بھی تو جنم لے سکتے ہیں۔ بیٹی کو سمجھانا' مشکل لفظ' جملے' پیراگراف' کہانی کے خاکے کا چناؤ مشکل تھا کہ بات دل میں اتر جائے۔ زندگی کا راستہ سیدھا ہو جائے' راہ حیات کے کانٹے چبھنے سے پہلے چن لیے جائیں۔ کسی بھی منفی رویے کا کیسے مقابلہ کیا جائے۔ بیٹیوں کو کیونکر سکھایا جائے۔

درسی کتب کے اندر رکھ رکھ کر خواتین ڈائجسٹ پڑھنے والی بیٹی نے آہستہ سے دوسری کے کان میں بات کی۔ سرگوشی کی بازگشت دور دور تک گونجی کہ بات بے حد مستند تھی۔

خواتین ڈائجسٹ کی مانگ بڑھنے لگی۔ ملازمت پیشہ خواتین' کاروبار کرنے والی' گھر میں رہنے والی' خواتین پڑھنے والی طالبات' بچوں کی پرورش کو بہتر بنانے والی خواتین' سسرال میں خوشگوار ماحول پیدا کرنے والی خواتین' خواتین ڈائجسٹ ایسے پڑھنے لگیں جیسے فضا میں ہوا کے ہونے کا احساس نہیں ہوتا لیکن اگر یہ نہ ہو تو کوئی انسان زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ بک اسٹال پر' اسکول' کالج' پبلک لائبریریوں میں' گھر کے ٹی وی لاؤنج میں جہاں کہیں بھی خواتین ڈائجسٹ ملا۔ ہاتھ اس طرف بڑھ گیا۔ بہت زیادہ معروفیت میں بھی



ایک بار تو ورق گردانی کیے بنا نہیں رہ سکتی۔
اب جبکہ خواتین ڈائجسٹ کے پیٹرن پر کئی رسالے خواتین کے لیے مارکیٹ میں آچکے ہیں لیکن جو بات خواتین ڈائجسٹ میں ہے وہ کسی اور میں کہاں۔ نہ جانے نام کا اثر ہے یا اس کے اندر موجود مواد کا پھیلاؤ ہے۔

خواتین ڈائجسٹ بس خواتین ڈائجسٹ ہے۔ آج مائیں اور استاد نہایت اعتماد سے طالبات اور بیٹیوں کو خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ تحفے میں دیا جاتا ہے۔ اس میں خاص مباحثوں کو فروغ دیا جاتا ہے۔

جب سے خطوط شائع ہونے شروع ہوئے ہیں۔ اس وقت سے بات چیت کا سماں ہی کچھ اور ہونے لگا ہے۔ جس میں ناز و ادا ہے، شکوہ، شکایت ہے۔ کرداروں اور خاکوں پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

ایک عام عورت کہانی کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ اور تو اور مصنفین کو باقاعدہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان کرداروں کے ساتھ ایسے کرو اور ویسے کرو، یہ غلط ہو گیا ہے وہ صحیح ہے۔ گویا زندگی کی رسی پر ان کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتی ہے۔ زندگی کے مسائل کو دل لگا کر حل کرنے کی صلاحیت نکھرتی ہے۔ اعتماد کی فضا پیدا ہوتی نظر آتی ہے۔

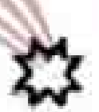
خواتین، خواتین کی تعلیم و تربیت کریں تو خواتین کے مسائل ان کی نظر میں کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اور جب ایک مسئلہ واضح طور پر سامنے آجاتا ہے تو اس کے ممکنہ حل تلاش کیے جاتے ہیں۔ جن میں ایک حل بہترین حل ہوتا ہے۔ یوں زندگی کی شادمانیوں کو اپنی مٹھی میں قید کر کے خواتین ہنس کر جینے کا فن سیکھتی ہیں۔ زندگی گزارنا ایک فن ہی تو ہے اور یہ فن خواتین ڈائجسٹ بہت خوبی سے اپنے قارئین کو سکھاتا ہے۔

وہ خواتین جو ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھتی ہیں، ان میں ایک عجیب سی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ رشتوں کے تقدس کا احساس روشن ہوتا ہے۔ آپس کے نازک معاملات کو خوب صورتی سے سلجھانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ حق بات کہنے کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ زندگی کو دور تک دیکھنے، پرکھنے اور مشاہدہ کرنے کی قوت بڑھتی ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کے افسانے بہت مثبت سوچ کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں رشتوں ناتوں کو نبھانے کا پختہ انداز ہوتا ہے۔ محبتوں نفرتوں کی شدت کا اظہار ہوتا ہے کہ محبت سے محبت اور نفرت سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ عشق کی پھوار کا لطف کائنات کے ہر رنگ کو نکھار دیتا ہے۔ عورت اس نمی سے ہر رنگ اپنے اندر اتار کر دنیا کو اور رنگین کر دیتی ہے۔ یہی رنگ ڈائجسٹ پڑھنے والی خواتین اور نہ پڑھنے والی خواتین میں ایک واضح امتیاز پیدا کر دیتے ہیں۔

آپ کو کوئی خط لکھے یا نہ لکھے۔ آپ کو کوئی بتائے یا نہ بتائے، آپ خواتین ڈائجسٹ سے ایک زبردست کام لے رہے ہیں کہ عورت کو عورت ہونے کا احساس دلا رہے ہیں۔ کیا یہ فخر پیدا کرنا کوئی کم کام ہے۔ تو پھر آئیں چلیں اسی دنیا میں جہاں خواتین کی ادائیں ہیں۔ ناز برداریاں ہیں۔ عشق و محبت کے سلیقے ہیں۔ گھروں کو سجانے کی باتیں ہیں۔ بہترین لباس و زیورات زیب تن کرنے کے رکھ رکھاؤ ہیں۔ ماں کی ممتا ہے۔ بیٹیوں کی معصومیت ہے۔ بہنوں کی گھرکیاں ہیں۔ موسموں کی بہاریں ہیں۔ دن رات کی آنکھ مچولی ہے۔ انسانوں کی انسانوں سے تو تکرار ہے۔

پھر بھی فیصلہ پڑھنے والے قاری کا ہے کہ وہ ان سب باتوں کو کس انداز سے دیکھتا ہے، پرکھتا ہے اور کیا اثر لیتا ہے۔ یہی تو کمال ہے خواتین ڈائجسٹ کا۔ تو پھر آؤ، خواتین ڈائجسٹ جلدی سے پڑھتے ہیں تاکہ ہمسائی کے گھر بھی پڑھنے کے لیے بھجوا سکیں۔ آگے انہوں نے بھی کسی اور کو ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے دینا ہوتا ہے۔ اف یہ شوق کا عالم۔

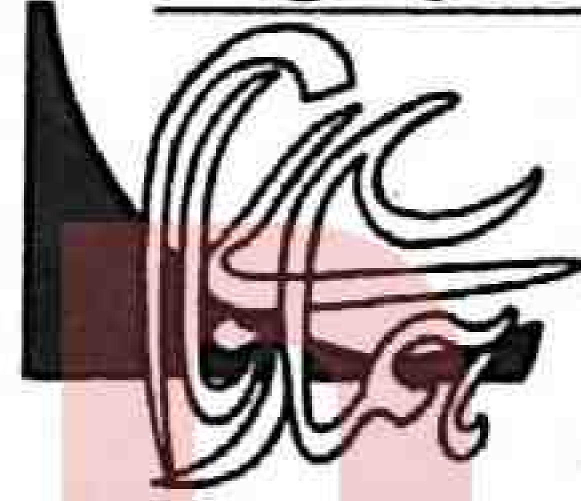


ہیں۔ "اپنا پن" راشدہ رفعت کا ناولٹ بہت اچھا لگا۔ "محبت ہو گئی ہے تم سے" گڑیا راجپوت آپ کا ناولٹ پڑھ کر تو دن بھر کی بیزاری دور ہوئی۔ ساتھ ہنسی بھی بہت آئی۔ خاص طور پر حذر کے نقلی حلیے اور پھوہڑپن پہ۔ زیادہ غرور کرنے والوں کا یہی حال ہونا چاہیے۔ لڑکیوں کو تو ایسے باتیں سنا رہا تھا جیسے خود بڑا ذہین فطین ہیرو ہو۔ گڑیا آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔ آئندہ مکمل ناول ضرور لکھیں۔ آپی نعیمہ ناز کا ناول "ہم صورت گر کچھ خوابوں کے" اچھی تحریر تھی لیکن تھوڑا اسا دکھی بھی کر گئی "رشتے کچھ انوکھے سے" آپی ام ایمان بہت اچھی تحریر ہے۔ بالکل حقیقت کے قریب۔ سائرہ آپی اب یہ صحرا میں کس کو اتنا ذلیل کر رہی ہیں۔ اس بے چارے کا نام ہی بتادیں۔ بہت اچھی تحریر جا رہی ہے۔ "عشق مجذوب" آپی مصباح ہینڈسم کا بھی کوئی نام بتادیں۔

"دشت جنوں" آپی آمنہ! جلدی سے کردار واضح کردیں بہت شدت سے انتظار رہتا ہے کہ کب شمارہ ملے اور پڑھ کر تسلی کریں۔ اوپر سے مسرت الطاف نے ڈرا کر رکھ دیا ہے۔ ہم تو خوش نصیب کو آیوشمتی سمجھتے تھے جبکہ مسرت آپا نے تو آئے کت کو ہی آیوشمتی بنا ڈالا ہے۔ کیف کو کہاں گم کردیتی ہیں۔

ان کے علاوہ افسانے بہت اچھے لگے۔ "بھید" سمیرا عثمان تو سب افسانوں میں بازی لے گئیں۔ باقی تمام سلسلے





نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: *info@khawateendigest.com*

رمشا فاطمہ، چوک قریشی

مجھے تقریباً" آٹھ سال ہو گئے ہیں خواتین پڑھتے لیکن کبھی میں نے آپ کو خط نہیں لکھا۔ لیکن آج نمل نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیونکہ میں نے نمل کی آخری قسط نہیں پڑھی۔ اگر میں نے آخری قسط نہ پڑھی تو مر جاؤں گی۔ میں نے پرچا بہت ڈھونڈا نہیں ملا۔

ج : پیاری رمشا! آپ نے خط میں اپنا ایڈریس نہیں لکھا، نہ ہی کوئی فون نمبر لکھا ہے۔ آپ ہمیں اپنا ایڈریس بھجوا دیں۔ جنوری کا خواتین آپ کو وی پی کر دیں گے۔ آپ کو ڈاکیے کو 100 روپے دینا ہوں گے۔

رمشاء شہزادی، مانانوالہ ضلع شیخوپورہ

"کرن کرن روشنی" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ بہت کچھ حاصل ہوتا ہے اسے پڑھ کر۔ "ہمارے نام" پڑھ کر بہنوں کے خیالات اچھے لگتے ہیں۔ انٹرویو بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔

آپی نماز کے دوران ذہن مختلف خیالات کی طرف بھٹک جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی حدیث یا کوئی حل ضرور بتائیں۔

ج : پیاری رمشاء نماز کے دوران بندہ اپنے رب سے عرض و معروض کرتا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنے رب سے کیا کہہ رہا ہے۔ جب آپ کے ذہن میں خیالات آئیں تو نہ ان پر توجہ دیں نہ انہیں ہٹانے کی کوشش کریں، خیالات آتے ہیں تو انہیں آنے دیں۔ آپ پوری توجہ نماز میں پڑھے جانے والے کلام پر رکھیں۔ اور رہی شاعری تو شعبہ "شاعری" ہماری شاعری کی تو درگت بنا دیتا ہے۔ آپ کی شاعری کا پتا نہیں انہوں نے کیا بنایا؟

رمشاء آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ پتا چل رہا ہے



کہ آپ نے توجہ سے پورا پرچا پڑھا ہے۔ آئندہ بھی شرکت کیجیے گا۔

اقراء ممتاز۔۔۔۔ کراچی

اس دفعہ ٹائٹل گرل نے تو اپنے سحر میں ہی جکڑ لیا۔ مکمل ناول "عشق مجذوب" مصباح نوشین کی کیا زبردست تحریر تھی۔ یہ کہانی پڑھتے ہوئے میں بہت روئی۔ اکثر عبیر جیسی کو جیسی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ مجھے بھی سننے کو ملتی ہیں۔

ہم صورت گر کچھ خوابوں کے نعیمہ ناز سلطان کا ناول بھی زبردست تھا۔ اس تحریر نے کئی جگہ مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ناولٹ "محبت ہو گئی تم سے" ثریا راجپوت نے ثریا جیسی ہی تحریر لکھی۔ ہمارے نام میں حافظہ رملہ مشتاق کو بہت مبارک ہو قرآن مجید کو حفظ کرنے پر۔

خواتین کی سالگرہ پر ایک دعا لکھ رہی ہوں۔

تمہاری سالگرہ کے پُر مسرت موقع پر میری جاں!
"تمہیں کیا تحفہ دوں؟
میرے بس میں اگر ہو تو۔۔۔!
اپنی قسمت میں آنے والی
ہر خوشی کا تحفہ تمہیں سونپ دوں"

ج : پیاری اقراء! اتنی پیاری دعا اور محبت کے لیے شکریہ۔ مگر اللہ کے خزانے میں کوئی کمی ہے کیا؟ آپ کے حصے کی خوشیاں اللہ آپ ہی کو نصیب کرے اور اللہ تعالیٰ ہم سب پر ہماری تمام قارئین پر مہربان رہے۔ آپ کی خوشی میں ہی ہماری خوشی ہے۔

اور لوگوں کی باتوں کی پروانہ کیا کریں' لوگوں کا تو کام ہے کہنا' انہیں کچھ نہ کچھ کہنا ہی ہوتا ہے۔ اچھی صورت سے زیادہ اچھی سیرت اہم ہے اور سب سے بڑھ کر تو نصیب ہے اگر قسمت اچھی ہو تو سب کچھ اچھا ہو جاتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ پیاری اقراء بہت اچھی سیرت کی مالک ہے اور اس کی قسمت بھی اچھی ہو گی' ان شاء اللہ۔

ملائکہ کوثر۔۔۔۔ بسم اللہ پور

سب سے پہلے خواتین کے 45 سال ہونے پر بہت بہت مبارک۔ یہ مجھ سے عمر میں تھوڑا سا چھوٹا ہے' پر درجے میں بہت بڑا۔

"انمول" ماڈل کے ہیئر اسٹائل کو چھوڑ کر اگر دیکھیں تو شکا! "لڑکی خاصی خوبرو دکھ رہی تھی۔ "کہنی سنی" کے تلخ و شیریں الفاظ پڑھ کر "کرن کرن روشنی" کی طرف بڑھی۔ نماز اور وضو کی اہمیت نے دل میں ایک خوب صورت احساس کو اجاگر کیا۔ "ہم لوگ تو ظلمت میں" انشاجی کی نظم اچھی لگی۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا کھ پڑھ کر آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔ کیسے کیسے پیارے لوگ پل میں خاک نشیں ہو جاتے ہیں۔ آمنہ ریاض "دشت جنوں" کی آئے کت کو ذرا چین و قرار نہیں' اس حالت میں بھی اونچی نیچی جگہوں پر مٹر گشت کرتی پھر رہی ہے اور پھر الزام دوسروں پر لگانے میں بڑی شیر ہے' خیر قسط بڑی زبردست لگی۔

سائرہ رضا کی "حسن المآب اور" کی کہانی آہستہ آہستہ کھل رہی ہے۔ "اپنا پن" راشدہ رفعت کی بے حد اچھی تھی۔ ام ایمان قاضی کی "رشتے کچھ انوکھے سے" بھی پسند



آئی۔ نعیمہ ناز کی تحریر "ہم صورت گر کچھ خوابوں کے" حقیقت سے قریب تر کہانی۔ مکالمے پُر تاثیر تھے۔ نمرہ کہہ رہی ہے نمرہ احمد کے ناول کی خوش خبری آپ نے اچھی سنائی ورنہ میری دلچسپی "مکمل" "ختم ہونے کے بعد "دشت جنوں" تک رہ گئی تھی۔ "عشق مجذوب" مصباح نوشین کی کچھ الجھی الجھی سی لگی۔ "موسم کے پکوان" کی خالدہ جیلانی سے گزارش ہے کہ سوجی اور بیسن کے ٹکڑے بنانے کی ریسیپی دوبارہ دے دیں مہربانی۔

ج : پیاری ملائکہ! سائرہ رضا کا ناول زیادہ طویل نہیں ہے' اس کی چند ہی اقساط ہوں گی۔ مصباح کے ناول کی صرف ایک قسط مزید ہوگی۔ سائرہ کے ناول میں آپ کا اندازہ کتنا درست ہے' یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلے گا۔

پیاری ثمرہ کو ہمارا پیغام پہنچادیں کہ ان کی دلچسپی صرف دشت جنوں تک ہی کیوں محدود ہو گئی۔ سائرہ رضا اور مصباح نوشین بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں اور پچھلے ماہ نعیمہ ناز کا ناول بھی بہت منفرد موضوع پر تھا یہ جان کر افسوس ہوا کہ پیاری ثمرہ ہمارا پرچا پڑھتی ہی نہیں' ہم آپ کے لیے ہی تو اتنی محنت کرتے ہیں۔

مسرت الطاف احمد' کراچی

مارچ کا شمارہ اس بار تھوڑا دیر سے ملا۔ ماڈل گرل کا سوفٹ سا میک اپ قابل تعریف تھا۔ "دشت جنوں" کی یہ قسط قابل تعریف تھی آئے کت کا کردار کافی مشکوک سا لگتا ہے۔ معاویہ کی آئے کت کے لیے اتنی شدت پسندی بھی اچھی نہیں لگی۔ "ہم صورت گر کچھ خوابوں کے" یہ تحریر پڑھ کر دل اداسی کی لپیٹ میں محسوس ہوا۔ "محبت ہو گئی تم سے" سوسو لگی "حسن المآب" سائرہ رضا نے اس بار منفرد انداز میں لکھا ہے۔ سب کردار آپس میں بہت الجھے ہوئے ہیں لیکن اسٹوری اچھی لگی۔

میرا خیال ہے جو صحرا میں ہے وہ بدر الدین ہے موسیٰ کا فادر "انوکھے رشتے" ٹاپک بہت جان دار تھا لیکن طرز تحریر پسند نہیں آئی کافی جھول محسوس ہوا۔ "اپنا پن" فنٹاسٹک تحریر تھی منظر نگاری اتنی زبردست تھی کہ حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی "عشق مجذوب" تحریر بہت زیادہ دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔ یہ قسط بھی بہت لاجواب تھی۔

افسانوں میں ٹاپ آف دی لسٹ "بھید" رہا بہت زیادہ متاثر کن تحریر تھی۔ "انقلاب" میں معصومہ نے خود حرا کو چھوڑ دی تھی۔ "اپنی جنت اپنا جہنم" قابل تعریف تحریر تھی جیسا کو تیسا والا سین تھا ماریہ کے ساتھ۔

سلسلہ وار ناول میں نمرہ احمد کا نام دیکھ کر میری خوشی دیدنی تھی اور ہاں تمام اسٹاف اور رائٹرز کو سالگرہ کی ڈھیر ساری مبارک باد۔

ج : پیاری مسرت! آپ کا اور دیگر قارئین کا شکریہ جنہوں نے ہمیں سالگرہ کی مبارک باد کے پیغامات بھیجے۔ اس دفعہ آپ کو ہمارا انتخاب متاثر نہیں کر سکا' بہت افسوس ہوا یہ جان کر' الیہ تحریریں ہمیں بھی اچھی نہیں لگتیں لیکن نعیمہ ناز ناول کا اس سے بہتر انجام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر اس کہانی کو خوش گوار انجام دیا جاتا تو یہ ایک روایتی عام سی کہانی بن کر رہ جاتی۔



اختر جہاں ۔۔۔ بابا ڈھوک راولپنڈی

پڑھنا ہم نے تب سے شروع کیا جب سمجھ کم تھی۔ ناول پڑھنا ہمیں وراثت میں ملا۔ میرے ابو پڑھتے تھے پھر ہم سب بہن بھائی پڑھتے اور پھر تبصرہ کرتے میٹرک کیا۔ جامعہ کا کورس عالمہ تک کیا پھر شادی ہو گئی بعد میں شوہر نہیں پڑھنے دیتے تھے لیکن میں نے پڑھنا نہیں چھوڑا اب تو خیر سترہ سال شادی کو ہو گئے اب کچھ نہیں کہتے۔ ہم نے سب ڈائجسٹ پڑھے لیکن خواتین تو خواتین ہے اس جیسا کوئی نہیں۔ نمرہ احمد، سائرہ رضا، سمیرا حمید، عمیرہ احمد کیا کمال لکھتی ہیں۔

میری جو زندگی اتنی پرسکون گزر رہی ہے۔ میری سوچ ہمیشہ پوزیٹو رہی ہے خواتین ڈائجسٹ کی وجہ سے۔ آمنہ جی دشت جنوں بہت سست چل رہا ہے کچھ تیزی لائیے۔ سائرہ رضا کا ناول پڑھ کر دل جھوم جھوم اٹھا باقی۔ کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ کرن کرن روشنی ہمیں نئے سرے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث یاد کراتی ہے۔ ہمارے گھر میں میری بہن "سرور جہاں، افسر جہاں، مریم خلیل اور میں خود اختر جہاں، خوب شوق سے پڑھتے ہیں اور پھر فون پر تبصرہ کرتے ہیں کیونکہ میری بڑی بہن افسر جہاں کشمیر میں سرور جہاں اور مریم خلیل لاہور میں اور میں بیچاری پنڈی میں ہوں۔

ج : پیاری اختر جہاں! آپ نے تو بہت اچھا لکھا ہے۔ خط بھی اور تبصرہ بھی۔ اپنی بہنوں کو ہمارا اسلام پہنچا دیں۔

صائمہ مشتاق ۔۔۔ بھاگٹانوالہ سرگودھا

خواتین میں، میں دو سال بعد لکھ رہی ہوں۔ یہ ہی کہوں گی آفرین آفرین "تیری تعریف ممکن نہیں۔ سب سے پہلے "کہنی سنی" پڑھا پھر "کرن کرن روشنی" کو پڑھ کر دل روشن ہو گیا۔ مصباح نوشین کا ناول "عشق مجذوب" پڑھا۔ عبیر کو توفار نے احساس کمتری میں اس طرح جتلا کیا ہوا ہے کہ اس کو اپنی اچھائیاں ہی نظر نہیں آرہیں۔ مصباح نوشین کی اچھی کاوش ہے۔

ج : پیاری صائمہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ آفرین کے مستحق ہمارے ساتھ ساتھ ہمارے پیارے قارئین بھی ہیں جنہوں نے ہمیشہ ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔

محمودہ اکبر ۔۔۔ کراچی

خواتین ڈائجسٹ "کرن کرن روشنی" سے لے کر "بیوٹی بکس" تک بہت اچھا ہے "نفسیاتی مشورے" بھی الجھنیں دور کرنے والے ہوتے ہیں۔

ناولز میں "نمل" اور "آب حیات" بہترین رہے۔ مجھے سائرہ رضا بھی بہت پسند ہیں۔ امید ہے "حسن المآب" بھی اچھا ثابت ہو گا۔ "دشت جنوں" بھی دلچسپی کے لحاظ سے اسپیڈ پکڑ رہا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ جس طرح اچھا لکھنے والوں کو آگے لے کر آرہا ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی دوسرا میگزین یہ کام کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ خواتین ڈائجسٹ ایک ایسا استاد ہے جو پڑھنے والوں کو اچھا لکھنے والوں سے ملوا دیتا ہے۔ ورنہ مجھے اور میری سہیلیوں کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ اچھا لکھنے والوں کو کیسے تلاش کیا جائے۔ آج خواہ اندرون ملک جائیں یا بیرون ملک میں تو



بھیجنے میں "جنت کے پتے" "پیر کامل" "عہد الست" اور "امر بیل" دیتی ہوں ساتھ بونس کے طور پر سمیرا حمید کا "مہر ثبت" اور "ابن القلم" کی فوٹو کاپی بھی دیتی ہوں۔ سمیرا حمید بھی کمال لکھتی ہیں۔

میں کوئی تجویز دینے کے قابل تو نہیں ہوں 'خواتین ڈائجسٹ ہر طرح سے مکمل ایک ایسا پیکج ہے۔ جس میں کسی کمی کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اگر خواتین کے لیے "بیوٹی بکس" کے ساتھ ساتھ کچھ اچھی ورزشیں بھی ہوں اور یوگا بھی ہو۔ مہربانی ہوگی۔

ج : پیاری محمودہ! آپ تجاویز بھی دے سکتی ہیں اور فرمائش بھی کر سکتی ہیں۔ کوئی پابندی نہیں۔ آپ کی فرمائش شعبہ بیوٹی بکس تک پہنچا دی ہے۔ ان شاءاللہ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

وردہ زبیر۔۔۔ کیماڑی کراچی

ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ کہانیاں بھی ساری اچھی تھیں۔ سب سے زیادہ عشق مجذوب۔ سائرہ رضا کی کہانی بہت الجھی ہوئی ہے مگر انٹرسٹنگ ہے۔ ماہا وارثی سے ملاقات اچھی لگی مگر تصویر وہی پرانی دے دی آپ نے اور ہاں وشت جنوں اب جا کر کہیں کہانی میں تھوڑا انٹرسٹ پیدا ہوا ہے ورنہ وسامہ کی موت کے بعد تو کہانی ایک جگہ رکی ہوئی تھی۔

مشکل سے ہی سہی مگر میں نے کہانی مکمل کر لی ہے اور اب آپ سے درخواست ہے کہ میری کہانی ضرور شائع کرنا۔ میں عائشہ فیاض نہیں ہوں جس نے دس سال صبر کیا تھا مجھ سے تو ایک مہینے کا بھی صبر نہیں ہوگا اور میں روؤں گی بہت زیادہ۔

میرے شوہر تبلیغی دورے پر چالیس دن کے لیے چلے گئے۔ میں رات کو دس بجے اپنے دیور کے پاس گئی یہ پوچھنے کہ صبح آپ بینک جائیں گے؟ (میرے دیور ہول سیل کی دکان کرتے ہیں۔ کبھی کبھار بینک میں پیسے جمع کروانے جاتے ہیں بینک کے نزدیک ہی ڈاک خانہ ہے) وہاں قریب ڈاک خانہ ہے۔ میرا ایک خط پوسٹ کر دیں گے وہ آگے سے حیران کس کو خط لکھا ہے جب میں نے آپ کا بتایا تو ایک طویل بحث' یہ سب جھوٹ ہوتا ہے کوئی خط نہیں شائع ہوتا ایسے ہی پھینک دیتے ہیں یہ لوگ اور ہاں ایک اور بات رات کو بچوں کے سونے کے بعد جب میں زیرو بلب کی روشنی میں ڈائجسٹ پڑھتی ہوں اور میرے شوہر آجاتے ہیں تو وہ ہمیشہ ایک بات کہتے ہیں' اتنی کم روشنی میں پڑھ رہی ہو یاد رکھو' اگر تم اندھی ہو گئیں تو میں تمہارا علاج نہیں کرواؤں گا بلکہ دوسری شادی کرلوں گا مجھے اندھی بیوی نہیں چاہیے۔ دیکھ لیں آپ کی محبت میں دوسری شادی کا طعنہ بھی برداشت کر لیتی ہوں مگر ڈائجسٹ پڑھنا نہیں چھوڑ سکتی۔

ج : پیاری وردہ! آپ نے رونے کا تہیہ کر ہی لیا ہے تو اس کے علاوہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ ٹشو پیپر کے چار بڑے ڈبے اپنے قریب رکھ لیں اور ہاں اپنے شوہر سے کہیں کہ ذرا تصور کریں کہ وہ رات کو گھر آئیں جہاں بیوی کی چیخ پکار اور کل کل ہو۔ پھر حقیقت دیکھیں کہ بیوی خاموشی سے اپنی مصروفیات میں مگن ہے۔ اور ڈائجسٹ پڑھنے کے چکر میں

ان کے تمام کام پھرتی، خاموشی اور تیزی سے کردیتی ہے مگر بات یہ ہے کہ انسان ہے، ہی ناشکرا۔ آپ ان کی باتوں کو دل پر نہ لیں مگر دن کی روشنی میں پڑھا کریں۔ رات اللہ نے آرام کے لیے بنائی ہے۔

عائشہ، مریم، نوشابہ، ہما سحرش اور خدیجہ..... خان پور

خواتین اور شعاع کے ساتھ ہمارا تعلق پرانا ہے۔ اس بار "نمل" نے قلم اٹھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ اس میں قرآن کی اتنی اچھی تشریح اور ہر پہلو پر اتنی تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ کوئی گنجائش نہیں رہ گئی۔ بہت زبردست۔ سچ تو یہ ہے کہ سلسلے وار ناولز کے علاوہ مجھے باقی ناولز آج کل کچھ خاص نہیں لگ رہے... پتا نہیں کیا سب میں ایک ہی بات ہوتی ہے "محبت" اور اینڈ میں وہ مل جاتے ہیں۔ بس کوئی اور ٹاپک ہو... نا۔ سلسلے وار ناولز سارے اچھے چل رہے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ جو ناولٹ وغیرہ ہوتے ہیں وہ کچھ خاص اٹریکٹ نہیں کرتے۔ "دشت جنوں" بھی اچھا جارہا ہے۔ سائرہ رضا تو جب آتی ہیں، چھا جاتی ہیں۔

ج : عائشہ مریم، نوشابہ، ہما، سحرش اور خدیجہ! پیاری دوستو! پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں بعض خطوط اس وقت ملتے ہیں جب پرچا مارکیٹ میں آجاتا ہے۔ ہم وہ خطوط پڑھتے ضرور ہیں مگر ظاہر ہے وہ شائع نہیں ہو سکتے۔ دوسرے کچھ خطوط سرے سے ملتے ہی نہیں یا کچھ خطوط صرف حال احوال تک محدود ہوتے ہیں۔ شمارے پر تبصرہ نہیں ہوتا۔ اور بھی کچھ وجوہات ہیں جن کی بنا پر خط شائع نہیں ہوتا پھر آپ لوگ ناراض بھی ہوتے ہیں اور دل گرفتہ بھی۔ کوشش کریں گے کہ آئندہ ایسے ناولٹ کا انتخاب کریں جو آپ کو پسند آئیں۔

حنا سلیم اعوان۔ گاؤں آخون بانڈی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ

ویسے تو خط لکھنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلا وجہ بھی خط لکھا جاسکتا ہے۔ لیکن جناب میرے پاس خط لکھنے کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہی ہے کہ میرے ابو ہر ماہ مجھے خط لکھنے کو کہتے ہیں۔ آخر کار اس بار قلم اٹھا ہی لیا ہے۔ دوسری بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ میرے نام کی کوئی بھی آئی ڈی... کسی بھی طرح کی ویب سائٹ پہ فی الحال نہیں ہے اور نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بابدولت نے جان جوکھوں میں ڈال کر آخر کار بی اے کا امتحان پاس کرلیا ہے۔ ہمارا مطلب ہے کہ زمانے سے ٹکرا کر... اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر" اور اب ایم اے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ سب سے اہم وجہ ہماری پیاری نمرہ احمد ہیں جن کے ناول کا بتا کر آپ نے ہمارا سیروں خون بڑھا دیا ہے۔ اب کچھ تبصرہ شمارے پر بھی ہو جائے۔ معصوم سی ماڈل سید ھی دل میں جا اتری۔

"دشت جنوں" میں میرے فیورٹ کردار خوش نصیب اور کیف ہیں۔ دونوں کے درمیان ہونے والی نوک جھونک مجھے بہت پسند ہے۔ آمنہ، پلیز کیف کو چھٹی پر لے آئیں اور ہاں پلیز خوش نصیب کو گمراہ مت ہونے دینا۔ "حسن المآب" زبردست ناول ہے اور پھر سائرہ کے قلم میں تو جادو ہے۔ جو پڑھنے والے کو باندھ لیتا ہے، سحرزدہ کر دیتا ہے۔ "محبت ہو گئی تم سے" "من کو نہیں لگی۔ معذرت کے ساتھ افسانوں میں صرف "انقلاب" اور "میری جنت" ہی پڑھے ہیں۔ دونوں بہترین ہیں۔ ماہا وارثی سے ملاقات اچھی رہی۔ نفسیاتی الجھنوں میں عدنان بھائی تمام بہنوں کو اتنے اچھے طریقے سے جواب دیتے ہیں، دل خوش ہو جاتا ہے۔ آپا میری ایک کزن ہے۔ سعدیہ چوہدری فرام جھنگڑہ۔ وہ آپ کے رسالوں کی بہت بڑی فین ہے۔ اور میرے گاؤں کا حال بھی اچھا ہے۔ موٹروے مکمل ہو گیا ہے۔ عنقریب افتتاح ہونے والا ہے۔ اور ہمارے گاؤں کی سڑک بھی تکمیل کے مراحل میں ہے.... اور مکمل ہو کر میرے گاؤں کی خوب صورتی میں اضافہ کرنے والی ہے۔ یہی نہیں گیس کا بھی افتتاح ہونے والا ہے....

ج : پیاری حنا! سب سے پہلے تو بی اے کے امتحان میں کامیابی پر مبارک باد۔ دوسری مبارک باد گاؤں میں گیس آنے پر اور موٹروے پر.... کسی بھی ملک کی ترقی میں سب سے اہم کردار ذرائع نقل و حمل کا ہوتا ہے، سڑکوں کی تعمیر سے جہاں لوگوں کو سفر میں آسانی مہیا ہوتی ہے وہاں بہت سی دیگر سہولیات بھی میسر آئی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

طاہرہ نایاب..... شیخوپورہ

سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا بہت کچھ جاننے کو

ملادشت جنوں آمنہ جی آئے کت کے ساتھ آپ نے زیادتی نہیں کردی؟ اس کا بچہ چھین کر۔ پلیز آئے کت اور معاویہ کو جدا مت کیجئے گا حسن المآب میں تپتی ریت پہ تڑپنے والے یہ ہیں کون۔ بہت اچھی کہانی "عشق مجذوب" مصباح جی عبیر بچاری کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے اور نبیل نے اچھا نہیں کیا عبیر کے ساتھ اور محبت ہوگئی تم سے۔ گڑیا جی بہت اچھا لکھا آپ نے بچی مچی ہنسا دیا۔ آپ نے۔ نعیمہ ناز جی آپ نے دنیا کی حقیقت کو اتنے اچھے طریقے سے پیش کیا، راشدہ رفعت نے اپنا پن میں بہت سارے لوگوں کو آئینہ دکھایا ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے دوغلے لوگوں کے ساتھ۔ مزہ آگیا اِم ایمان رشتے کچھ انوکھے سے دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم جادو ٹونوں سے ہی باہر نہیں نکل رہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کو ایک بار پھر پڑھ کے اچھا لگا۔

ج : پیاری طاہرہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ٹائٹل پر انمول کی تصویر تھی۔ امید ہے آئندہ بھی شرکت کرتی رہیں گی۔

آپ کے پہلے خط کا جواب یہ ہے کہ ہماری فیلڈ الیکٹرانک فیلڈ سے بالکل مختلف ہے اور ہماری وہاں کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہے۔ اس لیے معذرت خواہ ہیں کہ آپ کی مدد نہیں کرسکتے آپ اپنے شوہر کی تصاویر فیس بک پر ڈال دیں شاید کسی کی نظر سے گزریں تو چانس بن جائے۔

سیدہ لوبا سجاد۔۔۔ کہروڑپکا

ایک عام سی بات کا اتنا سخت جواب پڑھ کر میں تو حیران رہ گئی یعنی تبصرہ یا رائے صرف تعریفی ہونی چاہیے؟ آپ نے کہا کہ آپ فارس اور ہاشم کے بچوں کی کہانی پڑھنا چاہتی ہیں تو وہ کہانی نہیں بلکہ انڈین ڈراما ہوگا۔" میں اکثر بہنوں کے خطوط پڑھتی تھی کہ وہ محسوس کرتی ہیں کہ اگر کسی بات میں تھوڑی سی تنقید کردی جائے تو یا تو خط شائع ہی نہیں کیا جاتا تھا یا جواب تھوڑا سخت دیا جاتا۔ مگر اب یقین ہوگیا کہ صرف تعریفی خط شامل ہوتے ہیں۔ خیر جی رسالہ آپ کا، مرضی بھی آپ کی۔ اس سلسلے میں شامل ہونے والے بہت ہیں۔ چند ایک کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

ج : پیاری لوبا!! اتنا غصہ!! بھئی ہم نے تو صرف تفنن طبع کے طور پر لکھا تھا کہ اسٹار پلس کے ڈراموں میں عموماً" تین چار نسلوں کی کہانی ہوتی ہے۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو یہ بات اتنی بری کیوں لگی؟ بہرحال ہم آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ آئندہ خیال رکھیں گے پرچا بھی آپ کا، مرضی بھی آپ کی اور ہم بھی اگر سمجھیں تو آپ سے الگ نہیں ہیں۔ جہاں تک تعریف و تنقید کا تعلق ہے تو آپ یقین کریں کہ ہمیں اتنی تعریفیں موصول ہوتی ہیں کہ ایڈٹ کر کرکے ہمارے ہاتھ دکھ جاتے ہیں ہم تو تلاش کرکے تنقیدی خطوط شامل کرتے ہیں۔

ہما فاروق۔۔۔ گوجرانوالہ

آپی' عمیرہ احمد اور نمرہ احمد کے بعد میری سب سے فیورٹ رائٹر سائرہ رضا ہیں۔ میں نے ان کے تمام افسانے اور ناولٹ جو "شعاع" اور ڈائجسٹ میں چھپے ہیں پڑھے ہیں۔ مگر آپی ان کا ایک مکمل ناول ہے۔ "سیدھی سڑک" جو کہ جون 2012ء کے خواتین ڈائجسٹ میں چھپا تھا۔ مجھے اس کا اینڈ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا آپ سمجھا کر میری الجھن دور کرسکتی ہیں۔

کیا اصدق نے چندرا سے شادی کی تھی؟ تو پھر خدیجہ کون تھی؟

ج : پیاری ہما! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ سیدھی سڑک میں اصدق نے دوسری شادی چندرا سے نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ جو معمولی شکل و صورت کی لڑکی خدیجہ کام کرتی تھی اس سے کی تھی۔ وہ ایک شریف لڑکا تھا چندرا جیسی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ دوسری شادی اس نے عیاشی کے لیے نہیں' تنہائی سے تنگ آکر کی تھی۔



بقیہ ڈاکٹر شکیل

میدان توجہ سے عاری ہیں۔"

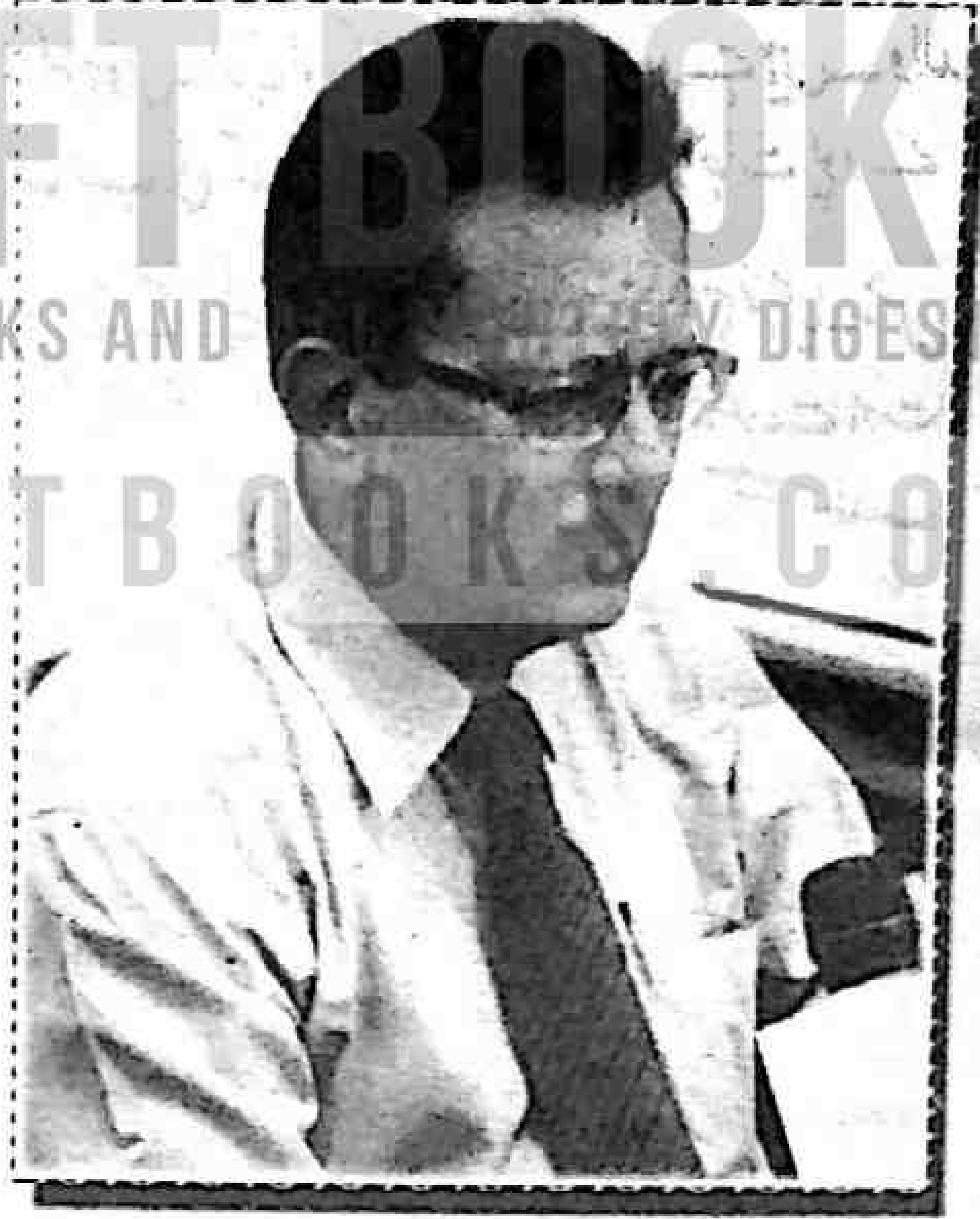
"ڈاکٹر صاحب! مزید سوالات سے پہلے اب آپ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔"

"جی ضرور۔۔۔ میں یکم ستمبر 1963 میں پاکستان کے مشہور شہر راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے گاؤں ڈھولک میکال میں پیدا ہوا۔۔۔ ابتدائی تعلیم "گجرات" کے ایک علاقے ملکوال سے حاصل کی' پھر والد صاحب کے تبادلے کی وجہ سے کراچی آگئے۔۔۔ کراچی میں "ہونہار پرائمری اسکول نارتھ کراچی" سے پرائمری کی تعلیم حاصل کی۔ جہاں میری کلاس ٹیچر مسز نوشابہ" نے مجھے آگے بڑھنے میں بہت معاونت کی اور مجھے اسکول کا بہترین طالب علم بنایا۔۔۔ پھر سیکنڈری تعلیم کے لیے ٹاؤن کمیٹی گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہاں میری استاد محترمہ ماہ جبیں نے مجھ پر خاص شفقت کی اور مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ پانچ سال میں نے اسکول میں ٹاپ کیا۔ دو گولڈ میڈلز اور اسکالر شپ حاصل کی۔۔۔ اس کے بعد ڈی جے سائنس کالج سے امتیازی نمبروں سے انٹر پاس کیا۔ یہاں میرے استاد محترم "م انجم ریاض" نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ ان کے علاوہ میرے استاد جناب سید صاحب کا ذکر نہ کروں تو میں اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک قابل طالب علم بنایا۔ پھر سندھ میڈیکل سے ایم بی بی ایس اور بقائی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔۔۔ اور اس کے بعد حصول علم کے لیے کئی ممالک گیا۔۔۔ والدین انتقال کر چکے ہیں' بہت ہی شفیق اور محبت کرنے والے والدین تھے' اگرچہ تعلیم یافتہ نہیں تھے مگر علم دوست تھے۔ ان کی کوشش رہی کہ ان کے بچے اعلا تعلیم یافتہ ہوں۔۔۔ ہم سات بہن بھائی تھے۔ ایک بہن کا انتقال ہو چکا ہے۔ چھ بھائی ماشاء اللہ حیات ہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ چھوٹا بھائی فزیو تھراپسٹ ہے۔ بھائیوں میں میرا نمبر چوتھا ہے' میں اپنے خاندان کا پہلا ڈاکٹر ہوں۔ اب اور کزن بھی ڈاکٹر بن رہے ہیں۔۔۔ والد صاحب کی آمدنی کم تھی۔ تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے "سن رائز کوچنگ سینٹر" قائم کیا۔ جس سے مالی آسودگی حاصل ہوئی۔۔۔ اس سینٹر سے بہت قابل بچے نکلے ہیں جو ڈاکٹر اور انجینئر ہیں۔ ایک طالب علم تو پرائیویٹ یونیورسٹی کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے ہیں۔۔۔ شادی ہو چکی ہے اور پسند سے ہوئی۔ والدین کی رضامندی بھی شامل تھی۔۔۔ بیگم خاندان سے ہیں۔ میرے ماشاء اللہ چار بچے ہیں۔ بڑی بیٹی ڈاؤ میڈیکل کالج میں ہے۔ چھوٹی بیٹی سینٹ لارنس جبکہ چھوٹا بیٹا اور بیٹی ہمدرد اسکول میں پڑھتے ہیں۔"

"میڈیکل لائن لینے کی کیا وجہ تھی۔۔۔ والدین کی خواہش کہ میرا بیٹا ڈاکٹر بنے گا؟" انجینئر بنے گا وغیرہ وغیرہ۔۔۔"

"جی نہیں۔۔۔ میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا' والد صاحب کہتے تھے کہ جو پڑھنا چاہے گا میں اسے پڑھاؤں گا۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ میری ٹیچر نے پہلی اور آخری بار میرے والد کو بلا کر کہا کہ آپ کا بچہ پڑھتا نہیں ہے اور پڑھائی میں بہت کمزور ہے۔۔۔ میرے والد نے کہا ہم تو اسے پڑھنے کے لیے نہیں کہتے' یہ تو خود پڑھتا ہے۔۔۔ دراصل ہم پنجاب سے آئے تھے تو اردو تو آتی نہیں تھی۔ تو اردو پڑھنے اور سمجھنے میں مشکل ہوتی تھی۔۔۔ جب شکایت ہوئی تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے خوب محنت کی اور اسی سال اسکول میں ٹاپ پوزیشن لی اور پھر ہر سال ٹاپ کیا میں نے۔۔۔

اب سوال یہ کہ ڈاکٹر بننے کا شوق تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں تو جی ڈی پائلٹ بننا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر بننا میرا خواب نہیں تھا اور نہ ہی مجھے کسی نے فورس کیا تھا۔ میٹرک نمایاں نمبروں سے پاس کیا تو ایئر فورس سے جی ڈی پائلٹ کے انٹرویو کی کال آگئی' لیکن چونکہ میری نظر کمزور تھی اور عینک لگاتا تھا تو انٹرویو کے دوران ہی مجھے نااہل قرار دے دیا گیا۔۔۔ پھر انٹر پری میڈیکل میں داخلہ لیا' انٹر امتیازی نمبروں سے پاس کیا تو سندھ میڈیکل



میں داخلہ مل گیا۔۔۔ میڈیکل کی طرف اس طرح رجحان ہوا کہ میرے والد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا' اور ہاتھ کی انگلی کٹ گئی تھی۔۔۔ تو جب ان کے ہاتھ کی انگلی کی ڈریسنگ ہوتی تھی تو میں بہت دلچسپی سے دیکھتا تھا۔۔۔ اور پھر خود ابو کی ڈریسنگ کرنے لگا' یہاں سے ہی میڈیسن میں دلچسپی پیدا ہوئی۔۔۔ لیکن گریجویشن کرنے کے بعد میں اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا تھا۔۔۔ کوئی فیلڈ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔۔۔ کہ ہاؤس جاب کے دوران مجھے ڈاکٹر حمیدہ جمیل نے کہا کہ آپ ڈائبیٹس Diabetes سینٹر میں بیٹھا کریں۔۔۔ اس وقت ذیابیطس میں کتابیں بھی کم تھیں اور کوئی نرسنگ بھی نہیں تھی۔ لہٰذا ہاؤس جاب کے بعد ڈاکٹر عبدالباسط (پروفیسر ڈاکٹر عبدالباسط اور ان کی ٹیم نے پاکستان کو ذیابیطس کے حوالے سے BIDE کے پلیٹ فارم سے دنیا بھر میں روشناس کرایا۔) سے ملاقات ہوئی۔ ان ہی کی زیر نگرانی پہلی پوسٹ گریجویشن ذیابیطس میں ٹریننگ حاصل کی۔ اور پیروں کے زخموں کے علاج میں دلچسپی ہوئی۔ تو ٹریننگ لی۔ اور نہ صرف ٹریننگ لی بلکہ پاکستان میں پیروں کی حفاظت پر پہلی کتاب بھی پیروں کی نگہداشت تحریر کی۔ جسے 2010 میں بہترین کتاب کا ایوارڈ بھی ملا۔۔۔ میں نے 1991 میں گریجویشن مکمل کیا۔۔۔ عام سا طالب علم تھا مگر پڑھتا بہت محنت سے تھا۔۔۔ میں نے کچھ سال گورنمنٹ جاب بھی کی' جہاں مجھے آرتھوپیڈک سرجری میں جناب پروفیسر ڈاکٹر نجم قریشی کے زیر سایہ آرتھوپیڈک سرجری میں کام کرنے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے پیروں کے زخم کے حوالے سے علاج میں معاونت کی۔۔۔"

"اب بھی آپ گورنمنٹ جاب کرتے ہیں؟"

"میں نے گورنمنٹ جاب چھوڑ دی ہے اور پرائیویٹ دیکھتا ہوں مریضوں کو۔ ذیابیطس میں میرا خاص شعبہ "شوگر + شوگر میں پیروں کے زخموں کا علاج ہے۔ میں دن میں پرائیویٹ مریضوں کو دیکھتا ہوں' جہاں میری فیس زیادہ ہوتی ہے۔ مگر رات کو میں ان مریضوں کو دیکھتا ہوں جو فیس افورڈ نہیں کر سکتے اپنی فیس کا صرف 10 فیصد رات کے مریضوں سے وصول کرتا ہوں اور یہ کلینک گزشتہ 25 سال سے ذیابیطس سے متاثرہ افراد کی خدمت میں پیش پیش ہے۔ اللہ تعالیٰ میری اس کوشش کو قبول کرے۔ (آمین)۔

"آپ نے بتایا کہ آپ نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔۔۔ کچھ اس کے بارے میں بھی بتائیں۔"

"جی۔ میں نے شوگر کے موضوعات پر مریضوں کی ایجوکیشن کے لیے تین کتابیں لکھی ہیں۔ (1) آپ اور ذیابیطس (2) شوگر میں پیروں کی نگہداشت (3) روزہ اور صحت' اس کے علاوہ مختلف اخبارات میں مضامین تحریر کیے ہیں۔۔۔ مختلف ٹی وی چینلز پر 500 سے زائد ٹی وی پروگرام ذیابیطس کے موضوع پر کر چکا ہوں۔ ان چینلز میں انڈس ٹی وی' اے آر وائی' اے ٹی وی' اے پلس "اب تک" ٹی وی' دھوم ٹی وی' میٹرو ٹی وی اور سچ ٹی وی شامل ہے۔۔۔ ایک عدد ڈرامے میں بھی کام کر چکا ہوں۔ "میرے محلے میں آئے رمضان" جس میں میرے ساتھ "تمنا"

شہزاد خلیل اور دانش نواز کے علاوہ دیگر آرٹسٹ بھی شامل تھے۔"

"ڈاکٹر بننے کے لیے بہت پیسہ درکار ہوتا ہے۔۔۔۔ آپ نے سب کچھ خود کیا یا والدین کی مدد شامل حال رہی؟"

"جی۔ میڈیکل کی تعلیم بہت مہنگی ہے۔ والدین اپنی بساط کے مطابق میرا بہت ساتھ دیتے تھے۔ میں نے مالی مشکلات پر قابو پانے کے لیے سن رائز کوچنگ سینٹر قائم کیا۔ جو میری مالی مشکلات کو بہت حد تک پورا کرتا تھا۔۔۔ میڈیکل کی کتابیں بہت مہنگی تھیں۔ میں نے لائبریری سے کتابیں نہیں لیں بلکہ خرید کر پڑھتا تھا۔"

"آپ ماشاء اللہ کوالیفائڈ ہیں۔ اس اعلا تعلیم کے ساتھ آپ ملک سے باہر رہنے کے بجائے پاکستان کو ترجیح دیتے ہیں کیوں؟"

جواب دینا پڑے گا وطن کی مٹی کو
شکیل جب کبھی پردیس کو سدھارو گے

"مجھے پاکستان میں رہنا پسند ہے۔ میں باہر جا سکتا تھا۔ جہاں بہت پیسہ ہے لیکن جب اپنے وطن میں ہی آپ کو آسائشیں مل رہی ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ باہر جانا مناسب نہیں۔۔۔۔ اگر سب ہی باہر چلے جائیں گے تو پھر یہاں کے لوگوں کا علاج کون کرے گا۔۔۔ یہاں ذیابیطس میں تربیت یافتہ ڈاکٹرز کی تعداد 100 سے بھی کم ہے۔ اس پر طرہ — یہ کہ پی ایم ڈی سی پاکستان نے ذیابیطس میں ڈپلوما کو تسلیم نہیں کیا۔ جبکہ سرکاری اداروں میں ذیابیطس کے اسپشلسٹ کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔"

"ایک سوال میں کرنا بھول گئی۔۔۔ چلتے چلتے اس کا بھی جواب دے دیں کہ شوگر کتنے اقسام کی ہوتی ہے؟"

"جی شوگر کی تین اقسام ہیں۔"

پہلی قسم میں لبلبہ انسولین بنانا اچانک بند کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے لبلبہ کے انسولین پیدا کرنے والے خلیات کا تباہ ہو جانا ہے۔ اس قسم کی شوگر عموماً کم عمری میں ہوتی ہے۔ لیکن یہ بڑی عمر میں بھی ہو سکتی ہے۔

دوسری قسم کی شوگر میں ابتدا میں جسم ناکارہ انسولین پیدا کرنے لگتا ہے۔ اسے انسولین مزاحمت کا مرحلہ کہتے ہیں۔ اس مرحلے میں مریض کو بھوک زیادہ لگنے لگتی ہے۔ وزن مسلسل بڑھتا رہتا ہے پھر آخر کار انسولین کی مقدار میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ اور ذیابیطس ظاہر ہو جاتی ہے۔۔۔۔ اس ذیابیطس میں ابتدا میں گولیاں اور پھر انسولین استعمال کی جاتی ہے۔ جبکہ پہلی ٹائپ میں ذیابیطس کے علاج کے لیے انسولین لازمی ہے۔

تیسری قسم کو "دوران حمل کی ذیابیطس" کہتے ہیں (GDM) یہ ذیابیطس کی وہ قسم ہوتی ہے جو عارضی ہوتی ہے۔ اور حمل ختم ہونے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ مگر شوگر ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔۔۔۔ اس کے علاوہ بھی ذیابیطس کی اقسام ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا بے محل ہو گا۔

"اور آخر میں شوگر سے متاثرہ افراد کو آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟"

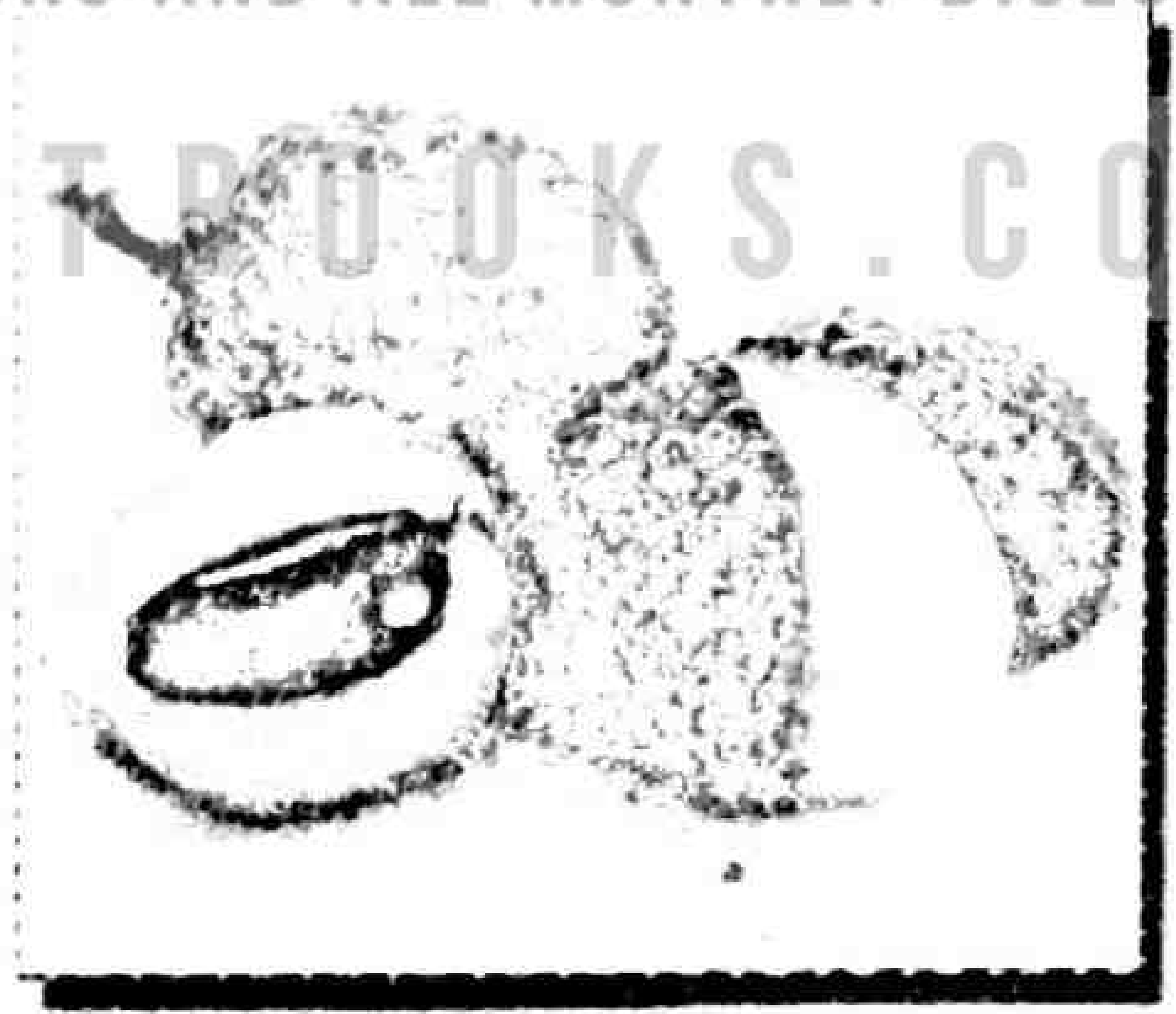
"جی بالکل۔۔۔ لوگوں سے میری گزارش ہے کہ اپنی شوگر کو سنجیدگی سے لیجیے۔ کوشش کریں کہ آپ کا کولیسٹرول، بلڈ پریشر، وزن اور شوگر لیول نارمل یا نارمل کے قریب رہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت چاہی۔



خبریں و بریں

واصفہ سہیل



خزانہ

گرمیوں میں لیچی کھائیں۔ لیچی ایک ایسا پھل ہے جس میں غذائیت بخش اجزا' منرلز اور وٹامنز کی بہتات ہوتی ہے۔ اس میں وٹامن سی بھی بڑی مقدار میں ہوتا ہے۔ جو نزلہ' زکام' گلے کی خراش اور بخار کو روکتا ہے۔ اسے کھانے سے پیشاب کھل کر آتا ہے اور کھانا ہضم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لیچی میں پوٹاشیم کی مقدار خاصی ہوتی ہے۔ جو دل اور خون کو صحت مند رکھنے کے لیے مفید ہے۔ لیچی میں کینسر کا خطرہ کم کرنے کی صلاحیت ہے۔ جو مدافعتی نظام کو توانا کرکے جسم کو انفیکشنز' بیماریوں اور طبی مسائل سے محفوظ رکھتا ہے۔ جگر کے افعال کو درست رکھتا ہے۔ لیچی کو خالی پیٹ نہیں کھانا چاہیے کیوں کہ خالی پیٹ کھانے سے جسم میں گلوکوز کی پیداواری صلاحیت رک جاتی ہے۔ اور دماغ پر سوجن آنے کی وجہ سے موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔

جوہری

حنا دلپذیر نے کلینکل سائیکالوجی میں ماسٹرز کیا ہے۔ شوبز میں آنے کے متعلق حنا دلپذیر کہتی ہیں۔

"میں نے کراچی میں بہت سے تعلیمی اداروں میں نوکری کی کوشش کی مگر مجھے کہیں نوکری نہ ملی (اگر مل جاتی تو۔۔۔؟) پھر میں نے ایک اسکرپٹ پر کام شروع کیا اور اسے ایک پرائیوٹ چینل کو پیش کیا۔ انہوں نے میرا اسکرپٹ تو ایک طرف رکھ دیا اور مجھے ایک لانگ پلے میں ایک کردار کی پیش کش کی۔ "برنس روڈ کی نیلوفر" میں مجھے نو بچوں کی اماں کے مشکل کردار میں لے لیا گیا۔ جب کہ میں نے اس سے پہلے اداکاری نہیں کی تھی۔ (پہلی مرتبہ میں ہی اتنی اچھی اداکاری) یہ میرے لیے آج بھی معمہ ہے کہ مجھ جیسی ناتجربہ کار کو کیوں کاسٹ کیا۔ (بھئی مظہر معین اور فصیح باری خان جوہری جو ٹھہرے) میں ہمیشہ سے نئی چیزوں کا تجربہ کرنے کی شوقین ہوں تو اسی لیے میں نے "سعیدہ" کا کردار کرنے کی ہامی بھرلی لیکن اس کے باوجود میں بہت خوف زدہ تھی اور شوٹنگ کے دن مجھے بخار ہوگیا۔ کیوں کہ مجھے عابد علی جیسے سینئر کے ساتھ کام کرنا تھا۔



لیکن ڈراما آن ایئر ہوا تو مجھے میرے خاندان والوں، دوستوں کے اتنے فون آئے کہ اس دن میرے فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔



مشن

مہوش حیات نے ٹی وی پر زیادہ تر کردار روتے دھوتے کیے ہیں (اسی لیے فلم میں۔) مہوش حیات اس بارے میں کہتی ہیں کہ انہوں نے دو سال تک ٹی وی ڈراموں میں صرف اس لیے کام نہیں کیا کہ انہیں صرف المیہ کردار آفر ہوتے رہے۔ (مہوش! ابھی ٹی وی ڈراموں میں آئٹم سانگ کا رواج نہیں ہے ورنہ۔)

انہوں نے مزید کہا کہ میں نے جان بوجھ کر کم مگر مختلف کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ (مہوش وہ جو آپ فلموں میں کر رہی ہیں وہ مختلف "کام" ہے؟) اب میں بطور اداکارہ خود کو تلاش کرنے کے مشن پر نکلی ہوں۔

اِدھر اُدھر سے

☆ حال ہی میں ایک دفاعی تجزیہ کار نے ہمارے مذہبی اسکالروں اور علما کا حق مارتے ہوئے وزیراعظم کے خلاف ایک فتویٰ جاری کرنے کی کوشش بھی کی۔ یہ وہ صاحب ہیں جن کے بارے میں ٹی وی کیمرہ مین حضرات سرعام کہتے ہیں کہ انہیں انٹرویو کی ریکارڈنگ کے لیے اپنے گھر کا صوفہ کھسکانے کی بھی اجازت نہیں ملتی۔ ایک اور وکیل کا کہنا تھا کہ یہ موصوف ایک وقت میں خود کو فضائیہ کا سربراہ بنانے کے لیے سپریم کورٹ میں سوموٹو نوٹس کی درخواست بھی دائر کرنے کا سوچ رہے تھے۔ (مطیع اللہ جان۔ از خودی)

☆ حسن نثار کی بکواس کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً ایک پہلو یہ ہے کہ "پردہ ساڑھے چودہ سو سال پہلے تو ٹھیک تھا مگر اب ٹھیک نہیں۔" لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ پردے کا حکم تو قرآن کا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ جو قیامت تک کے لیے ہے (شاہنواز فاروقی۔ روبرو)

☆ باخبر لوگوں کا کہنا ہے کہ بلدیہ عظمیٰ کراچی سے افسران کی تعلیمی اسناد اور دیگر دستاویزات چیک کی جائیں تو 93 فیصد ایسے نکلیں گے جن کی اسناد جعلی ہوں گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کے ایم سی کے کسی افسر کے پاس اس کا ریکارڈ نہیں ہے۔ (محمد انور)

☆ بھوسی غذا کا ایک انتہائی اہم، ضروری اور مفید حصہ ہے جو پھلوں کے چھلکوں، ترکاریوں اور کامل اناج سے حاصل ہوتا ہے، یہ ریشہ دار پھوک کی شکل میں ہوتا ہے اور صحت کو برقرار رکھنے میں نہایت معاون ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر محمد اسلم)

☆ کراچی شہر جو ملک بھر کے مظلوموں کی دادرسی کرنے والا تھا۔ حکمرانوں سے عوام کے حقوق کی جنگ لڑنے والا تھا۔ یکایک ایسا تبدیل ہوا کہ اسے اپنے حقوق کے دشمن اپنے جیسے مظلوم ہی نظر آنے لگے۔ 30 برس گزرنے کو آئے ہیں، کراچی کے عوام کبھی کسی حکمران کے خلاف اعلان بغاوت نہ کر سکے۔ (سید وجیہہ حسن)



آپ کا باورچی خانہ

ماہ روش خان

(1) خاتون خانہ کا سب سے اہم کام خاندان کو کھلانا پلانا ہوتا ہے۔ اگر کوئی کھانا دیکھ کر یا کھا کر خوش نہ ہو پھر بے چاری کی تو محنت گئی ناں۔

جب میں سیکنڈ ائیر میں تھی تب میری شادی ہوئی تھی۔ اس وقت میں اٹھارہ سال کی تھی اور اب میری شادی کو آٹھ سال ہو چکے ہیں۔ شادی سے پہلے مجھے کوکنگ کی الف' ب بھی نہیں آتی تھی' لیکن جب سر پر پڑی تو پھر۔۔۔

لیکن اب میں ہر چیز بہت عمدہ اور لذیذ پکا اور بنا لیتی ہوں۔ ہمارے گھر میں بیک وقت سب کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے گھر میں میرے اور میرے میاں کے علاوہ ایک دیور' دیورانی ہیں اور ایک دیور چھوٹا ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔

چھوٹا دیور سبزیاں بہت شوق سے کھاتا ہے۔ جب کہ باقی گھر والے مجھ سمیت سبزیاں اتنے شوق سے نہیں کھاتے۔ ہاں جس دن کوفتے بنتے ہیں' اس دن سب چھوٹے بڑے شوق سے کھانا کھاتے ہیں' بقر عید کے موقع لوگوں کے گھروں میں طرح طرح کے پکوان بنتے ہیں' لیکن ہمارے گھر میں کوفتے ہر دوسرے تیسرے دن بنتے ہیں۔

(2) ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ مہمان بغیر اطلاع دیے کھانے کے وقت پہنچ جائیں' لیکن اگر ایسا ہو تو پھر میری دیورانی کچن سنبھالتی ہے اور میں مہمانوں کے ساتھ بیٹھ جاتی ہوں' لیکن اگر مہمان اس کے رشتہ دار ہوں تو پھر وہ مہمانوں کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے اور میں کچن سنبھالتی ہوں۔

سب سے پہلے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مہمان مرد حضرات ہیں تو پھر پتلے چاول اور کوفتے بنتے ہیں' لیکن اگر مہمان خواتین ہیں تو پھر موٹے چاول اور ساتھ میں کوفتے وغیرہ (ہم پٹھان عورتیں موٹے چاول بہت شوق سے کھاتی ہیں) پتلے چاولوں میں اگر پانی کی مقدار تھوڑی سی بھی زیادہ ہو جائے تو چاول بیٹھ جاتے ہیں اور ٹیسٹ اچھا نہیں ہوتا' لیکن موٹے چاول پکاتے وقت زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ واحد چاول ہے کہ اگر پانی کی مقدار کم ہو جائے پھر بھی اچھے بنتے ہیں اور اگر زیادہ ہو جائے پھر بھی ٹیسٹ لاجواب ہوتا ہے۔ کھانے کے وقت اگر مہمان آجائیں تو نو ٹینشن۔۔۔

میں آپ لوگوں کو کوفتے بنانے کی آسان ترکیب بتاتی ہوں' تو مہمانوں کو کوفتے بنا کر کھلائیں۔

کوفتے

قیمہ	ایک کلو
سرخ مرچ	ایک چمچہ
لہسن' ادرک کا پیسٹ	دو چمچے
ٹماٹر	آدھا پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت
ہری مرچ	چھ عدد
گرم مسالا	آدھا چمچہ
انڈے	دو عدد
بیسن	دو چمچے

سب سے پہلے قیمے میں انڈے' بیسن' سرخ مرچ اور نمک ڈال کر آٹے کی طرح گوندھیں' گوندھے ہوئے قیمے سے درمیانے سائز کے کوفتے بنائیں پھر ایک ساس پین میں اتنا تیل ڈالیں کہ کوفتے اس میں ڈوب جائیں جب کوفتے سنہرے ہو جائیں تو نکال کے ایک کاغذ پر پھیلا دیں۔

ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں' اس میں کٹے ٹماٹر' لہسن' ادرک کا پیسٹ' نمک اور مسالا ڈال کر گلائیں۔ جب وہ پیسٹ کی شکل اختیار کرلے تو کوفتے شامل کر کے چمچے سے اچھی طرح ملائیں' اوپر سے گرم

مسالا اور ہری مرچ ڈال دیں اور تیل کے اوپر آنے تک چولہا دھیمی آنچ پر رکھ چھوڑیں۔

مزے دار کوفتے آدھے گھنٹے میں تیار ہیں۔

(3) سب سے پہلے میں آپ لوگوں کو بتاتی چلوں کہ ہمارے گھر میں ایک میں اور ایک میری دیورانی ہوتی ہے' میری دیورانی کسی دور دراز علاقے میں سرکاری ٹیچر ہے تو وہ صبح سویرے اسکول جاتی ہے اور دوپہر دو تین بجے تھکی ہاری گھر آتی ہے تو کچن کی صفائی ستھرائی کی ذمہ داری میرے سر ہے۔ ویسے بھی وہ کچن کی صفائی سے دور بھاگتی ہے۔ کچن کی صفائی میں سب سے پہلے برتن دھونا ہیں۔ اف.... برتن دھونا مجھے سخت ناپسند ہے' میں اس ڈائجسٹ کے توسط سے سب قاری بہنوں سے گزارش کرنا چاہتی ہوں کہ کیا کسی کے شہر میں برتن دھونے کی مشین ہے؟ اگر ہے تو مجھے اس شہر کا نام اور اس دکان کا پتا بتادیں تاکہ برتن دھونے سے تو جان چھوٹے۔

اس کے علاوہ چولہے کی صفائی روز کا معمول ہے۔ رات کو سونے سے پہلے فرش کو سرف سے چمکایا کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ عید اور بقر عید سے پہلے کچن کی تفصیلی صفائی ضرور کرتی ہوں۔

(4) ہمارے گھر میں صبح کا ناشتہ چھ بجے شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے میری دیورانی اپنے اور اپنے شوہر کے لیے ناشتہ تیار کرتی ہے۔ کیوں کہ اسے اسکول جانا ہوتا ہے۔ ویسے بھی اس کا ناشتہ سادہ سا ہوتا ہے۔ ایک کپ چائے اپنے لیے اور ایک کپ دودھ اپنے شوہر کے لیے گرم کرتی ہے۔ پھر سات بجے میں اپنی بیٹی جو کہ پانچ سال کی ہے' اس کے لیے ناشتہ بناتی ہوں۔ وہ ناشتے میں رات کا سالن پراٹھے کے ساتھ کھاتی ہے۔ یقین کیجیے جس دن سالن نہیں ہوتا اس دن وہ بھوکی اسکول چلی جاتی ہے' لیکن کوئی اور چیز انڈا' ملائی' سینڈوچ کچھ بھی نہیں بس اسے سالن چاہیے ہوتا ہے۔ میری دوسری بیٹی تین سال کی ہے۔ وہ صرف اور صرف ناشتے میں چائے پیتی ہے۔

البتہ میں اور میرا میاں ناشتہ ڈٹ کے کرتے ہیں۔ ہم ناشتے میں انڈا پراٹھا اور چائے لیتے ہیں۔ پراٹھے کے بغیر ہم ناشتہ کرتے ہی نہیں ہیں اور پراٹھا بھی ایسا کہ بہت باریک اور تیل میں تر بتر خستہ کرکرا۔ جس کو کھاتے ہوئے منہ سے کچر کچر۔ کی آواز ضرور آئے۔ پھر نو بجے میرا دیور اٹھتا ہے پھر وہ ناشتہ کرتا ہے (اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے) اور میری ساس میری شادی سے دو دن پہلے وفات پا گئی تھیں اور نند کوئی ہے نہیں تو اس کے ناشتہ پانی کی ذمہ داری میری ہے۔ وہ بھی میری طرح پراٹھا چائے اور انڈا کھاتا ہے۔

(5) اگر میرا اور میری دیورانی کا بس چلے نا تو ہم ہر روز ڈنر باہر جاکر کریں' لیکن کیا کریں ہمارے گھر میں عورتوں کا باہر جاکر ہوٹل میں کھانا کھانے کا رواج نہیں ہے' لیکن جب ہم شادی بیاہ کے کپڑے لینے پشاور جاتے ہیں تو اس دن دوپہر کا کھانا ہوٹل میں کھانے کی اجازت ہے۔ ویسے بھی جب گھر کے مرد باہر کھانا کھاتے ہیں تو واپسی پر ہمارے لیے وہی کھانا پیک کروا کے ضرور لے کر آتے ہیں' لیکن جب میرا بڑا بھائی دبئی سے آتا ہے تو پھر ہمیں مہینے میں ایک دو بار ضرور باہر کھانا کھلانے لے جاتا ہے۔

(6) ہر موسم میں ہر ڈش کا انتخاب موسم کی مناسبت سے نہیں ہوتا' لیکن جب بارش ہو رہی ہو تو ہمارا دل پکوڑوں اور خاص طور پر موٹے چاولوں کے لیے مچلنے لگتا ہے' لیکن اگر بارش جمعے کے دن ہو تو (جمعہ کے دن مرد حضرات گھر پر ہوتے ہیں) پھر بریانی ہمارے گھر میں ضرور بنتی ہے۔

(7) اچھا کھانا پکانے کے لیے محنت اور دل لگانا ضروری ہوتا ہے۔ موڈ اچھا نہ ہو یا دل نہ چاہ رہا ہو تو کھانا کبھی بھی اچھا نہیں بنے گا۔ کیوں کہ وہ محاورہ ہے ناکہ جتنا گڑ اتنا میٹھا۔

(8) ٹپ تو مجھے کچھ خاص آتی نہیں' لیکن اگر فرائی پین گیلا ہو اور اس میں گھی ڈالیں تو وہ چڑچڑ کرتا ہے۔ اگر اس گھی میں چٹکی بھر آٹا چھڑک دیا جائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔





موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

سنگاپورین رائس

ضروری اشیاء:

چکن (بون لیس)	آدھا کلو
انڈا	ایک عدد
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچ
میدہ	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
اسپیگھٹی (ابال لیں)	ایک پیکٹ
چاول	آدھا کلو
زرد رنگ	حسب ضرورت
ہری پیاز	دو عدد
گاجر	دو عدد
بند گوبھی	دو عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
لہسن کے جوے	تین سے چار عدد
تیل	حسب ضرورت
سویا سوس	آدھا کپ
کیچپ	آدھا کپ
تل کا تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

چاول، زرد رنگ اور نمک ڈال کر دو کنی کچے ابال کر الگ رکھ لیں۔ ہری پیاز، گاجر، بند گوبھی اور شملہ مرچ باریک کاٹ لیں۔ چکن کو ایک برتن میں ڈال کر اس میں انڈا، میدہ، کارن فلور، نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح ملا کر میرینیٹ ہونے کے لیے آدھا گھنٹے فریج میں رکھ دیں۔ فرائی پین میں تیل گرم کر کے چکن تل کر کے پلیٹ میں نکال لیں۔ اسی تیل میں لہسن ساتے کریں۔ اس میں ہری پیاز، گاجر، بند گوبھی اور شملہ مرچ ڈال کر ایک منٹ تل لیں۔

اسپیگیٹی، چاول، تلی ہوئی چکن، سویا سوس، آدھا چائے کا چمچہ سیاہ مرچ اور کیچپ ڈال کر مکس کر لیں اور تل کا تیل ڈال کر ڈش میں نکال کر ہری پیاز سے سجا کر کیچپ اور مایونیز کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

تکہ مسالا ونگز

ضروری اشیاء:

مرغی کے بازو	آدھا کلو
تکہ مسالا	دو کھانے کے چمچے
لہسن ادرک	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ
کارن فلور	تین کھانے کے چمچے
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

چکن ونگز (مرغی کے بازو) کو دھو کر خشک کر لیں۔
ایک برتن میں لہسن ادرک پسا ہوا، لیموں کا رس، تکہ مسالا، سویا سوس، نمک اور کارن فلور ڈال کر آمیزہ بنا لیں اور ونگز پر اچھی طرح لگا کر ایک گھنٹے تک فریج میں میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔
کڑاہی میں تیل گرم کر کے ونگز ڈال کر سنہری تل لیں (انہیں باربی کیو یا گرل بھی کر سکتے ہیں) ڈش میں نکال کر کیچپ اور چٹنی کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

ڈھابہ دال

ضروری اشیاء :

مسور دال — آدھا کپ
مونگ دال — آدھا کپ
ہلدی پاؤڈر — آدھا چائے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
لہسن — ایک چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچیں — چار عدد
کڑی پتے — چھ عدد
زیرہ — ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں (چوپ کرلیں) تین عدد
تیل — حسب ضرورت

ترکیب :

مونگ اور مسور کی دال کو الگ الگ پیالوں میں بھگو کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ہانڈی میں مونگ 'مسور کی دال 'لہسن پسا ہوا' ہلدی پاؤڈر اور پانی ڈال کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔ دالیں اچھی طرح گل جائیں تو گھوٹ لیں۔ حسب ضرورت پانی' ہری مرچیں اور نمک شامل کر کے ابال آنے تک پکائیں۔ دال حسب پسند گاڑھی ہو جائے تو چولہے سے اتار لیں۔

فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے ثابت لال مرچیں' زیرہ اور کڑھی پتے ڈال کر کڑکڑائیں 'بگھار دال کے اوپر ڈال دیں اور ڈش میں نکال کر چپاتی یا ابلے چاولوں کے ساتھ نوش کریں۔

ونٹر مکس سلاد

ضروری اشیاء :

شملہ مرچ — ایک عدد
لال مولی — تین عدد
سفید مولی — ایک عدد
ٹماٹر — ایک عدد
سلاد کے پتے — ایک گٹھی
میکرونی (ابلی ہوئی) — ایک کپ
انڈے — دو سے تین عدد
سرخ لوبیا — ایک کپ

ڈریسنگ کے لیے :

لیموں (رس نکال لیں) — دو عدد
سیاہ مرچیں — آدھا چائے کا چمچہ
چینی — ایک چائے کا چمچ
نمک — حسب ذائقہ
زیتون کا تیل — دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

شملہ مرچ' مولی اور ٹماٹر حسب پسند کاٹ لیں' ایک بڑے پیالے میں شملہ مرچ' لال مولی' سفید مولی اور ٹماٹر ڈالیں۔ اس میں ابلی ہوئی لال لوبیا اور میکرونی اور ابلے ہوئے انڈے ڈال کر مکس کر دیں۔

ایک پیالے میں نمک' لیموں کا رس' چینی' کٹی ہوئی سیاہ مرچیں' اور زیتون کا تیل ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔

ڈش میں سلاد کے پتے رکھیں اور اس پر سلاد ڈال دیں' پیش کرتے وقت سلاد ڈریسنگ ڈال کر پیش کریں۔

فرنچ ٹوسٹ

ضروری اجزا :

ڈبل روٹی — آٹھ سلائس
انڈے — دو عدد
دودھ — آدھا کپ
چینی — چھ کھانے کے چمچے
گھی / تیل — حسب ضرورت

ترکیب :

دودھ' چینی اور انڈے پھینٹ لیں۔ سلائس کو دو ٹکڑوں میں کاٹ کر انڈے اور دودھ والے آمیزے میں ڈبوئیں اور ہلکے گھی میں سنہری کریں۔ مزیدار فرنچ ٹوسٹ تیار ہیں۔ چاہیں تو ان پر جیم لگا کر بھی کھا سکتی ہیں۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

عرفانہ مغل...... وہاڑی

س : میرے بھائی کی منگنی چچا زاد سے ہوئی تھی۔ بھائی شہر پڑھنے گیا تو ان ہی چچا کے گھر ٹھہرا۔ ایک روز جب وہ اکیڈمی سے واپس آرہا تھا۔ اس کی کلاس فیلو بھی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں گرمی سے تنگ آکر ایک جگہ رک کر کولڈ ڈرنک پینے لگے۔ یہ منظر چچا نے دیکھ لیا۔ یہ کوئی ایسی معیوب بات نہ تھی مگر گھر آکر انہوں نے خوب واویلا کیا اور منگنی توڑ دی۔

میرے بھائی کو اپنی منگیتر سے بہت محبت ہے۔ اس کے غم میں اس نے سگریٹ پینا شروع کردی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ چچا کو کیسے منائیں' وہ تو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں۔

ج : آپ کے چچا عمر کے اس دور میں ہیں جب انسان میں سنجیدگی اور بُردباری آجاتی ہے۔ وہ جذبات کے تحت فوری فیصلے نہیں کرتا بلکہ سنجیدگی سے سوچ سمجھ کر فیصلے کرتا ہے۔ چچا آپ کے بھائی کی طبیعت' مزاج اور فطرت سے بھی بخوبی واقف ہوں گے کیونکہ دوران تعلیم وہ ان کے گھر مقیم رہا۔ بھائی کا اپنی منگیتر سے لگاؤ بھی ان سے پوشیدہ نہیں ہو گا کیونکہ بزرگ عموماً "ان باتوں کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

اس کے باوجود انہوں نے آپ کے بھائی کو ایک لڑکی کے ساتھ دیکھ کر فوری فیصلہ کرلیا اور منگنی توڑ دی تو یقیناً "یہ فوری فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے پس پشت کوئی اور بات ضرور ہوگی۔ ممکن ہے ان کی نظر میں کوئی اور رشتہ ہو جسے وہ آپ کے بھائی سے بہتر سمجھتے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی کوئی بات نہ ہو انہوں نے جذبات میں آکر فیصلہ کیا ہو۔ آپ اپنے' والد یا خاندان کے کسی بڑے سے کہیں کہ وہ چچا سے بات کریں' چچا کو یقین دلائیں کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے بھائی کا کسی لڑکی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تھوڑا وقت گزرنے پر ممکن ہے چچا کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرلیں۔

بھائی کو سمجھائیں کہ سگریٹ پی کر وہ خود کو نقصان پہنچا رہے ہیں' رشتہ دوبارہ جڑ سکتا ہے۔ اور بھائی کو دوسری لڑکی بھی مل سکتی ہے لیکن سگریٹ کی عادت پڑ گئی تو چھوڑنا بہت مشکل ہو گا۔ یہ صحت اور پیسہ دونوں کا نقصان ہے۔

ش۔ک...... جگہ نامعلوم

س : آج سے پانچ سال پہلے میں آفس کے کام سے شہر سے باہر گئی ہوئی تھی کہ اچانک میرے شوہر کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ میری اکلوتی بیٹی گھر میں تھی۔ راستے خراب ہونے کی وجہ سے مجھے گھر پہنچنے میں دو دن لگ گئے۔ گھر پہنچی تو بیٹی کی حالت بھی ابتر تھی۔

مسئلہ یہ ہے کہ اپنے والد کی وفات کے بعد بیٹی گم صم رہنے لگی ہے۔ بہت سے کام نہیں کر سکتی۔ کھانا کھانا بھی بھول جاتی ہے۔ راتوں کو جاگتی رہتی ہے۔ کیا اس کا نفسیاتی علاج ہو سکتا ہے؟

ج : آپ کی بیٹی بہت بڑے صدمے سے گزری ہے' باپ کی اچانک وفات ایک بہت بڑا سانحہ تھا اور اس وقت وہ تنہا تھی...... کوئی بہن بھائی نہیں تھا اور ماں بھی قریب نہیں تھی...... دکھ میں اپنوں کے گلے لگ کر ہی رویا جاتا ہے۔ اور ہمارے اپنے ہی ہمارا درد سمجھ سکتے ہیں۔ اس بچی کو تنہا اس سانحہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جس سے اس کے ذہن پر اثرات ہونا لازمی ہیں۔ ان اثرات سے باہر آنے کے لیے اس کو وقت کی ضرورت ہے۔ تھوڑا وقت گزرنے دیں۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو جائے گی۔ ڈاکٹر سے مشورہ کرکے آپ کچھ سکون آور دوائیں دے سکتی ہیں' جس سے اس کو رات کو نیند آجائے۔ میرے خیال میں اس کو نفسیاتی علاج سے زیادہ آپ کی دلجوئی اور وقت کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ وقت گزاریں' اس کے ذہن کو مختلف مشاغل کی طرف لگائیں۔ ان شاء اللہ بہتری ہوگی۔

نشاط نوید۔۔۔ لندن

س : ہماری فیملی لندن میں رہتی ہے جبکہ سارے رشتہ دار پنجاب میں رہتے ہیں۔ میرے والد ہم تینوں بہن بھائیوں کی شادی اپنے رشتہ داروں میں کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا ارادہ جان کر چھوٹی بہن گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اور اپنے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ مغربی معاشرے میں یہ باتیں معیوب نہیں مگر ہمارا دین اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ ہی سوچ انہیں سوچ کر والد دل کے مریض ہو گئے ہیں۔ بھائی بھی اپنی دوست سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر والد کی حالت کی وجہ سے دکھ بھی نہیں دینا چاہتا اور ان کے رشتے داروں میں شادی بھی نہیں کرنا چاہتا۔

ج : ہمارے ہاں ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ لوگ کمانے کے لیے باہر جاتے ہیں۔ اپنے بچوں کو وہاں تعلیم دلاتے ہیں۔ وہاں کی بود و باش اختیار کرتے ہیں اور اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ وہاں کا ماحول پاکستان سے یکسر مختلف ہے۔ وہاں ہر طرح کی آزادی ہے۔ لباس، تعلیم، آزادی سے گھومنا پھرنا کوئی پابندی نہیں۔۔۔ اکثر والدین تو اولاد کی تربیت پر بھی دھیان نہیں دیتے نہ مذہبی فرائض سے آگاہ کرتے ہیں۔ لیکن جب ان کی شادی کا وقت آتا ہے تو ان کو اپنا گاؤں، بھائی بھتیجے یاد آنے لگتے ہیں۔

آپ کے والد جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں اس طرح بوائے فرینڈ کے ساتھ رہنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ آپ کے والد کو چاہیے تھا کہ وہ آپ کی بہن کو اپنے مذہب اور اقدار سے روشناس کراتے۔ اسے اچھے برے کی تمیز دیتے تو وہ اس طرح کی حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن انہوں نے اس کی تربیت پر توجہ نہیں دی پھر شادی کا وقت آیا تو اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ شادی کے مسئلہ پر اس کی رائے لی جاتی اگر وہ رشتہ داروں میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی تو اسے مجبور نہ کیا جاتا بلکہ ایسا فیصلہ کیا جاتا جس میں اس کی مرضی بھی شامل ہوتی۔ یہ اس کا شرعی حق ہے۔ زبردستی کی شادی کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ اچھا ہوا کہ اس کی شادی وہاں نہیں ہوئی جہاں آپ کے والد چاہتے ہیں۔ اب بہن کو سمجھائیں اس سے کہیں کہ شادی کے مسئلے پر اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جائے گی۔ لیکن اس طرح بوائے فرینڈ کے ساتھ شادی کے بغیر رہنا غیر شرعی اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔ وہ گھر واپس آجائے۔ بھائی کو بھی مرضی کے خلاف شادی پر مجبور نہ کریں۔ ورنہ وہ بھی کوئی ایسا ہی قدم اٹھا سکتا ہے۔

ز۔س۔۔۔ اٹک

س : میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ جس وین سے اسکول جاتی تھی۔ اس کے ڈرائیور سے جان پہچان دوستی میں بدل گئی۔ پھر ہم دونوں نے خفیہ نکاح کر لیا۔ اس وعدے پر کہ جب تک وہ اجازت نہ دے گا نہ نکاح کا کسی کو بتاؤں گی نہ بچے کی خواہش کروں گی۔ اس نکاح کو دو سال ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ میری عمر ستائیس سال ہے اور میرے کئی رشتے آچکے ہیں۔ ٹیچنگ کر کے اپنے اخراجات پورے کرتی ہوں۔ کیونکہ بھائی کو میرے معاملات سے کوئی سروکار نہیں۔ بھابھی چاہتی ہیں کہ میری شادی ہو جائے مگر میرے شوہر نے مجھے دھمکی دی ہے کہ جس روز میں نے یہ راز ظاہر کیا وہ مجھے طلاق دے دے گا۔

ج : اچھی بہن! شادی کا مطلب ہی یہ ہے کہ معاشرے میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ دو افراد ازدواجی بندھن میں بندھ گئے ہیں۔ اسی لیے ولیمہ کرنے کا حکم ہے۔ آپ کی پہلی غلطی خفیہ شادی تھی۔ پھر اس نے آپ سے وعدہ لیا کہ کسی کو نہیں بتائیں گی اور نہ ہی بچے کی خواہش کریں گی لیکن اس وعدے کی کوئی مدت متعین نہیں کی۔۔۔ اس طرح کب تک چلتا رہے گا۔ آپ کی عمر 27 سال ہے۔ دو چار سال اسی طرح مزید گزر گئے تو آپ کے پاس کیا رہ جائے گا۔ ابھی تو رشتے آرہے ہیں بعد میں یہ رشتے آنا بھی بند ہو جائیں گے۔ ساری عمر اس طرح تو نہیں گزاری جا سکتی۔ بھائی لاتعلق ہے بھابھی آپ کو رکھنا نہیں چاہتیں پھر کہاں جائیں گی۔ آپ ہمت سے کام لیں۔ اگر آپ کی بہن یا والدہ ہیں تو ان کو ساری صورت حال بتائیں اور وہ اس لڑکے سے صاف صاف بات کریں اور وہ اس شادی کو قبول کرتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ طلاق ہی بہتر ہے۔ ابھی تو آپ کے سامنے دوسرے راستے کھلے ہیں لیکن اگر اس نے پانچ دس سال بعد طلاق دی تو کوئی راستہ نہیں ہو گا اور سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بھابھی رکھنے کو تیار نہیں تو آپ کہاں جائیں گی۔

امتہ الصبور

بیوٹی بکس

شاہین کنول.... کراچی

س: میں میک اپ کرتی ہوں تو تھوڑی دیر بعد ہی میک اپ خراب ہوجاتا ہے اور جلد پر دھبے سے نمایاں ہوجاتے ہیں۔ نم آلود ہوا اور گرمی کے موسم میں تو آدھے گھنٹے بعد ہی میک اپ بہہ جاتا ہے جب کہ مجھے پسینہ بھی زیادہ نہیں آتا۔

ج: شاہین! آپ کی جلد چکنی ہے۔ اسی لیے میک اپ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے، آپ پاؤڈر بیس میک اپ کا استعمال کریں۔ میک اپ کرنے سے آدھا گھنٹہ قبل چہرے پر برف سے ٹکور کریں اس سے جلد کے مسام بند ہوجائیں گے۔ پھر کلینزر ٹونر اور موئسچرائزر سے چہرا اچھی طرح صاف کرلیں۔ اس سے جلد کی چکنائی اچھی طرح صاف ہوجائے گی اور آپ کو میک اپ کرنے میں آسانی ہوگی۔

لپ اسٹک لگانے سے پہلے اپنے ہونٹوں پر فاؤنڈیشن لگائیں۔

لیکویڈ فاؤنڈیشن کے بجائے اسٹک استعمال کریں۔

نادیہ خان.... کراچی

س: باجی! مجھے پسینہ بہت آتا ہے، لیکن ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پسینے سے بو آتی ہے۔ گرمیوں میں تو یہ ناقابل برداشت ہوجاتی ہے۔ میں ڈیوڈرنٹ استعمال کرتی ہوں، لیکن گرمی کے موسم میں اس سے بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

ج: گرمی کے موسم میں آپ روزانہ غسل ضرور کریں۔ ایک آسان نسخہ لکھ رہی ہوں، اس سے آپ قیمتی ڈیوڈرنٹ کے خرچ سے بھی بچ جائیں گی۔

مٹھی بھر پودینہ کی پتیاں لیں۔ اس میں مٹھی بھر گلاب کی پتیاں ملائیں اور اس میں دو عدد لیموں کا عرق ملالیں اور اس محلول کو دو کپ پانی میں ابال لیں۔ رات بھر اس کو اسی طرح پڑا رہنے دیں۔ دوسرے دن اس محلول کو کسی صاف سی بوتل میں بھر کر رکھ لیں اور جب بھی استعمال کی ضرورت ہو، نہانے کے بعد اپنے جسم پر لگائیں اور دو منٹ بعد صاف تولیے سے خشک کرلیں آپ کے پسینے سے بدبو نہیں آئے گی۔

ساحرہ حسن.... میانوالی

س: میری آنکھوں کے گرد گہرے حلقے ہیں۔ اس کی وجہ سے آنکھیں اندر دھنسی ہوئی نظر آتی ہیں اور چہرہ بیمار لگتا ہے۔ کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ میری آنکھوں کے حلقے دور ہوجائیں۔ میرے ہاتھ پیر بھی کالے ہیں جب کہ چہرے کا رنگ خاصا صاف ہے۔ ہاتھ پیروں کو گورا کرنے کی ترکیب بتائیں۔

ج: آپ نے اپنی صحت کے بارے میں نہیں لکھا۔ خون کی کمی سے بھی آنکھوں کے گرد حلقے پڑجاتے ہیں۔ اگر آپ کی صحت کمزور ہے تو اس طرف توجہ دیں۔ سبزیاں، پھل زیادہ کھائیں، پوری نیند لیں۔ کم از کم آٹھ گھنٹہ ضرور سوئیں۔ مدھم روشنی میں مطالعہ نہ کریں۔

حلقے دور کرنے کے لیے درج ذیل نسخہ استعمال کریں۔

بیسن، دودھ اور لیموں کے عرق کا پیسٹ بنالیں اور آنکھوں کے گرد بہت احتیاط سے لگائیں۔ آنکھوں کے گرد کی جلد بہت نازک ہوتی ہے۔ خشک ہونے پر ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔ دن میں ایک بار یہ عمل کرنے سے حلقے دور ہوجائیں گے۔

دو چمچے دودھ میں تھوڑا سا نمک شامل کرلیں اور ہاتھوں پیروں پر روزانہ باقاعدگی سے مالش کرتی رہیں۔ رنگ صاف ہوجائے گا اور ہاتھ نرم ملائم ہوجائیں گے۔

